تفسیر فاروقی

جلد دوم

سورہ آل عمران آیت نمبر ۳۸ سے سورہ نساء آیت نمبر ۱۱۶ تک یعنی پارہ ۳ سے پارہ ۵ تک

اس تفسیر میں تقریباً دس، دس آیات پر مشتمل اسباق کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر سبق کی ابتدا میں قرآنی آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تفسیر نہایت جامع اور واضح انداز میں بیان کی گئی ہے، جس میں نہ صرف شانِ نزول اور اس سے متعلقہ احکام و مسائل شامل ہیں بلکہ ان آیات کے فضائل اور غیر مسلموں کے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی درج ہیں۔ یہ مجموعہ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اسے روزانہ مساجد میں درسِ قرآن کے لئے نیز گھروں میں اہلِ خانہ کے درمیان قرآن فہمی اور دینی تعلیم و ترتیب کی غرض سے بآسانی استفادہ کیا جا سکتا ہے

مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

(سابق استاذ: دارالعلوم ندوۃ العلماء و صدر جمعیت پیام امن، لکھنؤ، الہند)

جمعیت پیام امن

ندوہ روڈ، ڈالی گنج، لکھنؤ، یوپی، الہند ۲۰

© جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ U-4

نام	:	تفسیر فاروقی (جلد دوم)
مترجم	:	مفتی محمد سرور فاروقی ندوی
ناشر	:	مکتبہ پیامِ امن، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ، یوپی الہند-۲۰
اردو ایڈیشن	:	اشاعت اول
تعداد کتب	:	۱۱۰۰
سنہ طباعت	:	۲۰۲۶ء
ہدیہ	:	۸۰۰

Translator : Mufti Mohd Sarwar Farooqui Nadwi
Publisher : Maktaba Payam-e-Amn, Nadwa Road,
Daliganj,Lucknow-226020 U.P. India
Website : www.islamicjpamn.org
E-mail : ataullah2012@gmail.com
Phone No. 0091-9984490150, 9919042879

ملنے کے پتے

۱۔	مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ (لکھنؤ)	05222741539
۲۔	نیو سلور بک ایجنسی، 14، محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ممبئی	0522-2741539
۳۔	الفرقان بکڈپو، نظیر آباد ۳ (لکھنؤ)	9936635816
۴۔	سبحانیہ بک ڈپو، نیا محلہ، جبل پور، مدھیہ پردیش	9424708020
۵۔	ستیہ فاؤنڈیشن 182-A 5 گرین لینڈ کیمپس، پوکھرپور، کانپور	9935044343
۶۔	مکتبہ شباب جدید، ندوہ روڈ، لکھنؤ	9198621671
۷۔	مکتبہ شاہ ولی اللہ جامع مسجد، دیوبند	8439650526

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہ الکریم، اما بعد

عصرِ حاضر میں فہمِ قرآن کے لیے مختلف انداز میں تراجم وتفاسیر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ انہی گراں قدر کاوشوں میں داعی اسلام حضرت مولانا قاری ومفتی محمد سرور فاروقی ندوی دامت برکاتہم کی خدمات نمایاں ہیں۔ سنہ 2002ء میں آپ کا ہندی ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' شائع ہوا، جسے اندرون وبیرونِ ملک بالخصوص ترکی میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ہندی میں سات جلدوں پر مشتمل آپ کی تفسیر ''تفسیر فاروقی'' منظر عام پر آئی، پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسو چالیس سے زائد دعوتی موضوعات پر تصانیف اردو، ہندی، انگریزی، عربی، تمل، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں ''مکتبہ پیامِ امن'' لکھنؤ اور دیگر ملکی وغیر ملکی مکتبوں سے شائع ہوچکی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ''معانی القرآن الکریم'' ہے جو اردو میں نہایت رواں لفظی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ''مختصر تشریح معانی القرآن الکریم'' اور ''ترجمہ وتشریح لغات القرآن'' تین جلدوں میں نحوی، صرفی اور لغوی وضاحت کے ساتھ شائع ہوچکی ہیں۔ یہ شرف بھی ''مکتبہ پیامِ امن'' کو حاصل ہے۔ اب ہندی ''تفسیر فاروقی'' کا اردو ترجمہ بھی ''تفسیر فاروقی'' کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے۔

خصوصیات: (۱) اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلماتِ قرآنی کی تشریح میں اتباعِ سلف کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے، جو قرآن فہمی کی اصل روح ہے۔ (۲) اس تفسیر کی ترتیب روزانہ درس کی شکل میں کی گئی ہے۔ ہر درس میں تقریباً دس آیات درج کی گئی ہیں، پھر ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سب سے پہلے آیت کا شان نزول، پھر اس سے متعلق احادیث، معتبر علماء کے اقوال، مسائل، جدید سائنسی تحقیقات، نیز غیر مسلموں کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں ہر آیت سے متعلق فضائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

(۳) اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلمات کی وضاحت میں اتباعِ سلف کو بنیاد بنایا گیا ہے، جو اس تفسیر کی اصل روح ہے۔

(۴) الفاظ کی توضیح وتشریح کے مصادر میں عربی تفاسیر جیسے: تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی سے اور معتبر اردو تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح لغات وترکیبِ نحوی کے سلسلے میں اعراب القرآن (شیخ محی الدین درویش)، کلمات القرآن (مفتی شیخ حسنین محمد مخلوف)، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مکمل لغات القرآن، آسان لغات القرآن، مترادفات القرآن، مصباح اللغات وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس تفسیر کو پوری انسانیت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا کر شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

طالب دعا

عطاء اللہ صدیقی

سکریٹری (جمعیت پیام امن، لکھنؤ)

۲۳ رجب ۱۴۴۷ھ مطابق ۱۲ جنوری ۲۰۲۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائیہ کلمات

عالم اسلام کی عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وسابق صدر: مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد!

عزیز گرامی قدر مولوی محمد سرور فاروقی ندوی لائق مبارکباد ہیں کہ آسان ہندی زبان میں انسانوں کو انسانیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے انہوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے ترجمے اور ان سورتوں کے مضامین ومفاہیم اور روح و پیغام کو بہت آسان زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے اللہ پاک پورے قرآن کے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، مقصد یہ ہے کہ ہمارے جو بھائی ہندی زبان جانتے ہیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو بھائی ان سب تک انسانیت کا پیغام پہونچے۔

قرآن سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا تھا، اس کے نزول کو چودہ سو سال ہو رہے ہیں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر کروڑوں انسانوں کو امن وسکون حاصل ہوا۔ اس لئے کہ یہ کتاب انسانوں اور پوری کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے، ایسے خالق و مالک کی کتاب ہے جس کا علم یقینی اور مکمل ہے، اس لئے قرآن مجید میں جو علم ہے اس میں کوئی شبہ نہیں اور نہ کوئی اختلاف ہے، یکساں اور آخری علم ہے اور ہر چیز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

اس کتاب میں انسانوں کی زندگی کے لئے جو قانون دیا گیا ہے وہ لافانی ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہنے والے انسانوں کے لئے یکساں مفید ہے، اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اس لئے کہ قرآن ایک کلی مکمل اور اصول دستور العمل ہے، اس کو کسی سیاسی ضمیمہ کی ضرورت نہیں یہ حق و باطل، سچ، جھوٹ، ایمان، کفر، اسلام اور جاہلیت اور توحید وشرک کے درمیان فرق بتاتا ہے سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔

غرض کہ قرآن مجید ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مختلف عقائد وخیالات اور اخلاق واعمال کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں، اس نے کہیں صراحت کے ساتھ اور کہیں اشاروں میں ان گذشتہ قوموں اور اشخاص کا ذکر کیا ہے جو اپنے مخصوص اعمال واخلاق کی وجہ سے غیر فانی ہیں اس میں بھی ان جرائم کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کثیر الوقوع ہیں اور عام طور پر پیش آتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں قرآن مجید ایک ایسی زندہ جاوید کتاب ہے، جس میں حال، ماضی، قدیم وجدید کی کوئی تقسیم نہیں، اس کا خطاب ہر تمدن اور ہر دور کے لئے ہے۔ اس کی دعوت ہر دم تازہ اور حسب حال ہے، یہ انسانوں کا متکلم مرقع اور انسانی فطرت کا ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ قرآن مجید کی مخاطب پوری نوع انسانی ہے، لیکن جس طرح زمین مختلف ہے اپنی صلاحیت، زرخیزی کے

اعتبار سے یا اس سے فائدہ اٹھانے میں ،اسی طرح قرآن مجید کوقبول کرنے اوراس سے مفید ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جن کے اندرمندرجہ ذیل صفات اورخصوصیات ہوں۔

قرآن مجید سے استفادہ کی پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن سے فائدہ اٹھانے کی طلب اورجستجو ہو،موجودہ حالت پر بےاطمنانی ،اصلاح حال کی کوشش اور راستہ کی تلاش کا جذبہ ہو۔دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ جوشخص قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا چاہتاہےاس کے اندرخدا کا خوف ہو،یعنی خدا کا نام لینے سے ان کے دلوں پر اثر ہوتا ہو،اس لئے کہ قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اوراس کے خوف پر ہے۔

تیسری بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حقائق پر چاہے وہ عقل میں آئیں یانہ آئیں مکمل طور سے ایمان لائے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ،وحی،فرشتے،آخرت،جنت اوردوزخ کے وجودکوتسلیم کرے اوراس سلسلہ میں انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد کرے۔

چوتھی بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن مجید کوسوچ کرغوروفکر سے پڑھے۔پانچویں بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن کےفہم وتدبراوراس پرعمل کرنے میں مشقت اورمجاہدہ کرنا پڑےتواسکو برداشت کرےاوراس کے لئے اپنے اخلاق کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش کرے، قربانی دینے کی ضرورت پیش آئےتواس سے دریغ نہ کرےاورقرآن کی ہدایات پرعمل کرے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس قرآن مجید کی پوری عظمت دل میں ہو،اوراحترام وشوق اورمحبت کے ساتھ اس کو پڑھے جیسے کسی محبوب بادشاہ کا کلام شوق ومحبت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اگرہم قرآن مجید کا مطالعہ ان خصوصیات وصفات وشرائط کے ساتھ کریں گےتوہمیں فائدہ ہوگا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کوقبول فرمائے اورقبول حق کے لئے قرآن مجید پڑھنے والوں کے سینوں کوکھول دے۔آمین

ابوالحسن علی ندوی

ابوالحسن علی ندوی
ناظم:ندوۃ العلماء،لکھنؤ
۲۰/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ

نوٹ: مفکراسلام حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی حیات میں ہی تیسواں پارہ شائع ہوگیا تھا جس پرحضرت مولانا نے درج بالا مقدمہ تحریرفرماکردعائیہ کلمات سے ہمت افزائی فرمائی تھی جسے استفادہ کی غرض سے اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معروف علماء دین کی تصدیقات کے منتخب اقتباسات

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور درود وسلام ہو محسنِ اعظم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، جنہوں نے امت کو قرآن مجید کی تعلیم دی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں تمام صحابۂ کرام وحفاظ اکرام، مفسرین اور ہم تک قرآن مجید کے پہنچانے والوں پر جنہوں نے قرآن کریم کی تعلیم کو عالم کے قریہ قریہ تک پہنچایا۔

الحمدللہ ۱۹۹۶ء میں ہی قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کر دیا تھا تب سے آج تک الحمدللہ اس کام میں مسلسل مشغول ہوں جس میں سب سے پہلے سورہ فاتحہ کی تفسیر شائع ہوئی، پھر پورے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' کے عنوان سے شائع ہوا، اس کے بعد جیسے جیسے تفسیر کا کام ہوتا رہا، ایک ایک جلد ''تفسیر فاروقی'' کے عنوان سے سات جلدوں میں شائع ہوئی پھر قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور مختصر تفسیر بھی شائع ہوئی پھر 'ترجمہ وتشریح لغات القرآن الکریم' کے عنوان سے تین جلدوں میں نحوی، صرفی، لغوی تشریح کے ساتھ ترجمہ شائع ہوا، ان تمام قرآن مجید کے تراجم سے متعلق معروف قرآنی علوم کے ماہرین سے مفید مشورے لئے جاتے رہے اور ناچیز کی درخواست پر وہ اپنے دعائیہ کلمات سے ہمت افزائی بھی فرماتے رہے۔ اس لئے اپنے اساتذہ ومحسنین کے پیغامات کو جو تفسیر فاروقی یا اردو ہندی کے ترجمے وتفسیر پر الگ الگ تاریخوں میں لکھے گئے تھے اسے بھی شامل کر لیا گیا ہے، جس سے مطالعہ کرنے والوں کو رہنمائی ہوگی اور ہمارے سبھی محسنوں کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

چونکہ پیغامات کی فہرست لمبی ہے اس لئے ان حضرات کے دعائیہ کلمات کے اقتباسات سے کچھ سطریں اخذ کر کے یہاں بطور نمونہ درج کی جارہی ہیں تاکہ انشراح قلب کے ساتھ استفادہ کیا جاسکے جو درج ذیل ہیں:

(۱) عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وسابق صدر: مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد!

عزیز گرامی قدر مولوی محمد سرور فاروقی ندوی لائق مبارکباد ہیں کہ آسان ہندی زبان میں انسانوں کو انسانیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے انہوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے ترجمے اور ان سورتوں کے مضامین ومفاہیم اور روح وپیغام کو بہت آسان زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے اللہ پاک پورے قرآن کے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس قرآن مجید کی پوری عظمت دل میں ہو، اور احترام وشوق اور محبت کے ساتھ اس کو پڑھے جیسے کسی محبوب بادشاہ کا کلام شوق ومحبت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ ان خصوصیات وصفات وشرائط کے ساتھ کریں گے تو ہمیں فائدہ ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور قبول حق کے لئے قرآن مجید پڑھنے والوں کے سینوں کو کھول دے۔ آمین۔

(۲)عالم اسلام کی معروف شخصیت مرشدامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

ہندی ترجمہ وتفسیر پر حضرت تحریر فرماتے ہیں ''ہمارے عزیز 'مولوی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب' جو ایک فاضل شخص اورعربی وہندی دونوں سے اچھی واقفیت رکھنے والے ہیں، میرے سامنے اس وقت انہیں کا ہندی ترجمہ وتفسیر قرآن ہے جس کو انہوں نے بڑی محنت وقابلیت سے تیار کیا ہے۔ امید ہے کہ سارے مسلم اور غیر مسلم بھائی جو ہندی زبان ہی کے ذریعہ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں اس ترجمہ وتفسیر سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے، مسلمان حضرات تو عمل کرنے کے لئے اور اس کی رہنمائی میں اپنی زندگی سنوارنے کے لئے اور غیر مسلم بھائی اسلام اور قرآن کی صحیح حقیقت اور تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے۔ میری دعا ہے کہ یہ تفسیر مفید اور کامیاب ثابت ہو۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''ان کے ترجمے کے بعض نمونے دیکھے تو اندازہ ہوا کہ بہتر سے بہتر جو بات ان کو سمجھ میں آئی وہ اختیار کی ہے بلکہ دوسرے بڑی صلاحیتوں کے حامل لوگوں نے جو ترجمے کئے ہیں ان پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے، تاکہ جس قدر وہ راہ مستقیم پر چل سکیں چلیں اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہیں ہم اس پر اپنی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے اس ترجمہ کی جو افادیت ہے اس کے اثرات کی اچھی توقع رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں''۔

(۳)عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مہتمم: دارالعلوم دیوبند)

''مفتی محمد سرور فاروقی ندوی کے ہندی ترجمے پر ملک کے متعدد اکابر اہل علم نے گہری نظر سے ترجمہ کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اس لئے امید ہے کہ یہ ترجمہ نہ صرف ہندی داں مسلمانوں کے لئے، بلکہ ان برادران وطن کے لئے بھی ''قرآن کا پیغام'' کو سمجھنے میں مدد دیگا، جو سنجیدہ اور انصاف پسند ہیں اور قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے اور مزید دینی خدمت کی توفیق بخشے''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں ''جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اس سے قبل ہندی زبان میں قرآن پاک کی ترجمانی کی خدمت انجام دی ہے جسے اہل علم نے سراہا ہے اور اب ان کے اردو ترجمہ کا نمونہ سامنے آیا ہے جس میں حتی الامکان لفظی ترجمہ کی کوشش کی گئی ہے اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے''۔

(۴)عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے قلم سے

(سابق مہتمم: دارالعلوم وقف دیوبند وسابق نائب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

''پیش نظر تفسیر ''قرآن کا پیغام'' تفسیر فاروقی'' بزبان ہندی اور اس تفسیر کے ذریعہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے علمی ذوق سلیم وقیع دینی صلاحیت، وسیع مطالعہ اور علوم قرآنی سے استفادہ کی راہ عوام وخواص کے لئے کھول دی ہے۔ امید ہے کہ یہ تفسیر مؤلفین، مصنفین، محققین، مقررین اور مدرسین کے لئے ایک قیمتی علمی تحفہ ثابت ہوگی''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''مفتی مولانا محمد سرور فاروقی ندوی نے قرآن کریم کا لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو ترجمہ ولغوی تشریح کر کے ایک نمایاں کام انجام دیا ہے جس سے عوام الناس کو استفادے میں آسانی ہوجائے گی حق تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے''۔

(۵) عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث: دارالعلوم، دیوبند وصدر: جمعیت علماء ہند، انڈیا)

''اب جبکہ ہندی زبان ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے اور امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو سے دور ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کو ہندی زبان میں کیا جائے۔ یہ بات قابل قدر ہے کہ ''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب'' نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ و تفسیر کیا ہے، اگر چہ یہ فقیر اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کو ایک ایک لفظ نہیں دیکھ سکا، لیکن حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھنا اس ترجمہ و تفسیر کے ثبوت کے لئے کافی ہے''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''یہ بات قابل قدر ہے کہ مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے مذکورہ ضرورت کو ملحوظ رکھ کر حضرت تھانویؒ کے ترجمہ کو سامنے رکھتے ہوئے مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا ہے اور اب ہندی ترجمہ وتفسیر کے بعد اردو زبان میں لفظی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے رواں ترجمہ ومختصر تشریح کیا ہے جو عوام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا''۔

(۶) عالم اسلام کے معروف عالم دین اور ادیب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مہتمم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وچیف ایڈیٹر: البعث الاسلامی، لکھنؤ)

''ہمارے اس ملک میں ہندی زبان میں قرآن کریم کے ترجمے مختلف اداروں اور شخصیات کی طرف سے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک کسی ایسے عالم دین کی طرف سے جس کو ہندی زبان پر پوری طرح عبور حاصل ہو اور وہ عربی زبان کی روح کو سمجھ کر ہندی زبان میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، کوئی کام نہ ہوسکا تھا۔

ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں نہایت خوشی ہورہی ہے کہ ہمارے حلقہ ندوۃ العلماء کی طرف سے یہاں کے عالم دین مفتی محمد سرور فاروقی ندوی جو عربی، اردو، ہندی کے ماہر مایا ناز ادیب عالم اور صحافی قرآن کریم کا ہندی زبان میں ایک نہایت ہی قابل اسوک اور عربی زبان کی روح سے قریب تر ہندی ترجمہ وتفسیر پیش کررہے ہیں''۔

اسی طرح اردو ترجمہ وتفسیر پر تحریر فرماتے ہیں: ''ہمارے فاضل دوست جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی (صدر جمعیت پیام امن، لکھنؤ) نے قرآن کریم کی لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ومختصر تفسیر کیا ہے اور بامحاورہ اور لفظی ترجمے کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اسی طرح قواعد نحوی کا بھی لحاظ کیا ہے مثلاً مضاف، مضاف الیہ، موصوف صفت، جار مجرور اور لغوی تشریح وترکیب وغیرہ، میں سمجھتا ہوں کہ جو طریقہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اختیار کیا ہے وہ

ہر اعتبار سے تلاوت قرآن کرنے والے شخص کے لئے مفید تر ہے اور اس سے جو تاثیر اور نتیجہ ظاہر ہونا چاہئے اس میں مترجم محترم پوری طرح کامیاب ہیں''۔

(۷) عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سعید مظاہری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے

(ناظم ومتولی: مدرسہ مظاہر العلوم وقف سہارنپور، یوپی، انڈیا)

''مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ایک عالم دین جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کے لئے کوشاں اور فکر مند ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے مختلف کتابیں اور کتابچے بھی مرتب وشائع کئے ہیں، اسی طرح انہوں نے قرآن کریم کے دعوتی اسلوب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندی زبان میں تفسیر فاروقی کے نام سے بابرکت سلسلہ شروع کیا ہے جس کا ایک حصہ میرے پاس بغرض تقریظ پہنچا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محترم کی اس کوشش وکاوش کو شرف قبول اور مقام قبولیت عطا فرمائے''۔

(۸) فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کے قلم سے

(صدر: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وناظم: المعہد العالی اسلامی حیدرآباد وجنرل سیکریٹری اسلامی فقہ اکیڈمی)

''قرآن کو ایک پیغام کی شکل میں دعوتی اسلوب اور آسان انداز میں پیش کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ محب فی اللہ جناب مفتی محمد سرور فاروقی ندوی (صدر: جمعیت پیام امن، لکھنؤ) نے اسی انداز میں قرآن پاک کے ترجمے وتشریح کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس تفسیر میں سب سے پہلے سورہ کا تعارف، کے عنوان سے ہر رکوع کا خلاصہ پیش کیا ہے پھر آیتوں کے ترجمے اور ہر آیت کے متعلق تفسیر، اسباب نزول، فضیلت، ضروری مسائل اور آیات کے پیغام کو بیان کیا ہے۔ تفسیر کے دوران حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی معارف القرآن کے علاوہ اسلاف کی متعدد تفسیر سے استفادہ کیا ہے ایک خاص بات اس تفسیر کی یہ ہے کہ ہر آیتوں کے الگ الگ نمبر ڈال کر آیتوں کی تشریح کی گئی ہے تاکہ لوگ تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکیں اور طلبہ وطالبات بھی الگ الگ سبق کے طور پر اسے پڑھ سکیں''۔

(۹) عالمی شہرت یافتہ ادیب حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق معتمد تعلیم ونائب ناظم: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی صاحب جو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی سند یافتہ عالم ہیں مولانا محمد سرور صاحب بہت سی ہندی کتابوں کے مصنف ہیں اور اس سے پہلے بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں اور اب تفسیر کا کام بھی پورا کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کو قرآن فہمی کا ذریعہ بنائے اور ہدایت کے ملنے کا عنوان بنائے''۔

(۱۰) حضرت مولانا عبد القادر صاحب ندوی مظاہری گجراتی کے قلم سے

(نائب مہتمم: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''ہمارے عزیز گرامی مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے جو ندوہ سے سند یافتہ ہونے کے ساتھ ہندی سے بھی واقف ہیں

،واقف ہی نہیں بلکہ مسلسل اس طرح کے کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے عوام میں سمجھی جانے والی ہندی جو ہندوستانی زبان ہے اس سے بھی واقف ہیں انہوں نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے اور ایک حد تک اس کو پائے تکمیل تک پہنچا چکے ہیں اب پورے قرآن کی تفسیر شائع کرنے جارہے ہیں جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں''۔

(۱۱) مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ھلالی عثمانیؒ کے قلم سے

(سابق رکن تاسیسی: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وصدر: دارالسلام اسلامی مرکز، ملیر کوٹلہ پنجاب، الھند)

''یہ ناچیز محترم مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب کو اس عظیم خدمت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہے کہ انشاء اللہ ان کی اس خدمت سے ہندی جاننے والے طبقے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کی یہ خدمت شرف قبولیت حاصل کرے''۔

(۱۲) مشفق ومربی حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ایڈیٹر: الرائد واستاذ حدیث: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''ہندی میں ترجمے کی بہت کمی تھی اگر ترجمے کچھ ہوئے بھی تو ان میں قرآنی ترجمے کے آداب کا پورا لحاظ اکثر ترجمے کرنے والوں نے نہیں رکھا، ضرورت تھی کہ کوئی اچھا ہندی داں جو عربی سے بھی واقف ہو اس کام کو انجام دیتا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل مفتی محمد سرور فاروقی صاحب ندوی نے مولانا فتح محمد خاں صاحب جالندھری کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے ہندی میں ترجمانی کی کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ اس ترجمانی وتفسیر کو مقبول فرمائے اور تمام گمراہ لوگوں کے لئے اس کو ہدایت کا ذریعہ بنائے''۔

(۱۳) حضرت مولانا مفتی محب اللہ قاسمی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مبلغ: مدرسہ رحمانیہ، دربھنگا، بہار)

''ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں خوشی ہورہی ہے کہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب ایک عالمی ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے ساتھ ہندی زبان سے واقف ہیں جو برابر تمام انسانوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے جانے کا کام کرتے ہیں جس کے لئے انہوں نے بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے، آپ جمعیت پیام امن کے صدر ہیں۔ جناب مولانا مفتی سرور فاروقی ندوی نے خاص طور سے اس ملک کے ہندی داں طبقے کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے انسانی ہدایت کا ایک بڑا تحفہ تیار کیا ہے''۔

(۱۴) حضرت مولانا زکریا ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث وعمید کلیۃ شریعہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''اللہ نے محترم مفتی محمد سرور فاروقی کو ہندی سے واقفیت کو ان کے لئے اتنا مفید بنا دیا ہے جس کا اندازہ کرنا ان کی

کتابوں اور ہندی ترجمہ قرآن پاک اور ہندی تفسیر فاروقی کو پڑھے بغیر مشکل ہے قرآن مجید کی تفسیر وترجمہ کا کام خاص طور سے ہندی میں بہت مشکل ہے۔

ہندی پڑھنے والوں کے مذہب ذوق ومزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کام کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل ہے لیکن بس توفیق کی بات ہے جس نے مولانا سے اتنا بڑا کام لے لیا ہے، اس کے بہت اچھے نتیجے سننے میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی عمر اور کام میں برکت عطا فرمائے اور ان کی محنت اور کوششوں کو مزید بارآور کرے''۔

(۱۵) حضرت مولانا مفتی عتیق احمد قاسمی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ فقہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، وناظم: معہد الشریعہ، لکھنؤ)

''ہندی زبان میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں ایک معتبر نام جناب مولانا محمد سرور فاروقی ندوی کا ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ہونہار فاضل اور ہندی زبان میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، متوازع، ملنسار اور دھن کے پکے ہیں، انہوں نے قرآن کریم کا ہندی ترجمہ کیا ہے جس کے متعدد ایڈیشن شائع کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا موصوف کی تمام دینی خدمات اللہ کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرے اور بندگان خدا کو ان سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے''۔

(۱۶) حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری مدظلہ العالی کے قلم سے

(عمید کلیہ الدعوۃ واستاذ حدیث: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر: جمعیت معارف، لکھنؤ)

''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان وکرم ہے کہ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہمارے فاضل مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے ایک مکمل تفسیر بزبان ہندی میں بڑی محنت ولگن سے تیار کیا ہے اور ہندوستانی ماحول کو اور سلف صالحین کے طریقے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی لوگوں کی خدمت میں ایک نادر ونایاب قرآنی تحفہ پیش کیا ہے''۔

(۱۷) حضرت مولانا مفتی نیاز احمد صاحب ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث وفقہ، ووکیل کلیۃ الشریعہ یعنی صدر مفتی دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب جو علوم شریعہ میں ماہر، ندوے کے ہونہار فاضل جن کی قرآنی علوم پر اچھی نگاہ ہے یہ ہندو مذہبی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اور ہندو بھائیوں کے درمیان خاص طور سے ہندی زبان کو ذریعہ بنا کر دعوت کا کام کر رہے ہیں اس سے پہلے ان کا ہندی ترجمہ قرآن کا پیغام نام سے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں جو ان کے مقبولیت کی دلیل ہے۔

چونکہ میں انہیں تقریباً پندرہ بیس سال سے دعوت کے کاموں میں مشغول دیکھ رہا ہوں جو ایک اچھی فکر کے حامل ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اسی جزبہ کی وجہ سے ان سے بہت سے کام لے رہا ہے جس میں مدارس، مکاتب، اور نوجوانوں کی تربیت بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ ہندی جاننے والوں کے لئے یہ ترجمہ وتفسیر مراجع کی حیثیت رکھے گی اللہ تعالیٰ امت کو استفادے کی توفیق عطا فرمائے''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مترجم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف المرسلین وعلٰی آلہ وصحبہ ومن تبعھم إلی یوم الدین۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور انسانیت کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ نزولِ قرآن سے لے کر آج تک مختلف زبانوں میں اس کے تراجم، تفاسیر، لغات اور الفاظ ومعانی پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن کلامِ الٰہی کے معانی ومطالب کا مکمل احاطہ انسانی استطاعت سے باہر ہے۔ قرآن کے الفاظ نہایت جامع اور وسیع المعانی ہیں، اسی لیے کسی دوسری زبان میں ان کا پورا مفہوم منتقل کرنا ایک نہایت مشکل ذمہ داری ہے۔ ہر دور کے اہلِ علم نے اپنی علمی استعداد کے مطابق اس خدمت میں حصہ لیا اور قرآن کے فہم کو عام کرنے کی کوشش کی۔

الفاظِ قرآن اور وسعتِ معانی

قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لغاتِ قرآن بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، کیونکہ ایک ہی قرآنی لفظ مختلف مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوسکتا ہے۔ مثلاً تقویٰ قرآن مجید میں ایمان، توبہ، خوفِ الٰہی اور گناہوں سے بچنے جیسے مفاہیم میں آیا ہے۔ اسی طرح اُمّت کبھی گروہ اور قوم کے معنی میں اور کبھی پیشوا اور رہبر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی نماز کے بھی ہیں اور دعا کے بھی؛ روح جان کے معنٰی میں بھی ہے اور جبرئیل علیہ السلام اور وحی کے معنی میں بھی آتا ہے؛ نور روشنی کے ساتھ ہدایت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، جبکہ کتاب کبھی آسمانی کتاب اور کبھی حکم وفرض کے معنی دیتی ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ محض لغوی معنی دیکھ کر ہر مقام پر کسی قرآنی لفظ کی مراد متعین نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کے لیے سیاق وسباق، عہدِ نبوی، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اقوالِ صحابہؓ اور معتبر اہلِ علم کی تشریحات سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

قرآن اپنے الفاظ، تراکیب اور مضامین کے اعتبار سے سراپا اعجاز ہے، اسی لیے اس کی صحیح تشریح میں علومِ نبوت اور سلفِ صالحین کی علمی روایت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ علمی سلسلہ خیر القرون سے آج تک جاری ہے اور اہلِ علم نے اس سلسلے میں امت کے لیے ایک عظیم علمی ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ترجمۂ قرآن کی دشواریاں

ایک زبان کے تمام مفاہیم، لطائف اور اسالیب کو دوسری زبان میں بعینہٖ منتقل کرنا ممکن نہیں۔ جب عام انسانی کلام کے ترجمے میں یہ دشواری موجود ہے تو قرآن کریم جیسے معجز کلام کے تمام معانی ولطائف کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بدرجۂ اولیٰ مشکل ہے۔ اسی لیے بعض اہلِ علم قرآن کے ترجمے کو ''ترجمۂ معانی القرآن'' کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ عربی زبان سے براہِ راست واقفیت رکھنے والا قاری قرآن کے اسلوب، حلاوت اور معنوی لطافتوں کو جس طرح محسوس کرتا ہے، ترجمہ اس کا مکمل قائم مقام نہیں بن سکتا۔

ترجمے میں ایک اہم مسئلہ لفظی اور بامحاورہ ترجمے کے درمیان توازن قائم کرنا بھی ہے۔ خالص لفظی ترجمہ بعض اوقات اردو میں ثقیل اور غیر واضح ہو جاتا ہے، جبکہ بہت زیادہ بامحاورہ ترجمہ اصل الفاظ اور ترتیب سے دور جا سکتا ہے۔ اس لیے اس ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ عبارت آسان، رواں اور قابلِ فہم بھی رہے اور حتی الامکان قرآنی الفاظ اور ترتیب سے قربت بھی برقرار رہے۔

عربی زبان کے مختصر حروف بھی ترجمے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ب، ف، علیٰ، الیٰ، ل وغیرہ سیاق کے اعتبار سے مختلف مفاہیم دیتے ہیں۔ اسی طرح فعلِ مضارع حال اور مستقبل دونوں کے لیے آ سکتا ہے، بعض مستقبل کے واقعات ماضی کے صیغے میں بیان ہوتے ہیں اور ''الف لام'' کبھی استغراق، کبھی جنس اور کبھی عہد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تنوین بھی بعض مواقع پر تعظیم یا تحقیر کا مفہوم پیدا کرتی ہے۔ اس لیے ترجمے میں محض لفظ کا ظاہری معنی کافی نہیں بلکہ عربی قواعد، سیاق و سباق اور اسلوبِ قرآن کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

افعال وضمائر میں جمع کا صیغہ

اردو کے بہت سے مترجمین نے اللہ تعالیٰ سے متعلق افعال وضمائر کا ترجمہ واحد کے صیغے میں کیا ہے، لیکن قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، جو عظمت وجلال کے اظہار کا اسلوب ہے۔ اردو زبان میں بھی جمع کا صیغہ احترام کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر زیرِ نظر ترجمے میں اللہ تعالیٰ سے منسوب افعال وضمائر کے لیے حسبِ موقع جمع کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب کے لیے ''تو'' اور ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کے مقامات پر بھی ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''آپ'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

عرضِ حال

اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے ہندی داں طبقے کی ضرورت کے پیشِ نظر سب سے پہلے قرآن مجید کا آسان ہندی ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' شائع کیا گیا۔ اس کے بعد سات جلدوں پر مشتمل ''تفسیر فاروقی'' ہندی زبان میں منظرِ عام پر آئی۔ پھر اردو میں ایسا لفظی مگر رواں ترجمہ پیش کرنے کا ارادہ ہوا جو قاری کو قرآن سمجھنے کے ساتھ اس کی زبان سیکھنے کی طرف بھی متوجہ کرے۔ اسی مقصد سے ''لفظی رواں ترجمہ اور مختصر تفسیر'' شائع ہوئی اور بعد ازاں ''لغات القرآن'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل مستقل کتاب بھی شائع ہوئی۔ اب سات جلدوں پر مشتمل ''تفسیر فاروقی'' کا اردو ترجمہ اردو داں طبقے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے اپنی مقدس کتاب کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ بندہ اپنی علمی کم مائیگی کا معترف ہے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہے کہ وہ اس کوشش کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے، اسے شرفِ قبولیت عطا کر فرمائے اور قارئین کے لیے فہمِ قرآن کا ذریعہ بنائے۔

خصوصیات وماٰخذ

(۱) اس تفسیر کی ترتیب روزانہ درس کی شکل میں کی گئی ہے۔ ہر درس میں تقریباً دس آیات درج کی گئی ہیں، پھر ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سب سے پہلے آیت کا شانِ نزول، پھر اس سے متعلق احادیث، معتبر علماء کے اقوال، مسائل، جدید سائنسی تحقیقات، نیز غیر مسلموں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں ہر آیت

سے متعلق فضائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

(۲) اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلمات کی وضاحت میں اتباعِ سلف کو بنیاد بنایا گیا ہے، جو اس تفسیر کی اصل روح ہے۔

(۳) الفاظ کی توضیح وتشریح کے مصادر میں عربی تفاسیر جیسے: تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی اور معتبر اردو تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح لغات وترکیبِ نحوی کے سلسلے میں اعراب القرآن (شیخ محی الدین درویش)، کلمات القرآن (مفتی شیخ حسنین محمد مخلوف)، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مکمل لغات القرآن، آسان لغات القرآن، مترادفات القرآن، مصباح اللغات وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۴) کئی مقامات پر وہ الفاظ جن کی مختصر وضاحت پہلے درج کی جا چکی ہے، انہیں دوبارہ لاتے ہوئے مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اظہارِ تشکر

اس علمی کام کی تکمیل میں جن بزرگوں، اساتذہ، اہلِ علم، احباب اور اہلِ خانہ نے دعاؤں، رہنمائی، حوصلہ افزائی، کمپوزنگ، طباعت، اعراب اور پروف خوانی کے ذریعے تعاون فرمایا، میں ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

خصوصاً والدہ محترمہ کی دعائیں، مشفق ومربی استاذ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی سرپرستی ورہنمائی، حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی دامت برکاتہم اور جناب محمد عارف الانہ صاحب کی حوصلہ افزائی ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہی۔ اسی طرح جناب ڈاکٹر عطا اللہ صدیقی صاحب جنہوں نے اس کی ترتیب وتحقیق میں معاونت فرمائی، اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق ان سب کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

آخر میں جناب حاجی شفیع اللہ صاحب دامت برکاتہم کے ممنون ومشکور ہیں جو ہماری برابر ہمت افزائی فرماتے رہتے ہیں اور قرآن فہمی کے لئے فکرمند رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی شان کے مطابق اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو محض اپنے فضل سے اس گنہگار کے لئے حسنِ خاتمہ، آخرت کی نجات اور تمام انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

طالب دعا



محمد سرور فاروقی ندوی
(دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
۱۰ جنوری ۲۰۲۶ء/ مطابق ۲۱ رجب ۱۴۴۷ھ

نوٹ: اس تفسیر کے لئے جن بزرگوں نے اپنے تائیدی کلمات کے ذریعے ہمت افزائی فرمائی تھی، ان کے چند اقوال ابتداء میں اور مکمل کلمات آخر کی جلد میں شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ قارئین ان سے بھی استفادہ کر سکیں۔



تفسیر فاروقی

جلد-دوم

سورہ آل عمران آیت نمبر ۸ ۳ سے سورہ نساء آیت نمبر ۱۱۶ تک

یعنی پارہ ۳ سے پارہ ۵ تک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیت نمبر ۳۸ سے ۴۶ تک

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰي نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ:

(۳۸)۔تب وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی: اے میرے رب! مجھے اپنی خاص رحمت سے ایک پاکیزہ اولاد عطا فرما، یقیناً تُو دعا سننے والا ہے۔(۳۹)۔ پھر فرشتوں نے انہیں آواز دی جب وہ نماز میں کھڑے تھے کہ: اللہ تمہیں یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا، سردار ہوگا، اپنے نفس پر مکمل قابو پانے والا ہوگا، اور نیک لوگوں میں سے ایک نبی ہوگا۔(۴۰)۔زکریا نے کہا: اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟ فرشتے بولے: ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہے کرتا ہے۔ (۴۱)۔زکریاؑ نے عرض کیا: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن

تک لوگوں سے بات نہ کرسکو گے، سوائے اشارے کے۔ اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ (۴۲)۔ اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! بے شک اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزہ بنایا ہے، اور تمہیں تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ (۴۳)۔ اے مریمؑ! اپنے رب کے سامنے جھک جاؤ، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو۔ (۴۴) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کررہے ہیں، حالانکہ آپ اس وقت موجود نہیں تھے جب وہ لوگ اپنے قلم ڈال رہے تھے (قرعہ اندازی کررہے تھے) کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے گا، اور نہ ہی آپ ان کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ (۴۵) اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! بے شک اللہ تمہیں اپنے ایک کلمہ (عیسیٰؑ) کی خوشخبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح، عیسیٰؑ ابنِ مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں باوقار ہوگا، اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ (۴۶)۔ اور وہ لوگوں سے بات کرے گا گہوارے میں بھی اور بڑی عمر میں بھی، اور نیک لوگوں میں سے ہوگا۔

تفسیر آیت نمبر ۳۸ سے ۴۶ تک

آیت نمبر (۳۸) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: ''تب وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی: اے میرے رب! مجھے اپنی خاص رحمت سے ایک پاکیزہ اولاد عطا فرما، یقیناً تُو دعا سننے والا ہے''۔

تفسیر جب 'حضرت زکریاؑ' نے 'مریمؑ' کے ساتھ اللہ کا یہ لطف وکرم دیکھا، تو اپنی بڑائی سنی اور بیوی کے بڑی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود نیک لڑکے کے لئے دعا کی، جو نیکی اور طہارت ونجاست میں حضرت مریمؑ کی طرح ہو تو اللہ نے اُن کی دعا قبول کرلی اور فرشتوں کے ذریعے نیک لڑکے کی بشارت بھیج دی۔

یہ دعا محض اولاد کی خواہش نہ تھی، بلکہ ایک ایسے پاکیزہ وجود کی آرزو تھی جو عبادت، تقویٰ، پاک دامنی اور اطاعتِ الٰہی میں نمونہ ہو، اور جس کا وجود دین کی بقا اور حق کے فروغ کا ذریعہ بنے۔ حضرت زکریاؑ کی یہ دعا اس یقین سے لبریز تھی کہ اللہ کی قدرت ظاہری اسباب کی محتاج نہیں، وہ بڑھاپے میں بھی زندگی عطا کرسکتا ہے اور بانجھ پن میں بھی نسلِ طیبہ پیدا فرما سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندے کی اس خالص اور سچی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا، اور فرشتوں کے ذریعے ایسی اولاد کی بشارت دی جو نہ صرف نبوت کے منصب پر فائز ہونے والی تھی بلکہ بنی اسرائیل کے لیے

ہدایت، اصلاح اور روحانی بیداری کا روشن مینار بننے والی تھی۔

آیت نمبر (۳۹) فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ: ''پھر فرشتوں نے انہیں آواز دی جب وہ نماز میں کھڑے تھے کہ: اللہ تمہیں یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا، سردار ہوگا، اپنے نفس پر مکمل قابو پانے والا ہوگا، اور نیک لوگوں میں سے ایک نبی ہوگا''۔

تفسیر حضرت 'زکریاؑ' نماز پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے آواز دی اور کہا، ''اللہ تعالیٰ آپ کو ایک لڑکے کی خوشخبری دیتا ہے، جس کا نام 'یحییٰ' ہوگا جو حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کرے گا، علم وعبادت میں لوگوں کا سردار ہوگا، گناہوں سے محفوظ رہے گا اور نیک لڑکا ہوگا)۔

فائدہ: اس آیت میں حضرت 'یحییٰؑ' کی ولادت اور اُن کے نبی ہونے کی بشارت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی بھی بشارت پائی جاتی ہے۔ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے بڑے تھے اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔

یہ بشارت ایسے وقت میں دی گئی جب حضرت زکریاؑ عبادت میں محو تھے، جس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ خالص بندگی، خشوع وخضوع اور اللہ کے حضور یکسوئی کے لمحات میں رحمتِ الٰہی کے دروازے زیادہ کھلتے ہیں۔ حضرت یحییٰؑ کی شخصیت کو ابتدا ہی میں علم، عبادت، تقویٰ اور پاکیزگی کے اوصاف سے متصف قرار دیا گیا، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ محض نسبی طور پر نہیں بلکہ روحانی واخلاقی اعتبار سے بھی ایک غیر معمولی مقام کے حامل ہوں گے۔

اسی کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں انبیائے کرامؑ کی دعوت، مقصد اور پیغام ایک ہی سلسلۂ ہدایت کا حصہ تھا، جو بنی اسرائیل کی اصلاح اور انہیں دوبارہ راہِ حق کی طرف لوٹانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح یہ آیت نبوت کے باہمی ربط، تسلسل اور وحدتِ پیغام کو نہایت مؤثر انداز میں واضح کرتی ہے۔

آیت نمبر (۴۰) قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ''زکریا نے کہا: اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟ فرشتے بولے: ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہے کرتا ہے''۔

حضرت زکریاؑ کا تعجب

تفسیر جب حضرت زکریاؑ کو اس بات کا کامل یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بیٹے کی نعمت عطا فرمانے والا ہے، تو

انسانی نقطۂ نظر سے اپنی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے نہ انکار کے طور پر بلکہ حیرت اور استعجاب کے اظہار کے طور پر عرض کیا: ''اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا، حالانکہ میں بڑھاپے کی آخری منزلوں کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟''

اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تم اور تمہاری زوجہ جس حال میں بھی ہو، اسی حال میں تمہیں بیٹا عطا کیا جائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی ظاہری سبب کا پابند نہیں۔ اس کی قدرت کے سامنے کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی، اور اس کے لیے کوئی امر دشوار یا بعید نہیں ہے۔ وہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو محض اس کا چاہ لینا ہی اس کے واقع ہوجانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

آیت نمبر (۴۱) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

ترجمہ: ''زکریاؑ نے عرض کیا: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کرسکو گے، سوائے اشارے کے۔ اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو ''۔

تفسیر حضرت زکریاؑ نے عرض کیا کہ اے میرے رب! کوئی ایسی نشانی مقرر فرمادے جس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ واقعی حمل قرار پاچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتدا ہی میں نشانی اس لیے عطا فرمادی تاکہ وہ اس عظیم نعمت کے شکر میں فوراً مشغول ہوجائیں۔

چنانچہ یہ نشانی مقرر کی گئی کہ وہ تین دن تک زبان سے لوگوں سے بات نہ کرسکیں گے۔ اس حکمتِ الٰہی کا مقصد یہ تھا کہ اس مدت میں حضرت زکریاؑ مکمل طور پر اللہ کے ذکر اور شکر میں منہمک رہیں اور اپنی توجہ ہر قسم کے غیر ضروری مشاغل سے ہٹا کر عبادت و بندگی کی طرف مرکوز کردیں۔

فائدہ: اس آیت میں ذکرِ الٰہی کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ ابنِ ابی حاتم نے محمد بن کعب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کسی کو ذکرِ الٰہی سے رخصت دی جاسکتی تو وہ حضرت زکریاؑ ہوتے، اس لیے کہ وہ زبان سے گفتگو کرنے پر قادر نہ تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں بھی انہیں اپنے ذکر کا حکم دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکرِ الٰہی ہر حال میں مطلوب اور بندے کے لیے باعثِ قرب ہے۔

آیت نمبر (۴۲) وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰي

نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴿۴۲﴾

ترجمہ: ''اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! بے شک اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزہ بنایا ہے، اور تمہیں تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت دی ہے''۔

تفسیر یہاں ایک مرتبہ پھر آلِ عمران کے فضائل ومناقب کا بیان سامنے آتا ہے۔ فرشتوں نے حضرت مریمؑ کو مخاطب کر کے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت گزاری، پاکیزگی اور پرہیزگاری کی بنا پر انہیں اپنی خاص محبت اور قربت سے نوازا، اور اسی بنا پر انہیں تمام عورتوں پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔

دنیا کی بہترین عورتیں

صحیحین میں حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ دنیا کی سب سے افضل عورتیں مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ **(بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۳۲)**

اسی طرح امام حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے، اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی سب سے بہترین عورتیں خدیجہ، فاطمہ، مریم اور فرعون کی زوجہ آسیہ ہیں''۔ **(مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۴۱۶۰)**

مزید یہ کہ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَردوں میں تو بہت سے لوگ کمال کے درجے کو پہنچے، لیکن عورتوں میں صرف مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ اس مقام تک پہنچیں، اور حضرت عائشہؓ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے تمام کھانوں پر ثرید (روٹی اور شوربے کا ملا ہوا کھانا) کی فضیلت''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۲۷۲)**

اسی مفہوم کی تائید حضرت ابوموسیٰؓ کی ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مردوں میں تو بہت سے افراد کامل ہوئے، مگر عورتوں میں کمال کے مرتبے پر صرف مریم بنت عمران اور فرعون کی زوجہ آسیہ ہی فائز ہوئیں۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۲۷۲)**

آیت نمبر (۴۳) یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴿۴۳﴾

ترجمہ: ''اے مریمؑ! اپنے رب کے سامنے جھک جاؤ، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ فرشتوں نے حضرت مریمؑ کو کثرتِ عبادت، کامل

خشوع وخضوع، پابندی کے ساتھ رکوع وسجدہ اور مسلسل نیک اعمال کی تلقین کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس عظیم حکمِ الٰہی کے لیے قلبی اور روحانی طور پر پوری طرح آمادہ ہوجائیں، جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا تھا۔

یہ حکم ان کے لیے ایک نہایت سخت آزمائش بھی تھا اور ساتھ ہی دنیا وآخرت میں ان کے بلند مرتبے کا سبب بھی، کیونکہ اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ عظیم شرف عطا فرمانا تھا کہ ان کے بطن سے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہو۔

آیت نمبر (۴۴) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: ”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں، حالانکہ آپ اس وقت موجود نہیں تھے جب وہ لوگ اپنے قلم ڈال رہے تھے (قرعہ اندازی کر رہے تھے) کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے گا، اور نہ ہی آپ ان کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے“۔

رسول ہونے کی دلیل

تفسیر اس واقعے میں اس امر کی نہایت مضبوط اور واضح دلیل موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ کے سچے نبی اور رسول تھے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ایک ایسے واقعے کی تفصیل لوگوں کے سامنے بیان فرمائی جو ہزاروں سال قبل پیش آچکا تھا۔ اس بیان میں نہ کوئی کمی تھی اور نہ زیادتی، بلکہ واقعہ بعینہٖ اسی صورت میں پیش کیا گیا جیسا کہ وہ درحقیقت پیش آیا تھا۔ یہ تمام حقائق اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے رسول ﷺ کو عطا فرمائے، اور آپ ﷺ نے انہیں بغیر کسی تصرف کے لوگوں تک پہنچادیا۔

حضرت مریمؑ کی کفالت کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی والدہ انہیں مسجد لے کر آئیں اور علماء سے عرض کیا کہ میں نے اللہ کے حضور منت مانی تھی جسے اب پورا کر رہی ہوں، اس بچی کو آپ کے سپرد کرتی ہوں، لہٰذا آپ لوگ اس کی پرورش اور نگہداشت کا ذمہ سنبھالیں۔ چونکہ حضرت مریمؑ اپنے زمانے کے جلیل القدر امام عمران کی بیٹی تھیں، اس لیے ہر شخص ان کی کفالت کا خواہش مند ہوگیا۔

اس موقع پر حضرت زکریاؑ نے فرمایا کہ میں اس کا زیادہ حق دار ہوں، کیونکہ اس کی خالہ میری زوجہ ہیں۔ چنانچہ سب کے اتفاق سے قرعہ اندازی کا فیصلہ ہوا، اور نہرِ اردن میں سب نے اپنے اپنے قلم ڈال دیے، اس شرط کے ساتھ کہ جس کا قلم پانی میں ڈوبنے کے بعد دوبارہ سطح پر آجائے گا، وہی حضرت مریمؑ کی کفالت کا ذمہ دار قرار پائے گا۔

اللہ کے حکم سے حضرت زکریاؑ کا قلم اوپر آ گیا، جبکہ باقی سب قلم پانی میں ہی ڈوبے رہے۔ یوں حضرت زکریاؑ حضرت مریمؑ کو اپنے گھر لے آئے، جہاں ان کی خالہ کی آغوش میں ان کی پرورش ہونے لگی، یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئیں اور مکمل یکسوئی کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئیں۔

فائدہ: اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کا کامل اور ذاتی علم حاصل نہیں تھا، بلکہ غیب کی وہی باتیں آپ ﷺ کو معلوم ہوتی تھیں جن کی خبر اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے عطا فرماتا تھا، جیسا کہ اس مقام پر صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر (۴۵) اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝۴۵

ترجمہ: ''اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! بے شک اللہ تمہیں اپنے ایک کلمہ (عیسیٰؑ) کی خوشخبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح، عیسیٰؑ ابنِ مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں باوقار ہوگا، اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا''۔

مسیح کا لقب

تفسیر یہیں سے حضرت عیسیٰؑ کے واقعے کا آغاز ہوتا ہے اور حضرت مریمؑ کو اس عظیم خوشخبری سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹے کی نعمت عطا فرمانے والا ہے۔ فرشتوں نے ان سے کہا کہ اے مریم! اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمے کے ذریعے ایک بچے کی بشارت دیتا ہے، جو بغیر باپ کے وجود میں آئے گا، جس کا لقب ''مسیح'' اور نام ''عیسیٰ'' ہوگا۔

''مسیح'' کا لقب اس زمانے کی شریعت سے تعلق رکھتا تھا، جہاں یہ دستور تھا کہ امامِ وقت جس شخص کے جسم پر مقدس تیل مل دیتا، وہ پاکیزہ اور بابرکت قرار پاتا اور پھر وہ حکومت، علم اور دیگر اہم ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل سمجھا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو یہ لقب عطا فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ وہ یہ تمام اوصاف کسی انسانی تدبیر کے بغیر، پیدائشی طور پر اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہوں گے۔

ایک دوسرا قول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب کسی بیمار پر اپنا دستِ شفقت پھیر دیتے تو وہ صحت یاب ہو جاتا، اسی بنا پر انہیں ''مسیح'' کہا گیا۔ اسی طرح ''ابنِ مریم'' کہہ کر پکارے جانے میں اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے، لہٰذا ان کی نسبت ان کی والدہ ہی کی طرف کی جائے گی۔

یہی نسبت حضرت مریمؑ کے لیے بھی شرف و فضیلت کا سبب بنی اور دنیا کی تمام عورتوں پر ان کی برتری کی ایک

نمایاں دلیل قرار پائی۔

آیت نمبر(۴۶) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: ''اور وہ لوگوں سے بات کرے گا گہوارے میں بھی اور بڑی عمر میں بھی، اور نیک لوگوں میں سے ہوگا''۔

گود میں بات کرے گا

تفسیر یہ بچہ جب ابھی گود میں ہوگا تو اللہ کی قدرت سے بطورِ معجزہ لوگوں سے کلام کرے گا، اور پھر نبوت کے منصب پر فائز ہو کر اپنی متوسط عمر میں وہ تمام تعلیمات، جو اللہ تعالیٰ اسے وحی کے ذریعے عطا فرمائے گا، لوگوں تک پہنچائے گا۔ چونکہ انبیائے کرام کا بیان بچپن اور جوانی دونوں حالتوں میں حق اور یکساں ہوتا ہے، اس لیے اس بشارت میں حضرت مریمؑ کے لیے یہ خوشخبری بھی پوشیدہ ہے کہ ان کا فرزند ایک معقول عمر تک زندہ رہے گا، حتیٰ کہ چالیس پچاس برس کی عمر کو پہنچ کر اپنی رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرے گا۔

گود میں تین بچوں کی گفتگو

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گود میں تین بچوں کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ ان میں ایک عیسیٰ ابن مریمؑ تھے، دوسرے بنی اسرائیل کے جریج راہب، اور تیسرا وہ بچہ جس نے ماں کا دودھ چھوڑ کر یہ دعا کی: اے اللہ! مجھے اس ظالم سوار جیسا نہ بنانا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۴۳۶)**

❁❁❁

آیت نمبر ۴۷ سے ۵۵ تک

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ
فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا
تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسَّ
عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ
وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ
وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ
اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

ترجمہ:

(۴۷) مریمؑ نے کہا: اے میرے رب! میرے یہاں بچہ کیسے ہوگا، جب کہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں؟ فرشتے نے جواب دیا: "ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے: ہو جا! تو وہ ہو جاتا ہے۔ (۴۸)۔ اور اللہ اسے کتاب، حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا۔ (۴۹)۔ اور (عیسیٰؑ) بنی اسرائیل کے لیے رسول ہوگا۔ وہ کہے گا: میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ پرندہ بن جاتا ہے۔ میں مادرزاد اندھے کو اور برص کے مریض کو شفا دیتا ہوں، اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔ اور تمہیں بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔ یقیناً اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ (۵۰) اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس تورات کا جو مجھ سے پہلے نازل

ہوئی، اور میں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کرنے آیا ہوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔(۵۱)۔ یقیناً اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، سو تم صرف اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔(۵۲) پھر جب عیسیٰؑ نے ان میں کفر محسوس کیا تو کہا: اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، اور گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں۔(۵۳) اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تُو نے نازل فرمائی، اور ہم نے رسول کی پیروی کی، تو ہمیں گواہی دینے والوں میں شامل فرما۔(۵۴) اور (کافروں نے) ایک چال چلی، اور اللہ نے بھی ایک چال چلائی، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔(۵۵) جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰؑ! میں تمہیں واپس لینے والا ہوں، اور تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا، اور تمہیں ان لوگوں سے پاک کردوں گا جنہوں نے کفر کیا۔ اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے، انہیں ان منکروں پر قیامت کے دن تک غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب میری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے، تو میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر آیت نمبر ۴۷ سے ۵۵ تک

آیت نمبر (۴۷) قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: ''مریمؑ نے کہا: اے میرے رب! میرے یہاں بچہ کیسے ہوگا، جب کہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں؟ فرشتے نے جواب دیا: ''ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے: ہوجا! تو وہ ہوجاتا ہے''۔

تفسیر جب حضرت مریمؑ کو فرشتوں کے ذریعے یہ عظیم بشارت عطا کی گئی، تو انہوں نے نہ انکار کے طور پر بلکہ تعجب اور حیرت کے اظہار میں اپنے رب کے حضور عرض کیا: ''اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوسکتا ہے، حالانکہ نہ میرا کوئی شوہر ہے، نہ میں نے کبھی شادی کا ارادہ کیا ہے، اور نہ ہی میں کسی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں؟''

اس پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، جو بغیر کسی مرد کے ملاپ کے تمہیں بیٹے کی نعمت عطا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی ظاہری سبب کا محتاج نہیں، اور نہ ہی کوئی چیز اس کی قدرت کے آگے رکاوٹ بن سکتی ہے؛ وہ جس امر کا ارادہ فرماتا ہے، وہ اسی کے حکم سے وجود میں آجاتا ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب

اعتراض: بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر باپ کے بچے کی پیدائش سائنسی اور فطری قوانین کے خلاف ہے، اس لیے یہ واقعہ نا قابلِ قبول ہے۔ مزید یہ کہ ''كُنْ فَيَكُوْنَ'' (ہوجا تو ہوجاتا ہے) کہنا ایک غیر سائنسی اور غیر منطقی تصور ہے۔؟

جواب: یہ اعتراض کہ بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کا پیدا ہونا دراصل قدرتِ الٰہی، سائنسی حدود اور معجزہ (Miracle) کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب تین پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے:

● قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ یہ ایک معجزہ ہے، یعنی ایسا واقعہ جو عام اسباب سے ہٹ کر اللہ کی قدرت سے ہوتا ہے: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ''عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے''۔ **(سورہ آل عمران:۵۹)**

● جب اللہ نے حضرت آدمؑ کو بغیر ماں، باپ کے پیدا کیا، تو حضرت عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اس سے کم عجیب نہیں۔ ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' کا مطلب یہ نہیں کہ الفاظ کہہ کر چیز بن جاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے: اللہ کے ارادے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔

عقلی جواب (Rational Explanation)

کیا ہر چیز صرف نظر آنے والے اسباب سے ہوتی ہے؟ نہیں۔ ہم صرف ظاہری اسباب (Observed Causes) کو جانتے ہیں، مگر اصل سبب (Ultimate Cause) اللہ کی قدرت ہے جیسے: ہم کہتے ہیں ''دوا سے شفا ہوئی'' حقیقت میں شفا دینے والا اللہ ہے۔ اسی طرح عام طور پر بچے ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن یہ لازمی قانون (Absolute Law) نہیں بلکہ عام طریقہ (General Pattern) ہے۔

● سائنس میں بھی ہر قانون کے ساتھ Exceptions ہوتے ہیں مثلاً: زیادہ تر لوگ دائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں، مگر کچھ بائیں ہاتھ والے بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مادہ ٹھوس/ مائع/ گیس ہوتا ہے، مگر Plasma بھی ہے۔

● اسی طرح: عام قانون ماں + باپ = بچہ

Exception (معجزہ) صرف ماں = بچہ

سائنسی جواب (Modern Science Perspective)

۱- Parthenogenesis (غیر جنسی تولید)

سائنس میں ایک تصور موجود ہے: Parthenogenesis یعنی بغیر نر (male) کے تولید، یہ چیز کئی جانداروں

میں پایا جاتا ہے جیسے: کچھ reptiles (چھپکلیاں)، کچھ insects، کچھ مچھلیاں۔اس سے ثابت ہوا کہ بغیر نر کے تولید کا تصور سائنسی طور پر ناممکن نہیں ہے۔

۲۔کلوننگ (Cloning) اور جینیٹک سائنس (Genetic Science)

جدید سائنس نے ثابت کیا ہے کہ ایک خلیہ (cell) سے مکمل جاندار بنایا جا سکتا ہے (جیسے: Dolly sheep) اس کا مطلب ہے کہ زندگی کے لیے ہمیشہ روایتی (نر-مادہ male-female) طریقہ ضروری نہیں۔

۳۔سائنس کی حد (Limit of Science)

سائنس ''کیا ہوسکتا ہے'' بتاتی ہے، ''کیا نہیں ہوسکتا'' کا حتمی فیصلہ نہیں کرتی، یعنی سائنس صرف observed patterns بیان کرتی ہے، مگر معجزہ ان patterns سے اوپر ہوتا ہے۔

یعنی سائنس دراصل مشاہدہ (Observation) اور تجربہ (Experiment) پر قائم ہے۔یعنی جو چیزیں ہم بار بار دیکھتے ہیں، ان سے سائنس ایک قانون (Law) یا اصول (Pattern) بناتی ہے۔مثال کے طور پر: ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر بچہ ماں اور باپ کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، تو سائنس اسے ایک General Rule (عام طریقہ) قرار دیتی ہے۔

یہاں ایک اہم بات سمجھنی ضروری ہے کہ سائنس یہ نہیں کہتی کہ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ممکن ہی نہیں، بلکہ وہ صرف یہ کہتی ہے کہ اب تک ہم نے یہی طریقہ دیکھا ہے، البتہ ممکن ہے کہ Genetic Science یا کلوننگ کے ذریعہ مستقبل میں یہ بھی ممکن ہوجائے۔

سائنسی قوانین میں تبدیلی

اسی طرح سائنس کہتی ہے: ''پانی 100°C پر اُبلتا ہے'' لیکن اگر دباؤ (pressure) بدل جائے تو یہی پانی کم یا زیادہ درجہ حرارت پر بھی ابل سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سائنسی قانون ہمیشہ ہر حالت میں فکس (Absolute) نہیں ہوتا، بلکہ حالات کے مطابق بدل بھی سکتا ہے۔سائنس Limit (حد) کے اندر کام کرتی ہے: جو چیزیں ہم دیکھ سکتے ہیں ناپ سکتے ہیں تجربہ کر سکتے ہیں لیکن: عجزہ (Miracle) ان حدود سے باہر ہوتا ہے یعنی ایسا واقعہ جو عام قوانین کے خلاف نہیں بلکہ ان سے بالاتر (Beyond) ہوتا ہے۔

۴۔''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کا سائنسی مفہوم

''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کا مطلب: Absolute Creative Power/Instant Divine Command

یعنی یہ ایسا ہی ہے جیسے: Big Bang Theory میں کائنات اچانک وجود میں آئی - ایک لمحے میں کچھ نہ تھا - پھر سب کچھ ہو گیا۔

● سائنس بھی ''ابتدائی تخلیق'' کی مکمل وضاحت نہیں دے سکتی لہٰذا: ''کن فیکون'' = وہ اصل سبب (Ultimate Cause) جس کے آگے تمام سائنسی قوانین تابع ہیں۔ لہٰذا بغیر باپ کے پیدائش کو غیر سائنسی کہنا درست نہیں، کیونکہ سائنس خود یہ مانتی ہے کہ زندگی مختلف طریقوں سے وجود میں آسکتی ہے۔

کلوننگ کا عمل

● یہ کہنا کہ بغیر باپ کے بچے کی پیدائش ''سائنسی طور پر ناممکن'' ہے، جدید سائنس کے موجودہ نظریات اور تحقیقات کی روشنی میں درست نہیں۔ کیونکہ آج کی Genetic Engineering، Cloning، Stem Cell Research اور Reproductive Biology نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کی تخلیق صرف روایتی طریقۂ تولید (Female+Male) تک محدود نہیں۔ سب سے پہلے Cloning کو دیکھیے۔

۱۹۹۶ء میں سائنس دانوں نے Dolly Sheep نامی بھیڑ کو صرف ایک جسمانی خلیہ (Somatic Cell) سے پیدا کیا، جس میں نر (Male) کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اس تجربے نے ثابت کیا کہ ایک مکمل جاندار کی تخلیق کے لیے ہمیشہ روایتی نر و مادہ دونوں کا ہونا ضروری نہیں۔ بعد میں بندر، خرگوش، بلی، گھوڑے اور دیگر جانور بھی کلون کیے گئے۔

● اسی طرح جدید Genetic Engineering اور Stem Cell Technology میں سائنس دان خلیات (Cells) کے جینیاتی مادّے (DNA) کو تبدیل کر کے نئے حیاتیاتی امکانات پیدا کر رہے ہیں۔

آج Artificial Embryos، Synthetic Cells اور Lab-Grown Biological Structures پر تحقیق جاری ہے۔ بعض تحقیقات میں Female Genetic Material سے Embryo Development کے امکانات بھی زیرِ مطالعہ ہیں۔

بغیر نر کے تولید

● مزید یہ کہ سائنس میں Parthenogenesis کا تصور پہلے سے موجود ہے، جس میں بعض جاندار بغیر نر کے تولید کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ بغیر Male contribution کے زندگی کا وجود سائنسی اعتبار سے مکمل طور پر ناممکن نہیں۔

لہٰذا جب محدود انسانی سائنس آج Cloning، Genetic Manipulation اور Artificial Reproduction

جیسے مراحل تک پہنچ سکتی ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کے لیے حضرت مریمؑ سے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کو پیدا کرنا کیسے ناممکن ہوسکتا ہے؟ اس لیے معجزہ سائنسی قوانین کی نفی نہیں کرتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ خالقِ کائنات ان تمام قوانین کا بنانے والا اور ان سے بالاتر ہے۔

یہی حقیقت قرآن کے الفاظ ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' میں بیان ہوئی ہے، یعنی اللہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے ظاہری اسباب کا پابند نہیں ہوتا۔

آیت نمبر (۴۸) وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

ترجمہ: ''اور اللہ اسے کتاب، حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا''۔

حضرت مریم کو بشارت

تفسیر یہ آیت حضرت مریمؑ کو دی جانے والی اس بشارت کا تسلسل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، ان کے بلند مقام اور ان کی آئندہ نبوی ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو کتاب وحکمت کا علم عطا فرمائے گا، یعنی انہیں لکھنے پڑھنے، صحیح فہم، دانائی اور دینی حقائق کی معرفت سے نوازے گا۔ نیز انہیں تورات کی تعلیم دی جائے گی، جو ان سے پہلے حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی، اور انجیل عطا کی جائے گی، جو خود حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انہیں علم وحکمت اور وحی سے سرفراز فرما کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے رسول بنا کر بھیجے گا۔

اس کے بعد اگلی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور ان معجزات کا ذکر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی نبوت کی صداقت کے لیے عطا فرمائے۔ ان معجزات کے ساتھ بار بار ''بِاِذْنِ اللّٰهِ'' کے الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ یہ کام اپنی ذاتی قدرت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اجازت سے انجام دیتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے برگزیدہ بندے اور رسول تھے اور معجزات کا حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہی تھا، جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ نشانیاں ان کے ہاتھوں ظاہر فرمائیں، تاکہ لوگ ان کی نبوت ورسالت کی صداقت کو پہچانیں اور ان پر ایمان لائیں۔

فائدہ: چونکہ حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ طب اور علاج کے ماہرین کا دور تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے معجزات عطا فرمائے جن کا تعلق طب اور شفا سے تھا۔ لیکن اس دور کے ماہرین اپنی تمام تر مہارت اور علمی صلاحیتوں کے باوجود ان معجزات کی کوئی نظیر پیش نہ کر سکے۔

اس طرح واضح ہو گیا کہ ان کے ہاتھوں جو خارقِ عادت امور ظاہر ہوئے، وہ کسی انسانی علم یا مہارت کا نتیجہ نہیں تھے، بلکہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے طور پر ظاہر کیے گئے تھے۔

آیت نمبر (۴۹) وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۴۹

ترجمہ: ''اور (عیسیٰؑ) بنی اسرائیل کے لیے رسول ہوگا۔ وہ کہے گا: میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ پرندہ بن جاتا ہے۔ میں مادرزاد اندھے کو اور برص کے مریض کو شفا دیتا ہوں، اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔ اور تمہیں بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔ یقیناً اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو''۔

اللہ کی نشانی

تفسیر اور وہ بنی اسرائیل کی طرف اللہ کے رسول بن کر آئے گا اور ان سے کہے گا: ''میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی سی شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اللہ کے حکم سے جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ ہی کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھ کے مرض میں مبتلا شخص کو شفا عطا کرتا ہوں، اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔

مزید یہ کہ، میں تمہیں وہ باتیں بھی بتا دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور وہ اشیاء بھی جو تم اپنے گھروں میں جمع کر کے رکھتے ہو''۔

یہ تمام امور محض دعویٰ نہیں بلکہ اللہ کی قدرت کے کھلے ہوئے مظاہر ہیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں۔ یقیناً ان نشانیوں میں تمہارے لیے بڑی عبرت اور واضح دلیل موجود ہے، اگر تم حقیقت میں ایمان لانے والے ہو اور حق کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔

آیت نمبر (۵۰) وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۵۰

ترجمہ: ''اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس تورات کا جو مجھ سے پہلے نازل ہوئی، اور میں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کرنے آیا ہوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو''۔

تفسیر حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے توریت کے بعض احکام کو منسوخ فرمادیا تھا۔ تاہم بعض اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے توریت کا کوئی حکم فی نفسہٖ منسوخ نہیں ہوا، بلکہ یہ ہوا کہ انہوں نے چند ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا جن کے بارے میں یہودی علماء کے درمیان پہلے ہی اختلاف پایا جاتا تھا، اور جسے انہوں نے اپنی طرف سے سختی اور غلو کے سبب حرام ٹھہرا رکھا تھا۔

اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کا مقصد شریعتِ موسوی میں پیدا کی گئی غیر ضروری پابندیوں کو دور کرنا اور دین کو اس کی اصل آسانی اور اعتدال کی طرف لوٹانا تھا، تاکہ لوگ اللہ کے احکام کو درست فہم کے ساتھ قبول کریں اور انسانی سختیوں سے نجات پاسکیں۔ یہ اختلافِ رائے دراصل شریعت کے فہم اور اس کے نفاذ کے دائرے سے متعلق ہے، جس میں دونوں آراء اپنی اپنی جگہ علمی بنیاد رکھتی ہیں، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اللہ کے حکم ہی سے حلال وحرام کی وضاحت فرمائی، نہ کہ اپنی خواہش یا ذاتی رائے سے۔

آیت نمبر (۵۱) اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۵۱

ترجمہ: ''یقیناً اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، سو تم صرف اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے''۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت

تفسیر تمام انبیائے کرامؑ کی دعوت کی بنیاد توحید پر قائم تھی۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو اسی ایک ابدی حقیقت کی طرف بلایا کہ عبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی بنی اسرائیل کے سامنے یہی آفاقی دعوت پیش کی اور نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا: ''میرا بھی رب اور تمہارا بھی رب اللہ ہی ہے، لہٰذا تم سب اسی کی عبادت کرو''۔

چنانچہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اس دعوتِ حق کو قبول کیا، ان پر ایمان لائے اور ان کے پیروکار بن گئے، جبکہ کچھ لوگوں نے ہٹ دھرمی اور عناد کی بنا پر انکار کیا، انہیں جھٹلایا اور حد یہ کہ یہودیوں نے ان کی والدہ حضرت مریمؑ پر بدکاری کا بہتان باندھا (نعوذ باللہ)، جو ان کے شدید کفر اور اخلاقی پستی کی علامت تھی۔

جب حضرت عیسیٰؑ پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوگئی کہ انکار کرنے والے لوگ ایمان لانے پر آمادہ نہیں اور انہوں نے دانستہ طور پر حق کو رد کر دیا ہے، تو انہوں نے بنی اسرائیل میں اپنے مخلص ساتھیوں کو اللہ کے دین کی نصرت کے لیے پکارا اور فرمایا: ''تم میں سے کون ہے جو اللہ اور اس کے دین کے لیے میرا مددگار بنے؟''

اس پکار پر حواریوں نے پورے یقین اور اخلاص کے ساتھ جواب دیا:

''ہم اللہ کے دین اور اس کے رسول کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں، اور اے نبی! آپ گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار (مسلمان) ہیں''۔

● نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے، اور میرا حواری زبیر ہے''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۱۹، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۲۴۳)

ظاہری اسباب توکل کے منافی نہیں

حضرت عیسیٰؑ کا کامل بھروسا اور توکل اللہ تعالیٰ پر تھا، تاہم ظاہری اسباب کے طور پر انہوں نے اپنے پیروکاروں سے مدد طلب کی، جن کی تعداد بارہ بتائی جاتی ہے۔ یہی سنتِ انبیاء ہے کہ وہ اللہ پر کامل اعتماد کے ساتھ ساتھ جائز اسباب بھی اختیار کرتے ہیں۔

● اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کفارِ قریش کے مظالم سے تنگ آ کر ابتدا میں ابو طالب اور دیگر قریبی افراد سے مدد طلب فرمائی، اور مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ہر مشکل اور آزمائش کے موقع پر صحابۂ کرامؓ سے تعاون لیا۔ صحابہؓ نے بھی جان و مال، قربانی اور وفاداری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کی اور یوں تاریخِ انسانی میں ایمان، اخلاص اور وفا کی بے مثال مثالیں قائم کیں۔

آیت نمبر (۵۲) فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: ''پھر جب عیسیٰؑ نے ان میں کفر محسوس کیا تو کہا: اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، اور گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں''۔

تفسیر پھر جب حضرت عیسیٰؑ کو اپنی قوم کی جانب سے مسلسل انکار اور ہٹ دھرمی کا پورا یقین ہو گیا، اور یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ لوگ حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں، تو انہوں نے نہایت دردمندانہ انداز میں پکار کر فرمایا: ''کون ہے جو اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار بنے؟'' اس پکار کے جواب میں حواریوں نے کامل اخلاص اور پختہ ایمان کے ساتھ

کہا: ''ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔'' یہ جواب ان کے دلوں کی صداقت، دین کے لیے قربانی کے جذبے اور حق کی نصرت کے عزم کا کھلا اظہار تھا۔

● حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے، اور میرا حواری زبیرؓ ہے''۔ **(صحیح بخاری: حدیث نمبر: ۳۷۱۹)**

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حواری مخلص مددگار بن کر کھڑے ہوئے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے گرد بھی ایسے جاں نثار صحابہؓ موجود تھے جو ہر حال میں دین کی نصرت کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے کہ وہ اللہ پر کامل توکل کے ساتھ ساتھ دین کے کام میں سچے اور وفادار ساتھیوں کو بھی شریکِ سفر بناتے ہیں، تاکہ حق کی دعوت مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھتی رہے۔

آیت نمبر (۵۳) رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تُو نے نازل فرمائی، اور ہم نے رسول کی پیروی کی، تو ہمیں گواہی دینے والوں میں شامل فرما''۔

تفسیر حواری حضرت عیسیٰؑ سے گفتگو کے بعد براہِ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے اور عاجزی و اخلاص کے ساتھ عرض کیا: ''اے ہمارے رب! تو گواہ رہ کہ ہم تیری نازل کی ہوئی شریعت پر ایمان لے آئے ہیں اور تیرے رسول کے پیروکار بن گئے ہیں، لہٰذا ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو تیری وحدانیت کی سچی گواہی دینے والے ہیں''۔

یہ دعا ان کے کامل یقین، خلوصِ نیت اور عملی اطاعت کا مظہر تھی۔ انہوں نے صرف زبانی اقرار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اللہ کی نازل کردہ تعلیمات کو دل سے قبول کرنے اور رسول کی اتباع کا عہد بھی کیا۔ مزید یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی درخواست کی کہ انہیں اُن خوش نصیب بندوں میں شمار فرمایا جائے جو توحید کی گواہی دیتے ہیں اور اپنے قول و عمل سے اس گواہی کو ثابت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا ایمان صرف دعویٰ کا نام نہیں، بلکہ اللہ کی شریعت پر ایمان، رسول کی پیروی اور عملی وفاداری کا مجموعہ ہے۔

آیت نمبر (۵۴) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: ''اور (کافروں نے) ایک چال چلی، اور اللہ نے بھی ایک چال چلائی، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے''۔

تفسیر کفارِ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کروانے کی ایک منظم اور مکروہ سازش تیار کی، اور اُس وقت کے کافر

بادشاہ کے سامنے ان کی شکایت پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ ایک شخص ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، انہیں بادشاہ کی فرمانبرداری سے روکتا ہے، عوام کے درمیان اختلاف اور انتشار پیدا کرتا ہے، باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے، اور (العیاذ باللہ) اسے اپنی ماں کا ناجائز بیٹا قرار دیا۔ ان جھوٹے اور بہتان آمیز الزامات کو سن کر بادشاہ سخت غضبناک ہو گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھانے کا حکم صادر کر دیا۔

آسمان کی طرف سفر

چنانچہ جب لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا اور اس گمان میں مبتلا ہو گئے کہ وہ انہیں پا چکے ہیں، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت اور حکمت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کو اس گھر کے روشن دان کے راستے آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ اسی لمحے اللہ نے سازش کے سرغنہ کو حضرت عیسیٰؑ کا ہم شکل بنا دیا، جسے لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ پھر اسے ذلیل و رسوا کیا گیا اور آخر کار سولی پر چڑھا دیا گیا، جبکہ وہ خود اپنی ہی سازش کا شکار بن گیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو قیامت تک کے لئے کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ان کے دل سخت کر دیے گئے، اور اللہ کی طرف سے ذلت و مسکینی کی ایسی چادر ان پر ڈال دی گئی جو قیامت تک ان کا مقدر بنی رہے گی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف تدبیریں کیں اور سازشوں کے جال بچھائے، مگر اللہ کی تدبیر کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے بڑھ کر تدبیر کرنے والا کوئی نہیں، اور اسی کی حکمت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب

اعتراض: انہوں نے مکر کیا خدا نے بھی مکر کیا اور اللہ اچھا مکر کرنے والا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خدا مکار ہے؟ یعنی آیت ''وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ'' سے مراد اللہ ''مکار'' ہے؟

جواب: یہ اعتراض عربی زبان، قرآنی اسلوب اور آیت کے سیاق کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے:

ترجمہ: ''انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف خفیہ سازش کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے''۔ یہاں مکر کا مطلب ہر جگہ ''دھوکہ'' نہیں، بلکہ خفیہ تدبیر، منصوبہ بندی، سازش کا توڑ، دشمن کی چال کو اسی پر پلٹ دینا ہے۔ عربی لغت میں ''مکر'' کے معنیٰ to plan, to scheme,to plot یعنی تدبیر، منصوبہ اور چال کے بھی آتے ہیں۔

یہ اعتراض دراصل اردو محاورے کو عربی لفظ میں بھی سمجھنے کی غلطی ہے۔ اردو میں ''مکر'' کا مطلب دھوکہ اور فریب ہوجاتا ہے، جبکہ عربی میں ''مکر'' کا اصل معنیٰ خفیہ تدبیر (Hidden strategy/plan) ہوتا ہے۔

لغت کی معتبر کتابوں کے مطابق

مفردات راغب میں ہے: ''المکر: **صرف الغیر عما یقصد بحیلة**'' یعنی کسی کو اس کے مقصد سے تدبیر کے ذریعے ہٹا دینا۔

النهایه فی غریب الحدیث والاثر میں ہے: مکر کا مطلب خفیہ تدبیر اور پوشیدہ حکمت عملی ہے۔

مکر کی دو قسمیں ہیں:

مکر مذموم: برے مقصد کے لیے (یہ کفار کا مکر ہے)

مکر محمود: اچھے اور عدل کے لیے (یہ اللہ کی تدبیر ہے)

''خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ'' کا مطلب

اس کا مطلب یہ نہیں کہ (معاذ اللہ) اللہ دھوکہ باز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ: اللہ ظالموں کی خفیہ سازشوں کو سب سے بہتر طریقے سے ناکام کرنے والا ہے۔

یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ یہودیوں نے آپ کو قتل کرنے اور سولی دینے کی سازش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچا لیا اور ان کی سازش ناکام کر دی۔ یعنی ''انہوں نے مکر کیا'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار اور قتل کرانے کی سازش ہے، اور ''اللہ نے مکر کیا'' یعنی اللہ نے ان کی چال کو ناکام بنا دیا۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ معاذ اللہ دھوکے باز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ ظالموں کی خفیہ سازشوں کا بہترین توڑ کرنے والا ہے۔

قرآن خود واضح کرتا ہے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ''بے شک اللہ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا''۔ (سورہ النساء:40)

● اسی طرح فرمایا: وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا

ترجمہ: ''اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔ (سورہ الکہف:49)

لہٰذا اللہ کا ''مکر'' ظلم، دھوکہ، جھوٹ یا فریب نہیں ہوسکتا، کیونکہ قرآن نے اللہ کو ہر ظلم اور برائی سے پاک قرار دیا ہے۔

اصل قاعدہ: لفظ کا معنیٰ سیاق سے طے ہوتا ہے:

ایک لفظ ہر جگہ ایک ہی معنیٰ نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر اردو میں ہم کہتے ہیں: ''دشمن نے چال چلی، حکومت نے اس کی چال ناکام بنادی'' ''مجرم نے چال چلی تو پولس نے اس کی چال کو ناکام بنادیا''۔

سائنس کا اصول

● اسی طرح سائنس کا ایک بنیادی اصول ہے Cause & Effect (سبب اور نتیجہ)

یعنی ہر عمل کا ایک ردّعمل (Reaction) ہوتا ہے، جب کوئی شخص ظلم سازش یا برائی کرتا ہے تو وہ دراصل ایک منفی عمل (Negative Cause) پیدا کرتا ہے اور کائنات کے نظام کے تحت اس کا انجام بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے: اگر کوئی زہر کھائے تو اس کا جسم متأثر ہوگا، اگر کوئی آگ میں ہاتھ ڈالے تو جلے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ظلم اور سازش کرے گا تو اس کے خلاف نتائج پیدا ہوں گے یہی اللہ کا ''مکر'' ہے، یعنی ظالم کی چال کا نتیجہ اسی پر پلٹ جانا۔

● اسی طرح سائنس میں ایک اصول ہوتا ہے Feedback System (واپسی کا نظام)

Thermostat درجہ حرارت کو کنٹرول کرتا ہے، اگر گرمی بڑھے تو یہ سسٹم اسے کم کر دیتا ہے اسی طرح کائنات میں بھی ایک اخلاقی توازن (Moral Balance System) موجود ہے اور جب ظلم بڑھتا ہے تو حالات ایسے بنتے ہیں کہ ظالم خود پھنس جاتا ہے یہ ایک Self-Correcting System ہے۔

یہی اللہ کا مکر ہے یعنی کائنات کا خود بخود توازن قائم کرنا، یعنی ظالم حکمران اکثر اپنی ہی پالیسیوں میں پھنس جاتے ہیں، دھوکہ دینے والا اکثر خود دھوکہ کھا جاتا ہے، سازش کرنے والا اپنی ہی سازش کا شکار ہو جاتا ہے۔

● اسی طرح فرض کریں ایک مجرم بڑی پلاننگ کے ساتھ جرم کرتا ہے مگر: CCTV، موبائل لوکیشن، یا ایک چھوٹا ثبوت اسے پکڑوا دیتا ہے، وہ سمجھتا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا مگر وہی اسباب اس کے خلاف ہو گئے۔ اسی چیز کو قرآن مجید اللہ کا مکر کہتا ہے۔

اللہ کے لیے ''مکار'' کہنا کیوں غلط ہے؟

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ''اللہ مکار ہے'' بطور مستقل صفت، بلکہ فرمایا: وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یعنی جب ظالم خفیہ سازش کرتے ہیں تو اللہ ان کی سازشوں کو سب سے بہتر طریقے سے ناکام کرنے والا ہے۔

● اسلامی عقیدہ میں اللہ کے لیے وہی نام مستقل طور پر استعمال کیے جاتے ہیں جو قرآن وحدیث میں بطور اسماء حسنیٰ آئے ہیں، مثلاً: الرحمٰن، الرحیم، العلیم، الحکیم، العدل۔ اس لیے اللہ کو عام بول چال میں ''مکار'' کہنا درست نہیں، کیونکہ اردو میں ''مکار'' کا معنیٰ برا اور عیب والا ہے، جبکہ اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

اس لئے اگر کوئی قاتل ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنائے، اور حکومت خفیہ تدبیر سے اس قاتل کو گرفتار کرلے، تو کیا حکومت کو ''دھوکہ باز'' کہا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ کہا جائے گا کہ حکومت نے مجرم کی سازش ناکام بنائی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں نے ظلم وقتل کی سازش کی، اللہ نے اپنے نبی کو بچالیا۔ یہ دھوکہ نہیں، بلکہ عدل، حفاظت اور حکمت ہے۔

اس آیت میں ''مکر'' کا مطلب اللہ کے لیے دھوکہ نہیں، بلکہ ظالموں کی سازش کو ناکام بنانے والی حکمتِ الٰہی ہے۔ کافروں کا مکر ظلم تھا، اللہ کا مکر عدل تھا؛ ان کا مکر باطل تھا، اللہ کی تدبیر حق تھی؛ وہ نبی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے، اللہ نے نبی کو محفوظ فرمالیا۔

آیت نمبر (۵۵) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۵۵

ترجمہ: ''جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰؑ! میں تمہیں واپس لینے والا ہوں، اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور تمہیں ان لوگوں سے پاک کردوں گا جنہوں نے کفر کیا۔ اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے، انہیں ان منکروں پر قیامت کے دن تک غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب میری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے، تو میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے''۔

حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش

تفسیر جب بنی اسرائیل کے کافروں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش کو حتمی شکل دے دی اور اس کے تمام مراحل آپس میں جوڑ لیے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے طور پر فرمایا: ''اے عیسیٰؑ! میں تمہیں پورے طور پر اپنی طرف اٹھانے والا ہوں، تمہیں آسمان پر بلا کر کافروں کی خباثت اور شر سے محفوظ کرنے والا ہوں، اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک کافروں پر غلبہ عطا کرنے والا ہوں''۔

لفظ 'متوفیک' کی تفسیر میں اہلِ علم کے متعدد اقوال منقول ہیں:

حضرت قتادہؒ اور بعض دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں تقدیم وتاخیر پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ حالت میں آسمان پر اٹھالیا، اور قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں اتارنے کے بعد ان کی وفات واقع ہوگی۔

مفسرین کی رائے

اکثر مفسرین نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے، کیونکہ صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے قریب آسمان سے دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے، دجال کو قتل کریں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

جہاں یہ فرمایا گیا کہ ''میں تمہارے پیروکاروں کو قیامت تک فوقیت عطا کروں گا'' تو اس سے مراد بنی اسرائیل کے وہ مومن افراد ہیں جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے تھے اور کافروں کے مقابلے میں ان کی نصرت کا اعلان کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد یہی لوگ حضرت عیسیٰؑ کے سچے پیروکار قرار پائے، کیونکہ انہوں نے اسلام کو قبول کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلے میں ان کی مدد فرمائی اور ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیا، اور اللہ کے فضل سے قیامت تک اسلام اور مسلمان غالب ہی رہیں گے۔

نصاریٰ کا غلبہ

بعض اہلِ علم کا ایک قول یہ بھی ہے کہ نصاریٰ ہمیشہ یہودیوں پر غالب رہیں گے، اس قول کے مطابق یہاں کافروں سے مراد یہود ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اہلِ روم اپنے مخالف کافروں پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ ایک چوتھا قول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری کافروں پر غلبہ حاصل کریں گے۔

لیکن اگر ان اقوال کو بھی تسلیم کر لیا جائے، تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان عیسائیوں پر غالب نہیں آئیں گے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا۔

قیامت کے قریب آسمان سے نزول

● صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں وارد روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ قبول نہیں کریں گے، اور ان کے زمانے میں یا تو اسلام ہوگا یا قتال۔ وہ شریعتِ اسلامیہ کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں گے، اور مسلمان ہی ان کے مددگار اور پیروکار رہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ اسی حقیقت کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہو۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۸۹)

● نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ وقت قریب ہے کہ

مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) تم میں عادل حاکم بن کر نازل ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ موقوف کر دیں گے، اور مال اس قدر وافر ہو جائے گا کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہ رہے گا۔ اس وقت ایک سجدہ دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہوگا''۔ (صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ۴۹، حدیث: ۳۴۴۸)

اور ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب مریم کے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) تم میں نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا''۔

(صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ۴۹، حدیث: ۳۴۴۹)

❁❁❁

آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ:

(۵۶) تو جو لوگ کافر ہوئے، میں انہیں دنیا میں بھی سخت عذاب دوں گا اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ (۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، تو اللہ انہیں ان کا پورا اجر دے گا۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ (۵۸) یہ سب آیات ہم آپ پر پڑھتے ہیں، جو اللہ کی کتاب کی آیات ہیں، اور یہ ایک حکمت بھرا ذکر ہے۔ (۵۹) عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدمؑ کی۔ اسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا: 'ہوجا!' تو وہ ہوگیا۔ (۶۰) یہ سب کچھ آپ کے رب کی طرف سے سچ ہے، تو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ (۶۱) پھر جو شخص آپ سے عیسیٰؑ کے بارے میں بحث کرے، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے، تو آپ کہہ دیں: آؤ! ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، ہم خود بھی آئیں اور تم بھی آؤ، پھر ہم دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ (۶۲) یقیناً یہی سچا بیان ہے، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ ہی غالب ہے، حکمت والا۔ (۶۳) پھر اگر وہ منہ موڑ لیں، تو یقیناً اللہ خوب جانتا ہے فساد پھیلانے والوں کو۔ (۶۴) کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں۔ پھر

اگر وہ منہ موڑیں، تو کہہ دیجئے: گواہ رہو کہ ہم تو صرف اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

تفسیر آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک

آیت نمبر (۵۶) فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۵۶

ترجمہ: ''تو جو لوگ کافر ہوئے، میں انہیں دنیا میں بھی سخت عذاب دوں گا اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا''۔

تفسیر پچھلی آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان فرمائی تھی کہ بالآخر تمام انسانوں کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور وہی ان کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔ ان آیات میں اسی حتمی فیصلے کی تفصیل کھول کر بیان کی جارہی ہے۔ چنانچہ یہاں واضح کردیا گیا کہ جن لوگوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود کفر کی راہ اختیار کی، ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت، رسوائی اور عذاب مقدر ہے، اور آخرت میں بھی سخت سزا ان کا انتظار کرے گی۔ اس روز نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، جو اللہ کے عادلانہ فیصلے کے مقابل کھڑا ہو سکے۔

دنیاوی عذاب کی شکلیں

اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ایسے منکروں کو سزا دیتا ہے، جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے:

۱۔ ذلت اور رسوائی کا عذاب

اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل قانون یہ ہے کہ جو قومیں حق کو پہچان لینے کے بعد تکبر، انکار اور سرکشی اختیار کرتی ہیں، ان پر دنیا ہی میں ذلت اور رسوائی مسلط کردی جاتی ہے۔ یہ ذلت کبھی سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی اقتدار کے چھن جانے، اور کبھی عزت و وقار کے مکمل خاتمے کی شکل میں۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرعون جیسی طاقتور سلطنت، عاد اور ثمود جیسی مضبوط قومیں، اور بنی اسرائیل کے نافرمان گروہ اسی قانونِ الٰہی کے تحت ذلیل وخوار کیے گئے۔ یہ ذلت دراصل اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ طاقت، تعداد اور وسائل اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

۲۔ قلبی بے چینی اور اضطراب

دنیاوی عذاب کی ایک نہایت گہری اور تکلیف دہ صورت دل کا سکون چھن جانا ہے۔ بسا اوقات انسان کے

پاس دولت، آسائش، عہدہ اور ظاہری کامیابیاں سب کچھ ہوتی ہیں، مگر دل کے اندر بے قراری، خوف، اضطراب اور عدم اطمینان کا طوفان برپا رہتا ہے۔ ڈپریشن، مایوسی، احساسِ تنہائی اور مقصدِ حیات سے محرومی اسی روحانی خلا کا نتیجہ ہیں۔ قرآن کا یہ اصول ہے کہ ایمان کے بغیر حقیقی اطمینانِ قلب ممکن نہیں؛ چنانچہ کفر کی زندگی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔

۳۔ اجتماعی عذاب اور سماجی تباہی

جب کفر اور نافرمانی انفرادی سطح سے نکل کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کے نتائج بھی اجتماعی عذاب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جنگیں، خانہ جنگی، تباہ کن فسادات، قحط، مہنگائی، وبائیں اور قدرتی آفات اسی اجتماعی بگاڑ کا نتیجہ بن جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اخلاقی زوال، خاندانی نظام کی تباہی، والدین اور اولاد کے رشتوں میں بگاڑ، اور معاشرتی ناانصافیاں عام ہو جاتی ہیں۔ یوں پوری سوسائٹی ایک عذاب زدہ وجود بن جاتی ہے، جہاں انسان انسان کے لیے خوف اور تکلیف کا سبب بن جاتا ہے۔

۴۔ اعمال کا وبال اور خود ساختہ نظاموں کی سزا

دنیاوی عذاب کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ انسان کے اپنے اعمال ہی اس کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اللہ کے دیے ہوئے نظام کو چھوڑ کر خود ساختہ نظریات، ظالمانہ قوانین اور غیر فطری معاشی و سماجی ڈھانچے قائم کیے جاتے ہیں تو وہی نظام انسان کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ ظلم، سود، فحاشی، استحصال، جھوٹ اور ناانصافی بظاہر فائدہ دیتی محسوس ہوتی ہیں، مگر بالآخر یہی چیزیں معاشروں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہیں۔ یہ عذاب اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ انسان نے فطرت اور ہدایتِ الٰہی سے بغاوت کی ہے۔

۵۔ دنیاوی عذاب کی اصل حکمت

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ دنیا کا عذاب دراصل تنبیہ (Warning) ہوتا ہے، نہ کہ آخری فیصلہ۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو فوراً ہلاک نہیں کرتا، بلکہ دنیا میں تکالیف، نقصانات اور مشکلات کے ذریعے انہیں جھنجھوڑتا ہے تاکہ وہ سنبھل جائیں، رجوع کریں اور حق کی طرف لوٹ آئیں۔ لیکن جو لوگ ان نشانیوں کے باوجود ضد، ہٹ دھرمی اور انکار پر قائم رہتے ہیں، وہ خود اپنے لیے آخرت کے دائمی اور شدید عذاب کا راستہ ہموار کر لیتے ہیں۔

ناقابلِ برداشت عذاب

آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے بالکل مختلف ہوگا۔ دنیا کی تکلیفیں عارضی اور محدود ہوتی ہیں، جبکہ آخرت کا عذاب ہمیشہ رہنے والا، نہایت شدید اور کسی بھی طرح ناقابلِ برداشت ہوگا۔ یہ عذاب کسی جذباتی انتقام پر نہیں بلکہ اللہ

کے عدلِ کامل پر مبنی ہوگا، کیونکہ وہاں انسان اپنے کیے ہوئے اعمال کا پورا پورا نتیجہ دیکھے گا۔

۱۔ جہنم کی آگ

آخرت کے عذاب کی سب سے نمایاں اور ہولناک صورت جہنم کی آگ ہے۔ یہ کوئی معمولی آگ نہیں ہوگی بلکہ ایسی آگ ہوگی جو نہ کبھی بجھے گی اور نہ اس کی شدت میں کمی آئے گی۔ قرآن کے مطابق جہنمیوں کی کھالیں بار بار بدلی جائیں گی تاکہ وہ عذاب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہیں۔ پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی اور پیپ دیا جائے گا جو اندر جاتے ہی آنتوں کو کاٹ ڈالے گا۔ یہ عذاب جسمانی تکلیف کی اس انتہا کو ظاہر کرتا ہے جس کا تصور دنیا میں ممکن نہیں۔

۲۔ دائمی حسرت اور پچھتاوا

آخرت کے عذاب کا ایک نہایت دردناک پہلو ہمیشہ کی حسرت ہے۔ وہاں کافر اور منکر یہ تمنّا کریں گے کہ کاش ہم ایمان لے آتے، کاش ہم رسول کی بات مان لیتے، کاش ہمیں ایک موقع اور مل جاتا۔ مگر یہ حسرت بے فائدہ ہوگی، کیونکہ اس دن نہ توبہ قبول ہوگی اور نہ واپسی کا کوئی راستہ ہوگا۔ یہی دائمی ندامت انسان کے لیے ایک ایسا ذہنی و روحانی عذاب بن جائے گی جو جہنم کی آگ سے بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوگا۔

۳۔ اللہ کی رحمت سے محرومی

آخرت کا سب سے بڑا اور سب سے ہولناک عذاب اللہ کی رحمت اور قربت سے ہمیشہ کے لیے محرومی ہے۔ یہ محض جسمانی سزا نہیں بلکہ روحانی تباہی ہے۔ اللہ کی نظرِ کرم سے دوری، اس کی محبت اور رحمت سے محروم ہونا، اور اس کی رضا کے بغیر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جانا، یہ وہ عذاب ہے جس کے مقابلے میں ہر دوسری سزا چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ جنت کی نعمتیں دیکھ کر محرومی کا احساس اس عذاب کو اور زیادہ شدید بنا دے گا۔

آیت نمبر (۵۷) وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، تو اللہ انہیں ان کا پورا اجر دے گا۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔

تفسیر جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک اعمال اختیار کیے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا اور کامل بدلہ عطا فرمائے گا۔ ان کے اجر میں نہ کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کی محنت رائیگاں جائے گی، بلکہ ہر نیکی کا صلہ

عدل وفضل کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، یعنی وہ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا جو حق کو جان کر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں یا دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

اس آیت میں ایمان اور عملِ صالح کے باہمی تعلق کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں، بلکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے کردار اور اعمال سے بھی اس کی تصدیق کرے۔ جو لوگ اس معیار پر پورا اترتے ہیں، ان کے لئے اللہ کی رضا، اس کا اجر اور اس کی خصوصی عنایت یقینی ہے؛ جبکہ ظلم اور سرکشی کا انجام محرومی اور گرفت کے سوا کچھ نہیں۔

آیت نمبر (۵۸) ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: ''یہ سب آیات ہم آپ پر پڑھتے ہیں، جو اللہ کی کتاب کی آیات ہیں، اور یہ ایک حکمت بھرا ذکر ہے''۔

تفسیر (اے محمد ﷺ!) یہ وہ آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کو بار بار پڑھ کر سناتے ہیں، جو سراسر حکمت سے لبریز اور نصیحت و رہنمائی کا خزانہ ہیں۔ ان میں عبرت بھی ہے، ہدایت بھی، اور حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز بھی۔ یہ آیات محض تاریخی واقعات کا بیان نہیں، بلکہ دلوں کو بیدار کرنے والی حکیمانہ نصیحتیں ہیں، جو انسان کو فکر، ایمان اور عمل کی صحیح راہ دکھاتی ہیں۔

یہ آیت اپنے سے پہلے بیان ہونے والے پورے مضمون پر تبصرہ اور توثیق کی حیثیت رکھتی ہے، خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں صحیح عقیدہ، اہلِ کتاب کے باطل تصورات، اور حق و باطل کے واضح امتیاز کے سلسلے میں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعے نہایت صراحت کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جو کچھ سنایا جا رہا ہے وہ کسی انسانی فکر، ذاتی رائے یا تاریخی قیاس پر مبنی نہیں، بلکہ براہِ راست وحیِ الٰہی ہے۔

اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک مصنف یا مفکر کی نہیں بلکہ ایک امینِ وحی اور ذمہ دار مبلغ کی ہے، جو اللہ کا پیغام جوں کا توں انسانوں تک پہنچا رہے ہیں۔

لفظ ''ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ'' اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ قرآن کا اصل ماخذ اللہ تعالیٰ خود ہے، اور یہ تعلیمات حکمت کے ساتھ بتدریج نازل ہو رہی ہیں۔ اس اسلوب کے ذریعے ان تمام اعتراضات کی تردید ہو جاتی ہے جو قرآن کو انسانی تصنیف یا سابقہ آسمانی کتابوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔

مزید یہ کہ ''مِنَ الْاٰيٰتِ'' سے مراد وہ وحی شدہ نشانیاں ہیں جو اللہ کی قدرت، وحدانیت اور حقانیت پر عقلی و فطری دلائل فراہم کرتی ہیں۔ قرآن کے بیانات محض مذہبی اقوال نہیں بلکہ ایسے مضبوط دلائل ہیں جو عقل، فطرت اور

انسانی وجدان تینوں کو بیک وقت مخاطب کرتے ہیں۔

اسی طرح ''وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ'' یہ بتاتا ہے کہ قرآن صرف معلوماتی کتاب نہیں بلکہ حکمت سے بھرپور نصیحت ہے، جو انسان کی فکری، اخلاقی اور عملی اصلاح کرتی ہے اور اسے ایک متوازن نظامِ حیات عطا کرتی ہے۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کو محض تاریخی کہانیوں کے طور پر نہیں بلکہ ہدایت اور عبرت کے لیے بیان کرتا ہے، تاکہ انسان کا ایمان مضبوط ہو، اس کا عمل درست ہو اور اس کا اخلاق سنور جائے۔ اس طرح اس آیت کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ قرآن وحی، دلیل اور حکمت کا جامع مجموعہ ہے اور نبی کریم ﷺ اللہ کے سچے رسول اور امانت دار مبلغ ہیں، جن کے ذریعے یہ الٰہی ہدایت انسانیت تک پہنچی۔

آیت نمبر (۵۹) اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

ترجمہ: ''عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدمؑ کی۔ اسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا: 'ہوجا!' تو وہ ہوگیا''۔

تفسیر ''نصاریٰ'' کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے تھے، اور اس دعوے کی بنیاد وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس باطل دعوے کی نہایت واضح اور عقلی تردید فرمائی اور ارشاد کیا کہ اگر محض بغیر باپ کے پیدا ہونا الوہیت یا ابنیت کی دلیل ہوتا، تو حضرت آدمؑ اس سے کہیں زیادہ اس کے مستحق ہوتے، کیونکہ اللہ نے انہیں نہ ماں کے ذریعے پیدا کیا اور نہ باپ کے ذریعے، بلکہ براہِ راست مٹی سے وجود بخشا۔

بے مثال حکمت کا اظہار

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کر کے، حضرت آدمؑ کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر کے، اور حضرت حواؑ کو صرف مرد سے پیدا کر کے اپنی کامل قدرت اور بے مثال حکمت کا اظہار فرمایا۔ یہ تمام صورتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ تخلیق اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ جس طرح چاہے، جس سبب کے ساتھ یا بغیر سبب کے، پیدا فرمانے پر قادر ہے۔

لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں درست اور حق پر مبنی عقیدہ یہی ہے کہ نہ حضرت مریمؑ نے کسی معبود کو جنا، جیسا کہ نصاریٰ کا باطل دعویٰ ہے، اور نہ ہی انہوں نے 'یوسف النجار' کے ساتھ کوئی بدکاری کی، جیسا کہ بعض یہودی ان پر بہتان لگاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی قدرت کی ایک عظیم نشانی تھے، اور یہی عقیدہ

عدل، عقل اور وحی تینوں کے مطابق ہے۔

آیت نمبر (۶۰) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: ''یہ سب کچھ آپ کے رب کی طرف سے سچ ہے، تو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں''۔

تفسیر یہ بات سراسر حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اس میں کسی قسم کے شک، شبہے یا تردد کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا تم ہرگز ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو حق کے واضح ہو جانے کے باوجود شک وشبہ میں مبتلا رہتے ہیں، بلکہ پورے یقین، اعتماد اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اس حقیقت کو قبول کرو اور اس پر ثابت قدم رہو۔

آیت نمبر (۶۱) فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: ''پھر جو شخص آپ سے عیسیٰؑ کے بارے میں بحث کرے، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے، تو آپ کہہ دیں: آؤ! ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، ہم خود بھی آئیں اور تم بھی آؤ، پھر ہم دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں''۔

آیاتِ مباہلہ

تفسیر ان آیات کو آیاتِ مباہلہ کہا جاتا ہے۔ لفظ مباہلہ کے معنی ہیں: دو فریقوں کا اللہ کے حضور ایک دوسرے کے خلاف بددعا کرنا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی معاملے میں حق و باطل کے بارے میں دو فریقوں کے درمیان شدید اختلاف ہو جائے اور دلائل کے باوجود فیصلہ کن نتیجہ سامنے نہ آ سکے، تو دونوں اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کریں کہ اے اللہ! ہم میں سے جو جھوٹا ہو، اس پر تیری لعنت نازل ہو۔ یہ طریقہ دراصل حق کی صداقت پر کامل یقین اور اللہ کے عادلانہ فیصلے پر مکمل بھروسے کا مظہر ہے۔

اسباب نزول

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ صلحِ حدیبیہ کے بعد ۹ ہجری میں نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سوالات کیے اور بحث و گفتگو ہوئی۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے واضح دلائل کے ساتھ ثابت فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے اور اس

کے رسول ہیں۔ جب نصاریٰ نے باطل عقیدے پر اصرار کیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ساتھ مباہلہ کرنے کا حکم دیا۔

امام بخاری نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ نجران کے نصاریٰ کے دو سردار مباہلہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ مگر حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ''ایسا نہ کرنا، اللہ کی قسم! اگر یہ واقعی نبی ہیں اور ہم نے ان سے مباہلہ کیا، تو نہ ہم اور نہ ہماری آئندہ نسل کبھی کامیاب ہو سکے گی۔'' چنانچہ وہ مباہلہ سے پیچھے ہٹ گئے اور جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ **(بخاری ۴۳۸۰)**

امام احمد نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر مباہلہ پر آمادہ ہونے والے واقعی اس پر عمل کر گزرتے، تو واپسی پر نہ انہیں اپنا مال ملتا اور نہ اہل وعیال سلامت رہتے۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۲۵)** یہ قول ترمذی اور نسائی میں بھی منقول ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقررہ وقت پر علی الصبح حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسن وحسینؓ کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تشریف لائے اور نصاریٰ کو بلایا، مگر انہوں نے انکار کر دیا اور جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر جزیہ مقرر فرمایا اور اس کی وصولی کے لیے حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کو ان کے ساتھ بھیجا، جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امینِ امت کا لقب عطا فرمایا تھا۔ **(حوالہ: تفسیر ابن کثیر، فتح القدیر)**

یہ واقعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مباہلہ محض ایک مناظرانہ طریقہ نہیں، بلکہ حق پر کامل یقین، باطل سے برأت اور اللہ کے فیصلے پر غیر متزلزل اعتماد کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ اسی لیے جب باطل کے علمبرداروں نے اس کے انجام کو محسوس کیا تو وہ خود پیچھے ہٹ گئے، اور حق اپنی جگہ روشن ونمایاں ہو کر باقی رہا۔

آیت نمبر (۶۲) اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

ترجمہ: ''یقیناً یہی سچا بیان ہے، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ ہی غالب ہے، حکمت والا''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور اہلِ کتاب سے متعلق جو واقعات قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، وہ سب حقیقت پر مبنی اور سراسر سچ ہیں، ان میں کوئی شک، مبالغہ یا

انسانی گھڑت شامل نہیں۔

یہ آیت اہلِ کتاب، خصوصاً نصاریٰ، کے ان عقائد کی تردید کرتی ہے جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں گڑھ لیے تھے، اور بتاتی ہے کہ قرآن کا بیان ہی اصل اور معتبر بیان ہے۔

اس میں صاف لفظوں میں توحید کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، نہ حضرت عیسیٰؑ، نہ کوئی اور نبی یا بزرگ الوہیت میں شریک ہوسکتا ہے۔

یہ آیت عقیدۂ تثلیث اور حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے نظریے کو جڑ سے رد کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ عبادت صرف اللہ وحدہٗ کے لئے خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کو زبردست کہا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے، اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کی قدرت کے سامنے تمام طاقتیں بے بس ہیں۔

اللہ کو حکمت والا قرار دیا گیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے تمام فیصلے دانائی، مصلحت اور عدل پر مبنی ہوتے ہیں، چاہے انسان کو ان کی حکمت فوری طور پر سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

حضرت عیسیٰؑ کی غیر معمولی پیدائش، ان کا آسمان پر اٹھایا جانا، اور قیامت سے پہلے دوبارہ آنا یہ سب اللہ کی قدرت اور حکمت کے مظاہر ہیں، نہ کہ الوہیت کی دلیل۔

یہ آیت دراصل پورے واقعۂ عیسیٰؑ کا خلاصہ اور فیصلہ ہے، جس میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے دیا گیا ہے۔

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو اللہ کے بیان پر کامل یقین رکھنا چاہیے اور باطل عقائد یا شکوک وشبہات میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

آیت نمبر (۶۳) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

ترجمہ: ''پھر اگر وہ منہ موڑ لیں، تو یقیناً اللہ خوب جانتا ہے فساد پھیلانے والوں کو''۔

تفسیر اگر یہ لوگ حق واضح ہوجانے کے بعد بھی اس سے روگردانی اختیار کریں اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں، تو اس سے حق کی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو خوب جانتا ہے جو جان بوجھ کر حق سے منہ موڑ کر فساد کی راہ اختیار کرتے ہیں، کیونکہ حق کا انکار صرف ذاتی گمراہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ معاشرے میں فکری، دینی اور اخلاقی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ ایمان کے لیے تسلی کا پیغام بھی ہے کہ مخالفین کی ہٹ دھرمی سے دل گرفتہ نہ

ہوں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر اور باطن دونوں سے باخبر ہے اور ہر ایک کا انجام اس کے علم اور عدل کے مطابق طے ہوگا۔

آیت نمبر (۶۴) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں۔ پھر اگر وہ منہ موڑیں، تو کہہ دیجئے: گواہ رہو کہ ہم تو صرف اللہ کے فرمانبردار ہیں''۔

تفسیر اس آیت کے مخاطب یہود، نصاریٰ اور تمام انسان ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ہدایت عطا فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو تین بنیادی اور فیصلہ کن امور کی طرف دعوت دیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں، دوسری یہ کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور تیسری یہ کہ اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین، خود ساختہ ضابطوں اور ان کے طے کردہ حلال وحرام کو معیار نہ بنائیں۔ اس آیت میں دراصل دین کے اصل سرچشمے کو واضح کیا گیا ہے کہ بندگی، اطاعت اور قانون سازی کا حق صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔

صحیح بخاری، مسلم اور نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابوسفیان نے بیان کیا کہ قیصرِ روم ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط منگوایا اور جب اس نے وہ خط پڑھا تو اس میں یہ تحریر تھی:

ہرقل کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کا ترجمہ

ترجمہ: ''اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے ہرقل، عظیمِ روم کے نام۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس کے بعد، میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو، سلامتی پاؤ گے، اللہ تمہیں دوگنا اجر عطا فرمائے گا، اور اگر تم نے انکار کیا تو اَریسیوں کا گناہ تمہارے سر ہوگا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷)

تین بنیادی اصولوں کی دعوت

اس خط کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی آیت درج فرمائی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہِ روم

کو بھی دعوتِ اسلام کے ساتھ انہی تین بنیادی اصولوں کی طرف بلایا: خالص توحید، شرک سے برأت اور اللہ کی شریعت کے سوا ہر قانون کی نفی۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت عزیرؑ کی الوہیت کے عقیدے کی صریح تردید بھی پائی جاتی ہے، اور اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حضرات بھی ہماری اور تمہاری طرح اللہ کے بندے اور انسان تھے، معبود کیسے بن سکتے ہیں۔

اسی طرح اس میں ان لوگوں کا رد بھی کیا گیا ہے جو دین کے معاملے میں اندھی تقلید کا شکار ہو گئے، اپنے علماء اور پیشواؤں کے بنائے ہوئے حلال وحرام کو اللہ کے حکم کے برابر سمجھ بیٹھے، اور اس طرح نادانستہ طور پر انہیں معبود کا درجہ دے دیا۔

علماءِ سوء کی اتباع

امام ترمذیؒ نے حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی آیت (سورۂ توبہ: ۳۱) تلاوت فرمائی اور وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لوگ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ علماء کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو وہ اسے حلال مان لیتے اور جب کسی چیز کو حرام ٹھہراتے تو وہ اسے حرام سمجھ لیتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرزِ عمل کو انہیں معبود بنا لینے کے مترادف قرار دیا، کیونکہ حلال وحرام مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۹۵)**

اس طرح یہ آیت انسان کو اس بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین میں اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے، اور جو شخص اس اختیار کو کسی اور کے حوالے کر دے، وہ شعوری یا لاشعوری طور پر توحید کے دائرے سے باہر قدم رکھ دیتا ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۶۵ سے ۷۴ تک

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

ترجمہ:

(۶۵) اے اہلِ کتاب! تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیمؑ کے بارے میں، حالانکہ تورات اور انجیل نازل ہی اس کے بعد ہوئیں۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (۶۶) سن لو! تم وہی لوگ ہو جنہوں نے ان باتوں میں جھگڑا کیا جن کا تمہیں کچھ علم تھا، تو اب ان باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم ہی نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ (۶۷) ابراہیمؑ نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ تو اللہ کے فرمانبردار اور یکسو (مسلمان) تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۶۸) بے شک ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی، اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور اللہ مومنوں کا سرپرست ہے۔ (۶۹) اہلِ کتاب کے ایک گروہ کی خواہش ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دیں، حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ (۷۰) اے اہلِ کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم خود اس کی گواہی دیتے ہو؟ (۷۱) اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل میں کیوں ملاتے ہو، اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو؟ (۷۲) اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا

ہے: ایمان لے آؤ اس چیز پر جو مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے، دن کے آغاز میں، اور آخر دن میں انکار کر دو، شاید وہ (مسلمان) بھی پھر (اپنے دین سے) لوٹ جائیں۔ (۷۳) اور کسی پر اعتماد نہ کرو سوائے اس کے جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔ کہہ دیجئے: یقیناً ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ بھی نہ مانو کہ کسی اور کو بھی وہی (کتاب وعلم) دیا گیا ہے جو تمہیں دیا گیا تھا، یا یہ کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم پر کوئی حجت لے آئیں گے۔ کہہ دیجئے: بے شک فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور اللہ وسعت والا ہے، سب کچھ جاننے والا۔ (۷۴) وہ اپنی رحمت خاص کرتا ہے جس پر چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۵۶ سے ۷۴ تک

آیت نمبر (۶۵) يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵

ترجمہ: ''اے اہلِ کتاب! تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیمؑ کے بارے میں، حالانکہ تورات اور انجیل نازل ہی اس کے بعد ہوئیں۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''۔

تفسیر ''اے اہلِ کتاب! تم حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو اور انہیں یہودی یا عیسائی ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہو، حالانکہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل کی گئی تھیں؟ کیا تم اتنی بات بھی سمجھنے کے لیے عقل سے کام نہیں لیتے؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی ہو سکتے ہیں اور نہ عیسائی، اس لیے کہ ان مذاہب کی بنیاد ہی ان کے بعد پڑی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان تقریباً ایک ہزار برس کا فاصلہ تھا، اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان تو قریب دو ہزار سال کا زمانہ حائل تھا۔ ایسے میں یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد اور تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی یا عیسائی تھے''۔ (قرطبی)

آیت نمبر (۶۶) هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۶

ترجمہ: ''سن لو! تم وہی لوگ ہو جنہوں نے ان باتوں میں جھگڑا کیا جن کا تمہیں کچھ علم تھا، تو اب ان باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم ہی نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے''۔

تفسیر اس آیت کی عملی تفسیر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائی حکمرانوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کی

دعوت دی۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ابوسفیان نے مجھ سے کہا کہ اُس زمانے میں، جب میرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان صلحِ حدیبیہ ہو چکی تھی، میں شام میں موجود تھا کہ خبر ملی قیصرِ روم ہرقل کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک خط پہنچا ہے۔ یہ خط حضرت دحیہ کلبیؓ لے کر آئے تھے، جنہوں نے اسے والیِ بصریٰ کے حوالے کیا، اور اس نے آگے ہرقل تک پہنچا دیا۔

حضرت ابوسفیانؓ بیان کرتے ہیں کہ ہرقل نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا اور مجھ سے متعدد سوالات کیے، جن کے ذریعے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور آپ کے حالات کے بارے میں غائبانہ طور پر معلومات حاصل کیں۔ ان سوالات اور جوابات کے نتیجے میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت اور حقانیت سے گہرا تاثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔

(صحیح بخاری، باب ۴، حدیث: ۴۵۵۳)

یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت محض نظری گفتگو تک محدود نہ تھی، بلکہ عملی حکمت، دعوتی بصیرت اور آفاقی پیغام کے ساتھ دنیا کے حکمرانوں تک بھی پہنچائی گئی، تاکہ حق ہر اس شخص کے سامنے پیش ہو جائے جو غور و فکر اور انصاف سے کام لینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

آیت نمبر (۶۷) مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: ''ابراہیمؑ نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ تو اللہ کے فرمانبردار اور یکسو (مسلمان) تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

ملتِ ابراہیمی کی نسبت

تفسیر یہود، نصاریٰ، مشرکین اور مسلمان سب ہی اپنے اپنے دعوؤں کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ ملتِ ابراہیم پر قائم ہیں۔ ہر گروہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اپنی طرف جوڑ کر خود کو حق پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اسی پس منظر میں محمد بن اسحاق، ابنِ جریر اور امام بیہقیؒ نے ''کتاب الدلائل'' میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نجران کے نصاریٰ اور یہودی علماء ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جمع ہوئے اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں باہمی جھگڑے میں مبتلا ہو گئے۔ یہودی علماء کہنے لگے کہ ابراہیمؑ یہودی تھے، جبکہ نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ وہ نصرانی تھے۔

اس اختلاف اور باطل دعوؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور دونوں فریقوں کے دعوؤں کو قطعی طور پر جھٹلا دیا۔ اللہ نے واضح فرمایا کہ توریت حضرت ابراہیمؑ کے تقریباً ایک ہزار سال بعد نازل ہوئی اور انجیل

لگ بھگ دو ہزار سال بعد، لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی یا نصرانی تھے، سراسر تاریخی اور عقلی لحاظ سے غلط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ان تمام بعد میں آنے والے مذاہب سے پہلے گزر چکے تھے، اس لیے ان کی نسبت ان مذاہب کی طرف کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اصل معیار بیان فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ، جو خلیلُ اللہ تھے، ان سے نسبت کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں ان کے دین، یعنی توحید، اخلاص اور کامل اطاعتِ الٰہی کی پیروی کریں۔ اس معیار پر سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ، پھر آپ ﷺ کے مہاجرین و انصار صحابۂ کرام، اور بعد کے وہ تمام مسلمان پورے اترتے ہیں جو اسی ملتِ ابراہیمی پر قائم ہیں۔

اس طرح سے یہ تشریح اس بنیادی حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ملتِ ابراہیمی کسی نسل، قوم یا محض نام کا عنوان نہیں، بلکہ توحید، شرک سے برأت اور اللہ کے سامنے مکمل سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ جو شخص اس راہ پر ہو، وہی حقیقت میں حضرت ابراہیمؑ کی ملت کا پیروکار اور ان سے نسبت کا مستحق ہے، اور یہی اسلام کا آفاقی اور دائمی پیغام ہے۔

آیت نمبر (۶۸) اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۸

ترجمہ: ''بے شک ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی، اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور اللہ مومنوں کا سرپرست ہے''۔

تفسیر اس آیت میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے حقیقی قربت اور نسبت کا معیار نسب، قوم یا محض زبانی دعویٰ نہیں، بلکہ ان کی مکمل اطاعت اور ان کے طریقۂ دین کی پیروی ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے دل و جان سے ان کی اطاعت کی، پھر خود یہ نبی، یعنی حضرت محمد ﷺ، جو ملتِ ابراہیمی کے حقیقی وارث اور اس کے سب سے کامل نمائندہ ہیں، اور اس کے بعد وہ تمام لوگ جو ایمان لائے اور اس دینِ توحید پر ثابت قدم رہے۔

ایمان والوں کے لئے خوشخبری

اسی کے ساتھ یہ خوشخبری بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کا خود مددگار ہے۔ وہ انہیں تنہا نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر دور اور ہر حال میں ان کی نصرت فرماتا ہے، چاہے وہ فکری محاذ ہو یا عملی میدان۔ اس مدد میں دنیا کی رہنمائی بھی شامل ہے اور آخرت کی کامیابی بھی۔

اس طرح آیت اس حقیقت کو مضبوطی سے واضح کرتی ہے کہ جو شخص ایمان اور اطاعت کے راستے پر قائم ہو، وہی حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی پیروکار ہے، اور اللہ کی مدد ہمیشہ اسی کے ساتھ رہتی ہے۔

آیت نمبر (۶۹) وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۹

ترجمہ: ''اہلِ کتاب کے ایک گروہ کی خواہش ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دیں، حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے''۔

تفسیر یہاں اہلِ کتاب سے مراد بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع کے وہ یہودی قبائل ہیں جو مدینہ میں مقیم تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مخالفت اور دینی عناد کے تحت بعض مسلمانوں کو یہودیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور انہیں اپنے دین کی دعوت دی۔ اس پس منظر میں قرآنِ کریم نے اہلِ ایمان کو متنبہ فرمایا کہ وہ ان کی باتوں سے دھوکا نہ کھائیں، کیونکہ یہ دعوت خلوص یا خیر خواہی پر مبنی نہیں تھی بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش اور فکری گمراہی کا ذریعہ تھی۔

اس تشریح کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اہلِ کتاب کی یہ کوشش حق کی تلاش نہیں بلکہ مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے کی ایک تدبیر تھی۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو ہوشیار رہنے، اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہنے اور وحیِ الٰہی کی رہنمائی پر کامل اعتماد رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ وہ کسی بیرونی اثر یا فریب کا شکار نہ ہوں اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھ سکیں۔

آیت نمبر (۷۰) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝۷۰

ترجمہ: ''اے اہلِ کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم خود اس کی گواہی دیتے ہو؟''۔

تفسیر اے اہلِ کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم خود ان کی صداقت پر گواہ ہو؟ تمہارے پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں، تم حق کو پہچانتے بھی ہو اور اس کی نشانیاں بھی جانتے ہو، پھر اس کے باوجود جان بوجھ کر انکار کرنا سراسر ضد، ہٹ دھرمی اور حق سے روگردانی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سوال دراصل تمہارے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اس بات کی یاددہانی کے لیے ہے کہ جس حق کو تم پہچان چکے ہو، اس کا انکار تمہارے اپنے علم اور گواہی کے خلاف ہے۔

آیت نمبر (۷۱) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۷۱

ترجمہ: ''اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل میں کیوں ملاتے ہو، اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم

جانتے ہو؟''۔

یہود ونصاریٰ کی آسمانی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات اور آپ کی نبوت کی واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں، جنہیں وہ خود بھی جانتے اور پہچانتے تھے، مگر اس کے باوجود انہوں نے ان حقائق کو عام لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اس طرزِ عمل کے ذریعے وہ نہ صرف لوگوں کو حق تک پہنچنے سے روکتے رہے بلکہ دانستہ طور پر گمراہی کو فروغ دیتے رہے۔ اس آیت میں اسی رویّے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حق کو جان بوجھ کر چھپانا اللہ کے نزدیک نہایت سنگین اور ناپسندیدہ جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ رویّہ اس لیے بھی زیادہ قابلِ گرفت ہے کہ حق چھپانے والا نہ صرف خود گمراہ رہتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ہدایت کے دروازے بند کرنے کا سبب بنتا ہے، اور یہی طرزِ عمل اللہ کی ناراضی اور مؤاخذے کو دعوت دیتا ہے۔

آیت نمبر (۷۲) وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: ''اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے: ایمان لے آؤ اس چیز پر جو مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے، دن کے آغاز میں، اور آخر دن میں انکار کر دو، شاید وہ (مسلمان) بھی پھر (اپنے دین سے) لوٹ جائیں''۔

تفسیر یہاں اہلِ کتاب کی ایک نئی اور نہایت چالاک سازش کا ذکر کیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ کچھ سادہ دل اور کمزور ایمان رکھنے والے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی حقانیت اور سچائی کے بارے میں شبہات پیدا کیے جائیں۔ انہوں نے آپس میں یہ منصوبہ بنایا کہ ان میں سے چند لوگ صبح کے وقت اسلام قبول کرنے کا اعلان کریں، مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کریں اور بظاہر ایمان واخلاص کا اظہار کریں، پھر جب شام ہو جائے تو دوبارہ اپنے سابقہ دین کی طرف پلٹ جائیں۔

اس چال کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمان یہ گمان کریں کہ چونکہ یہ لوگ اہلِ کتاب اور اہلِ علم ہیں، انہوں نے حق کی تلاش میں اسلام قبول کیا تھا، اور اب تحقیق کے بعد اسے چھوڑ دیا ہے، لہٰذا لازماً اسلام کوئی سچا دین نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ان کی اس خفیہ تدبیر کو پہلے ہی بے نقاب فرما دیا، ان کے مکر وفریب کو واضح کر دیا اور یوں ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کے دلوں پر اس فتنہ انگیز کوشش کا کوئی منفی اثر نہ پڑا، بلکہ اہلِ ایمان کا یقین مزید مضبوط ہو گیا۔ اس تشریح سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ باطل جتنی بھی تدبیریں کر لے، وہ اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اور اللہ اپنے دین اور اہلِ ایمان کی حفاظت خود فرماتا ہے۔

آیت نمبر (۷۳) وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۷۳

ترجمہ: ''اور کسی پر اعتماد نہ کرو سوائے اس کے جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔ کہہ دیجئے: یقیناً ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ بھی نہ مانو کہ کسی اور کو بھی وہی (کتاب وعلم) دیا گیا ہے جو تمہیں دیا گیا تھا، یا یہ کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم پر کوئی حجت لے آئیں گے۔ کہہ دیجئے: بے شک فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور اللہ وسعت والا ہے، سب کچھ جاننے والا''۔

مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرنے کی سازش

تفسیر اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ آپس میں یہ باتیں کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں پر ہرگز بھروسہ نہ کیا جائے، نہ انہیں اپنے راز بتائے جائیں اور نہ دل کی باتیں ان کے سامنے کھولی جائیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان حق کو سمجھ لیں، اس پر مضبوطی سے قائم ہو جائیں اور قیامت کے دن ہمارے خلاف گواہ بن کر کھڑے ہو جائیں۔

یہ دراصل ایک منظم فکری سازش تھی، جس کا مقصد مسلمانوں کو ذہنی طور پر کمزور کرنا، ان کے اعتماد کو متزلزل کرنا اور انہیں سچائی کے پورے شعور تک پہنچنے سے روکنا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس باطنی چال اور پوشیدہ حسد کو بے نقاب کرنے کے بعد اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ صاف اور دوٹوک انداز میں ان سے کہہ دیں کہ اصل ہدایت صرف اور صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے، وہ خواہ کتنا ہی قدیم، معزز یا معروف کیوں نہ ہو، درحقیقت گمراہی اور نفس کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ تمہاری ساری چالیں، تمہاری سازشیں اور تمہارا یہ رویہ کسی دلیل یا حق کی بنیاد پر نہیں، بلکہ محض اس حسد کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے علاوہ دوسروں کو بھی اپنی شریعت، اپنی کتاب اور اپنے علم سے نواز دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ جن نعمتوں کو تم اپنی جاگیر سمجھتے تھے، وہ اب کسی اور قوم کو بھی عطا ہو رہی ہیں۔ یا پھر تم اس اندیشے میں مبتلا ہو کہ کہیں مسلمان قیامت کے دن یہ گواہی نہ دے دیں کہ ہم ایمان لے آئے تھے، جبکہ تم نے حق کو پہچان لینے کے باوجود دانستہ انکار کیا۔

اللہ کی حکمتیں

اسی تناظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بھی کہنے کا حکم دیا گیا کہ قرآن ہو یا نبوت، علم ہو یا ہدایت، یہ سب اللہ کے اختیار

میں ہے۔ یہ کسی قوم کی وراثت نہیں اور نہ کسی نسل کی جاگیر۔ اللہ جسے چاہتا ہے، جس وقت چاہتا ہے، اپنی رحمت اور نعمتوں سے نواز دیتا ہے۔ اس کے فیصلے نہ حسد سے بدلتے ہیں اور نہ سازشوں سے، کیونکہ وہ وسیع علم اور کامل حکمت کا مالک ہے۔

اس طرح اس آیت کے ذریعے واضح کر دیا گیا کہ حق کا معیار نہ قوم ہے، نہ نسب اور نہ ماضی کی نسبتیں، بلکہ اصل معیار ایمان، اخلاص اور حق کو قبول کرنے کا حوصلہ ہے۔ جو اس معیار پر پورا اترے، وہی اللہ کی ہدایت کا مستحق ہے، اور جو حسد، تعصب اور انکار کی راہ اختیار کرے، وہ خود اپنی محرومی کا ذمہ دار ہے۔

آیت نمبر (۷۴) يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: ''وہ اپنی رحمت خاص کرتا ہے جس پر چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

تفسیر ''وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں خاص کر لیتا ہے، اور اللہ بڑا فضل والا ہے'' یہ فقرہ اس حقیقت کو نہایت جامع اور بلیغ انداز میں واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی کے حسب ونسب، قوم، نسل یا ظاہری دعووں کی پابند نہیں۔ وہ اپنی حکمتِ کاملہ اور ازلی علم کی بنیاد پر جس بندے کو چاہتا ہے، اپنی خاص رحمت کے لیے منتخب فرما لیتا ہے۔ یہ انتخاب نہ کسی انسانی سفارش کا محتاج ہے اور نہ کسی دنیاوی معیار کا تابع، بلکہ خالصتاً اللہ کی مشیت اور اس کی دانائی پر مبنی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل بے حساب ہے؛ وہ محض عدل پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں پر کرم فرماتا ہے، ان کی معمولی کوششوں پر بڑے اجر عطا کرتا ہے اور حق کو قبول کرنے والوں کو ہدایت، بصیرت اور قربِ الٰہی سے نواز دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اللہ بڑا فضل والا ہے، یعنی اس کی عطا محدود نہیں، اس کی بخشش تنگ نہیں اور اس کی رحمت کسی خاص طبقے تک مقید نہیں۔

یہ آیت بندوں کے دلوں میں امید کا چراغ بھی روشن کرتی ہے اور غرور کا دروازہ بھی بند کرتی ہے؛ امید اس لیے کہ جو بھی اخلاص کے ساتھ حق کی طرف رجوع کرے، وہ اللہ کی رحمت کا امیدوار بن سکتا ہے، اور غرور اس لئے کہ کوئی شخص یا قوم یہ گمان نہ کرے کہ اللہ کی رحمت اس کی پیدائشی وراثت ہے۔ یوں یہ کلام انسان کو عاجزی، اخلاص اور اللہ کی مشیت پر کامل اعتماد کی تعلیم دیتا ہے، اور واضح کر دیتا ہے کہ اصل کامیابی اللہ کے فضل اور اس کی خاص رحمت سے وابستہ ہے، نہ کہ انسانی دعوؤں اور ظاہری نسبتوں سے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۷۵ سے ۸۲ تک

وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ
اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ
عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ
يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا
يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ ۪ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ
اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا
هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ
الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ
بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا ؕ اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ
اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ
قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ
الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ:

(۷۵) اور اہلِ کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ڈھیر سونا چاندی امانت رکھو، تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے، اور بعض ان میں ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھو، تو وہ تمہیں واپس نہ کریں، سوائے اس کے کہ تم ان کے پیچھے بار بار کھڑے رہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم پر اَن پڑھ (عربوں) کے بارے میں کوئی گناہ نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔ (۷۶) کیوں نہیں! جو کوئی اپنا عہد پورا کرے اور اللہ سے ڈرے، تو یقیناً اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ (۷۷) بے شک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے کلام کرے گا، نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا، اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۷۸) اور بے شک ان

(اہل کتاب) میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبان کو کتاب پڑھنے میں مروڑتا ہے، تاکہ تم سمجھو کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ جانتے ہیں۔(۷۹) کسی بشر کے لیے یہ لائق نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا کرے، پھر وہ لوگوں سے کہے: میرے بندے بن جاؤ، اللہ کو چھوڑ کر! بلکہ (وہ تو یہی کہے گا): رب والے بنو، کیونکہ تم کتاب سکھاتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو۔(۸۰) اور وہ تمہیں یہ حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو؟ (۸۱) اور یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ: جو کچھ بھی میں تمہیں دوں کتاب اور حکمت میں سے، پھر تمہارے پاس ایک رسول آئے جو اس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور میرے اس عہد کو قبول کیا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: پس تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔(۸۲) پھر جو اس کے بعد (اس عہد سے) منہ موڑے گا، تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

تفسیر آیت نمبر ۷۵ سے ۸۲ تک

آیت نمبر (۷۵) وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝۷۵

ترجمہ: ''اور اہلِ کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ڈھیر سونا چاندی امانت رکھو، تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے، اور بعض ان میں ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھو، تو وہ تمہیں واپس نہ کریں، سوائے اس کے کہ تم ان کے پیچھے بار بار کھڑے رہو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم پر اَن پڑھ (عربوں) کے بارے میں کوئی گناہ نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں''۔

یہودیوں کی دینی و مالی خیانت

تفسیر گزشتہ آیات میں یہودیوں کی دینی خیانت کا ذکر کیا گیا تھا، یعنی وہ طرزِ عمل جس میں انہوں نے اللہ کی کتاب، اس کے احکام اور حق کی گواہی میں خیانت کا راستہ اختیار کیا۔ اب زیرِ بحث آیات میں ان کی مالی خیانت کو

نمایاں کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خیانت ان کے ہاں محض عقیدے تک محدود نہ تھی بلکہ عملی زندگی اور معاشی معاملات میں بھی اس کا ظہور ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نہایت عدل و انصاف کے ساتھ یہ حقیقت بیان فرماتا ہے کہ اہلِ کتاب سب ایک جیسے نہیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو امانت دار ہیں، جن پر اگر ڈھیروں مال بھی سپرد کر دیا جائے تو وہ پورا پورا واپس کر دیتے ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر ایک دینار جیسی معمولی رقم بھی ان کے حوالے کی جائے تو وہ اسے ہڑپ کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کسی قوم پر اندھا دھند الزام نہیں لگاتا بلکہ ہر فرد کے کردار کو اس کے عمل کی بنیاد پر پرکھتا ہے۔

وضاحت

عدی بن حاتمؓ کا قول اسی پس منظر کی وضاحت کرتا ہے کہ آیت میں جن اہلِ کتاب کو امانت دار قرار دیا گیا ہے، ان سے مراد نصاریٰ ہیں، جبکہ خیانت کرنے والوں سے مراد یہود ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود میں سے بعض لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ عربوں، جنہیں وہ "اُمِّیِّیْنَ" یا مشرک کہتے تھے، کا مال کسی بھی طریقے سے حاصل کرنا جائز ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ لوگ ہمارے دین پر نہیں، اس لیے ان کے مال میں خیانت کرنا گناہ نہیں۔

یہ سوچ سراسر جھوٹ، فریب اور اللہ پر بہتان تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی کسی انسان کو، خواہ وہ کسی بھی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتا ہو، دوسرے کا مال ناحق اور شریعت کے خلاف طریقے سے لینے کی اجازت نہیں دی۔ امانت، دیانت اور مالی انصاف ایسے اخلاقی اصول ہیں جو شریعتِ الٰہی میں ہر حال میں لازم قرار دیے گئے ہیں، اور جن کی خلاف ورزی کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

جھوٹی قسم کھانے کی ممانعت

اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے نہایت سخت اور واضح الفاظ میں بیان فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد کیا کہ جو شخص کسی کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم کھاتا ہے، وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر سخت ناراض ہوگا۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۹۴۶)**

یہ وعید اس بات کی دلیل ہے کہ مالی خیانت محض دنیاوی جرم نہیں بلکہ ایک سنگین اخلاقی اور دینی گناہ ہے، جس کا انجام اللہ کی ناراضی اور آخرت کی رسوائی ہے۔

اس طرح یہ آیات اور احادیث مل کر یہ واضح پیغام دیتی ہیں کہ دین کا دعویٰ اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب وہ دیانت، امانت اور انصاف کے عملی تقاضوں کے ساتھ جڑا ہو۔ جو شخص یا قوم امانت میں خیانت کرتی ہے، وہ دراصل اپنے

کردار سے اپنے دین کے دعوے کو جھٹلا دیتی ہے، اور اللہ کے ہاں ایسی چالاکیوں اور خود ساختہ جوازوں کی کوئی وقعت نہیں۔

آیت نمبر (۷۶) بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: ''کیوں نہیں! جو کوئی اپنا عہد پورا کرے اور اللہ سے ڈرے، تو یقیناً اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے''۔

عہد کی پاسداری اور تقویٰ

تفسیر یہ دونوں باتیں انسانی کردار کے دو بنیادی اوصاف کو نمایاں کرتا ہے: عہد کی پاسداری اور تقویٰ۔ عہد پورا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے قول و قرار میں سچا، ذمہ داریوں میں دیانت دار اور وعدوں میں مضبوط ہے۔ چاہے یہ عہد اللہ سے ہو، بندوں سے ہو یا اپنے ضمیر سے، اس کی پابندی انسان کے اخلاقی وقار اور ایمانی پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسری طرف اللہ سے ڈرنا، یعنی تقویٰ اختیار کرنا، محض خوف کا نام نہیں بلکہ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جو انسان کو گناہ سے روکتی، نیکی پر ابھارتی اور ہر عمل میں اللہ کی رضا کو پیشِ نظر رکھنے کی تربیت دیتی ہے۔

تقویٰ انسان کے دل میں یہ شعور بیدار کرتا ہے کہ اللہ ہر حال میں دیکھ رہا ہے، اس لئے وہ امانت، انصاف اور سچائی سے ہٹنے کی جرأت نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں اوصاف کو اپنی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص وعدوں کا پابند ہو اور دل میں اللہ کا خوف رکھتا ہو، وہ اللہ کی خاص محبت کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہاں واضح کر دیا گیا کہ اللہ کی دوستی نہ ظاہری دعوں سے حاصل ہوتی ہے، نہ نسب، قوم یا محض زبان کے اقرار سے، بلکہ اس کا حقیقی راستہ کردار کی سچائی اور دل کے تقویٰ سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس طرح یہ کلام انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ایمان کا حسن عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو شخص امانت و عہد کی حفاظت کرتا ہے اور ہر قدم پر اللہ سے ڈرتا ہے، وہی اللہ کے نزدیک محبوب ہے، اور اللہ کی محبت ہی دراصل دنیا و آخرت کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آیت نمبر (۷۷) اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں،

ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے کلام کرے گا، نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا، اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اللہ کے عہد اور قسموں کا بدلہ

تفسیر ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت سخت اور واضح انداز میں ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے جو معمولی اور حقیر دنیوی فائدوں کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ وقتی طور پر تو دنیا کا کچھ نفع حاصل کر لیتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ اپنی آخرت کو برباد کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی بھلائی نہیں، نہ اللہ ان سے کلام فرمائے گا، نہ رحمت کی نظر سے ان کی طرف دیکھے گا، بلکہ یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے سخت ناراض ہوگا، اور ان کے لئے دردناک اور ذلت آمیز عذاب تیار ہے۔

یہ وعید اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اللہ کے نام کو دھوکہ، فریب اور ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا معمولی گناہ نہیں، بلکہ یہ ایمان کی جڑوں کو کمزور کر دینے والا جرم ہے۔ جو شخص اللہ کی عظمت کو پسِ پشت ڈال کر اس کے نام کی جھوٹی قسم کھاتا ہے، وہ دراصل اپنے دل کی بے خوفی اور باطن کی خرابی کا اعلان کرتا ہے۔

سبب نزول

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن ابی عوفہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص بازار میں اپنا سامان لے آیا اور جھوٹی قسم کھا کر یہ ظاہر کیا کہ اس نے وہ سامان بہت زیادہ قیمت میں خریدا ہے، حالانکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی مسلمان کو دھوکے میں ڈال کر سامان بیچ دے۔ اس فریب اور جھوٹی قسم کے موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، تاکہ واضح ہو جائے کہ بازار کے معاملات میں بھی جھوٹ اور قسم بازی اللہ کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ہے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۵۱)**

یہودی کا واقعہ

اسی طرح حضرت اشعث بن قیس کندیؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ان کے معاملے میں بھی صادق آتی ہے۔ ان کا اور ایک یہودی کا زمین کے بارے میں نزاع تھا۔ جب یہودی نے زمین سے انکار کیا تو اشعثؓ نے معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اصولی طور پر پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی گواہ یا دلیل ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس دلیل موجود نہیں۔

اس پر آپ ﷺ نے یہودی سے قسم کھانے کو فرمایا۔ یہ سن کر اشعثؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!

اگر یہ شخص قسم کھالے گا تو میرا حق مار لیا جائے گا۔

اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے واضح کر دیا کہ جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال ہڑپ کرنے والا اللہ کے غضب سے نہیں بچ سکتا، خواہ دنیا میں وقتی طور پر وہ کامیاب ہی کیوں نہ نظر آئے۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۴۰۴۹)**

اس طرح یہ آیات اور واقعات مل کر یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ عدل وانصاف کا اصل محافظ اللہ ہے، اور جھوٹی قسموں کے سہارے حق دبانے والے لوگ اللہ کی عدالت سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔ دنیا کی چند گھڑیوں کا فائدہ، آخرت کے دائمی خسارے کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لیے ایک مومن کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر حال میں سچائی، دیانت اور اللہ کے خوف کو مقدم رکھے، کیونکہ یہی راستہ اللہ کی رضا اور نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

آیت نمبر (۷۸) وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: ''اور بے شک ان (اہل کتاب) میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبان کو کتاب پڑھنے میں مروڑتا ہے، تاکہ تم سمجھو کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ جانتے ہیں''۔

تفسیر یہ آیتِ کریمہ بھی یہود کے اسی طرزِ عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں انہوں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب کے ساتھ امانت اور دیانت کا برتاؤ نہ کیا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اس آیت سے مراد وہ یہودی ہیں جو توریت میں اپنی طرف سے باتیں بڑھایا کرتے تھے، یعنی وہ ایسے معانی اور توضیحات شامل کر دیتے تھے جو اصل وحی کا حصہ نہ تھیں، مگر انہیں اللہ کی کتاب کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔

حضرت مجاہدؒ کا بیان اس حقیقت کو مزید واضح کرتا ہے کہ یہ لوگ توریت میں تحریف کیا کرتے تھے اور عوام سے یہ جھوٹ کہتے تھے کہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں، وہی توریت کا اصل حکم ہے، حالانکہ وہ دل سے جانتے تھے کہ یہ باتیں جھوٹ پر مبنی ہیں اور اللہ تعالیٰ پر صریح بہتان کے مترادف ہیں۔

اس طرزِ عمل کا مقصد محض علمی غلطی نہ تھا، بلکہ اکثر اوقات ذاتی مفاد، دینی برتری کے زعم اور عوام پر فکری غلبہ قائم رکھنا ہوتا تھا۔

امام بخاری نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہود تورِیت میں اس طرح کی تحریف کرتے تھے کہ الفاظ کو جوں کا توں رکھتے، مگر ان کے معانی کو بدل کر بیان کر دیتے تھے۔ اس وضاحت سے یہ نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ اللہ کی کسی کتاب کے الفاظ میں حقیقی تبدیلی ممکن نہیں، کیونکہ اللہ خود اپنی وحی کا محافظ ہے؛ البتہ انسان اپنی خواہشات کے تحت اس کے مفہوم کو موڑ توڑ کر پیش کر سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ طرزِ تحریف اس وقت جنم لیتی ہے جب مذہب اقتدار، سماجی برتری یا معاشی مفاد کا ذریعہ بن جائے۔ ایسے ماحول میں کتابِ الٰہی ہدایت کے بجائے دلیلِ اقتدار بنا دی جاتی ہے، اور اس کے معانی کو حالات اور مفادات کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر یہ عمل اس خوف اور حسد کی علامت ہوتا ہے کہ کہیں حق واضح ہو جانے سے جھوٹی برتری ختم نہ ہو جائے، یا عوام آزادانہ سوچنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس طرح یہ آیت صرف ایک تاریخی واقعے کی خبر نہیں دیتی بلکہ ایک دائمی اصول بھی بیان کرتی ہے کہ اللہ کی کتاب کو زبان سے ماننا کافی نہیں، بلکہ اس کے مفہوم میں خیانت سب سے بڑی گمراہی ہے۔ جو لوگ جان بوجھ کر معانی میں تحریف کرتے ہیں، وہ دراصل لوگوں کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں، اور اللہ کے ہاں ایسی علمی چالاکیوں اور لفظی موشگافیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

آیت نمبر (۷۹) مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ”کسی بشر کے لیے یہ لائق نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا کرے، پھر وہ لوگوں سے کہے: میرے بندے بن جاؤ، اللہ کو چھوڑ کر! بلکہ (وہ تو یہی کہے گا): رب والے بنو، کیونکہ تم کتاب سکھاتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو“۔

حضرت عیسیٰؑ پر الزام

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں بالخصوص نصاریٰ اور خصوصاً نجران کے عیسائیوں کے اس باطل دعوے کی تردید کی گئی ہے جس میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو اپنی عبادت کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہ دعویٰ حقیقت کے سراسر خلاف اور انبیائے کرام کی شان کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس انسان کو وہ وحی جیسی عظیم نعمت عطا کرے، آسمانی کتاب سے نوازے، نبوت کے منصب پر فائز فرمائے اور شریعت کے فہم و بصیرت سے آراستہ کرے، اس کے لیے یہ بات عقلاً، شرعاً اور فطرتاً ناممکن

ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے بجائے اپنی عبادت، کسی نبی یا کسی فرشتے کی عبادت کی طرف بلائے۔ ایسا کرنا کھلے کفر کے مترادف ہے، اور انبیائے کرام علیہم السلام کا منصب اس سے کہیں بلند اور پاکیزہ ہوتا ہے۔

بندگی کی اعلیٰ مثال

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ اسی لیے مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ہر قسم کے کفر، شرک اور گمراہی سے روکیں اور خالص توحید کی طرف دعوت دیں۔ وہ خود بندگی کی اعلیٰ مثال ہوتے ہیں، نہ کہ بندگی کا مرکز۔ ان کا کام یہ نہیں کہ لوگ انہیں معبود بنالیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو اللہ واحد کی بندگی کی طرف رہنمائی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے خاص طور پر واضح فرمایا کہ وہ لوگوں کو یہی تعلیم دیتے تھے کہ تم دین کا علم حاصل کرو، اللہ کی کتاب کو سمجھو، اور اپنے علم وعمل کے ذریعے اللہ والے بن جاؤ۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کا مرکز نہ ان کی ذات تھی اور نہ ان کی شخصیت، بلکہ اللہ کی معرفت، اطاعت اور بندگی تھی۔

اس طرح یہ آیت نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کی تردید کرتی ہے، بلکہ ایک آفاقی اصول بھی بیان کرتی ہے کہ تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی تھا یعنی اللہ کی بندگی، علمِ دین کی اشاعت اور شرک سے اجتناب۔ جو لوگ انبیاء کو معبود بنالیتے ہیں، وہ دراصل ان کی تعلیمات سے انحراف کرتے ہیں، نہ کہ ان کی پیروی۔

حضرت عیسیٰؑ کا بشر ہونا

اس آیتِ کریمہ میں لفظ ''بشر'' نہایت معنی خیز اور فیصلہ کن ہے۔ یہ لفظ صاف طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان تھے اللہ کے بندے، اس کے منتخب رسول اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کے حامل۔

جب وہ بشر تھے تو پھر معبود کیسے ہو سکتے تھے؟ معبود وہی ہو سکتا ہے جو خالق، مالک اور ہر عیب سے پاک ہو، جبکہ حضرت عیسیٰؑ خود اللہ کی مخلوق تھے، اس کے حکم سے پیدا ہوئے اور اسی کے دین کی دعوت دیتے رہے۔

مفسرین اور محدثین نے اس حقیقت کی تائید تاریخی واقعات سے بھی کی ہے۔ ابنِ اسحاق، ابنِ جریر، ابنِ المنذر، ابنِ ابی حاتم اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ یہود کے علماء اور نجران کے نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو ابورافع قرضی نے سوال کیا:

''اے محمد! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں، جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی عبادت کرتے

ہیں؟'' اسی طرح ایک نصرانی نے بھی یہی بات دہرائی۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں فرمایا: ''ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے سے، یا اس کا حکم دینے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ نے نہ مجھے اس مقصد کے لئے بھیجا ہے اور نہ ہی اس کا حکم دیا ہے۔'' اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تاکہ ہمیشہ کے لیے یہ اصول واضح ہو جائے کہ کوئی نبی، خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، عبادت کا مستحق نہیں ہوتا۔

علم نافع

یہ آیت اس اہم حقیقت کی بھی رہنمائی کرتی ہے کہ علم اور تعلیم کا حقیقی مقصد صرف معلومات کا انبار لگانا نہیں، بلکہ انسان کا ''ربانی'' بن جانا ہے، یعنی ایسا شخص جو علم کے ذریعے اللہ کو پہچانے، اس سے قریب ہو اور اس کی بندگی میں پختہ ہو جائے۔ اگر علم حاصل کرنے کی نیت اللہ کی معرفت اور اس کی رضا نہ ہو، تو ایسا علم انسان کے لیے نفع کے بجائے وبال بن جاتا ہے، اور عمر کی قیمتی گھڑیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی:

''ہم اللہ سے ایسے علم کی پناہ مانگتے ہیں جو نفع نہ دے، اور ایسے دل کی پناہ مانگتے ہیں جو اللہ کے سامنے جھکنے والا نہ ہو''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۷۲۲)**

عبادت کی ایک شکل

اس آیت سے ایک نہایت اہم اصول بھی سامنے آتا ہے کہ جو علماء سوٗ یا مشائخ قرآن وسنت سے ہٹ کر اپنی خواہش کے مطابق حلال وحرام کے فیصلے صادر کرتے ہیں، اور اپنے ماننے والوں سے بلا دلیل اطاعت کرواتے ہیں، وہ دراصل لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں خواہ زبان سے عبادت کا دعویٰ نہ بھی کیا جائے۔

مسند احمد اور ترمذی کی روایت میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! نصاریٰ نے تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کی تھی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا انہوں نے اپنے علماء کی بات نہیں مانی، جب انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا؟'' انہوں نے عرض کیا: ''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بس یہی ان کی عبادت تھی''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۹۵)**

آیت نمبر (۸۰) وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۸۰

ترجمہ: ''اور وہ تمہیں یہ حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے

گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو؟''۔

تفسیر یہ آیتِ کریمہ نہایت واضح اور فیصلہ کن انداز میں اس باطل تصور کی نفی کرتی ہے کہ کوئی نبی یا فرشتہ انسانوں کو اپنی عبادت یا ربوبیت کی طرف بلاتا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ کوئی نبی یہ حکم دے سکتا ہے کہ فرشتوں یا انبیاء کو رب بنا لیا جائے، اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ لوگوں کو کفر کی طرف بلائے، خاص طور پر اس حال میں کہ وہ پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہوں۔ یہ بات عقل، فطرت اور نبوت کے منصب بی تینوں کے سراسر خلاف ہے۔

انبیاءؑ کا مشن

انبیاء علیہم السلام کا مشن ہمیشہ ایک ہی رہا ہے: لوگوں کو صرف اللہ واحد کی بندگی کی طرف بلانا۔ وہ خود اپنی ذات کو عبادت کا مرکز بنانے سے روکتے ہیں، بلکہ اپنی شان میں حد سے بڑھی ہوئی تعریف اور مبالغہ آرائی سے بھی منع فرماتے ہیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عقیدت کی شدت لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جائے اور وہ نبی کو بھی خدائی صفات کا حامل سمجھ بیٹھیں۔ اس لیے انبیاء کرام علیہم السلام کا کمال یہی ہے کہ وہ بندگی کی اعلیٰ مثال بن کر، بندوں کو خالقِ حقیقی سے جوڑ دیتے ہیں۔

اسی اصول کو نبی اکرم ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے اتنا مت بڑھاؤ (میری تعریف میں حد سے تجاوز نہ کرو) جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریمؑ کو حد سے بڑھا دیا۔ میں تو بس اللہ کا بندہ ہوں، اس لیے اس طرح کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول''۔

(صحیح بخاری، احادیث الانبیاء، باب ۴۸، حدیث نمبر: ۳۴۴۵)

نبی کی عظمت کا معیار

یہ فرمان اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ نبی کی عظمت کا صحیح معیار یہ نہیں کہ اسے الوہیت کے درجے پر پہنچا دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اسے اللہ کا برگزیدہ بندہ اور اس کا سچا رسول مانا جائے۔ جب نبی کی ذات کو اس کے اصل مقام یعنی بندگی سے بلند کر دیا جاتا ہے، تو یہی غلو آگے چل کر شرک اور کفر کی بنیاد بن جاتا ہے، جیسا کہ سابقہ امتوں کی تاریخ گواہ ہے۔ اس طرح یہ آیت اور حدیث مل کر امت کو ایک متوازن، محفوظ اور خالص عقیدہ عطا کرتی ہیں، نہ انبیاء علیہم السلام کی توہین، نہ ان کی الوہیت بلکہ احترام، اطاعت اور اتباع اس حد تک جس حد تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمائی ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو ایمان کو خالص رکھتا ہے اور انسان کو فکری و عقیدتی گمراہی سے محفوظ رکھتا ہے۔

آیت نمبر (۸۱) وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ

عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾

ترجمہ: ''اور (یاد کرو) جب اللہ نے لیا عہد نبیوں سے، کہ البتہ میں جو کچھ تمہیں دوں کتاب سے اور حکمت (سے) پھر تمہارے پاس آئے کوئی رسول جو تصدیق کرنے والا ہو، اُس کی جو تمہارے پاس ہے، تو تم ضرور ایمان لانا اُس (نبی) کے ساتھ اور تم ضرور اس کی مدد کرنا، ارشاد ہوا! کیا تم اقرار کرتے ہو اور قبول کرتے ہو اس پر میرا عہد، انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا ارشاد ہوا! سو تم گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ ہوں گواہوں میں سے''۔

آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں ایک بار پھر نجران کے نصاریٰ کے اعتراضات کا مدلّل اور فیصلہ کن جواب دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ واضح فرماتا ہے کہ اس نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی سے ایک مضبوط عہد لیا تھا کہ جب کوئی ایسا رسول مبعوث ہوگا جو پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہو، تو اس وقت کے نبی اور اس کی امت پر لازم ہوگا کہ وہ اس نئے رسول پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔ یہ عہد محض رسمی وعدہ نہ تھا بلکہ نبوت کے تسلسل اور وحدتِ دین کا بنیادی اصول تھا۔

چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام نے اس عہد کا اقرار کیا، اس پر گواہ بنے، اور اللہ تعالیٰ نے خود بھی اس عہد پر گواہی دی۔ اس عہد نامے کا عملی تقاضا یہ تھا کہ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائیں تو وہ تمام لوگ جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار ہونے کے دعوے دار تھے، بلا تردد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔

اس لیے اب اگر کوئی شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے انکار کرتا ہے تو وہ دراصل فاسق، اللہ کا نافرمان اور اپنے ہی نبی کا منکر ہے، جس کی محبت اور اطاعت کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔

اسی بنا پر اگر نجران کے نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان کا دعویٰ کریں مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائیں، تو ان کا یہ دعویٰ خود ان کے عمل سے جھوٹا ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ سمیت تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے آنے والے آخری رسول کی خبر دی، اس پر ایمان لانے کی تلقین کی، اور اپنی امتوں کو اس کے لیے تیار کیا۔

حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوں تو وہ ان پر ایمان لائے گا اور ان کی مدد کرے گا۔ **(تفسیر ابن کثیر، تفسیر طبری، درمنثور)**

اسی طرح ہر نبی کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ اپنی امت سے یہ عہد لے کہ اگر محمد ﷺ ان کی زندگی میں تشریف لائیں تو وہ بھی آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی نصرت کریں گے۔ **(تفسیر ابن کثیر، جلد دوم سورہ آل عمران: آیت ۸۱)**

رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت

حضرت علیؓ کے اس قول کی روشنی میں علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی وہ آخری رسول ہیں جن پر ایمان لانا تمام سابقہ امتوں کے لیے بھی لازم قرار دیا گیا۔ اسی حقیقت کو قاضی عیاض نے اپنی مشہور کتاب الشفا میں واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔

اسی مضمون کی تائید حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر موسیٰؑ آج آ جائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم یقیناً گمراہ ہو جاؤ گے، کیونکہ اگر موسیٰؑ زندہ ہوں اور میری نبوت کو پا لیں تو وہ بھی میری ہی پیروی کریں گے''۔ **(سنن دارمی حدیث نمبر: ۴۴۹)**

یہ حدیث اس حقیقت کو قطعی طور پر واضح کر دیتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت، تمام سابقہ رسالتوں کی تکمیل اور ان پر حاکم ہے۔ آپ ﷺ کی اتباع دراصل تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع ہے، اور آپ ﷺ سے اعراض درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے انحراف ہے۔

آیت نمبر (۸۲) فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: ''پھر جو اس کے بعد (اس عہد سے) منہ موڑے گا، تو وہی لوگ نافرمان ہیں''۔

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح اور فیصلہ کن انداز میں حق سے روگردانی کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا ہے۔ یہاں ''ذٰلِكَ'' سے مراد وہی عظیم عہد ہے جس کا ذکر پچھلی آیات میں ہوا یعنی تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیا گیا وہ پختہ وعدہ کہ جب آخری رسول حضرت محمد ﷺ تشریف لائیں تو ان پر ایمان لایا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص یا گروہ اس کھلی وضاحت، واضح دلیل اور الٰہی عہد کے بعد بھی منہ موڑ لے، حق کو قبول کرنے سے انکار کرے، یا جان بوجھ کر پیروی سے گریز کرے، تو ایسے لوگ محض گمراہ نہیں بلکہ فاسق ہیں۔ یہاں فسق کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کی حد سے نکل گئے، اس کے حکم کو توڑ دیا، اور سچائی کے باوجود نافرمانی کا راستہ اختیار کیا۔

یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ یہ نافرمانی لاعلمی یا غلط فہمی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے انکار کی وجہ

سے ہے۔ کیونکہ دلیل آ چکی، رسول آ چکے، اور عہد بھی موجود ہے۔ اس کے بعد حق سے پھرنا محض فکری اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی اور دینی بغاوت ہے۔

اس آیت میں دراصل ہر دور کے انسان کے لیے ایک اصولی معیار قائم کیا گیا ہے، جو شخص حق کو پہچان لینے کے بعد اس کی پیروی کرے، وہ اطاعت گزار ہے۔ اور جو حق واضح ہو جانے کے بعد بھی پیٹھ پھیر لے، وہ اللہ کے نزدیک نافرمان اور فاسق شمار ہوتا ہے۔

اس طرح یہ آیت ایمان کو محض زبانی اقرار تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اسے عملی اطاعت سے جوڑ دیتی ہے۔ سچا ایمان وہی ہے جو عہد کی پاسداری، رسول کی اتباع اور اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے ظاہر ہو۔ جو اس معیار پر پورا نہ اترے، وہ خود اپنے عمل سے اپنے دعوے کی نفی کر دیتا ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۸۳ سے ۹۱ تک

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ:

(۸۳) تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی یا نا خوشی سے، سب اسی کے تابع ہیں، اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (۸۴) کہہ دیجئے: ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا، اور جو نازل کیا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر، اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں۔ (۸۵) اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے، تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (۸۶) اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا، جو ایمان لا چکے تھے، پھر کافر ہو گئے، حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول سچا ہے، اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آ چکی تھیں؟ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۸۷) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ (۸۸) وہ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔ (۸۹) مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی، تو بے شک اللہ بڑا معاف

کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔(۹۰) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی، اور یہی لوگ واقعی گمراہ ہیں۔(۹۱) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اسی حالت میں مر گئے، ان میں سے اگر کوئی زمین بھر کر سونا بھی فدیے میں دے دے، تو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر آیت نمبر ۸۳ سے ۹۱ تک

آیت نمبر (۸۳) اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمہ: ''تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی یا ناخوشی سے، سب اسی کے تابع ہیں، اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

دینِ محمدی سے روگردانی

تفسیر جب یہ حقیقت واضح اور ثابت ہو چکی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں پر لازم قرار دیا گیا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو شخص دینِ محمدی سے منہ موڑتا ہے، وہ دراصل اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور راستے کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ایسا شخص محض ایک نبی کی اتباع سے انکار نہیں کرتا بلکہ اللہ کے مقرر کردہ آخری اور کامل نظامِ ہدایت کو رد کر دیتا ہے۔

اسی بنیادی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے کہ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ یہ سوال محض استفہام نہیں بلکہ سخت تنبیہ اور سرزنش ہے، کیونکہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کا تصور ہی عقل و فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ وہ واحد ذات ہے جس کے سامنے آسمان و زمین کی پوری کائنات سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے، اور اس کی اطاعت سے باہر کوئی شئے نہیں۔

اللہ کے حکم کا پابند

کائنات کا ہر ذرہ، ہر نظام اور ہر قانون اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ مومن تو دل و جان سے، خوشی اور رضا کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکتا ہے، اس کی اطاعت کو سعادت اور فخر سمجھتا ہے؛ جبکہ کافر بھی، اگرچہ انکار اور سرکشی کا دعویٰ کرتا ہے،

مگر حقیقت میں وہ بھی اللہ کے قہر اور اس کے نافذ کردہ قوانین کے آگے بے بس ہے۔ اس کے پاس اس اطاعت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعے یہ واضح فرما دیتا ہے کہ اللہ کے دین کے مقابلے میں کسی دوسرے دین کا انتخاب محض ایک وہم ہے، کیونکہ پوری کائنات بالفعل اللہ کی فرماں بردار ہے۔ انسان اگر شعوری طور پر اس اطاعت کو قبول کر لے تو وہ مومن ہے، اور اگر انکار کرے تو بھی وہ اللہ کے اقتدار سے باہر نہیں جا سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک رضا کے ساتھ جھکتا ہے اور دوسرا جبر کے تحت۔

یہ آیت انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ کائنات کے ہم آہنگ نظام کو دیکھ کر شعوری اطاعت کا راستہ اختیار کرے، کیونکہ اللہ کے دین کے سوا کوئی دین نہ فطرت سے ہم آہنگ ہے، نہ عقل کے مطابق، اور نہ ہی نجات کا ضامن۔ حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنے اختیار کو اللہ کی اطاعت کے تابع کر دے، کیونکہ کائنات پہلے ہی اس کی تابع ہے۔

آیت نمبر (۸۴) قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: ”کہہ دیجئے: ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا، اور جو نازل کیا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر، اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں“۔

اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین

تفسیر یہ آیت اہلِ کتاب کے ساتھ ایک فیصلہ کن اور اصولی مکالمہ پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اہلِ کتاب پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ اگرچہ وہ ظاہری طور پر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر ایمان کے دعوے دار ہیں، مگر محمد ﷺ اور دینِ اسلام کا انکار دراصل اپنے ہی دعوے کی نفی ہے۔

اس لیے کہ سابقہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ آخری نبی ﷺ پر بھی ایمان لایا جائے، کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت ان ہی انبیاء کرام علیہم السلام کی بشارتوں اور سلسلۂ ہدایت کی تکمیل ہے۔

اس کے مقابلے میں اہلِ ایمان کا موقف نہایت واضح، جامع اور آفاقی ہے: وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، قرآنِ کریم کو مانتے ہیں، اور ان تمام آسمانی صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، ان کی اولاد، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کئے گئے۔

اسلام کسی نبی یا کتاب کے درمیان تفریق نہیں کرتا بلکہ سب کو ایک ہی سلسلۂ ہدایت کا حصہ مانتا ہے۔

اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ قطعی اعلان فرما دیتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اب اسلام کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ یہ اعلان کسی تعصب یا تنگ نظری پر مبنی نہیں بلکہ حقیقتِ وحی اور تسلسلِ نبوت کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب آخری اور کامل شریعت نازل ہو چکی، تو سابقہ شرائع اپنی زمانی حیثیت پوری کر چکیں۔ اسی اصول کو نبی کریم ﷺ نے حدیثِ مبارکہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں، وہ مردود ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۹۷)**

فائدہ: اس حدیث سے یہ اصول پوری قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اللہ کے یہاں قبولیت صرف اسی دین اور اسی طریقے کی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمایا۔ دین کے نام پر کوئی نیا عقیدہ، کوئی خود ساختہ عبادت، یا کوئی ایسا نظریہ جو محمد ﷺ کی تعلیمات کے دائرے سے باہر ہو، وہ اللہ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔

پس اس آیت اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اب دینِ اسلام کے علاوہ نہ کوئی مذہب، نہ کوئی عقیدہ، اور نہ کوئی راستہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ ہدایت، نجات اور رضائے الٰہی کا واحد راستہ وہی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، اور یہی حقیقت تمام انسانوں کے لیے دائمی پیغام ہے۔

آیت نمبر (۸۵) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: ''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے، تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔

اللہ کے نزدیک قبولیت کا واحد راستہ

تفسیر قرآنِ مجید نہایت قطعی اور دوٹوک انداز میں اعلان کرتا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے گا، اُس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہوگا۔ یہ محض ایک مذہبی دعویٰ نہیں بلکہ ایک اصولی اور ابدی ضابطہ ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری اور مکمل ہدایت نازل فرما دی اور سلسلۂ نبوت کو محمد ﷺ پر مکمل کر دیا، تو اب نجات اور قبولیت کا راستہ بھی اسی دین کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

'اسلام' کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم

لفظی (Literal) معنیٰ: اسلام کا مادہ ''س ل م'' ہے، جس کے معنیٰ ہیں سلامتی، اطاعت اور سپردگی۔ لہٰذا اسلام کا لفظی مفہوم ہے: اپنے آپ کو بغیر کسی شرط کے اللہ کے حوالے کر دینا، اُس کی مرضی کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دینا۔

اصطلاحی معنیٰ

اسلام سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور اُس کی نازل کردہ تعلیمات کو دل و جان سے قبول کرے، اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دے، اپنی خواہشات کو اُس کے حکم کے تابع کر دے، اور پوری زندگی میں اُسی کو رب، معبود اور حاکم مان کر اُس کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یعنی بندگی صرف زبانی اقرار نہیں بلکہ مکمل عملی اطاعت اور ہمہ گیر فرمانبرداری کا نام ہے۔

رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان کی فرضیت

جب اسلام کا مطلب اللہ کی کامل اطاعت اور اُس کی نازل کردہ ہدایت کو مان لینا ہے، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا فرض ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور اُس کی آخری شریعت کے حامل ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد کسی سابقہ شریعت پر قائم رہنا یا آپ ﷺ کے پیغام کو رد کرنا درحقیقت اللہ کے حکم کو رد کرنا ہے۔

اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے نہایت جلال اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ صحیح مسلم میں ارشاد ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اس امت میں سے جو بھی، خواہ یہودی ہو یا نصرانی، میرے بارے میں سنے اور پھر اُس پیغام پر ایمان لائے بغیر مر جائے جو میں لے کر آیا ہوں، تو وہ جہنم والوں میں سے ہوگا''۔ (صحیح مسلم، باب ۷۰، حدیث نمبر: ۱۵۳)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت عام اور عالمگیر ہے، اور آپ ﷺ کے پیغام کو سن لینے کے بعد اُس کا انکار کرنا نجات کے دروازے کو خود اپنے اوپر بند کر لینا ہے۔

دین کی ہمہ گیری اور جامعیت کو ایک اور حدیث میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، جسے حدیثِ جبرئیل کہا جاتا ہے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جبرئیل امینؑ انسانی صورت میں حاضر ہوئے اور نبی کریم ﷺ سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے ہر سوال کا مفصل جواب دیا، اور جب وہ چلے

گئے تو فرمایا: ''یہ جبرئیل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے''۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ۳۷، حدیث نمبر: ۵۰؛ کتاب العلم، باب ۲۵، حدیث نمبر: ۸۷)

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان یہ سب مل کر 'دین' کہلاتے ہیں۔ یعنی دین صرف چند عقائد کا نام نہیں، نہ محض ظاہری اعمال کا عنوان ہے، بلکہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے جس میں عقیدہ، عبادت، اخلاق اور باطنی کیفیت سب شامل ہیں۔ اسی باب میں نبی کریم ﷺ نے عبدالقیس کے وفد کو ایمان کے معانی بھی واضح فرمائے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی حقیقت محض رسمی شناخت نہیں بلکہ عملی التزام اور قلبی یقین ہے۔

آیت نمبر (۸۶) كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۶

ترجمہ: ''اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا، جو ایمان لا چکے تھے، پھر کافر ہو گئے، حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول سچا ہے، اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آ چکی تھیں؟ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا''۔

اہلِ کتاب کا انکار اور توبہ کا دروازہ

تفسیر یہ آیت بنیادی طور پر اہلِ کتاب، خصوصاً یہود کے بارے میں نازل ہوئی، اگرچہ اس میں مرتدین کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہود بعثتِ نبوی ﷺ سے پہلے آپ کے ظہور کو حق مانتے اور آپ کے وسیلے سے مشرکین کے خلاف فتح کی دعائیں کرتے تھے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے تو انہوں نے حسد اور عناد کی وجہ سے انکار کر دیا اور ایمان نہ لائے۔

اسی سلسلے میں مدینہ کا ایک شخص، جو اسلام لا چکا تھا، مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا۔ بعد میں نادم ہو کر اس نے پوچھا: کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ **(آلِ عمران: ۸۶)** یہ روایت سنن النسائی (کتاب الحدود، باب حکم المرتد)، المستدرک للحاکم اور صحیح ابن حبان میں مذکور ہے۔

آیت میں بتایا گیا کہ جو لوگ ایمان کے بعد کفر اختیار کریں، ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور ان کا انجام جہنم ہے۔ تاہم جو سچے دل سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں، ان کے لئے مغفرت کا دروازہ کھلا ہے۔

کافر کی دعا

علماء امت کا اتفاق ہے کہ کافر اور گنہگار کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ مرتد کی توبہ کے بارے میں اگرچہ کچھ اختلاف

ہے، لیکن جمہور کے نزدیک سورۂ نساء (آیت ۱۳۷) کی روشنی میں اس کی توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے، بشرطیکہ وہ نیک اعمال سے اپنی سچائی ثابت کرے۔

آیت نمبر (۸۷) اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: ''ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے''۔

تفسیر اُن لوگوں کی سزا یہ ہے کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، فرشتے اُن پر پھٹکار بھیجیں اور تمام انسان اُنہیں نفرت وملامت کی نگاہ سے دیکھیں؛ یوں وہ دنیا وآخرت میں رسوائی اور ذلت (Disgrace) کا شکار ہوجائیں۔

آیت نمبر (۸۸) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

ترجمہ: ''وہ اس لعنت میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی''۔

تفسیر وہ لوگ اسی عذاب میں ہمیشہ کے لیے گرفتار رہیں گے؛ نہ تو ان پر عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ہی انہیں نجات یا مہلت کی کوئی فرصت دی جائے گی۔ یہ دائمی سزا ان کے انجامِ بد کی قطعی اور اٹل تصویر ہے، جس سے خلاصی کی کوئی صورت نہیں۔

آیت نمبر (۸۹) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: ''مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کرلی اور اپنی اصلاح کرلی، تو بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک مسلمان لغزش کا شکار ہوکر اسلام سے پھر گیا اور مشرکین کے ساتھ جاملا، مگر زیادہ دیر نہ گزری کہ اس کے دل میں ندامت کی آگ بھڑک اٹھی اور اسے اپنی سنگین خطا کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے چند لوگوں کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ سوال بھجوایا: ''کیا میرے لیے توبہ کی قبولیت کی کوئی صورت باقی ہے''؟

اسی سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں گمراہی کے بعد ہدایت اور توبہ کے

دروازے کی حقیقت واضح کردی گئی۔ (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۴۰۷۳)

یہ روایت اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ اگرچہ ارتداد نہایت سنگین جرم ہے، لیکن جب بندہ سچے دل سے ندامت اختیار کرے اور اللہ کی طرف رجوع کرے تو رحمتِ الٰہی کا دروازہ اس کے لئے بند نہیں ہوتا۔

آیت نمبر (۹۰) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝۹۰

ترجمہ: ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی، اور یہی لوگ واقعی گمراہ ہیں''۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار

تفسیر یہ آیت بھی براہِ راست اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مفسرینِ امت قتادہ، عطا اور حسن بصری رحمہم اللہ کا بیان ہے کہ اس آیت کا مصداق وہ یہود و نصاریٰ ہیں جنہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان لینے کے باوجود آپ کی رسالت کا انکار کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں صاف الفاظ میں فیصلہ سنا دیا کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انکار پر قائم رہے، یہاں تک کہ اسی حالت میں موت نے انہیں آلیا، تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی، اور حقیقت میں یہی لوگ راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

بعض اہلِ علم نے اس آیت کا مفہوم اُن لوگوں پر بھی منطبق کیا ہے جو بار بار ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹتے رہے۔ ایسے افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ چونکہ کفر ان کے دلوں میں رچ بس چکا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرماتا۔ امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ بھی اسی رائے کے قائل ہیں۔

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت ۱۳۷ میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ: جو لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر دوبارہ کفر کیا، اور اس کفر میں مزید بڑھتے چلے گئے، تو اللہ تعالیٰ نہ انہیں کبھی معاف فرمائے گا اور نہ ہی انہیں سیدھی راہ کی ہدایت نصیب ہوگی۔

یہ آیت دراصل اس انجام سے خبردار کرتی ہے جو ضد، ہٹ دھرمی اور مسلسل انکار کی روش اختیار کرنے والوں کا مقدر بن جاتا ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ ہدایت کی توفیق صرف اُسی کو ملتی ہے جو حق کو پہچان کر اسے قبول کرے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور اس پر ثابت قدم رہے۔

آیت نمبر (۹۱) اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افۡتَدٰی بِهٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ: ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اسی حالت میں مر گئے، ان میں سے اگر کوئی زمین بھر کر سونا بھی فدیے میں دے دے، تو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا''۔

اللہ کا عذاب

تفسیر جو لوگ انکار و کفر کی راہ اختیار کر کے اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اُن کے انجام کو نہایت واضح اور عبرت انگیز انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اُس روز نہ کسی کے پاس مال و دولت کارآمد ہوگی اور نہ کوئی دنیاوی سہارا۔

فرض کر لیا جائے کہ کسی کے اختیار میں پوری زمین بھر سونا بھی ہو اور وہ اسے اپنی جان چھڑانے کے لیے فدیہ میں پیش کرے، تب بھی وہ اللہ کے عذاب سے نجات حاصل نہ کر سکے گا۔ اس دن کوئی قیمت، کوئی بدلہ اور کوئی سفارش اُسے عذابِ الٰہی سے محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔

قیامت کے دن جہنمی کا حال

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب سے ہلکے عذاب والے جہنمی سے فرمائیں گے: اگر تیرے پاس دنیا اور اس کے برابر مزید دولت بھی ہو تو کیا تو اسے اپنے فدیے میں دے دے گا؟ وہ عرض کرے گا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے دنیا میں تجھ سے اس سے کہیں آسان بات (یعنی توحید) طلب کی تھی اور کہا تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، مگر تو شرک پر قائم رہا''۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۰۵)

اسی مضمون کو حضرت انسؓ ہی سے مروی ایک اور روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایک جہنمی سے پوچھا جائے گا: ''اگر تم زمین کی ہر چیز کے مالک ہوتے تو کیا سب کچھ دے کر اپنی جان چھڑانا چاہتے؟'' وہ کہے گا: ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

''میں نے تو تم سے اس سے کہیں آسان بات چاہی تھی جب تم اپنے باپ آدمؑ کی پشت میں تھے کہ میرے

ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، مگر تم نے انکار کر دیا''۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۳۱۴)

اخلاقی نیکیاں

مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عبداللہ بن جدعان کے بارے میں پوچھا گیا جو مہمان نوازی کرتا، قیدیوں کو آزاد کراتا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا کہ کیا اس کی یہ نیکیاں اسے فائدہ دیں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، اس لیے کہ اس نے کبھی یہ نہیں کہا: اے میرے رب! قیامت کے دن میرے گناہ معاف فرما دینا''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۱۸)

کافر کا حال

اسی حقیقت کو ایک اور حدیث میں بیان فرمایا گیا: ''قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا: اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہو تو کیا اسے دے کر اپنے آپ کو بچانا چاہے گا؟ وہ کہے گا: ہاں۔ تو اس سے کہا جائے گا: دنیا میں تجھ سے اس سے کہیں آسان بات کہی گئی تھی (کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کر)، مگر تو نے انکار کیا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۵۳۸)

ان تمام احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن نجات کا معیار مال و دولت یا ظاہری نیکیاں نہیں، بلکہ خالص توحید اور سچی بندگی ہے۔ جس نے دنیا میں اللہ کی وحدانیت کو قبول نہ کیا، اس کے لیے اُس دن کوئی فدیہ، کوئی قیمت اور کوئی عذر کارگر نہ ہوگا۔

❁❁❁

آیت نمبر ۹۲ سے ۱۰۱ تک

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۤ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ:

(۹۲) تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ نہ کرو جسے تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو، اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ (۹۳) تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے، سوائے ان کے جو یعقوب (علیہ السلام) نے خود اپنے اوپر حرام کر لیے تھے، قبل اس کے کہ تورات نازل کی گئی ہو۔ کہہ دو، اگر تم سچے ہو تو تورات لا کر اسے پڑھو۔ (۹۴) پھر اس کے بعد بھی جو اللہ پر جھوٹ باندھے، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ (۹۵) کہہ دو، اللہ نے سچ فرمایا ہے، تو اب تم ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کی پیروی کرو، جو ہر باطل سے کٹ کر صرف اللہ کے ہو گئے تھے، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ (۹۶) یقیناً سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (عبادت کی خاطر) بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے، جو بابرکت ہے اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کا مرکز ہے۔ (۹۷) اس میں کھلی نشانیاں ہیں، جیسے مقامِ ابراہیم، اور جو بھی اس میں داخل ہوا، وہ امن پا گیا۔ اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج فرض ہے، جو اس تک

پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اور جو انکار کرے تو یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ (۹۸) کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (۹۹) کہہ دو، اے اہل کتاب! تم ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو، تم چاہتے ہو اس میں کجی، حالانکہ تم گواہ ہو، اور اللہ غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ (۱۰۰) اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہنا مانو گے، تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ (۱۰۱) اور تم کیسے کفر کر سکتے ہو، جب کہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں؟ اور جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے، تو یقیناً وہ سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا۔

تفسیر آیت نمبر ۹۲ سے ۱۰۱ تک

آیت نمبر (۹۲) لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: ''تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ نہ کرو جسے تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو، اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

تفسیر پچھلی آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن کوئی شئے کافروں کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی، اور نہ ہی اس دن صدقہ وخیرات کا کوئی موقع میسر ہوگا۔ صدقہ وخیرات کا میدان یہی دنیا ہے۔ جو شخص ایمان لا کر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، وہی اپنا خرچ قیامت کے دن محفوظ پائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہلِ ایمان کی رہنمائی فرمائی ہے کہ تم اللہ کی رضا اور اس کی جنت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے، جب تک اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو۔

حضرت ابوطلحہؓ کا نکاح

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ انصار میں حضرت ابوطلحہؓ کے پاس سب سے زیادہ باغات تھے، اور ان سب میں انہیں بَیرُ حاء نامی باغ سب سے زیادہ محبوب تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''میری تمام جائیداد میں یہ باغ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، میں

اسے اللہ کی رضا کے لیے صدقہ کرتا ہوں، اور اللہ کے ہاں اس کے اجر کی امید رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ جہاں مناسب سمجھیں اسے صرف فرمادیں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''بہت خوب! یہ تو باقی رہنے والا مال ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے اپنے غریب رشتہ داروں میں تقسیم کردو''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۴۶۱)

اسی طرح حافظ ابوبکر بزار نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''جب میں نے یہ آیت سنی تو میں نے اپنی جائیداد پر غور کیا۔ میری سب سے قیمتی ملکیت ایک رومی لونڈی تھی، چنانچہ میں نے اسے اللہ کی رضا کے لیے آزاد کردیا''۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی نیکی یہی ہے کہ بندہ اللہ کی محبت میں اپنی عزیز ترین چیز قربان کرے، کیونکہ آخرت میں نجات اور کامیابی کا دارومدار اسی اخلاص اور ایثار پر ہے۔

آیت نمبر (۹۳) كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۹۳

ترجمہ: ''تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے، سوائے ان کے جو یعقوب (علیہ السلام) نے خود اپنے اوپر حرام کرلیے تھے، قبل اس کے کہ تورات نازل کی گئی ہو۔ کہہ دو، اگر تم سچے ہو تو تورات لاکر اسے پڑھو''۔

تفسیر علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل یہودیوں کے دعوے کی تردید اور اُن کی تکذیب کے لیے نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (آیات ۱۶۰،۱۶۱) اور سورۂ انعام (آیت ۱۴۶) میں واضح فرمایا ہے کہ بعض پاکیزہ اور حلال چیزیں اُن پر ان کے ظلم وسرکشی کی سزا کے طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اس بیان سے یہودیوں کو ناگواری ہوئی، چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر حقیقت کو بدلنے کی کوشش کی کہ یہ چیزیں تو ہم پر ابتدا ہی سے نوحؑ، ابراہیمؑ اور اولادِ اسرائیل کے زمانے سے حرام چلی آرہی تھیں۔

یہود کے دعوے کی تردید

اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس دعوے کو ردّ کرتے ہوئے فرمایا کہ بنی اسرائیل پر اصل میں کوئی چیز بذاتِ خود حرام نہ تھی؛ البتہ حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کی اولاد نے نذر کے طور پر بعض کھانوں کو خود اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ پھر نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو توریت پیش کریں اور اس سے اپنی بات ثابت

کریں کیونکہ توریت میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ وہ چیزیں قدیم زمانے سے حرام تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: ''بتایئے، یعقوبؑ نے اپنے اوپر کون سی چیز حرام کی تھی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں عِرق النساء (جوڑوں کے درد) کی تکلیف تھی۔ انہوں نے بطورِ علاج اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا، اور اسے اپنے اوپر حرام کرلیا''۔ یہ سن کر یہودیوں نے کہا: ''آپ نے سچ فرمایا''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۴۸۳)**

امام احمدؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ چیزیں بطورِ نذر اپنے اوپر حرام کی تھیں، نہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء انہیں حرام قرار دیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کو توریت پیش کرنے کا چیلنج دراصل آپ کی صداقت کی روشن دلیل تھا، کیونکہ اگر اُن کے پاس کوئی ثبوت ہوتا تو وہ ضرور پیش کرتے، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے وہی اصل ظالم ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ نتیجتاً واضح ہو گیا کہ حق اللہ کے پاس ہے اور یہود کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ لہٰذا ان کے لیے لازم تھا کہ وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملتِ ابراہیمی یعنی دینِ اسلام کو اختیار کریں، جو خالص توحید اور حق کی راہ ہے۔

آیت نمبر (۹۴) فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: ''پھر اس کے بعد بھی جو اللہ پر جھوٹ باندھے، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں''۔

تفسیر پس جو شخص اس واضح حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرے، وہی درحقیقت سخت ظالم ہے؛ کیونکہ اس نے جان بوجھ کر حق کو چھپایا اور اللہ پر بہتان باندھ کر اپنے ظلم کو خود ہی آشکار کر دیا۔

آیت نمبر (۹۵) قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

ترجمہ: ''کہہ دو، اللہ نے سچ فرمایا ہے، تو اب تم ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کی پیروی کرو، جو ہر باطل سے کٹ کر صرف اللہ کے ہو گئے تھے، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

تفسیر کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل سچی اور قطعی بات فرما دی ہے؛ لہٰذا اب تم اس سیدھی اور خالص راہ کی پیروی کرو جو حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے وہ دین جو یکسوئی، توحید اور حق پر قائم تھا، اور یاد رکھو کہ حضرت ابراہیمؑ کبھی مشرکوں میں سے نہ تھے۔

آیت نمبر (۹۶) اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۚ﴿۹۶﴾

ترجمہ: ''یقیناً سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (عبادت کی خاطر) بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے، جو بابرکت ہے اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کا مرکز ہے''۔

یہود کی چالیں

تفسیر اس آیت میں یہود کی ایک نئی چال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ اعتراض اٹھایا کہ بیت المقدس پہلا قبلہ ہے اور خانۂ کعبہ سے افضل ہے، کیونکہ وہ پاک سرزمین پر واقع ہے اور بہت سے انبیاء ورسل نے وہاں ہجرت کی؛ پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنالیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس شبہے کا دوٹوک جواب دیا کہ زمین پر سب سے پہلا گھر خانۂ کعبہ ہی ہے، جو ابتدا سے باعثِ برکت اور انسانیت کے لیے ہدایت کا مرکز ہے۔ قیامت تک لوگ دنیا کے ہر گوشے سے یہاں حج وزیارت کے لیے کھنچے چلے آئیں گے اور اسی کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے اور اللہ کو یاد کرتے رہیں گے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! زمین پر سب سے پہلی مسجد کون سی بنائی گئی''؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسجدِ حرام''۔ میں نے پوچھا: ''پھر کون سی''؟ فرمایا: ''مسجدِ اقصیٰ''۔ میں نے پوچھا: ''دونوں کے درمیان کتنی مدت تھی''؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چالیس سال''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۳۶۶ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۲۰)

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا، اور اس کے چالیس سال بعد حضرت یعقوب بن اسحاقؒ نے مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد رکھی۔

مقامِ ابراہیم اور شعائرِ حج

آیت میں مذکور ''آیاتِ بیّنات'' سے مراد بالخصوص مقامِ ابراہیم ہے وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی دیواریں بنائیں اور جس پر اللہ کے حکم سے ان کے قدموں کے نشانات ثبت ہو گئے۔ (تفصیل: سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۵) اسی طرح صفا ومروہ، زمزم کا پانی، خانۂ کعبہ اور حج کے تمام شعائر بھی اس میں شامل ہیں۔

فتحِ مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے اس شہر (مکہ) کو اسی دن سے بلدِ حرام بنا دیا ہے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا، اور یہ قیامت تک بلدِ حرام ہی رہے گا''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۸۳۲ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۳۵۳)

حج کی فرضیت اور استطاعت

اکثر علماء نے ان آیات سے حج کی فرضیت پر استدلال کیا ہے۔ حج بالغ ہونے کے بعد زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دے کر فرمایا: ''اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج ادا کرو''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۳۳۷)**

حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آیت میں مذکور ''سبیل'' کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''راستے کا خرچ اور سواری''۔ (حاکم نے اسے امام مسلم کی شرط پر صحیح کہا) آیت وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ میں کفر سے مراد یا تو فریضۂ حج کا انکار ہے یا استطاعت کے باوجود اس کی ادائیگی سے گریز۔ **(المستدرک للحاکم حدیث نمبر ۱۶۱۳)**

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس سفر کا خرچ اور سواری ہو، پھر بھی وہ حج نہ کرے، تو وہ ایسا ہے جیسے یہودی یا نصرانی ہو کر مرے''۔ **(سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۸۱۲ (اگرچہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، مگر قرآنِ کریم اور دیگر صحیح احادیث اس کے مفہوم کی تائید کرتی ہیں)**



خانۂ کعبہ کا اندرونی حصہ



مقامِ ابراہیم



خانۂ کعبہ اور حطیم



خانۂ کعبہ کا اندرونی حصہ 3D شکل میں

آیت نمبر (۹۷) فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: ''اس میں کھلی نشانیاں ہیں، جیسے مقامِ ابراہیم، اور جو بھی اس میں داخل ہوا، وہ امن پا گیا۔ اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج فرض ہے، جو اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اور جو انکار کرے تو یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ یعنی جو شخص انکار کرے، تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ سعید بن منصور نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ جب آیت وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا نازل ہوئی تو یہودیوں نے کہا: ہم بھی مسلمان ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے حجِ بیت اللہ فرض کیا ہے''۔ انہوں نے کہا: ''یہ ہم پر فرض نہیں''، اور حج کرنے سے انکار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جو انکار کرے، اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ **(باب النقول فی أسباب النزول)**

اسی باب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''میں نے اپنے والد کو اس حال میں پایا کہ وہ بہت بوڑھے ہیں اور سواری پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے؛ کیا میں ان کی طرف سے حج کر دوں''؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۵۱۳)**

یہی وہ گھر ہے جس میں کھلی نشانیاں ہیں بالخصوص مقامِ ابراہیم اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں آ گیا۔

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو، وہ اس کا حج ادا کرے؛ اور جو کوئی اس فرض کا انکار کرے، تو یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ساری دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

آیت نمبر(۹۸) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: ''کہہ دو، اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

تفسیر پچھلی آیات میں اہلِ کتاب کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا اور ان کے باطل دعوں کے مقابلے میں واضح اور مضبوط دلائل قائم کئے گئے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ آپ ان سے صاف صاف سوال کریں: تم جان بوجھ کر اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے کیوں گریزاں ہو؟ خود اسلام میں داخل کیوں نہیں ہوتے، اور دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے روکنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟

یہ اندازِ خطاب دراصل ان کے عناد، ہٹ دھرمی اور دانستہ انکار کو نمایاں کرتا ہے، اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حق ان پر پوری طرح روشن ہو چکا ہے، مگر وہ جانتے بوجھتے اسے قبول نہیں کر رہے۔

آیت نمبر(۹۹) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: ''کہہ دو، اے اہل کتاب! تم ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو، تم چاہتے ہو اس میں کجی، حالانکہ تم گواہ ہو، اور اللہ غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو''۔

تفسیر کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! تم ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو؟ کیوں اس سیدھی راہ میں کج روی اور عیب تلاش کرتے ہو، حالانکہ تم خود حق کے گواہ ہو، اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اللہ تمہارے اعمال اور تمہاری چالوں سے ہرگز بے خبر نہیں۔

یہ خطاب اس دانستہ رکاوٹ اور شعوری گمراہ کرنے پر سخت گرفت ہے، جس میں حق پہچاننے کے باوجود اسے بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور اہلِ ایمان کے قدم ڈگمگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آیت نمبر(۱۰۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہنا مانو گے، تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پھیر دیں گے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو نہایت دردمندانہ انداز میں نصیحت فرمائی ہے کہ وہ اہلِ کتاب، خصوصاً یہودیوں کے مکر وفریب اور خفیہ سازشوں سے ہوشیار رہیں۔ حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ قبیلۂ اوس اور خزرج کے درمیان جاہلیت کے زمانے سے شدید عداوت اور جنگیں چلی آ رہی تھیں۔ ایک موقع پر دونوں قبیلے اکٹھا بیٹھے، پرانی لڑائیوں کا تذکرہ ہوا تو جذبات بھڑک اٹھے، غصہ اس قدر بڑھا کہ لوگ ہتھیار اٹھا کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے۔ اسی موقع پر آیت وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ اور اس کے بعد آنے والی دو آیات نازل ہوئیں، جنہوں نے اس فتنہ کو جڑ سے کاٹ دیا۔

اسباب نزول

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے شانِ نزول میں زید بن اسلمؒ کی روایت نقل کی ہے، جسے ابن جریر، ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی اسناد سے بیان کیا ہے۔ ان روایات کے مطابق ایک یہودی شاس بن قیس مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ ایک دن اس کا گزر انصارِ مدینہ کی ایک مجلس کے پاس سے ہوا۔ جب اس نے اوس وخزرج کے مسلمانوں کو باہم محبت، اتحاد اور اخوت کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو اس کے دل میں حسد اور دشمنی بھڑک اٹھی۔ اس نے ایک نوجوان یہودی کو وہاں بھیجا تاکہ وہ انصار کو جنگِ بعاث کی یاد دلا کر قبائلی غیرت کو ابھار دے۔

اس سازش کا اثر ہوا؛ پرانے زخم ہرے ہو گئے، زبانیں تلخ ہوئیں اور معاملہ دوبارہ جنگ تک جا پہنچا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس فتنہ کی خبر ہوئی تو آپ فوراً تشریف لائے، اللہ کا خوف یاد دلایا، جاہلیت کے انجام سے آگاہ کیا اور اخوتِ اسلامی کی عظمت بیان فرمائی۔ آپ ﷺ کی نصیحت کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کے دل پگھل گئے، ہتھیار ہاتھوں سے گر پڑے، سب زار وقطار رونے لگے اور ایک دوسرے سے لپٹ کر صلح ومحبت کا اعلان کیا۔

یہ واقعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ اہلِ ایمان کی قوت باہمی اتحاد میں ہے، اور دشمن کی سب سے خطرناک چال یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ہمیشہ بیدار رہنے اور جاہلیت کی ہر شکل سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

آیت نمبر (۱۰۱) وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: ''اور تم کیسے کفر کر سکتے ہو، جب کہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں؟ اور جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے، تو یقیناً وہ سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ واقعے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح فرمادی ہے کہ اہلِ ایمان کی جماعت کفر کو قبول نہیں کرسکتی۔ اس لیے کہ وہ لوگ مسلسل قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کی ہدایات سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتے ہیں، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت ان کی رہنمائی اور اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بات ناممکن ہے کہ وہ حق کو پہچان لینے کے بعد دینِ اسلام کو چھوڑ دیں اور دوبارہ کفر کی تاریکی میں لوٹ جائیں۔ یہ آیت اس امر کی بشارت ہے کہ جب قرآن دلوں میں زندہ ہو اور رسولِ ہدایت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت ساتھ ہو، تو ایمان محفوظ رہتا ہے اور گمراہی کی راہیں خود بخود بند ہوجاتی ہیں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۰۲ سے ۱۱۰ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ:

(۱۰۲) اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت صرف اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔ (۱۰۳) اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اللہ کی وہ نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی تھی، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی، تو تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نشانیاں واضح کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (۱۰۴) اور تم میں ایک ایسا گروہ ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ (۱۰۵) اور تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلائل آ چکے تھے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (۱۰۶) جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جن کے چہرے

سیاہ ہوں گے، ان سے کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کیا تھا؟ تو اب چکھو عذاب، اس کفر کے بدلے جو تم کرتے تھے۔(۱۰۷) اور جن کے چہرے روشن ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۰۸) یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انہیں تم پر حق کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں، اور اللہ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔(۱۰۹) اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔(۱۱۰) تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان میں کچھ ایمان والے ہیں، مگر اکثر نافرمان ہیں۔

تفسیر آیت نمبر ۱۰۲ سے ۱۱۰ تک

آیت نمبر (۱۰۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت صرف اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو''۔

تفسیر ابنِ ابی حاتمؒ اور امام حاکمؒ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آیت کے الفاظ ''حَقَّ تُقَاتِهٖ'' کا مفہوم یوں بیان فرمایا: ''اللہ کی پوری اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے؛ اسے ہر وقت یاد رکھا جائے اور کبھی بھلایا نہ جائے؛ اس کی نعمتوں پر شکر ادا کیا جائے اور ناشکری سے بچا جائے''۔

(المستدرک للحاکم حدیث نمبر ۹۷۷، امام حاکم نے اسے صحیح کہا)

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس آیت کے ابتدائی حصے کو سورۂ تغابن کی آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی ''اللہ سے اپنی طاقت بھر ڈرتے رہو نے منسوخ کر دیا ہے؛ مگر یہ رائے درست نہیں۔ اس لیے کہ پہلی آیت کا مقصود یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں اللہ سے مضبوط تعلق رکھے، اس کے عذاب سے خوف اور اس کی عظمت وجلال کا احساس دل ودماغ پر غالب رہے۔

جبکہ سورۂ تغابن کی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں کیا۔ یوں دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں؛ بلکہ پہلی آیت تقویٰ کے معیاری اور قلبی پہلو کو واضح کرتی ہے، اور دوسری

آیت تکلیف کے عمومی اور عملی دائرے کی حد بندی بیان کرتی ہے۔

آیت نمبر (۱۰۳) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۱۰۳

ترجمہ: ''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اللہ کی وہ نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی تھی، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی، تو تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نشانیاں واضح کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پاؤ''۔

تفسیر حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ یہاں بالخصوص اوس اور خزرج کے حالات کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے درمیان شدید دشمنی اور خونریزیاں تھیں، مگر جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کے دل جوڑ دیے اور وہ اللہ کی خاطر آپس میں حقیقی بھائی بن گئے۔

اس آیت میں مذکور ''اللہ کی رسی'' سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد و پیمان ہے، یا پھر قرآنِ کریم۔ امام مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! میں تمہارے درمیان دو نہایت عظیم اور بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں؛ ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے اور دوسری رسول کی سنت۔ جو ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے گا وہ ہدایت پر رہے گا، اور جو انہیں چھوڑ دے گا وہ گمراہی میں پڑ جائے گا''۔ (صحیح مسلم حدیث: ۲۴۰۸، کتاب فضائل الصحابہ (حدیث کے متعدد طرق)

اتحاد کی بنیاد

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد کی تاکید کی گئی ہے اور ہر طرح کے تفرقے سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے، نیز اتحاد کی مضبوط بنیاد قرآنِ کریم کو قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنت قرآن سے جدا نہیں ہو سکتی، اور قرآن سنت کے بغیر صحیح طور پر سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ اسی لیے امتِ مسلمہ میں حقیقی اور پائیدار اتحاد صرف قرآن و سنت پر عمل سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی مضمون پر متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، جن میں امت کو فرقہ بندی اور الزام تراشی سے خبردار کیا گیا ہے، اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ امت صرف اس وجہ سے فرقوں میں بٹ گئی کہ اس نے قرآن و سنت کو پسِ پشت ڈال

دیا۔نجات پانے والے گروہ کی علامت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمادی کہ وہی گروہ حق پر ہوگا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریقے پر چلے گا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آئندہ آنے والے فتنوں کی خبر دیتے ہوئے امت کو سختی سے متنبہ فرمایا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہود بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تھے، نصاریٰ بھی بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہوئے، اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی؛ ان میں سے سب جہنم میں ہوں گے سوائے ایک کے''۔پوچھا گیا: وہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر ہوگا''۔

(سنن ترمذی، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۲۶۴۱ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۳۹۹۲، ۳۹۹۳)

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی بھی دور میں امتِ مسلمہ کے درمیان حقیقی اتحاد ممکن ہے، تو وہ صرف اور صرف قرآن وسنت کی بنیاد پر ہی ممکن ہے؛ اس کے سوا کوئی اور بنیاد امت کو حقیقی طور پر یکجا نہیں کرسکتی۔

آیت نمبر (۱۰۴) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۰۴

ترجمہ: ''اور تم میں ایک ایسا گروہ ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے۔اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے''۔

اصلاح اور دعوتِ دین کا نظام

تفسیر پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو نہایت محبت بھرے انداز میں خطاب کرکے ان کی انفرادی اور اجتماعی کامیابی کے دو بنیادی اصول بیان فرمائے تھے۔انفرادی اصلاح کے لیے حکم دیا گیا کہ ہر شخص تقویٰ اور خوفِ خدا کو اپنی زندگی کا شعار بنائے، اور اجتماعی قوت وملی استحکام کے لیے سب کو مل کر اللہ کی رسی یعنی قرآنِ کریم کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کی تاکید کی گئی۔اس طرح مسلمانوں کی قومی اجتماعیت اور اتحاد کا ایک جامع نظام واضح کردیا گیا۔

اب ان آیات میں یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ یہ انفرادی تقویٰ، اجتماعی اتحاد، باہمی محبت اور ''**اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ**'' یعنی سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا بھی اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت موجود ہو جو خاص طور پر دعوت وتبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دے۔

دعوت وتبلیغ کے لئے ایک باصلاحیت جماعت

اس جماعت کا اصل کام یہ ہو کہ وہ اپنے قول وعمل کے ذریعے لوگوں کو قرآن وسنت کی طرف بلائے۔جب

لوگوں کو نیکی میں سستی اور برائی میں مبتلا دیکھے تو اپنی استطاعت کے مطابق انہیں بھلائی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے میں کوتاہی نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری وہی افراد بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں جو معروف اور منکر کا صحیح علم رکھتے ہوں، معروف وہ کام ہے جو کتاب وسنت کے مطابق ہو، اور منکر وہ جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔

مزید یہ کہ وہ لوگ دین کا علم رکھنے کے ساتھ بصیرت، حکمت اور موقع شناسی بھی رکھتے ہوں، اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے آداب وطریقے سنت کے مطابق جانتے ہوں۔ ورنہ لاعلمی کی بنا پر ممکن ہے کہ معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھ لیا جائے، یا اصلاح کے نام پر ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو مزید فساد کا سبب بن جائے؛ کہیں نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے مقام پر نرمی برتی جائے۔

اس لیے اس عظیم فریضے کی تکمیل کے لیے مسلمانوں میں ایک باصلاحیت جماعت کا ہونا ضروری ہے جو پوری اہلیت کے ساتھ دعوتِ الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام انجام دے۔

تبلیغِ دین کی ذمہ داری

اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف اسی مخصوص جماعت کی ذمہ داری ہے اور باقی امت اس سے بری ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فریضہ ہر مسلمان پر اس کی استطاعت کے مطابق لازم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے، تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے؛ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے؛ اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری طرف سے (دین کی بات) پہنچا دو، اگرچہ ایک ہی آیت ہو''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۴۶۱)

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری امت کی ذمہ داری ہے، البتہ ہر شخص اپنی طاقت، علم اور حالات کے مطابق اس کا مکلف ہے۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں خاموشی عذر بن سکتی ہے، اور بعض حالات میں یہ فریضہ واجب یا مستحب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس طرح اسلام نے ایک ایسا متوازن نظام پیش کیا ہے جس میں علم وحکمت کے ساتھ اجتماعی دعوت کا انتظام بھی ہے اور ہر فرد کی ذاتی ذمہ داری بھی تاکہ امت کا ایمان، اتحاد اور اخلاقی استحکام ہمیشہ قائم رہے۔

آیت نمبر (۱۰۵) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: ''اور تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلائل آ چکے تھے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

امتِ مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری سے غفلت کے نتائج

تفسیر اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو ایک مخصوص جماعت اور امت کی حیثیت سے وجود بخشا، تو اس کے ساتھ ہی نہایت واضح انداز میں یہ ہدایت اور تنبیہ بھی فرما دی کہ تم یہود و نصاریٰ کی روش اختیار نہ کرنا؛ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے صریح اور واضح احکامات پہنچ جانے کے بعد نفسانی خواہشات (Desires) اور باطل گمانوں و وہم پرستی (Hypotheses) کی پیروی شروع کر دی، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ بندی نے ان کے دین کو پارہ پارہ کر دیا، اور وہ سب کے سب اللہ کے عذاب کی گرفت میں آ گئے۔

آج افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام پر حملے باہر سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے اندر سے ہو رہے ہیں۔ فرائض اور واجبات پر عمل صرف عام مسلمانوں ہی میں کمزور نہیں پڑ رہا بلکہ وہ طبقہ بھی کوتاہی کا شکار ہے جسے دین کا نگہبان اور رہنما ہونا چاہیے۔

نماز اور روزے کے ترک کا تذکرہ تو الگ رہا، یہاں تک کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ کھلے شرک اور کفر کی گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ فسق و فجور جس تیزی سے پھیل رہا ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ معاملہ صرف دین سے غفلت تک محدود نہیں رہا بلکہ اب تو دین کا مذاق اڑانا بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ دراصل قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق دعوت و تبلیغ اور اجتماعی اصلاح کے فریضے سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران میں واضح فرمایا، جہاں امتِ مسلمہ کو بہترین امت قرار دینے کی بنیادی وجہ بیان کی گئی: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، اس لیے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)

استطاعت کے مطابق دعوت

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پوری امت پر عائد ہے، اور دیگر امتوں پر امتِ مسلمہ کی فضیلت کی اصل بنیاد بھی یہی ذمہ داری ہے۔ اسی مضمون کو سورۃ العصر میں نہایت جامع اور فیصلہ کن انداز میں بیان فرمایا گیا ہے: إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

یعنی آخرت کے گھاٹے اور خسارے سے صرف وہی لوگ محفوظ ہیں جو خود ایمان اور عملِ صالح کے پابند ہوں، اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی حق کی تلقین اور صبر کی نصیحت کرتے رہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی اصلاح کافی نہیں، بلکہ دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری بھی ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت تنبیہ

● نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں بھی اس فریضے کی سخت تاکید بار بار ملتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائی سے روکتے رہو گے، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنا عذاب نازل کر دے، پھر تم دعا کرو گے تو وہ قبول نہ کی جائے گی''۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر:۲۱۶۹)

● ایک دوسری مشہور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصلاحِ معاشرہ کے درجات کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو ہوتا ہوا دیکھے، اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ (طاقت) سے اسے روک دے؛ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے؛ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم دل میں اسے برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وجوب

ان تمام آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' ہر مسلمان پر اس کی استطاعت، قدرت اور حالات کے مطابق لازم اور واجب ہے۔ البتہ اس وجوب میں تفصیل ہے، جسے حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی مشہور تفسیر معارف القرآن میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ جن اعمال کا کرنا واجب ہے، ان میں دوسروں کو ترغیب دینا بھی واجب ہے، اور جن امور سے بچنا حرام ہے، ان سے روکنا بھی واجب ہے۔

اسی طرح جو اعمال مستحب ہیں، ان کی تلقین بھی مستحب ہے۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز فرض ہے، لہٰذا جو شخص نماز چھوڑتا ہو، اسے نصیحت کرنا واجب ہوگا۔ جبکہ نوافل چونکہ مستحب ہیں، اس لیے ان کی ترغیب بھی مستحب کے درجے میں آئے گی۔

اس ضمن میں ایک نہایت اہم ادبی اور اخلاقی اصول بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ مستحبات کے معاملے میں نرمی اختیار کی جائے، جبکہ واجبات میں ابتدا نرمی سے ہو، لیکن اگر نصیحت کے باوجود اعراض کیا جائے تو بقدرِ ضرورت سختی کی بھی

گنجائش ہے۔افسوس کہ آج کا المیہ یہ ہے کہ لوگ مستحبات بلکہ بعض اوقات مباح امور میں بھی سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں،مگر فرائض اور واجبات کے ترک پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔حالانکہ ہر شخص کی قدرت اور ذمہ داری الگ الگ ہوتی ہے۔

علم کے بغیر امر بالمعروف

'امر بالمعروف' کی پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ جس شخص نے یہ فریضہ انجام دینا ہے،اسے معروف اور منکر کی صحیح پہچان حاصل ہو۔جو شخص خود شریعت کے احکام سے ناواقف ہو، یا صحیح علم نہ رکھتا ہو،اگر وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دینے یا برائی سے روکنے لگے تو اصلاح کے بجائے فساد کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ایسا شخص ممکن ہے اپنی نادانی میں کسی معروف کو منع کر دے یا کسی منکر کا حکم دینے لگے۔

اس لئے جسے معروف ومنکر کا علم حاصل نہیں،اس پر پہلا فرض یہ ہے کہ وہ علمِ شریعت حاصل کرے،قرآن و سنت کے احکام سمجھے،اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔جب تک اسے صحیح واقفیت حاصل نہ ہو،اس خدمت کے لیے آگے بڑھنا درست نہیں۔

آج کے دور میں یہ صورتِ حال عام ہو چکی ہے کہ بہت سے نادان لوگ تقریر کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ قرآن کا علم، نہ حدیث کی سمجھ۔اسی طرح بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں پر جھگڑنے لگتے ہیں: ''یہ کرو، وہ نہ کرو''۔یہ طرزِ عمل معاشرے کی اصلاح کے بجائے بگاڑ، انتشار اور اختلاف کا سبب بنتا ہے۔

امر بالمعروف کی قدرت

'امر بالمعروف' کی قدرت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان کو ناقابلِ برداشت نقصان کا غالب اندیشہ نہ ہو۔اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت حکمت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ:

''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے،اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے روکے؛اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے؛اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل میں اسے برا جانے،اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے''۔
(صحیح مسلم،حدیث نمبر:۴۹)

یہاں ''زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونا'' اس معنیٰ میں نہیں کہ زبان بولنے سے معذور ہو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر حق بات کہنے کی صورت میں جان جانے،شدید نقصان یا بڑا فتنہ پیدا ہونے کا قوی خطرہ ہو۔ایسی حالت میں انسان کو شرعاً غیر قادر سمجھا جائے گا،اور اس پر ترکِ امر بالمعروف کا گناہ نہیں ہوگا۔

البتہ یہ ایک اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے کہ کوئی شخص اللہ کی رضا کے لیے جان و مال کی پروا کیے بغیر بھی حق کہتا

رہے، جیسا کہ صحابہ، تابعین اور ائمۂ اسلام کے بے شمار واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس عظیم قربانی کے سبب ان کے درجات دنیا و آخرت میں بلند ہوئے، لیکن یہ ہر شخص پر فرض نہیں۔

منکر سامنے ہو تو ذمہ داری

مثلاً کوئی شخص دیکھے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے، تو اس پر لازم ہوگا کہ اپنی قدرت کے مطابق اسے روکے۔ لیکن اگر یہ سب اس کے سامنے نہیں ہو رہا تو اب یہ ذمہ داری اسلامی حکومت کی ہے کہ وہ تحقیق کرے، جرم ثابت کرے اور سزا دے۔

امر بالمعروف کے دو درجے

پہلا درجہ: یہ کہ امت کا ہر فرد اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق اس فریضے کو ادا کرے۔

دوسرا درجہ: یہ کہ مسلمانوں میں سے ایک خاص جماعت ایسی ہو جو مستقل طور پر دعوت، تبلیغ اور اشاعتِ دین کے کام میں مشغول رہے۔ اسی جماعت کا ذکر ان آیات کی تفسیر میں آیا ہے، جن کے تین بنیادی کام بتائے گئے ہیں:

دعوت اِلی الخیر (بھلائی کی دعوت)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود وضاحت فرمائی ہے کہ 'خیر' سے مراد قرآن اور میری سنت کی اطاعت ہے۔ دعوت اِلی الخیر کا کام ہر وقت جاری رہتا ہے، چاہے متعلقہ وقت قریب ہو یا دور۔ مثلاً رمضان یا حج کا زمانہ ابھی نہ آیا ہو، تب بھی لوگوں کو پہلے سے آگاہ کیا جاتا رہے کہ رمضان میں روزہ فرض ہوگا اور صاحبِ استطاعت پر حج فرض ہوگا۔ دعوت اِلی الخیر کے دو درجے ہیں:

(۱) غیر مسلموں کو دعوت پہلا اور اہم درجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے قول سے، تحریر سے اور عملی کردار کے ذریعے۔ (۲) مسلمانوں کو دعوت دوسرا درجہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو دعوت کا پر عمل کی طرف بلایا جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وضاحت

معروف: وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

منکر: وہ تمام برائیاں، گناہ اور مفاسد جنہیں اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔

صحابہؓ: اس جماعت کا اولین نمونہ

اس عظیم فریضے کی سب سے پہلی اور کامل مثال صحابۂ کرامؓ ہیں، جنہوں نے دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ چند ہی برسوں میں انہوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، روم وایران کی سلطنتوں کو زوال پذیر کیا، اور انسانیت کو اخلاق، عدل اور پاکیزگی کا درس دیا۔

فرقہ بندی سے سخت تنبیہ

اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی صفات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو سختی سے متنبہ فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کی طرح اختلاف اور تفرقہ میں مبتلا نہ ہونا۔ انہوں نے واضح احکام ملنے کے بعد نفس کی پیروی کی، آپسی جھگڑوں میں پڑے، اور اسی سبب عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ افسوس کہ آج مسلمانوں میں بھی درجنوں فرقے پیدا ہو چکے ہیں، جو شریعتِ اسلامیہ کے صاف احکام سے ہٹ کر اپنی تباہی اور آخرت کے عذاب کا سامان کر رہے ہیں۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلے اہلِ کتاب بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک جنت میں جائے گا''۔ **(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۴۵۹۷ جامع ترمذی، حدیث: ۲۶۴۱)**

خلاصہ یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر محض ایک نعرہ نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کی روح، اس کی پہچان اور اس کی بقا کا ضامن ہے۔ علم، حکمت، اخلاص اور اعتدال کے ساتھ اس فریضے کی ادائیگی ہی امت کو انتشار اور زوال سے بچا سکتی ہے۔

آیت نمبر (۱۰۶) يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ: ''جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ان سے کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کیا تھا؟ تو اب چکھو عذاب، اس کفر کے بدلے جو تم کرتے تھے''۔

اچھے اور برے اعمال کا بدلہ

تفسیر قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ نیکی اور بدی، ایمان اور کفر، جنت اور دوزخ کو ساتھ ساتھ بیان کرتا ہے، تاکہ ہر صاحبِ عقل پر حقیقت پوری طرح روشن ہو جائے۔ اس لیے کہ کسی چیز کی اصل قدر و قیمت اُس کے مقابل سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ نیکی کی عظمت اسی وقت دل میں جاگزیں ہوتی ہے جب بدی کے انجام کو سامنے رکھا جائے۔ سفیدی کی چمک اُس وقت نمایاں ہوتی ہے جب سیاہی بھی نگاہ میں ہو۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر قرآنِ پاک میں

اکثر مقامات پر دونوں پہلو ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اُس روز (قیامت کے دن) کچھ چہرے روشن اور سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ اور تاریک۔ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا: کیا تم ایمان لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہو گئے تھے؟ پس اب اپنے کفر کی سزا چکھو۔ اور جن کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔ (سورہ آلِ عمران:۱۰۶-۱۰۷)

اعمال کی دائمی حیثیت

یہ حقیقت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی کے اعمال کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ وہ وقتی اور عارضی نہیں بلکہ دائمی اثر رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر عمل محفوظ رہتا ہے۔ قیامت کے دن جب تمام انسان میدانِ حشر میں جمع ہوں گے تو دنیا کی پوری زندگی اور اُس کے اعمال نہ صرف نامۂ اعمال میں ظاہر ہوں گے بلکہ انسان کے چہرے پر بھی اُن کے اثرات نمایاں ہوں گے، تاکہ ہر شخص مومن و کافر، نیک و بد کو اُن کے چہروں سے پہچان سکے۔

جن لوگوں نے دنیا میں ایمان اور عملِ صالح کی زندگی گزاری ہوگی، اُن کے چہروں پر ایمان و تقویٰ کا نور جھلک رہا ہوگا۔ اُن کے چہرے سفید، روشن اور تابناک ہوں گے۔ وہ عزت، وقار اور سرور کی کیفیت میں ہوں گے، خوشی اور اطمینان اُن کے ظاہر و باطن سے نمایاں ہوگا۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے دنیا میں کفر و شرک، نفاق، فسق و فجور اور گناہوں کی زندگی اختیار کی، اُن کے چہرے سیاہی میں ڈوبے ہوں گے۔ کفر اور بداعمالی کا اثر اُن کے چہروں سے عیاں ہوگا۔ گویا قیامت کے دن ہر چہرہ اُس کے باطن کا آئینہ ہوگا۔

شرمندگی اور رسوائی کا لمحہ

جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، اُن سے نہایت سخت سوال کیا جائے گا: أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (کیا تم ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف لوٹ گئے تھے؟)

یہ سوال دراصل اُن کی سرزنش اور رسوائی کے لیے ہوگا۔ اُس وقت اُن کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ شرم و ندامت سے سر جھک جائیں گے، حسرت اور پشیمانی میں ڈوبے ہوں گے۔ پھر جب عذاب کا فیصلہ سنا دیا جائے گا تو وہ اپنے کفر کے بدلے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے ذلت، خواری اور دائمی محرومی کے ساتھ۔

اور دوسری طرف وہ لوگ جن کے چہرے نورانی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں جنت میں داخل

کئے جائیں گے، جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے نہ وہاں کوئی خوف ہوگا، نہ غم، نہ محرومی۔

ایمان کے بعد کفر

اس مقام پر مفسرین نے آیت کے اس جملے کی نہایت اہم تشریح بیان کی ہے: أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے''؟ یہ سوال کن لوگوں سے ہوگا؟ اس بارے میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ خطاب مختلف طبقات کو شامل ہوسکتا ہے۔

ان کے مطابق یہ الفاظ مرتدین، منافقین، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)، عام کفار اور حتیٰ کہ فساق و فجار سب کے لئے ہو سکتے ہیں البتہ ہر ایک کے اعتبار سے اس کا مفہوم الگ الگ ہوگا۔

مرتد وہ ہے جو ایمان لانے کے بعد صریح طور پر کفر اختیار کر لے۔ منافق وہ ہے جو زبان سے ایمان کا اقرار کرے مگر دل میں کفر چھپائے رکھے۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتابوں پر ایمان کے دعوے دار ہیں، اور اس ایمان کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی کتابوں میں دی گئی آخری نبی ﷺ کی بشارتوں کو تسلیم کرتے اور ان کی ہدایت کے مطابق حضرت محمد ﷺ پر ایمان لاتے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر انکار پر جمے رہے گویا اپنے نبیوں اور کتابوں پر ایمان کے دعوے کے باوجود عملاً کفر ہی پر قائم رہے۔

کافروں جیسے اعمال

اگر یہ خطاب فساق کے حق میں سمجھا جائے جن کا بنیادی عقیدہ درست تھا تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ: تم نے ایمان لانے کے بعد کافروں جیسے اعمال کیوں اختیار کیے؟ یعنی یہاں اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر مراد ہوگا۔ اور اگر یہ خطاب عام کفار کے حق میں مانا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرتِ ایمانی پر پیدا فرمایا تھا؛ پھر تم نے اس فطری ایمان کو ضائع کر کے کفر کا راستہ کیوں اختیار کیا؟

فیصلہ کن سوال اور انجام

بہر حال، قیامت کے دن جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے، ان سب سے یہ سوال ضرور کیا جائے گا کہ: تم ایمان پا لینے کے بعد کفر کی طرف کیوں لوٹے؟ اُس وقت وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ شرمندگی، ندامت اور ذلت ان پر طاری ہوگی۔ پھر ان کے بارے میں یہ حکم صادر ہوگا: فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ''اب عذاب چکھو، اس کفر کے بدلے جو تم کرتے رہے تھے''۔ چنانچہ انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا یہی ان کے اعمال کا منطقی اور عادلانہ انجام ہوگا۔

ایمان وتقویٰ والوں کا انعام

ان بدبختوں کے انجام کو بیان کرنے کے بعد قرآنِ کریم ان خوش نصیبوں کا حال بیان کرتا ہے جن کے چہرے قیامت کے دن ایمان اور تقویٰ کے نور سے روشن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا اور یہاں رحمت سے مراد جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ وہاں نہ موت ہوگی، نہ فنا، نہ نعمتوں کا زوال، اور نہ کبھی وہاں سے نکالا جانا۔ یہ سفید اور روشن چہرے والے وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں دینِ اسلام کو دل وجان سے قبول کیا، اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا سچا اور آخری رسول مانا، قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا دستور بنایا، اور اللہ کے احکام کے مطابق اپنی پوری زندگی بسر کی۔

آیت نمبر (۱۰۷) وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: ''اور جن کے چہرے روشن ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

تفسیر آیتِ کریمہ میں جب سفید اور روشن چہروں والوں کے بارے میں فرمایا گیا: فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (پس وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے)

رحمت الٰہی سے مراد

تو مفسرینِ کرام نے متفقہ طور پر یہاں 'رحمتِ الٰہی' سے مراد جنت لی ہے۔ جنت کو لفظِ رحمت سے تعبیر کرنے میں نہایت گہرا اور لطیف اشارہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ بندۂ مومن خواہ ساری عمر عبادتِ الٰہی میں گزار دے، اور ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے، تب بھی آخرت میں جو عظیم انعام اسے نصیب ہوگا، وہ اس کے اعمال کے زور پر نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل سے ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کرنا انسان کا کوئی ذاتی یا ذاتی کمال نہیں، بلکہ عبادت کی توفیق، طاقت، صحت، عقل اور مہلت سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔ جب عبادت کا امکان اور قدرت بھی اللہ کی بخشش ہو، تو پھر عبادت کے بدلے جنت کو انسان کا حقِ لازمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ جنت میں داخلہ اعمال کے استحقاق سے نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سے ہوگا۔ اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟ فرمایا: ''میں بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لے''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۶۷۳ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۱۶)

یہ حدیث اس قرآنی حقیقت کی واضح تائید کرتی ہے کہ نجات اور کامیابی کا اصل مدار اللہ کے فضل وکرم پر ہے، نہ کہ صرف اعمال پر۔

عدلِ الٰہی کا مظہر

اس کے بعد قرآنِ کریم نے دونوں گروہوں نیک و بد، مومن و کافر، متقی و فاسق بی کا انجام بیان کر کے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ یہ جزاوسزا نہ تو بے بنیاد ہے اور نہ ہی ظلم پر مبنی، بلکہ عین عدل وانصاف کے مطابق ہے۔ ہر شخص کو اس کے ایمان، عقیدے اور عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا، تاکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کا پورا ہونا، اس کی حکمت اور اس کے عدل کا ظہور پوری طرح ثابت ہوجائے۔ اس طرح قرآن یہ پیغام دیتا ہے کہ نجات کا راستہ ایمان، اطاعت اور عاجزی کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار بننا ہے، اور ہلاکت کا راستہ کفر، سرکشی اور غرورِ عمل ہے۔

آیت نمبر (۱۰۸) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: ''یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انہیں تم پر حق کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں، اور اللہ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا''۔

آخرت کا عذاب

تفسیر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ سب اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں حق کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اس اعلانِ ربانی سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر کسی قسم کا ظلم نہیں چاہتا۔ جس شخص کے لیے جو بدلہ مقرر کیا گیا ہے، وہ سراسر عدل، کامل حکمت اور مکمل انصاف پر مبنی ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے، اور آخر کار تمام مخلوق کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اُس دن نہ کوئی دوسرا مالک ہوگا، نہ کوئی شریکِ اقتدار، اور نہ کوئی ایسا اختیار رکھنے والا جو اللہ کے فیصلے کو بدل سکے۔

اس آیت میں بندوں کو صاف طور پر متنبہ کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کی جزاوسزا کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہے میں مبتلا نہ ہوں، جیسا کہ آج بعض بے دین لوگ استہزا کے انداز میں کہہ دیتے ہیں کہ ''ہم تو دنیا میں آرام سے جی رہے ہیں، آخرت کا کیا پتہ!'' بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، لیکن اس نے اپنی رحمت سے تمہیں بھی

پہلے ہی آگاہ کر دیا ہے کہ یہ سب امور حق، یقینی اور سچے ہیں، جن کی خبر اس نے اپنے سچے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دے دی ہے۔ لہٰذا جو جزا و سزا بیان کی جارہی ہے، وہ لازماً واقع ہو کر رہے گی، اس میں کوئی شک، کوئی تاخیر اور کوئی تبدیلی نہیں۔

پھر مزید وضاحت فرما دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فیصلہ، ہر حکم اور ہر بدلہ حکمت، مصلحت اور انصاف کے عین مطابق ہوگا۔ نہ کسی نیک کے ساتھ ناانصافی ہوگی، نہ کسی بدکار پر بلا وجہ ظلم۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کو بغیر جرم کے سزا دے دے، یا کسی کے نیک اعمال کا بدلہ نہ دے، تو اسے اس کا پورا حق اور کامل اختیار حاصل ہے؛ کیونکہ وہی حقیقی مالک ہے، وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ لیکن اس کی شانِ رحمت اور اس کا وعدۂ عدل یہ ہے کہ وہ خود اپنے بندوں پر ظلم کو حرام کر چکا ہے، اور اپنے فضل و انصاف کے مطابق ہی فیصلے فرماتا ہے۔

آیت نمبر (۱۰۹) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: ''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے''۔

حقیقی مالک

یعنی زمین و آسمان اور پوری کائنات کی ہر شے اسی کی ملکیت ہے۔ وہی حقیقی خالق، وہی مالکِ مطلق اور وہی مدبرِ کائنات ہے۔ جب ساری مخلوق اور ساری کائنات اسی کی ملک ہو، تو ظاہر ہے کہ مالک کو اپنی ملک میں ہر طرح کا تصرف کرنے اور حکم جاری کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوقات پر مکمل اختیار اور حاکمیت حاصل ہے، اور اس کے حکم کے سامنے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ پھر فرمایا: وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ''اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

یعنی آخر کار ہر مقدمہ، ہر فیصلہ اور ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوگا۔ قیامت کے دن وہی واحد حاکم ہوگا، کوئی دوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا۔ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہیں، نہ کوئی اس کے حکم کو چیلنج کر سکتا ہے۔

اسی لئے وہ اکیلا ہی تمام اختیارات کا مالک ہے۔ البتہ وہ ظالم حاکم نہیں بلکہ عادل اور حکیم ہے۔ وہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے اور ہر شئے پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ اس کے فیصلے نہ جذبات پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کسی ناانصافی پر، بلکہ سراسر

عدل اور حکمت پر قائم ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور جنہیں عذاب دیا جائے گا، وہ اسی کے مستحق ہوں گے۔ اور جن کے چہرے روشن اور نورانی ہوں گے اور جنہیں انعام واکرام سے نوازا جائے گا، وہ بھی اسی کے اہل ہوں گے۔ ہر شخص کو اس کے ایمان اور عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

اس رکوع کے آغاز میں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ''اے ایمان والو!'' تو اس خطاب کے ذریعے مسلمانوں کو دین وایمان پر ثابت قدم رہنے، تقویٰ اختیار کرنے، اور مسلسل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

اب اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے امتِ محمدیہ کو دوبارہ مخاطب کیا جارہا ہے اور انہیں یاد دلایا جارہا ہے کہ وہ محض ایک عام جماعت نہیں بلکہ بہترین امت ہیں بشرطیکہ وہ اپنے منصب اور ذمہ داری کو پہچانیں اور اس پر قائم رہیں۔ یہ فضیلت کسی نسلی یا قومی امتیاز کی بنا پر نہیں، بلکہ ایمان، تقویٰ، اصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کی عملی ذمہ داری نبھانے کی وجہ سے ہے۔ اگر امت اس منصب کو سنبھالے رکھے تو عزت وسربلندی اس کا مقدر ہے، اور اگر غفلت اختیار کرے تو زوال بھی اس کے لئے بعید نہیں۔

آیت نمبر (۱۱۰) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: ''تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان میں کچھ ایمان والے ہیں، مگر اکثر نافرمان ہیں''۔

امتِ مسلمہ کی فضیلت اور اس کی بنیاد

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو براہِ راست مخاطب کر کے اس کی فضیلت، برتری اور امتیازی شان کی اصل وجہ بیان فرمائی ہے۔ یہ فضیلت کسی نسلی امتیاز یا محض نسبت کی بنا پر نہیں، بلکہ اس خاص صفت کی وجہ سے ہے جسے قرآن نے نمایاں کیا یعنی 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر'۔

اس بیان میں ایک طرف اہلِ اسلام کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس وصفِ خاص پر قائم رہیں اور ان کی پہچان یہی بنی رہے؛ اور دوسری طرف اہلِ کتاب کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اس دین کو قبول کر کے اس امت میں شامل

ہوجائیں، جسے تمام امتوں پر افضلیت کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔

امتِ محمدیہ اور خیرِ امت

اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں خبر دی کہ امتِ محمدیہ تمام امتوں سے بہتر ہے اور اسے 'خیرِ امت' کا لقب عطا فرمایا گیا۔ مسلمانوں کا اشرفُ الناس اور امتِ محمدیہ کا اشرفُ الامم ہونا قرآنِ مجید کے مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے اور متعدد احادیثِ مبارکہ میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تم بہترین لوگ ہو جو لوگوں کے لئے بہتر بنائے گئے ہو؛ (یعنی ان کی بھلائی اور ہدایت کی فکر کرتے ہو) تم انہیں گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو اور وہ اسلام میں داخل ہوجاتے ہیں''، یعنی تمہاری کوششوں کے نتیجے میں وہ جہنم کے دائمی عذاب سے بچ کر جنت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ **(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۵۵۷)**

افضلیت کی اصل دلیل

اس امت کی برتری کی سب سے بڑی دلیل اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت ہے۔ جس طرح آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مخلوق میں افضل ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت بھی دیگر امتوں سے افضل قرار دی گئی۔ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کی خبر سابقہ انبیاء علیہم السلام کو دے دی گئی تھی، اسی طرح آپ کی امت کی فضیلت کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ قرآنِ کریم نے اس امت کو خیر الامم قرار دے کر اس کی افضلیت کی تین بنیادی صفات بھی واضح فرمادیں۔

ایمان باللہ سے پہلے امر بالمعروف کا ذکر

مفسرینِ کرام نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ اس آیت میں 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا ذکر 'ایمان باللہ' سے پہلے فرمایا گیا، حالانکہ ایمان تمام اعمال کی بنیاد اور اصل ہے، اور بغیر ایمان کے کوئی عمل قابلِ قبول نہیں۔ اس ترتیب کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایمان تو سابقہ امتوں میں بھی موجود تھا؛ وہ بھی اپنے اپنے انبیاء پر ایمان رکھتی تھیں۔ لیکن وہ امتیازی وصف جس کی بنا پر امتِ محمدیہ کو تمام امتوں پر فضیلت عطا کی گئی، وہ یہی ہے کہ اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنے اجتماعی نظام اور عملی زندگی کا شعار بنایا۔

چونکہ بغیر ایمان کے کوئی نیکی معتبر نہیں، اس لیے ایمان کا ذکر بھی ساتھ کر دیا گیا، لیکن اس مقام پر اصل مقصود اس خاص وصف کو نمایاں کرنا تھا، اسی لیے اسے مقدم رکھا گیا۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کو چاہیے کہ ان صفات کو محض نظری طور پر

نہ اپنائے بلکہ عملاً ان پر مضبوطی سے قائم رہے۔

حضرت عمرؓ کی تنبیہ

حضرت عمر بن خطاب نے اپنے سفرِ حج میں اس آیت کی تلاوت فرما کر لوگوں سے فرمایا: ''اگر تم چاہتے ہو کہ اس آیت کے مصداق میں شامل ہو جاؤ تو اپنے اندر یہ صفات پیدا کرو اور ان شرائط کو پورا کرو یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنالو''۔ یہ ارشاد اس بات کی واضح تنبیہ ہے کہ خیرِ امت کا اعزاز دعوے سے نہیں بلکہ عمل سے حاصل ہوتا ہے۔

ایمان باللہ کا مفہوم

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی تمام باتوں کو سچ مانا جائے۔ اگر کسی شخص نے دین کی کسی ثابت شدہ بات کا انکار کر دیا تو اس کا ایمان اللہ پر بھی معتبر نہیں رہتا۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ امتِ محمدیہ، بحیثیت بہترین امت، اس مقصد کے لئے برپا کی گئی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ عقائد ہوں، عبادات ہوں، معاملات ہوں، سماجی اور سیاسی نظام ہو، ہر جگہ نیکی کو فروغ دے اور برائی کو روکے۔

اسی امت کو خبردار کیا گیا ہے کہ دنیا میں نظامِ حق کو قائم رکھنے اور اسے چلانے کے لئے شریعت کی پابندی لازم ہے، اور کوئی قدم اس کے خلاف نہ اٹھایا جائے۔

امت کا معیار

آیت میں اگرچہ خطاب بظاہر صحابۂ کرامؓ سے ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ کسی جماعت کے بارے میں فیصلہ اس کے اکثر افراد کی حالت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، نہ کہ چند افراد کے عمل کو بنیاد بنا کر۔ اسی تناظر میں ایک حدیث درج ہے۔

امت کا زوال

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق ہو جائیں گے اور تمہاری عورتیں سرکش ہو جائیں گی؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں، اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا''۔

پھر فرمایا: ''اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کا حکم دینا چھوڑ دو گے اور برائی سے روکنا ترک کر دو گے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: کیا ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں، اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا''۔ پھر فرمایا: ''اس وقت

تمہارا کیا حال ہوگا جب تم برائی کا حکم دینے لگو گے اور نیکی سے منع کرنے لگو گے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: کیا ایسا بھی ہو جائے گا؟ فرمایا: ''ہاں، اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا''۔ پھر فرمایا: ''اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کو برا اور برائی کو اچھا سمجھنے لگو گے؟''۔ **(مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۱۲۲۱۰)**

برائی کو اچھا سمجھنا

اس حدیث کے آخری الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ کسی برے کام کا ارتکاب کرنا ایک گناہ ہے، لیکن اس گناہ کو اچھا سمجھنا اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ شریعت کی رو سے اگر کوئی شخص گناہ کرتے ہوئے اسے گناہ ہی سمجھتا رہے تو اس میں توبہ کی گنجائش باقی ہے؛ لیکن اگر وہ برائی کو اچھا اور نیکی کو برا سمجھنے لگے تو یہ عقیدے کی خرابی ہے، اور عقیدے کی خرابی ہمیشہ عملی خرابی سے زیادہ سنگین ہوتی ہے۔

انسان بڑے سے بڑا گناہ کرلے، وہ لازماً کفر نہیں بنتا؛ لیکن دین کی کسی ثابت شدہ اور ضروری بات کا مذاق اڑانا یا انکار کردینا انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کردیتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

اہلِ کتاب کے لئے دعوت

آیت کے آخر میں اہلِ کتاب کو بھی یہ پیغام دیا گیا کہ اگر وہ آخری نبی ﷺ، آخری کتاب اور آخری شریعت پر ایمان لے آئیں اور اس نبیِ برحق کی تصدیق کریں جس کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں پاتے ہیں تو وہ بھی خیر الامم میں شامل ہوسکتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ بعض اہلِ کتاب نے حق قبول کیا، جیسے یہود میں سے عبداللہ بن سلام، اور عیسائیوں میں نجاشی (شاہِ حبشہ) اور عدی بن حاتم وغیرہ۔ انہوں نے حق کو پہچانا اور امتِ مسلمہ میں شامل ہوکر کامیابی حاصل کی۔ مگر اکثر لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔

خیرِ امت کا مفہوم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اس آیت: ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی'' کا مطلب یہ ہے کہ تم بہترین لوگ ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے برپا کیے گئے ہو؛ تم انہیں اس حال میں لاتے ہو کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیتے ہیں (اور اسلام قبول کرتے ہی وہ طوق اتر جاتے ہیں) **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۵۷)**

نہی عن المنکر کا عملی درجہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے ہاتھ سے روکے؛ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے؛ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں اسے برا جانے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۴۹)**

امتِ محمدیہ کی ذمہ داری

''خیرِ امت'' کا یہ مقام امتِ محمدیہ کے لیے صرف فضیلت اور اعزاز ہی نہیں بلکہ ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو انسانیت کی خیر خواہی، بھلائی اور ہدایت کے لیے برپا کیا ہے؛ چنانچہ اس کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دوسروں تک اللہ کا پیغام حکمت، خیر خواہی اور حسنِ اخلاق کے ساتھ پہنچائے، نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔

قرآن مجید نے خیرِ امت کی خصوصیت ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے دعوتِ دین صرف علماء اور مبلغین کا کام نہیں، بلکہ ہر مسلمان اپنی استطاعت، علم اور دائرۂ کار کے مطابق اس ذمہ داری میں شریک ہے۔ البتہ دعوت کا طریقہ جبر و اکراہ نہیں، بلکہ حکمت، عمدہ نصیحت اور اچھے کردار کے ذریعے حق کو واضح کرنا ہے، تاکہ انسان اپنی رضا و اختیار سے ہدایت کی راہ اختیار کرے۔

خلاصہ یہ کہ امتِ محمدیہ کی فضیلت اس کے منصب سے وابستہ ہے۔ ایمان، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ تینوں صفات اس کی شناخت ہیں۔ اگر یہ صفات زندہ رہیں تو خیرِ امت کا اعزاز باقی رہے گا، اور اگر یہ ماند پڑ گئیں تو محض نام باقی رہ جائے گا۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۱۱ سے ۱۱۷ تک

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ:

(۱۱۱) وہ تمہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف ہی دے سکتے ہیں، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اگر تم سے لڑیں گے بھی، تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ (۱۱۲) ان پر ذلت مسلط کر دی گئی ہے جہاں بھی ہوں، سوائے اس کے کہ اللہ یا کسی انسان کی پناہ میں ہوں۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوئے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (۱۱۳) سب اہل کتاب یکساں نہیں، ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ (۱۱۴) وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں، یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ (۱۱۵) اور جو نیکی بھی وہ کریں گے، اسے کبھی ضائع نہیں کیا جائے گا، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ (۱۱۶) یقیناً جنہوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال اور نہ ان کی اولاد انہیں اللہ سے کچھ بھی بچا سکے گی۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱۱۷) ان کی مثال اس کھیتی جیسی ہے جسے ایک تیز، سخت سردی والی ہوا نے برباد کر دیا، کیونکہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۱۱ سے ۱۱۷ تک

آیت نمبر (۱۱۱) لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمہ: ''وہ تمہیں زیادہ سے زیادہ تکلیف ہی دے سکتے ہیں، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اگر تم سے لڑیں گے بھی، تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی''۔

تفسیر پچھلی آیات میں امتِ مسلمہ کی فضیلت کو واضح کیا گیا تھا کہ یہ امت اپنی دینی بصیرت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کی بنا پر دیگر امتوں سے ممتاز ہے۔ اسی تسلسل میں زیرِ نظر آیات میں مسلمانوں کو تسلی اور اطمینان دلایا گیا ہے اور ایک واضح پیشین گوئی بیان فرمائی گئی ہے۔

اللہ کی مدد کا وعدہ

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ مدینہ کے یہود، خواہ کتنے ہی سخت مخالف اور معاند کیوں نہ ہوں، وہ مسلمانوں کو حقیقی اور فیصلہ کن نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ اگر ایذا رسانی کریں گے تو زیادہ سے زیادہ زبان درازی، طعن و تشنیع اور زبانی پروپیگنڈے تک محدود رہیں گے۔ ان کی سازشیں، مخالفتیں اور اشتعال انگیز باتیں وقتی اذیت کا باعث تو بن سکتی ہیں، مگر وہ مسلمانوں کے دینی و اجتماعی وجود کو متزلزل نہیں کر سکتیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہے:

''وہ اہلِ کتاب تمہیں ہرگز کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، سوائے اس کے کہ کچھ ایذا دیں (یعنی زبانی اذیت اور دل آزاری کریں)، اور اگر وہ تم سے لڑائی کریں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر ان کی کہیں سے مدد نہ کی جائے گی''۔

یہ قرآنی پیشین گوئی تاریخ کے آئینے میں پوری طرح جلوہ گر ہوئی۔ عہدِ نبوی میں جب بھی یہود نے مسلمانوں کے خلاف سازش یا جنگ کا راستہ اختیار کیا، آخرکار انہیں شکست اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی وہ معاہدہ شکنی کے بعد جلاوطن کیے گئے، کبھی ان پر جزیہ عائد کیا گیا، اور بعض مواقع پر بغاوت اور کھلی دشمنی کے نتیجے میں ان کے خلاف سخت اقدام کیا گیا۔ لیکن کسی مرحلے پر بھی وہ اسلامی جماعت پر غالب نہ آ سکے۔ یوں ان آیات میں ایک طرف امتِ مسلمہ کو حوصلہ اور اعتماد عطا کیا گیا، اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ باطل کی قوتیں خواہ کتنی ہی منظم اور پرجوش نظر آئیں، اگر اہلِ ایمان استقامت اور تقویٰ پر قائم رہیں تو بالآخر غلبہ انہی کا مقدر ہوتا ہے۔

آیت نمبر (۱۱۲) ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: ''ان پر ذلت مسلط کر دی گئی ہے جہاں بھی ہوں، سوائے اس کے کہ اللہ یا کسی انسان کی پناہ میں ہوں۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوئے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے''۔

یہود پر ذلت ومسکنت

تفسیر اس پیشین گوئی کے بعد قرآنِ مجید میں بنی اسرائیل کے ایک مخصوص طرزِ عمل اور اس کے نتیجے میں اُن پر آنے والی ذلت ورسوائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہے کہ اس قوم پر ذلت وخواری اور محتاجی مسلط کر دی گئی، اور دنیا میں جہاں کہیں بھی وہ پائے گئے، اُن پر بے اعتباری اور بے وقعتی کی کیفیت طاری رہی۔ ان کی جان و مال کو وہ استحکام اور وقار حاصل نہ ہو سکا جو اطاعتِ الٰہی اور سچائی کی بنیاد پر قائم اقوام کو نصیب ہوتا ہے۔

البتہ قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ان کے لیے دو راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے انہیں امن وتحفظ حاصل ہو سکتا ہے: ایک ''بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ'' یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا اس سے مراد عہدِ الٰہی کی پاسداری، ایمان، اور احکامِ خداوندی کی اطاعت ہے۔

دوسرا ''وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ'' یعنی لوگوں کے ساتھ معاہدہ اور تعلق کے ذریعے امن حاصل کرنا یعنی کسی مضبوط معاشرتی یا سیاسی معاہدے کی پناہ میں آ جانا۔ اس کے بعد یہ بیان کیا گیا کہ وہ اللہ کے غضب کے مستحق بنے، اور اُن پر ذلت ومسکنت لازم کر دی گئی۔

اس انجام کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اس کے احکام سے روگردانی کرتے تھے، اور بعض انبیائے کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کرنے جیسے سنگین جرائم کے مرتکب ہوتے رہے۔ قرآنِ حکیم دوسری جگہ اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ وہ ''اللہ کی آیات کا انکار کرتے اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے''۔ **(آلِ عمران: ۱۱۲)**

یہ طرزِ عمل محض فکری انحراف نہ تھا بلکہ سرکشی، تکبر اور مسلسل نافرمانی کا اظہار تھا۔ احادیثِ مبارکہ میں بھی

انبیائے بنی اسرائیل کی تکذیب اور اذیت رسانی کا ذکر ملتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں انبیاء علیہم السلام کی بڑی تعداد مبعوث ہوئی، اور ایک نبی کے بعد دوسرے نبی آتے رہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۵۵؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۴۲)

لیکن ان میں سے بعض کو ان کی اپنی قوم کی طرف سے سخت اذیتیں دی گئیں، حتیٰ کہ قتل تک کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ ذلت اور غضب کسی نسلی بنیاد پر نہیں، بلکہ ان کے اعمال، انکارِ حق، اور مسلسل نافرمانی کے سبب مسلط ہوا۔ جہاں اطاعت، توبہ اور عہد کی پاسداری ہوگی، وہاں عزت و امن کا دروازہ کھلا رہے گا؛ اور جہاں سرکشی، انکار اور ظلم ہوگا، وہاں انجام کار ذلت اور رسوائی ہی مقدر بنے گی۔

اس طرح ان آیات میں ایک تاریخی حقیقت کے ساتھ ساتھ ایک آفاقی اصول بھی بیان کر دیا گیا ہے: عزت اطاعتِ الٰہی میں ہے، اور ذلت نافرمانی اور ظلم کے نتیجے میں آتی ہے۔

یہودیوں کو امن ملنے کے دو سبب

قرآنِ مجید کی مذکورہ آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو عمومی طور پر ذلت و بے وقعتی کا سامنا رہے گا، البتہ دو صورتوں میں انہیں امن و پناہ میسر آ سکتی ہے: ایک ''بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ'' کے ذریعے، اور دوسری ''وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ'' کے ذریعے۔ مفسرین نے ان دونوں تعبیرات کی مختلف توضیحات بیان کی ہیں۔

پہلا سبب

۱۔ بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ (اللہ کی رسی کے ذریعے) بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی اہلِ کتاب خواہ یہودی ہو یا نصرانی اپنی مذہبی عبادت میں مشغول رہے، مسلمانوں کے خلاف قتال اور بغاوت نہ کرے، تو اسلامی قانونِ جہاد کے تحت اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ گو اس کی عبادت اور عقیدۂ آخرت میں اس کے لئے نجات کا ذریعہ نہ ہوگا، لیکن دنیا میں اسے تحفظ حاصل رہے گا۔

اسی مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتیں اور نابالغ بچے جنگ میں قتل نہیں کئے جائیں گے، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر جنگ کے بعد ایک عورت کو مقتول پایا تو فرمایا:

''یہ (عورت) تو لڑنے والوں میں سے نہ تھی''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۰۱۵؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۴۴)

● اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں کے قتل سے بھی منع فرمایا''۔ (صحیح مسلم، رقم: ۱۷۴۴)

پس یہ سب ''اللہ کی رسی'' یعنی شریعتِ الٰہی کے تحت انہیں حاصل ہونے والا تحفظ ہے۔

● کچھ مفسرین نے بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ سے مراد اسلام قبول کرنا بھی لیا ہے؛ یعنی اگر وہ ایمان لا کر امتِ مسلمہ میں شامل ہو جائیں تو مکمل طور پر محفوظ اور معزز ہو سکتے ہیں۔

دوسرا سبب

۲۔وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (لوگوں کی رسی کے ذریعے) اس سے مراد یہ لیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں یا دیگر اقوام کے ساتھ معاہدۂ صلح کر کے، کسی طاقتور قوم کی پشت پناہی میں آ کر امن حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ لفظ ''الناس'' عام ہے، اس میں مومن اور کافر سب شامل ہیں۔ لہٰذا یہ صورت بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں سے معاہدہ کریں اور یہ بھی کہ کسی دوسری غیر مسلم طاقت کے سہارے تحفظ حاصل کریں۔

موجودہ یہودی حکومت

موجودہ دور میں فلسطین میں قائم اسرائیلی حکومت کے حوالے سے بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن میں بنی اسرائیل کے لیے عمومی ذلت کا ذکر ہے، تو پھر ایک ریاست کا قیام اس کے خلاف کیوں نہیں سمجھا جائے؟

حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے معارف القرآن میں اس آیت کے تحت اس شبہے کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ موجودہ اسرائیلی حکومت درحقیقت اپنی ذاتی قوت پر قائم نہیں، بلکہ بڑی یورپی اور عالمی طاقتوں کے سہارے برقرار ہے۔ اگر ان طاقتوں کی پشت پناہی ختم ہو جائے تو وہ اپنی داخلی طاقت کے بل بوتے پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی۔ ان کے نزدیک یہ دراصل عالمی سیاسی مفادات کے تحت قائم ایک چھاؤنی کی حیثیت رکھتی ہے، جسے بعض بڑی طاقتیں اسلامی دنیا کو کمزور رکھنے کے لئے سہارا دیتی ہیں۔

اس اعتبار سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایسی محدود اور بیرونی سہارے پر قائم حکومت کو قرآن کے بیان کردہ اصول کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ آیت میں خود یہ استثنا موجود ہے کہ ''لوگوں کی رسی'' کے ذریعے انہیں وقتی تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اگر عالمی نقشے پر نظر ڈالی جائے تو ایک محدود خطہ، وہ بھی بیرونی طاقتوں کے سہارے، پوری دنیا میں پھیلی ہوئی اقوام اور حکومتوں کے مقابلے میں ایک نہایت چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس محدود تسلط کو بنی اسرائیل کی دائمی عزت وغلبہ کی دلیل نہیں کہا جا سکتا، بلکہ قرآنی اصول کے مطابق وہ تحفظ بھی دوسروں کے سہارے ہی کے تحت ہے۔

ایک اصولی نکتہ

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن میں بیان کردہ ذلت یا عزت کا تعلق نسلی امتیاز سے نہیں بلکہ اعمال، اطاعت اور نافرمانی سے ہے۔ جہاں اطاعتِ الٰہی ہوگی وہاں عزت نصیب ہوگی، اور جہاں سرکشی و انکار ہوگا وہاں ذلت مقدر ہوگی۔ یہی اصول ہر قوم اور ہر زمانے کے لئے یکساں ہے۔

اس طرح مذکورہ آیت میں بیان کردہ دونوں ''رسیاں'' اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی دراصل تحفظ کے دو مختلف اسباب کو واضح کرتی ہیں: ایک دینی اور شرعی بنیاد پر، اور دوسری سیاسی و معاشرتی معاہدات کی بنیاد پر۔

یہودیوں پر ناراضگی کے اسباب

اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس قوم نے اللہ تعالیٰ کا غضب اور ناراضی کن اعمال کے سبب اپنے اوپر لازم کی۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس کے چار بنیادی اسباب تھے:

(۱) وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، یعنی احکامِ الٰہی کو جھٹلاتے اور حق کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔

(۲) انہوں نے اللہ کے پیغمبروں اور رسولوں کو جانتے بوجھتے ناحق قتل کیا۔

(۳) گناہ اور نافرمانی کو انہوں نے اپنی قومی روش بنالیا تھا۔

(۴) انہوں نے سرکشی اختیار کی، حدودِ الٰہی کو پامال کیا اور قانونِ خداوندی کی پابندی سے منہ موڑ لیا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی، اس کے احکام کا انکار، اور اس کی مقرر کردہ حدود کو توڑ دینا ایسے سنگین جرائم ہیں جو غضبِ الٰہی کو دعوت دیتے اور قومی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو بھی اس سے سبق حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سبھی کافر بُرے نہیں ہوتے

یہاں یہود کی بطورِ قوم مذمت کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تمام اہلِ کتاب یا سب یہودی یکساں طور پر برے تھے یا ان میں کوئی صالح اور سچا شخص موجود نہ تھا۔ قرآنِ کریم خود اس کی وضاحت کرتا ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حق کو پہچانا، سچائی کے ساتھ دینِ حق کو قبول کیا اور اسلام پر ثابت قدم رہے۔

چنانچہ آگے ان اہلِ کتاب مومنین کی تعریف بیان کی گئی ہے، تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ معیار نسل یا قومیت نہیں بلکہ ایمان، صداقت اور اطاعتِ الٰہی ہے۔

آیت نمبر (۱۱۳-۱۱۵) لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: ''سب اہل کتاب یکساں نہیں، ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں، یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ اور جو نیکی بھی وہ کریں گے، اسے کبھی ضائع نہیں کیا جائے گا، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے''۔

بُروں میں کچھ اچھے بھی ہیں

تفسیر قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: لَيْسُوْا سَوَآءً — یعنی سب یکساں نہیں ہیں۔

ابنِ ابی حاتمؒ اور طبرانیؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن سلامؓ، ثعلبہ بن سعیہؓ، اُسید بن عبدؓ اور ان کے چند ساتھیوں نے اخلاص کے ساتھ اسلام قبول کیا اور نہایت شوق و رغبت سے دینِ حق میں داخل ہوئے، تو یہود کے علماء اور منکرین کہنے لگے کہ جو لوگ ہم میں سے کمتر اور ناپسندیدہ تھے وہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے ہیں، جبکہ ہمارے معزز اور باوقار لوگ اپنے آباء و اجداد کے دین پر قائم ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اہلِ کتاب سب کے سب ایک جیسے نہیں ہیں۔

● امام احمدؒ اور دیگر محدثین نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ عشاء میں کچھ تاخیر فرمائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو صحابۂ کرامؓ کو نماز کے انتظار میں بیٹھا پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگوں کے سوا کوئی ایسا نہیں جو اس وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہا ہو''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۷۶۰)**

اسی موقع پر لَيْسُوْا سَوَآءً سے لے کر وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ تک کی آیات نازل ہوئیں۔ **(تفسیر ابن عباس)**

ان آیات میں واضح کیا گیا کہ تمام اہلِ کتاب ایک حال پر نہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے حق کو پہچانا، اسے دل سے قبول کیا اور اسلام کی آغوش میں آ کر اس پر اس طرح جم گئے کہ اب کوئی قوت انہیں متزلزل نہیں کر سکتی۔ ان کے اندر دین کا ایسا ذوق و شوق تھا کہ رات کی تاریکی میں نرم و گداز بستروں کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور کھڑے

ہوتے، عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے اور دیر تک پیشانی زمین پر رکھ کر قربِ الٰہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ نماز میں کلامِ الٰہی کی تلاوت کرتے اور اس کے پڑھنے سے روحانی لذت پاتے۔ ان کا شب بیدار ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ اپنے رب سے غافل نہیں تھے، کیونکہ ان کے دلوں میں اللہ کی توحید راسخ تھی اور آخرت کا یقین ان کی نگاہوں کے سامنے زندہ تھا۔

ان کی نیکی صرف ان کی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔ جب کسی نیک کام کی دعوت ملتی تو سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے سعادت اور کامیابی کا خاص حصہ عطا فرمایا۔ ایسے اہلِ کتاب کے بارے میں سورۃ القصص میں فرمایا گیا:

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا''۔ **(القصص:۵۴)**

احادیثِ نبویہ ﷺ میں بھی وارد ہوا ہے کہ جو اہلِ کتاب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں، انہیں دوہرا اجر ملے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تین اشخاص کو دوہرا اجر دیا جائے گا..... ان میں وہ شخص بھی ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا، اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر ایمان لے آیا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۹۷؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۵۴)**

بعض اہل کتاب کے اوصاف

اسی لئے جب قرآن میں یہود کی عمومی برائیوں کا ذکر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ پرہیزگار اور صالح افراد کو ان سے الگ کر دیتا ہے، اور ان کے ساتھ دنیا و آخرت میں الگ معاملہ فرمایا جاتا ہے۔ ان آیات میں جن اوصاف کی بنا پر انہیں صالحین قرار دیا گیا، وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ اور یومِ آخرت پر کامل ایمان۔

۲۔ راتوں کو تلاوتِ قرآن اور قیامِ تہجد۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

۴۔ نیکیوں کی طرف شوق و رغبت کے ساتھ سبقت کرنا وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ۔

یہی وہ اہلِ کتاب تھے جنہوں نے اسلام کو دینِ حق جان کر دل سے قبول کیا اور پوری استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے۔

آیت نمبر (۱۱۶-۱۱۷) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ

شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: ''یقیناً جنہوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال اور نہ ان کی اولاد انہیں اللہ سے کچھ بھی بچا سکے گی۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی مثال اس کھیتی جیسی ہے جسے ایک تیز، سخت سردی والی ہوا نے برباد کر دیا، کیونکہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے''۔

کافروں کے اعمال کا بدلہ

تفسیر اِن آیات میں اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو ایمان نہ لائے اور کفر ہی پر قائم رہے۔ فرمایا گیا کہ وہ دنیا میں خواہ کتنا ہی مال خرچ کریں، اور اپنے خیال میں اسے بڑی نیکی اور خیرات سمجھیں، مگر آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی، کیونکہ ایمان کے بغیر ہر عمل بے روح اور بے جان ہے۔ درحقیقت اعمال کی حفاظت اور ان کی بقا ایمان و اسلام ہی سے وابستہ ہے۔

ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ظالم نے کھیتی یا باغ لگایا، مگر اسے سردی اور پالا سے بچانے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ چند دن اس کی ہریالی اور شادابی دیکھ کر خوش ہوتا رہا، امیدیں باندھتا رہا، لیکن اچانک ایسی چیخ بستہ ہوا چلی اور ایسا سخت پالا پڑا کہ ساری لہلہاتی فصل جل کر خاک ہوگئی۔ اب نہ اس کی امیدیں پوری ہوئیں، نہ وہ ضرورت کے وقت اس سے فائدہ اٹھا سکا۔

یہی حال اُن کفار کا ہے جو کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے صدقات اور نیکیوں میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، مگر ایمان نہ ہونے کے سبب اُن کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ نہ مال اُنہیں بچا سکے گا، نہ اولاد عذابِ الٰہی سے نجات دے سکے گی۔ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ان کی نیکیوں کا عدمِ قبول ظلم ہے۔ ایسا نہیں؛ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی آخرت کی کھیتی تباہ کی۔ اگر وہ کفر اختیار نہ کرتے تو یہ انجام نہ دیکھتے۔ اصل شرط ایمان و توحید ہے، جو اعمال کی قبولیت کی بنیاد ہے، اور جب یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو عمارت کیسے باقی رہ سکتی ہے؟

ایمان کی اہمیت

انسان دنیا میں مال و دولت، زمین و جائداد، اولاد و خاندان پر بڑا بھروسا کرتا ہے اور انہیں اپنی کامیابی کا

ذریعہ سمجھتا ہے، مگر آخرت میں نفع دینے والی چیز صرف ایمان ہے۔ مال اور اولاد، اگر ایمان کے ساتھ نہ ہوں، تو وہاں کسی کام نہ آئیں گے۔ کفر کی حالت میں نہ مال عذاب کو ٹال سکے گا اور نہ اولاد، بلکہ اس کے نتیجے میں دائمی خسارہ مقدر ہوگا۔

کافروں کے صدقات وخیرات

کبھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم محتاجوں کی مدد کرے، یتیموں کی خبر گیری کرے یا رفاہی کام انجام دے تو کیا اسے آخرت میں کوئی فائدہ ہوگا؟ قرآن نے مثال دے کر واضح کر دیا کہ ایسے اعمال کی دنیاوی جزا تو ممکن ہے، مگر آخرت میں ایمان کے بغیر ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ بھی ظلم نہیں، بلکہ یہ اُن کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ایمان سے منہ موڑ کر اپنی آخرت کی بنیاد کمزور کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ عبداللہ بن جدعان (جو زمانۂ جاہلیت میں مہمان نوازی اور سخاوت کے لیے مشہور تھا) کیا اپنی نیکیوں سے فائدہ اٹھا سکے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے کبھی یہ نہ کہا کہ اے میرے رب! قیامت کے دن میری خطا معاف فرما''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۴)**

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کسی مومن کی نیکی کا حق نہیں مارتا؛ اسے دنیا میں بھی اس کا بدلہ دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور کافر کو دنیا میں اس کی نیکیوں کا بدلہ دے دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہتی جس کا بدلہ دیا جائے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۰۸)**

اعتراض کا جواب

قرآن میں کافروں کے بارے میں فرمایا گیا: أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے)۔ اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جرم چونکہ محدود عمر کا ہے، اس لیے سزا بھی محدود ہونی چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سزا اور جرم کی مناسبت کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں کا دورانیہ برابر ہو، بلکہ یہ کہ سزا جرم کی سنگینی کے مطابق ہو۔

اگر کوئی جرم چند گھنٹوں میں سرزد ہو جائے تو کیا اس کی سزا بھی چند گھنٹے ہی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ اصل مناسبت شدتِ جرم سے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، جزا و سزا میں نیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۹۰۷)**

کافر کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اسے ہمیشہ زندگی ملے تو وہ کفر ہی پر قائم رہے، اس لیے اس کی سزا بھی دائمی قرار دی گئی۔ اسی طرح مومن کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے تو ایمان پر قائم رہے، اس لیے اس کا ثواب بھی دائمی ہے۔

اعمال کی کھیتی

ان آیات میں کافروں کے صدقات کو کھیتی اوران کے کفر کو پالا قرار دیا گیا ہے۔جس طرح پالا پوری فصل کو تباہ کر دیتا ہے، اسی طرح کفر نیکیوں کی کھیتی کو برباد کر دیتا ہے۔ قیامت کے دن انہیں اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔اس کے ساتھ اہلِ ایمان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ دین و دنیا کے دشمنوں سے بے جا اختلاط اور بے احتیاطی سے بچیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اثرات ایمان کی حرارت کو کمزور کر دیں اور اعمال کی کھیتی کو نقصان پہنچے۔ایمان ہی اصل سرمایہ ہے، اور اسی کی حفاظت میں دونوں جہانوں کی کامیابی مضمر ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۱۸ سے ۱۲۷ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ:

(۱۱۸) اے ایمان والو! غیر لوگوں کو اپنا دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، اور وہ چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی دشمنی تمہارے منہ سے ظاہر ہو چکی ہے، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔ (۱۱۹) سن لو! تم وہ لوگ ہو جو ان سے محبت رکھتے ہو، لیکن وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو: مر جاؤ اپنے غصے کے ساتھ، بے شک اللہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ (۱۲۰) اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو وہ اسے ناپسند کرتے ہیں، اور اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو وہ خوش ہوتے ہیں، لیکن اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی

چالیں تمہیں کچھ نقصان نہیں دے سکیں گی۔ بے شک اللہ ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔(۱۲۱) اور جب آپ صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے اور مومنوں کو جنگ کے لیے مورچوں پر مقرر کر رہے تھے، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔(۱۲۲) جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی اختیار کرنے کا ارادہ کیا، حالانکہ اللہ ان دونوں کا مددگار تھا۔ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔(۱۲۳) اور یقیناً بدر کے دن اللہ نے تمہاری مدد کی، حالانکہ تم کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔(۱۲۴) (یاد کرو) جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: "کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے نازل کرے؟" (۱۲۵) کیوں نہیں! بلکہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو، اور دشمن تم پر اچانک حملہ کرے، تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا۔(۱۲۶) اور اللہ نے یہ (مدد) صرف تمہیں خوشخبری دینے اور تمہارے دلوں کو تسلی دینے کے لیے رکھی، ورنہ مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے، جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا۔(۱۲۷) تاکہ اللہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انہیں ذلیل کر دے، پس وہ نامراد ہو کر لوٹ جائیں۔

تفسیر آیت نمبر ۱۱۸ سے ۱۲۷ تک

آیت نمبر (۱۱۸-۱۲۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! غیر لوگوں کو اپنا دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، اور وہ چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی دشمنی تمہارے منہ سے ظاہر ہو چکی ہے، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔ سن لو! تم وہ لوگ ہو جو ان سے محبت رکھتے ہو، لیکن وہ تم

سے محبت نہیں رکھتے، تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو: مرجاؤ اپنے غصے کے ساتھ، بے شک اللہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو وہ اسے ناپسند کرتے ہیں، اور اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو وہ خوش ہوتے ہیں، لیکن اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی چالیں تمہیں کچھ نقصان نہیں دے سکیں گی۔ بے شک اللہ ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے''۔

تفسیر گزشتہ آیات میں اُن اہلِ کتاب کی مدح بیان ہوئی تھی جنہوں نے سچے دل سے دینِ حق کو قبول کیا اور اس پر ثابت قدم رہے۔ اس کے برعکس اُن یہود و نصاریٰ کی مذمت کی گئی جو اپنے مال و اولاد کے گھمنڈ میں حق سے منہ موڑ کر کفر پر قائم رہے۔

کافروں کے ساتھ بے جا اختلاط کی ممانعت

ان آیات میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ کافروں سے ایسا قریبی تعلق نہ رکھیں کہ انہیں اپنا رازدار اور باطنی مشیر بنالیں، کیونکہ وہ مسلمانوں کے دین و دنیا دونوں کے لیے ضرر رساں ہو سکتے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض مسلمان جو اسلام سے پہلے یہودیوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتے تھے، اسلام کے بعد بھی اسی سابقہ تعلق کو برقرار رکھے ہوئے تھے اور اعتماد میں لے کر بعض رازدارانہ امور بھی ان سے بیان کر دیتے تھے۔

اسی طرح منافقین کو بظاہر مسلمان سمجھ کر ان سے بھی پوری احتیاط نہیں کی جاتی تھی اور بعض اہم باتیں ان تک پہنچ جاتی تھیں۔ چنانچہ اہلِ ایمان کو ان پوشیدہ خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں واضح فرمایا گیا کہ مسلمان اپنے سوا کسی کو ایسا رازدار نہ بنائیں جس سے دین و ملت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

یہ حکم نفرت یا ظلم کی تعلیم نہیں، بلکہ حکمت اور احتیاط کا تقاضا ہے۔ اسلام جہاں غیر مسلموں کے ساتھ عدل، احسان، عہد کی پابندی اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے، وہیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ دینی تشخص اور اجتماعی مفاد کی حفاظت کی جائے اور ایسے تعلقات سے بچا جائے جو ملت کے لئے ضرر کا باعث بن سکتے ہوں۔

دشمنی کی حقیقت

قرآن نے اس کی علت بھی بیان فرمائی کہ بعض غیر مسلم جماعتوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض اور حسد پایا جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی ترقی، اتحاد اور دین کی سربلندی کو پسند نہیں کرتے، اور ان کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان کسی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کے حال سے واقف ہے، اس لئے اس نے ان کے

باطن کی کیفیت کو ظاہر کر دیا، تا کہ مسلمان فریب میں نہ آئیں۔ یہ کیفیت محض ابتدائی دور تک محدود نہ تھی، بلکہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی جھلک نظر آتی رہی ہے، اگر چہ بسا اوقات سیاسی یا وقتی مصالح کی بنا پر اس کا اظہار کم یا زیادہ ہوتا رہا۔

ممکنہ شبہ کا ازالہ

یہ اندیشہ پیدا ہوسکتا تھا کہ اگر مسلمان ایسے لوگوں سے قریبی تعلقات کم کر دیں تو وہ اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہوں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصل تحفظ کا ذریعہ ظاہری تدبیریں نہیں بلکہ دو بنیادی اوصاف ہیں: صبر اور تقویٰ۔ ارشاد ہوا: لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا — یعنی اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ سازش نہ کریں گے، بلکہ یہ وعدہ کیا گیا کہ ان کی سازشیں کارگر نہ ہوں گی، بشرطیکہ اہلِ ایمان صبر و تقویٰ پر قائم رہیں۔

صبر میں دین پر استقامت، مشکلات میں ثابت قدمی اور حق پر ڈٹے رہنا شامل ہے۔ تقویٰ میں خوفِ خدا، گناہوں سے اجتناب، اللہ پر توکل اور احکامِ الٰہی کی پابندی سب داخل ہیں۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، اس کا ہر حال اس کے لیے خیر ہے؛ اگر اسے خوشی ملے تو شکر کرتا ہے، یہ اس کے لیے بہتر ہے، اور اگر تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے لیے بہتر ہے''۔
(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۹۹)

اصلاح کا قرآنی نسخہ

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے رب کے ساتھ تعلق کو مضبوط کریں، اس کی قدرت پر کامل بھروسا رکھیں، اس کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں، دین پر قائم رہیں، گناہوں سے بچیں اور باہمی اتحاد کو مضبوط کریں۔ جب یہ صفات اختیار کی جائیں تو دشمنوں کی سازشیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

تاریخِ اسلام میں غزوات کی مثالیں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ جہاں صبر و تقویٰ کو مضبوطی سے تھاما گیا، وہاں کامیابی نصیب ہوئی، اور جہاں ان میں کمزوری آئی، وہاں وقتی نقصان اٹھانا پڑا۔ پس آج بھی اگر امتِ مسلمہ اس قرآنی نسخے صبر اور تقویٰ کو اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور کوئی سبب نہیں کہ اس کی مدد شاملِ حال نہ ہو۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب:

اعتراض: بعض کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کو اپنا قریبی دوست، رازدار یا مشیر بنانے سے منع کیا گیا ہے؛ تو کیا یہ آیت غیر مسلموں کے ساتھ نفرت، دوری اور بداعتمادی پیدا نہیں

کرتی؟ کیا اسلام تمام غیر مسلموں کو دشمن سمجھتا ہے؟

جواب: سب سے پہلی بات یہ سمجھنی چاہیے کہ سورۂ آلِ عمران کی اس آیت (118:3) میں ''بطانۃ'' (قریبی رازدار، اندرونی مشیر) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا تعلق عام دوستی یا حسنِ سلوک سے نہیں، بلکہ انتہائی قریبی، رازدارانہ اور حساس تعلقات سے ہے۔ یعنی ایسے افراد جنہیں انسان اپنے معاملاتِ زندگی، کمزوریوں اور اجتماعی رازوں میں شریک کرتا ہے۔ یہ آیت دراصل ایک حفاظتی ہدایت (Security Guideline) ہے، نہ کہ نفرت یا دشمنی کا حکم۔

آیت کا اصل مفہوم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، جو تمہاری تباہی میں کمی نہیں کرتے، تمہاری تکلیف کے خواہاں ہیں، جن کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے، یعنی یہاں ہر غیر مسلم مراد نہیں، بلکہ وہ مخصوص افراد مراد ہیں جو اسلام یا مسلمانوں کے خلاف بغض رکھتے ہوں جو نقصان پہنچانے کی نیت رکھتے ہوں۔

اسلام تمام غیر مسلموں کو دشمن نہیں سمجھتا

قرآن خود اس کی واضح تردید کرتا ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ... أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ (سورہ الممتحنہ:۸)

ترجمہ: ''اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کرتے''۔

اس آیت سے واضح ہے کہ: پرامن غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، عدل اور بھلائی کا حکم ہے اسلام عمومی طور پر نفرت نہیں سکھاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر مسلموں کے ساتھ معاملات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ میثاقِ مدینہ کیا، غیر مسلموں کے ساتھ معاملات، تجارت، قرض لینا دینا سب کیا۔

اسی طرح ایک یہودی کے جنازے کے احترام میں کھڑے بھی ہوئے۔ اگر اسلام سب غیر مسلموں سے نفرت سکھاتا، تو یہ سب عمل ممکن نہ ہوتے۔

اصل میں یہاں ایک نہایت اہم فرق سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام عام انسانی تعلقات اور رازدارانہ تعلقات

کے درمیان واضح امتیاز قائم کرتا ہے۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ عام میل جول، تجارت، حسنِ سلوک اور عدل و انصاف کا برتاؤ نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہے، لیکن ایسے افراد کو، جو دل میں دشمنی رکھتے ہوں اور نقصان پہنچانے کی نیت رکھتے ہوں، اپنا قریبی راز دار اور مشیر بنانا درست نہیں۔ گویا اسلام ایک متوازن طرزِ زندگی سکھاتا ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے، معاشرتی ہم آہنگی کو برقرار رکھے، مگر ساتھ ہی اپنی سلامتی، عزت اور اجتماعی مفاد کو بھی محفوظ رکھے۔

دنیاوی اصول

یہ ہدایت صرف مذہبی نہیں بلکہ ایک عقلی اور عالمی اصول ہے: ہر قوم، ہر ملک اپنے راز صرف وفادار افراد کو دیتا ہے دشمن ذہن رکھنے والوں کو Sensitive معلومات نہیں دی جاتیں، لہٰذا قرآن کی یہ ہدایت دراصل ایک حکیمانہ اور فطری اصول ہے، نہ کہ تعصب۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک فطری اور عقلی اصول بیان کیا گیا ہے جو دنیا کے ہر معاشرے میں پایا جاتا ہے، کہ انسان اپنے راز اور حساس معاملات صرف ان لوگوں کے ساتھ شیئر کرتا ہے جو مخلص اور خیر خواہ ہوں، نہ کہ ان کے ساتھ جو اس کے نقصان کے درپے ہوں۔ لہٰذا یہ آیت نفرت پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کو ہوشیار، باخبر اور باوقار بنانے کے لیے ہے، تاکہ وہ محبت اور انصاف کے ساتھ زندگی گزاریں مگر اپنی سلامتی اور اجتماعی مفاد کو خطرے میں نہ ڈالیں۔

آیت نمبر (۱۲۱-۱۲۲) وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

ترجمہ: ''اور جب آپ صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے اور مومنوں کو جنگ کے لیے مورچوں پر مقرر کر رہے تھے، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی اختیار کرنے کا ارادہ کیا، حالانکہ اللہ ان دونوں کا مددگار تھا۔ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نا سمجھی کا وبال

تفسیر ان آیات اور ان کے بعد آنے والی آیات میں بطورِ دلیل یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جہاں صبر و تقویٰ میں کمی واقع ہوئی یا ان میں سے کسی کو چھوڑ دیا گیا، وہاں وقتی نقصان پیش آیا؛ اور جہاں صبر و تقویٰ پوری قوت کے ساتھ

اختیار کئے گئے، وہاں دشمن کی تدبیریں بے اثر ہوگئیں۔

غزوۂ بدر میں اہلِ ایمان نے کامل استقامت اور توکل کا مظاہرہ کیا تو کفار کی سازشیں ناکام ہوئیں اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی؛ لیکن غزوۂ اُحد میں ایک موقع پر حکمِ نبوی کی مکمل پابندی نہ ہونے کے باعث نقصان اٹھانا پڑا۔ انہی حقائق کی یاددہانی ان آیات میں کرائی گئی ہے۔ (غزوہ اس معرکے کو کہا جاتا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود شریک ہوئے ہوں)

غزوۂ اُحد کا پس منظر

رمضان المبارک ۲ ہجری میں غزوۂ بدر میں کفارِ قریش کو ایسی شکست ہوئی کہ ان کے ستر نامور سردار مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ یہ شکست اہلِ مکہ کے لیے نہایت ذلت آمیز تھی۔ چنانچہ بدلہ لینے کا جذبہ شدت سے بھڑک اٹھا۔ مقتول سرداروں کے قریبی لوگوں نے عرب قبائل کو ابھارا اور عہد کیا کہ جب تک اس کا انتقام نہ لیا جائے گا، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

شوال ۳ ہجری میں تقریباً تین ہزار کا لشکر، پورے ساز وسامان کے ساتھ، مدینہ پر چڑھائی کے ارادے سے روانہ ہوا۔ حتیٰ کہ عورتوں کو بھی ساتھ لایا گیا تاکہ وہ موقع پر مردوں کو ابھار سکیں اور پسپائی سے روک سکیں۔ یہ لشکر مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر جبلِ اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر صحابۂ کرامؓ سے مشورہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے، کیونکہ اس صورت میں کامیابی کے امکانات زیادہ تھے۔

یہی مشورہ عبداللہ بن اُبی نے بھی دیا، جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھا مگر درحقیقت منافقین کا سردار تھا۔ اس نے کہا کہ مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے میں ہمیشہ کامیابی رہی ہے، اور باہر نکلنے میں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

لیکن بعض پرجوش صحابہ، خصوصاً وہ نوجوان جنہیں بدر میں شرکت کا موقع نہ ملا تھا اور جو شوقِ شہادت سے سرشار تھے، انہوں نے عرض کیا کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کیا جائے تاکہ دشمن مسلمانوں کو کمزور نہ سمجھے۔ اکثریت کی رائے اسی جانب مائل ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر تشریف لے گئے، زرہ زیبِ تن کی اور ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر باہر آئے۔ اس کے بعد بعض صحابہؓ کو احساس ہوا کہ شاید ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی پسندیدہ رائے کے خلاف باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! اگر آپ کی خواہش ہو تو ہم مدینہ ہی میں رہتے ہیں، آپ اپنی رائے پر عمل فرمائیں''۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی نبی کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ ہتھیار پہن لے تو انہیں اتار دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے دشمن سے مقابلہ کرے''۔ (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۲۵۸۸)

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے نام پر نکلو، اور یاد رکھو! جب تک تم صبر اور ثابت قدمی اختیار کرو گے، اللہ کی مدد اور نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔

منافقین کی دھوکہ بازی

۱۱ رشوال، جمعہ کے دن نمازِ عصر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہزار صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑے پر سوار تھے۔ دوسری جانب کفارِ قریش کا تین ہزار کا لشکر، جس میں زرہ پوش جنگجو، دو سو گھوڑے، تین سو اونٹ اور پندرہ عورتیں بھی شامل تھیں، جبلِ اُحد کے قریب خیمہ زن تھا۔

جب اسلامی لشکر اُحد کے قریب پہنچا تو عبداللہ بن اُبیّ جو بظاہر مسلمانوں میں شامل مگر درحقیقت منافقین کا سردار تھا تین سو آدمیوں کے ساتھ لشکر سے الگ ہو کر واپس لوٹ گیا۔ بعض صحابہؓ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ کہنے لگا: ''جب ہماری رائے نہیں مانی گئی تو ہم اپنی جانیں کیوں خطرے میں ڈالیں؟''

اس طرح وہ تین سو افراد کو ساتھ لے کر میدان چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صرف سات سو صحابہؓ باقی رہ گئے۔ ان میں تقریباً سو افراد کے پاس مکمل اسلحہ تھا اور پورے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے۔ بنی حارثہ اور بنی سلمہ کے کچھ افراد کے دلوں میں بھی اس اچانک صورتِ حال سے کمزوری کا خیال آیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے قدم جما دیے اور وہ واپس نہ ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگی تدبیر

صبح کے وقت مسلمان میدانِ جنگ میں پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور سب نے نماز ادا کی۔ جو صفیں ابھی کچھ دیر پہلے اللہ کی عبادت کے لیے کھڑی تھیں، وہی اب راہِ خدا میں جہاد کے لیے منظم ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کو سامنے اور جبلِ اُحد کو پشت پر رکھ کر لشکر کی صف بندی فرمائی۔ پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ ایک ٹیلے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو ان کا امیر بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت تاکید فرمائی کہ وہ اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑیں، خواہ مسلمان غالب ہوں یا پسپا۔

جنگ شروع ہوئی تو ابتدا میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا۔ کفار میں بدحواسی پھیل گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگے۔

مسلمانوں نے سمجھا کہ فتح ہو چکی ہے اور مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹیلے پر مقرر تیر اندازوں نے بھی جب دشمن کو بھاگتے دیکھا تو ان میں سے اکثر نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم یاد دلایا، مگر چند کے سوا باقی سب نیچے اتر آئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب جنگ ختم ہو گئی ہے، یہی وہ لمحہ تھا جس سے دشمن نے فائدہ اٹھایا۔ خالد بن ولید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) نے پیچھے کی طرف سے گھوم کر آئے اور سے حملہ کر دیا۔ اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے سامنے بھی دشمن اور پیچھے کی جانب سے بھی دشمن۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زخمی ہونا

حضرت عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے چند ساتھیوں نے پوری بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ شہید ہو گئے۔ میدان کا نقشہ بدل گیا۔ کفار نے تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی۔ اسی ہنگامے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ خود کی دو کڑیاں رخسار میں پیوست ہو گئیں، جنہیں حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالا، جس سے ان کے دانت ٹوٹ گئے۔ اسی اثنا میں یہ افواہ پھیلی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ اس خبر نے مسلمانوں کے دل دہلا دئے اور بہت سے لوگ پریشان ہو گئے، اگرچہ ایک جماعت ثابت قدم رہی۔ اس شدید حالت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بددعا نہیں بلکہ رحمت کے کلمات جاری ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِی فَإِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُونَ'' ''اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ یہ جانتے نہیں''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۷۷؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹۲)

چہرۂ اقدس سے خون جاری تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے صاف کرتے جاتے تھے۔ اس معرکے میں کفار کے بائیس یا تیئیس افراد مارے گئے، جبکہ مسلمانوں میں سے ستر جلیل القدر صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش کیا۔

اللہ پر بھروسا

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ — یعنی اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔ اس ارشاد میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی کہ مسلمانوں کا اعتماد محض عددی کثرت یا ظاہری ساز و سامان پر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ظاہری تدبیریں اختیار کرنے کے بعد اصل سہارا صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو سمجھنا چاہیے۔

بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے دلوں میں جو کمزوری کا خیال پیدا ہوا تھا، وہ ظاہری اسباب کی کمی کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا

تھا۔اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے توکل سے بتایا۔اور توکل کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان ظاہری اسباب کو ترک کر دے، بلکہ اس کا صحیح معنیٰ یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق تمام جائز اسباب اختیار کئے جائیں، پھر نتیجہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔نہ اسباب پر غرور ہو اور نہ ان پر فخر، بلکہ اعتماد صرف اللہ کی قدرت پر رہے۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توکل کی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا: ''اگر تم اللہ پر ویسا ہی توکل کرو جیسا توکل کرنے کا حق ہے، تو وہ تمہیں اسی طرح رزق دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے؛ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں''۔
(سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۳۴۴)

یعنی پرندے محض بیٹھے نہیں رہتے بلکہ اڑ کر تلاش بھی کرتے ہیں، مگر بھروسا اللہ پر رکھتے ہیں۔

یہاں اسی حقیقت کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے جو پچھلی آیت میں بیان ہوئی تھی: **وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا** ۔ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو دشمن کی چالیں تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر صبر وتقویٰ میں کوتاہی ہو، یا ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دیا جائے، تو دشمن کی تدبیر اثر کر سکتی ہے اور نقصان پیش آ سکتا ہے۔غزوۂ اُحد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی مکمل پابندی نہ ہوئی اور صبر میں کمزوری آئی، تو اس کے نتیجے میں جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔یہ واقعہ اسی قرآنی اصول کی عملی مثال ہے۔

آئندہ آیات میں غزوۂ بدر کا ذکر آتا ہے، جہاں اہلِ ایمان نے کامل صبر، تقویٰ اور توکل کا مظاہرہ کیا۔باوجود اس کے کہ ساز وسامان کم تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم فتح عطا فرمائی۔اس طرح تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اصل قوت ظاہری تعداد نہیں، بلکہ صبر، تقویٰ اور اللہ پر کامل بھروسا ہے۔

آیت نمبر (۱۲۳-۱۲۷) وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: ''اور یقیناً بدر کے دن اللہ نے تمہاری مدد کی، حالانکہ تم کمزور تھے۔پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔(یاد کرو) جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: ''کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے نازل کرے؟'' کیوں نہیں! بلکہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو،

اور دشمن تم پر اچانک حملہ کرے، تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا۔ اور اللہ نے یہ (مدد) صرف تمہیں خوشخبری دینے اور تمہارے دلوں کو تسلی دینے کے لیے رکھی، ورنہ مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے، جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا۔ تاکہ اللہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کردے یا انہیں ذلیل کردے، پس وہ نامراد ہو کر لوٹ جائیں''۔

غزوۂ بدر

تفسیر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب تم میں سے دو گروہوں نے کمزوری کا ارادہ کیا، حالانکہ اللہ ان کا کارساز تھا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۰۵۱؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۰۵)**

اسی طرح ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور ابن ابی حاتم نے شعبیؒ سے نقل کیا ہے کہ بدر کے دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ کُرز بن جابر محاربی مشرکین کو فوجی مدد کے لئے روانہ کر رہا ہے، جس سے مسلمانوں میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے تسلی اور حوصلہ افزائی کے لئے آیات نازل فرمائیں۔

بدر کا مقام اور پس منظر

مدینۂ منورہ سے تقریباً ۸۰ راسی میل کے فاصلے پر ایک کنواں اور بستی تھی جسے ''بدر'' کہا جاتا تھا۔ اسی مقام پر ۱۷ ررمضان ۲ رہجری ۶۲۴ء کو اسلام کی پہلی عظیم جنگ پیش آئی۔ قریش کی طاقت و شوکت کا بنیادی ذریعہ شام کے ساتھ ان کی تجارت تھی۔ سیاسی حکمت کا تقاضا تھا کہ ان کی اقتصادی شہ رگ کو کمزور کیا جائے۔ ایک موقع پر شام سے قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ واپس آ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ۱۲ رمضان ۲ ہجری کو ۳۱۳ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ روانہ ہوئے۔

قافلے کے سردار کو خبر ہوگئی، اس نے راستہ بدل لیا اور مکہ کی طرف پیغام بھیج دیا کہ قافلے کی حفاظت کے لئے فوراً لشکر بھیجا جائے۔ مکہ میں یہ خبر پہنچی تو قریباً ۹۵۰ جنگجو، جن میں ایک سو گھوڑے اور سات سو اونٹ تھے، بڑے بڑے سرداروں کی قیادت میں مدینہ کی جانب نکل پڑے۔

اہلِ ایمان کی تیاری

رسول اللہ ﷺ کو جب اس لشکر کی خبر ملی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہؓ نے جان و مال قربان کرنے کا عزم پیش کیا۔ مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی، جن میں ۸۳ مہاجرین اور باقی

انصار تھے۔ان کے پاس نہ مکمل ہتھیار تھے، نہ مناسب سواری؛ کل ستر اونٹ اور صرف دو گھوڑے تھے۔ کچھ کے پاس پرانی تلواریں اور ٹوٹے ہوئے نیزے تھے، مگر ایمان کی حرارت اور یقین کی قوت بے مثال تھی۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو یہ حق و باطل کا پہلا عظیم معرکہ تھا۔ رشتہ دار ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے باپ بیٹے کے سامنے اور بیٹا باپ کے مقابل۔حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) میدان میں آئے تو صدیقؓ بھی مقابلے کے لیے تیار تھے۔

حضرت عمرؓ کے رشتہ دار سامنے آئے تو فاروقی عزم نے انہیں بھی نہ روکا۔ادھر میدان گرم تھا اور ادھر رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے حضور دستِ دعا دراز کیے ہوئے تھے۔آپ نے عرض کیا: ''اے اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۶۳)**

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق مدد فرمائی اور فرشتوں کو نازل کیا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ کفار کو سخت شکست ہوئی۔

قریش کا نقصان

قریش کے ستر افراد مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ابوجہل، عتبہ اور دیگر بڑے سردار ایک ایک کر کے قتل ہوئے۔دارالندوہ میں رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازش کرنے والے چودہ سرداروں میں سے گیارہ اسی معرکے میں مارے گئے اور تین بعد میں اسلام لے آئے۔اس فتح نے مکہ میں کفر کی کمر توڑ دی۔مسلمانوں میں سے صرف چودہ صحابہؓ شہید ہوئے جس میں چھ مہاجرین اور آٹھ انصار میں سے تھے۔

قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

کفارِ مکہ میں سے تقریباً ستر قیدی مدینہ لائے گئے۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں صحابہ میں تقسیم فرمایا اور تاکید کی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔صحابہؓ انہیں عمدہ کھانا کھلاتے اور خود کھجوروں پر گزارا کرتے۔جن کے پاس لباس نہ تھا، انہیں لباس فراہم کیا گیا۔مشورے کے بعد طے ہوا کہ فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔عام طور پر چار ہزار درہم فدیہ مقرر ہوا، بعض مالداروں سے زیادہ لیا گیا۔

ان قیدیوں میں حضرت عباسؓ (رسول اللہ ﷺ کے چچا) بھی تھے، جو بعد میں ایمان لے آئے۔روایت میں آتا ہے کہ حضرت عباسؓ قید کی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کی آواز سنی تو آپ کی آنکھوں سے نیند جاتی رہی۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں کیسے سو جاؤں جبکہ چچا عباس کی کراہنے کی آواز سن رہا ہوں؟''۔

باوجود اس قلبی شفقت کے، عدلِ شریعت کا تقاضا یہی تھا کہ جس طرح دوسروں سے فدیہ لیا گیا، اسی طرح ان سے بھی لیا جائے۔ انصاف کے اس اعلیٰ معیار نے ثابت کر دیا کہ اسلام میں قانون سب کے لئے برابر ہے، خواہ اپنا ہو یا پرایا۔

اسلامی مساوات

حضرت عباسؓ مالدار تھے، اس لیے ان سے چار ہزار سے زائد فدیہ لیا گیا۔ بعض انصار نے عرض کیا کہ عباس وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں اس لئے، ان سے فدیہ معاف کر دیا جائے؛ لیکن اسلامی مساوات کا اصول یہ تھا کہ رشتہ دار، دوست اور دشمن سب قانون کے سامنے برابر ہیں، اس لیے یہ درخواست قبول نہ کی گئی۔

اسی طرح آپ ﷺ کے داماد حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ ان کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے مال نہ تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی زوجہ، حضرت زینبؓ (جو مکہ میں تھیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں) کو پیغام بھیجا کہ فدیہ بھیج دیں۔

حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا وہ ہار اتار کر بھیج دیا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ نے شادی کے وقت انہیں دیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی نظر اس ہار پر پڑی تو آپ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کی یہ نشانی اسے واپس کر دو''۔ (سنن ابوداود، حدیث نمبر: ۲۶۹۲)

صحابہؓ نے خوشی سے ہار واپس کر دیا اور ابوالعاص سے کہا کہ زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں۔ انہوں نے وعدے کے مطابق ایسا ہی کیا۔ حضرت ابوالعاصؓ ایک کامیاب تاجر تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ شام سے مالِ تجارت لے کر آ رہے تھے کہ دوبارہ گرفتار ہو گئے، مگر پھر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ مکہ پہنچ کر انہوں نے تمام لوگوں کا حساب چکایا، امانتیں واپس کیں، پھر اسلام قبول کیا اور کہا کہ میں نے پہلے اس لئے اسلام قبول نہ کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں مال کے خوف یا دباؤ کی وجہ سے مسلمان ہوا ہوں۔

فرشتوں کے ذریعہ مدد

غزوۂ بدر حقیقت میں اسلام کی نمایاں نشانیوں میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ سورۂ انفال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دعا و استغفار پر پہلے ایک ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہوا، پھر تین ہزار کا ذکر آیا، اور ایک خاص شرط کے ساتھ پانچ ہزار فرشتوں کی نصرت کا وعدہ فرمایا گیا بشرطیکہ صبر و تقویٰ اختیار کیا جائے اور حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہو۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ بدر کے دن فرشتوں کے عمامے سفید تھے اور ان کے شملے کمر پر لٹک رہے تھے۔ (تفسیر طبری)

قرآن نے اس مدد کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ''اللہ نے اسے صرف تمہارے لئے خوشخبری اور تمہارے دلوں کے اطمینان کا ذریعہ بنایا، ورنہ مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، جو غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی''۔

مدد کی صورتیں

یعنی اصل مقصد فرشتوں سے میدانِ جنگ فتح کروانا نہ تھا، بلکہ اہلِ ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنا اور انہیں غلبے کی بشارت دینا تھا۔ یہ مدد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی کبھی دلوں میں اطمینان ڈال کر، کبھی ظاہری مشاہدے کے ذریعے، اور کبھی دشمن کے دلوں میں رعب بٹھا کر۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مواقع پر فرشتے براہِ راست شریک ہوئے ہوں، مگر اصل حکمت مجاہدین کے حوصلے کو بڑھانا تھی۔ کیونکہ اس دنیا میں جہاد اور امتحان انسانوں پر عائد ہے، اور فضیلت و درجات بھی انہی کے لئے مقرر ہیں۔

اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں ہی کے ذریعے تمام فتوحات کرا دیتا اور کفر کا نام و نشان مٹا دیتا، مگر اس کارگاہِ حیات میں ایمان و کفر دونوں کو جاری رکھا گیا ہے تاکہ انسانوں کا امتحان ہو اور آخرت میں جزا و سزا کا فیصلہ ہو۔

صبر و تقویٰ کی شرط

صبر و تقویٰ نصرت کی شرط جیسا کہ پہلے فرمایا گیا تھا:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا

''اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو دشمن کی سازشیں تمہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گی''۔

یہی شرط یہاں بھی بیان ہوئی کہ اللہ کی مدد صبر و پرہیزگاری کے ساتھ مشروط ہے۔ بدر میں اہلِ ایمان نے صبر و تقویٰ کا کامل مظاہرہ کیا، اس لئے غیر معمولی نصرت عطا ہوئی؛ جبکہ اُحد میں جب اس میں کمی آئی تو ویسی مدد ظاہر نہ ہوئی۔ اُحد میں فرشتوں کے نزول کے بارے میں کوئی قطعی دلیل موجود نہیں۔

پس پہلے اُحد کا ذکر ہوا، پھر بدر کی مثال بیان کی گئی، اور آگے دوبارہ اُحد ہی کے واقعے کی طرف رجوع کیا گیا تاکہ اہلِ ایمان کو یہ حقیقت سمجھا دی جائے کہ کامیابی کا اصل راز عددی برتری نہیں، بلکہ صبر، تقویٰ اور اللہ پر کامل بھروسا ہے۔

❁❁❁

جنگ اُحد کا نقشہ

آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۳۸ تک

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ
وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً
اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۫ وَلَمْ يُصِرُّوْا
عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ:

(۱۲۸) (اے نبی!) تمہارے اختیار میں کچھ نہیں، چاہے اللہ ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ (۱۲۹) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے سزا دیتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ (۱۳۰) اے ایمان والو! دوگنا، چوگنا بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱۳۱) اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (۱۳۲) اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۱۳۳) اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف، اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (۱۳۴) جو لوگ خوشحالی میں بھی خرچ کرتے ہیں اور تنگی میں بھی، اور غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۳۵) اور وہ لوگ جب کسی کھلے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ معاف کرے؟ اور وہ اپنے کیے

پر اصرار نہیں کرتے، جب کہ وہ جانتے بھی ہیں۔(۱۳۶) یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیک عمل کرنے والوں کا کیا ہی اچھا صلہ ہے!(۱۳۷) تم سے پہلے بھی بہت سے دور گزر چکے ہیں، تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔(۱۳۸) یہ (قرآن) سب لوگوں کے لیے واضح پیغام ہے، اور ہدایت و نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۳۸ تک

آیت نمبر ۱۲۸-۱۲۹) لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: ''(اے نبی!) تمہارے اختیار میں کچھ نہیں، چاہے اللہ ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے، کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے سزا دیتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے''۔

تفسیر یہاں سے غزوۂ اُحد کے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ مفسرین نے اسبابُ النزول میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے دوران رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے کے مبارک دانت شہید ہو گئے تھے اور آپ ﷺ کا چہرۂ انور زخمی ہو گیا تھا۔

چہرے مبارک سے خون بہہ رہا تھا اور آپ ﷺ اس حالت میں فرما رہے تھے: ''وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا، حالانکہ وہ انہیں ان کے رب کی طرف بلا رہا تھا''۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔۔ (آل عمران:۱۲۸) (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۰۲۷)

یعنی (اے نبی!) اس معاملے میں آپ کو کوئی اختیار نہیں؛ تمام امور اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہی چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دے کر ایمان نصیب فرما دے اور چاہے تو ان کے کفر کی وجہ سے انہیں عذاب میں مبتلا کرے۔ بعد میں تاریخ نے یہی منظر پیش کیا کہ غزوۂ اُحد میں جو لوگ مکہ سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے آئے تھے، ان میں سے بہت سے افراد بعد میں اسلام قبول کر گئے۔ انہی میں ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ بھی شامل تھے۔ یہاں تک کہ ابوسفیان کی اہلیہ ہند بنت عتبہ بھی مسلمان ہو گئیں، حالانکہ یہی وہ خاتون تھیں جنہوں نے حضرت حمزہؓ (رسول اللہ

ﷺ کے چچا) کے قتل میں کردار ادا کیا تھا۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ میدانِ اُحد میں جنگ کے دوران رسول اللہ ﷺ کے مبارک دانت شہید ہو گئے اور سر مبارک پر بھی زخم آیا۔ آپ ﷺ اپنے چہرے سے خون صاف کرتے جاتے اور فرماتے تھے: ''وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور دانت توڑ دیا، حالانکہ وہ انہیں اللہ کی طرف بلا رہا تھا''۔

(صحیح مسلم، حدیث:۱۷۹۱)

حضرت سالم اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ جب آپ ﷺ نمازِ فجر کی آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے اور ''**سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ**'' کہتے تو اس کے بعد بعض دشمنوں کے لئے بددعا کرتے اور فرماتے: ''اے اللہ! فلاں اور فلاں پر لعنت فرما''۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ **(آل عمران:۱۲۸، صحیح بخاری، حدیث:۴۰۶۹)**

آیت نمبر (۱۳۰-۱۳۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۡ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۣ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! دوگنا، چوگنا بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف، اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو لوگ خوشحالی میں بھی خرچ کرتے ہیں اور تنگی میں بھی، اور غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ نیک لوگوں

کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ لوگ جب کسی کھلے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ معاف کرے؟ اور وہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے، جب کہ وہ جانتے بھی ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیک عمل کرنے والوں کا کیا ہی اچھا صلہ ہے! تم سے پہلے بھی بہت سے دور گزر چکے ہیں، تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ یہ (قرآن) سب لوگوں کے لیے واضح پیغام ہے، اور ہدایت و نصیحت ہے متقیوں کے لئے''۔

تفسیر مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں مختلف روایات نقل کی ہیں۔ مجاہدؒ سے روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں لوگ مقررہ مدت تک کسی چیز کو ادھار فروخت کیا کرتے تھے۔ جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی تو قرض خواہ اصل رقم میں اضافہ کر دیتے اور یوں قرض بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے ایمان والو! سود کو کئی گنا بڑھا کر نہ کھاؤ۔

اسی طرح فریابیؒ نے حضرت عطاؒ سے نقل کیا ہے کہ قبیلہ ثقیف اور بنونظیر کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں قرض کا لین دین ہوا کرتا تھا۔ جب قرض کی مدت پوری ہو جاتی تو قرض دینے والے کہتے کہ اگر مدت بڑھانی ہے تو سود دینا ہوگا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ ''سود کو کئی گنا بڑھا کر نہ کھاؤ''۔ (تفسیر ابن عباس)

تقویٰ کا حکم

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابھی غزوۂ اُحد کے واقعات مکمل بیان نہیں ہوئے تھے کہ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے بعض گناہوں سے خاص طور پر بچنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی تقویٰ اختیار کرنے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کی ترغیب دی گئی اور فرمانبردار بندوں کے لیے آخرت میں بہترین اجر و ثواب کی بشارت سنائی گئی۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں سے جو لغزش ہوئی، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران:۱۵۵)

یعنی شیطان نے ان کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے انہیں لغزش میں ڈال دیا۔ یہاں عمومی طور پر گناہوں سے بچنے اور اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ گناہ عموماً مصیبتوں اور آزمائشوں کے آنے کا سبب بنتے ہیں، جبکہ فرمانبرداری اور تقویٰ مصیبتوں کے دور ہونے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور آخرت

میں مغفرت اور جنت کے حصول کا سبب بنتے ہیں۔

سود کا حکم

اسی ضمن میں خاص طور پر سود (ربا) لینے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ سود ایک ایسا گناہ ہے جو انسان کو دنیا پرست بنا دیتا ہے۔ سود خور کے دل سے اطاعتِ الٰہی اور خوفِ خدا رفتہ رفتہ ختم ہونے لگتا ہے، اور مال کی کثرت ہی اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم کا جذبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔

قرآنِ کریم میں یہ جو فرمایا گیا کہ ''سود کو کئی گنا بڑھا کر نہ کھاؤ'' تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تھوڑا سود لینا جائز ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سود کی معمولی مقدار بھی حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی سنگینی بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جو شخص جانتے بوجھتے سود کا ایک درہم کھاتا ہے، وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے''۔

(مشکوۃ المصابیح حدیث: ۲۸۲۵)

سودی قرض

سود پر قرض دینے والوں کا عمومی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اصل رقم سے زیادہ سود کی رقم بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عموماً ہر مہینے ایک مقررہ فیصد کے حساب سے سود لیا جاتا ہے، اور اگر مقررہ وقت پر ادائیگی نہ ہو تو اصل رقم اور سود دونوں پر مزید سود (چکرور دھی یا مرکب سود) لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب تک قرض مکمل ادا نہ ہو، ہر ماہ سود میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اصل رقم اور سود دونوں ملا کر مزید سود بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی اس آیت میں اسی ظالمانہ طریقۂ کار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاکہ کوئی فاسق سود خور یہ گمان نہ کرے کہ تھوڑا بہت سود لینا جائز ہے (العیاذ باللہ)۔ مزید یہ کہ یہاں غزوۂ اُحد کے بیان کے ساتھ سود کے ذکر میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جو شخص سود کی محبت میں مبتلا ہو جائے، اس کے لیے اللہ کے راستے میں جہاد اور قربانی کا جذبہ پیدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ مال کی محبت اس کے ایمان پر غالب آ جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں سود خوروں کے انجام کے بارے میں سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ **(البقرۃ: ۲۷۵)**

یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔

سود (Interest) کا نظام

سود کا نظام دراصل ایسا مالیاتی طریقہ ہے جس میں قرض دینے والا شخص یا ادارہ (جیسے بینک) اصل رقم کے علاوہ ایک مقررہ اضافی رقم وصول کرتا ہے۔ اس اضافی رقم کو سود یا رِبا کہا جاتا ہے۔ یہ اضافہ عام طور پر ایک طے شدہ شرح (Rate of Interest) کے مطابق لیا جاتا ہے اور قرض کی مدت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ عام طور پر سودی نظام اس طرح کام کرتا ہے:

۱۔ قرض دینا: کوئی فرد، کمپنی یا بینک کسی شخص یا ادارے کو ایک مخصوص رقم بطور قرض دیتا ہے۔

۲۔ شرحِ سود مقرر کرنا: قرض دیتے وقت ایک فیصد طے کیا جاتا ہے، مثلاً 10% سالانہ۔ مدت مقرر کرنا: قرض واپس کرنے کی ایک مدت مقرر ہوتی ہے، جیسے ایک سال یا پانچ سال۔

۳۔ اصل رقم کے ساتھ اضافہ: مقررہ مدت کے بعد قرض لینے والے کو اصل رقم کے ساتھ سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر: اگر کسی نے ۱/لاکھ روپے قرض لیا اور سود کی شرح 10% سالانہ ہے، تو ایک سال بعد اسے ایک لاکھ دس ہزار روپے واپس کرنے ہوں گے۔

مرکب سود (Compound Interest) کا نظام

جدید مالیاتی نظام میں اکثر مرکب سود استعمال ہوتا ہے۔ اس میں صرف اصل رقم پر ہی نہیں بلکہ پہلے سے جمع شدہ سود پر بھی مزید سود لگایا جاتا ہے۔ مثلا:

۱۔ اصل قرض: ۱/لاکھ روپے

۲۔ شرح سود: 10% پہلے سال کے بعد: 1,10,000

۳۔ دوسرے سال سود اس نئی رقم پر لگے گا۔ یعنی اب 10% سود، 1,00,000 پر نہیں بلکہ 1,10,000 روپے پر ہوگا۔

اس طرح قرض کی رقم مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات قرض لینے والا شخص پوری زندگی کوشش کے باوجود اسے مکمل طور پر ادا نہیں کر پاتا۔

سودی نظام کے بنیادی نقصانات

سودی نظام کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی سطح پر متعدد منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جن میں سے چند اہم نقصانات درج ذیل ہیں:

۱۔دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوتی ہے۔

سودی نظام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دولت رفتہ رفتہ امیر طبقے کے ہاتھوں میں جمع ہوجاتی ہے۔

- غریب لوگ قرض لیتے ہیں۔
- امیر لوگ سود لیتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر مزید امیر اور غریب مزید غریب ہوتا جاتا ہے۔

۲۔غربت میں اضافہ:

جب کوئی غریب شخص قرض لیتا ہے تو وہ پہلے ہی مالی مشکلات میں ہوتا ہے۔لیکن سود کی وجہ سے:

- اصل رقم کے ساتھ اضافی رقم بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔
- اگر وقت پر ادا نہ ہو تو سود بڑھتا رہتا ہے۔

اس طرح قرض لینے والا شخص غربت کے دائرے میں مزید پھنس جاتا ہے۔بعض اوقات کسان، مزدور یا چھوٹے کاروباری لوگ سود کے بوجھ کی وجہ سے اپنی زمین یا کاروبار بھی کھو دیتے ہیں۔

۳۔معاشی عدم مساوات (Economic Inequality)

سود کی وجہ سے معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھ جاتا ہے۔

- سرمایہ دار طبقہ بغیر محنت کے صرف پیسے سے پیسہ بناتا ہے۔
- جبکہ محنت کرنے والے لوگ قرض اور سود کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔

اس طرح معاشرے میں معاشی توازن ختم ہوجاتا ہے۔

۴۔معاشی استحصال (Exploitation)

سودی نظام دراصل کمزور طبقے کے استحصال کا سبب بنتا ہے۔مثلاً:

- کسان فصل کے لئے قرض لیتا ہے۔
- تاجر کاروبار کے لئے قرض لیتا ہے۔
- غریب لوگ ضروریات کے لئے قرض لیتے ہیں۔

لیکن سود کے بوجھ کی وجہ سے انہیں اپنی کمائی کا بڑا حصہ قرض ادا کرنے میں لگانا پڑتا ہے۔

۵۔معاشی بحران (Economic Crises)

دنیا کی کئی بڑی معاشی تباہیوں کے پیچھے سودی نظام کا کردار بتایا جاتا ہے۔مثلاً:

- مالیاتی بحران (Financial Crisis)
- بینکنگ بحران۔
- قرضوں کا بوجھ۔

جب قرض زیادہ بڑھ جاتا ہے اور لوگ ادا نہیں کر پاتے تو پورا معاشی نظام متأثر ہوتا ہے۔

۶۔محنت کے بجائے سرمائے کی حوصلہ افزائی

- سودی نظام میں پیسے سے پیسہ کمانا آسان ہوجاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:
- لوگ کاروبار اور پیداوار کے بجائے قرض اور سرمایہ کاری پر توجہ دیتے ہیں۔
- حقیقی معیشت (Real Economy) کمزور ہوجاتی ہے۔

۷۔اخلاقی اور سماجی نقصانات۔

- سود کی وجہ سے معاشرے میں کئی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:
- حرص اور لالچ بڑھ جاتا ہے۔
- انسانیت اور ہمدردی کم ہوجاتی ہے۔
- لوگ صرف منافع کے بارے میں سوچتے ہیں۔

سود اور غربت (Debt Trap)

سود اکثر ایک قرض کے جال (Debt Trap) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہ چکر اس طرح بنتا ہے:

۱۔غریب شخص قرض لیتا ہے۔

۲۔سود کے ساتھ قرض بڑھ جاتا ہے۔

۳۔قرض ادا کرنے کے لئے دوبارہ قرض لینا پڑتا ہے۔

۴۔قرض مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔

- اس طرح انسان ہمیشہ قرض کے بوجھ تلے رہتا ہے۔

اسلامی معاشی نظام کا متبادل

اسلام نے سود کو سختی سے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ معاشی ظلم اور ناانصافی کا سبب بنتا ہے۔اس کے مقابلے میں اسلام نے ایسے طریقے دئے ہیں جن میں:

(۱) مشارکت (Partnership)، (۲) مضاربت (Profit Sharing)، (۳) زکوٰۃ، (۴) صدقہ جیسے اصول شامل ہیں۔ ان طریقوں میں منافع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا ہوتا ہے، جس سے معاشرے میں انصاف اور توازن قائم رہتا ہے۔

سودی نظام اور عالمی بینکاری (World Banking System)

جدید عالمی بینکاری نظام بنیادی طور پر سود (Interest) کے اصول پر قائم ہے۔ دنیا کے بیشتر مرکزی بینک، تجارتی بینک اور مالیاتی ادارے قرض دینے اور سرمایہ کاری کے عمل میں سود کو بنیادی ذریعہ بناتے ہیں۔ مرکزی بینک (Central Banks) جیسے کسی ملک کا ریزرو بینک یا دیگر عالمی مالیاتی ادارے شرحِ سود (Interest Rate) طے کرتے ہیں، جس کے مطابق بینک حکومتوں، کمپنیوں اور افراد کو قرض فراہم کرتے ہیں۔

اسی طرح عالمی سطح پر بڑے مالیاتی ادارے جیسے عالمی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund) اور عالمی بینک (World Bank) بھی مختلف ممالک کو ترقیاتی منصوبوں یا معاشی استحکام کے لیے قرض دیتے ہیں، جن پر سود یا اضافی مالیاتی شرائط عائد ہوتی ہیں۔

اس نظام میں قرض لینے والے ممالک اور افراد کو اصل رقم کے ساتھ سود بھی ادا کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر ترقی پذیر ممالک پر قرضوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اور عالمی معیشت میں سرمایہ اور طاقت کا بڑا حصہ مالیاتی اداروں اور سرمایہ دار طبقات کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتا ہے۔

تقویٰ (پرہیزگاری) کی تاکید

سود سے بچنے کا حکم دینے کے بعد قرآنِ کریم میں تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی اور اسے حقیقی کامیابی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسی کے ساتھ جہنم کی آگ سے بچنے کی ہدایت دی گئی۔ دوزخ سے بچنے کا اصل طریقہ یہی ہے کہ انسان گناہوں سے مسلسل پرہیز کرتا رہے، کیونکہ ہر گناہ دراصل انسان کو جہنم کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔ لہٰذا گناہوں سے بچنا ہی درحقیقت جہنم سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

قرآنِ کریم میں یہ بھی فرمایا گیا: اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ

یعنی دوزخ کی آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم دراصل کافروں کا اصل ٹھکانہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان گناہوں میں مبتلا ہو کر اس انجام تک پہنچ جائے تو یہ اس کے لئے نہایت شرم اور افسوس کی بات ہے۔

دشمن کی جگہ پر جانا تو ویسے ہی مناسب نہیں، پھر اگر انسان خود اپنے عمل سے ایسی راہ اختیار کرے جو اسے سخت ترین عذاب تک پہنچا دے تو یہ انتہائی نقصان کا سبب ہے۔اس کے مقابلے میں مومن کو چاہیے کہ وہ ان مخلص بندوں کی پیروی اور رغبت اختیار کرے جو ہمیشہ جنت کے اعمال میں مصروف رہتے ہیں۔

جنت دراصل متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے، جیسا کہ انہی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔لہٰذا تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کر کے جنت کا مستحق بننا ہی مومن کا اصل مقام اور مقصد ہونا چاہیے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران:۱۳۲)

یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کرنے کا بنیادی راستہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل فرمانبرداری ہے۔پھر ارشاد فرمایا: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ یعنی اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنے کی کوشش کرو۔اس ارشاد میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مومن کو چاہئے کہ وہ نیکیوں اور اطاعت کے کاموں میں سستی کے بجائے سبقت لے جانے کی کوشش کرے اور اللہ کی بخشش اور جنت کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو''۔صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون سے گناہ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

۱۔اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (شرک کرنا)۔

۲۔جادو کرنا۔

۳۔کسی ایسے انسان کو ناحق قتل کرنا جس کی جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

۴۔سود کھانا۔

۵۔یتیم کا مال کھانا۔

۶۔میدانِ جنگ میں کافروں کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا

۷۔پاک دامن اور بے خبر مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔ (صحیح بخاری، حدیث:۲۷۶۶؛ صحیح مسلم، حدیث:۸۹)

جنت کی وسعت

قرآنِ کریم میں جنت کی عظمت اور وسعت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران: ۱۳۳) یعنی جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔اس ارشاد کا مقصد یہ بتانا ہے

کہ جنت کی وسعت انسان کے تصور سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ چونکہ انسان کی نگاہ میں آسمان اور زمین ہی سب سے بڑی اور وسیع مخلوقات ہیں، اس لیے جنت کی عظمت سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر ان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔
(روح المعانی، جلد ۴، ص ۵۴)

حقیقت یہ ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ حدیثِ نبوی میں بیان ہوا ہے کہ جنت میں سب سے کم درجے کے شخص کو بھی اتنی جگہ عطا کی جائے گی جتنی یہ پوری دنیا ہے، بلکہ اس جیسی دس گنا اور اس سے بھی زیادہ وسعت دی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے کم درجے کے جنتی کو دنیا کے برابر جگہ دی جائے گی اور اس جیسی دس گنا مزید عطا کی جائے گی''۔ **(صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۶)**

جس خالق نے آسمانوں اور زمین جیسی عظیم مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اس کی قدرت کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں کہ وہ ان سے بھی کہیں بڑی مخلوق پیدا فرما دے۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ زمین یا آسمان میں ہمیں جنت یا دوزخ نظر نہیں آتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک نہ آسمان کی حقیقت تک پہنچ سکا ہے اور نہ زمین کے تمام اسرار سے واقف ہو سکا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ انسان زمین کے بیشتر حصوں تک پہنچ بھی گیا ہو، تب بھی قرآن کے بیان کے مطابق صرف ایک زمین نہیں بلکہ سات زمین اور سات آسمان ہیں، اور ان کے درمیان بے شمار وسعتیں موجود ہیں جن تک انسان کی رسائی نہیں۔

لہٰذا یہ سوال اٹھانا کہ جنت اور دوزخ کہاں ہیں، دراصل انسانی محدود علم کی دلیل ہے، کیونکہ جو چیز آسمانوں اور زمین کے دائرے سے باہر ہو، اسے آسمان یا زمین کے اندر تلاش کرنا ہی درست نہیں۔

مفسرین نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب جنت کی چوڑائی ہی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو اس کی لمبائی کا اندازہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا، کیونکہ عام طور پر لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ **(معالم التنزیل، جلد ۱، ص ۳۵۱)**

اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا

قرآنِ کریم میں متقیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ۔ **(آل عمران: ۱۳۴)**

یعنی وہ لوگ جو خوش حالی اور تنگ دستی، دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنا عظیم ترین نیکیوں میں سے ہے۔ مومن کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے۔ جس طرح ایک مالدار شخص کے لیے ایک ہزار روپے میں سے ایک روپیہ خرچ کرنا آسان ہے، اسی طرح ایک

غریب کے لیے ایک روپیہ میں سے ایک پیسہ خرچ کرنا اسی قدر قیمتی ہے۔ اصل قدر مال کی مقدار میں نہیں بلکہ نیت اور اخلاص میں ہوتی ہے۔

جولوگ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے کا حقیقی شوق رکھتے ہیں وہ صرف خوش حالی میں ہی نہیں بلکہ تنگ دستی اور مصیبت کے وقت بھی خرچ کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ضرورتوں کو پیچھے رکھ کر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی صفت کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں فرمایا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔(الحشر:۹)

یعنی وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود شدید ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا صرف مالداروں کا کام نہیں بلکہ غریب بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ درحقیقت سخاوت ایک اعلیٰ اخلاقی صفت اور مزاج ہے جس کا تعلق صرف مالداری سے نہیں بلکہ دل کی فراخی سے ہے۔ جسے یہ صفت نصیب ہوجائے وہ ہر حالت میں خرچ کرنے کا راستہ تلاش کرلیتا ہے۔

صدقہ کی وسعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کے مفہوم کو بہت وسیع انداز میں بیان فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''انسان کے جسم کے ہر جوڑ پر روزانہ صدقہ لازم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی مدد کرے، اسے سواری پر سوار کرادے یا اس کا سامان اٹھا کر رکھ دے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے، نماز کی طرف اٹھایا گیا ہر قدم بھی صدقہ ہے اور کسی کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث:۲۸۹۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ صرف مال خرچ کرنے کا نام نہیں بلکہ ہر نیکی اور بھلائی کا کام بھی صدقہ کے حکم میں شامل ہے۔

حقیقی طاقت اور غصہ پر قابو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ حقیقی پہلوان وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے''۔ (صحیح بخاری، حدیث:۶۱۱۴)

قرآنِ کریم میں محسنین کا ذکر بھی آیا ہے۔ محسنین وہ لوگ ہیں جو نیکی کے کام صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتے ہیں، نہ کہ دکھاوے یا ریاکاری کے لیے۔ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل کرتے ہیں وہی درحقیقت محسنین کہلاتے ہیں۔

غصہ پی جانے کی فضیلت

متقیوں کی ایک اہم صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے: ''وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ'' یعنی وہ لوگ جو اپنے غصے کو پی جاتے ہیں اور اس کے اثرات پر عمل نہیں کرتے۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک اس گھونٹ سے بہتر کوئی گھونٹ نہیں جو بندہ غصے کا گھونٹ پی جائے اور اسے اللہ کی رضا کے لئے برداشت کرے''۔ **(مشکوۃ المصابیح حدیث نمبر:۵۱۱۶)**

● ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور آگ کو پانی ہی بجھاتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لے''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۷۸۴)**

● حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر اس طرح غصہ ختم ہو جائے تو بہتر ہے، ورنہ لیٹ جائے''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۷۸۲)**

● حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنی زبان کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور جو اپنے غصے کو روک لے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنا عذاب روک لیں گے''۔ (مشکوۃ المصابیح؛ اصل روایت طبرانی وغیرہ) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جہنم کی آگ سے بچو، چاہے کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۴۱۷)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نصیحت کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''غصہ نہ کیا کرو''۔ وہ بار بار نصیحت طلب کرتا رہا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مرتبہ یہی فرماتے رہے: ''غصہ نہ کیا کرو''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۶۱۱۶)**

معاف کرنے کی فضیلت

متقیوں کی ایک اور صفت یہ بیان کی گئی ہے: **وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** یعنی وہ لوگ جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

معاف کرنا نہایت بلند اخلاقی صفت ہے۔ اس میں ہر قسم کے ظلم کو معاف کرنا شامل ہے، خواہ کسی نے مال ہڑپ کیا ہو، حق روک لیا ہو، مار پیٹ کی ہو، غیبت یا بہتان لگایا ہو۔ ایسے تمام معاملات میں اگر انسان قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دے تو یہ اعلیٰ درجے کی اخلاقی عظمت ہے اور اس پر عظیم اجر و ثواب ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ

سے عرض کیا: اے میرے رب! آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ شخص جو قدرت رکھنے کے باوجود معاف کردے''۔ (مشکوۃ المصابیح حدیث نمبر: ۵۱۲۰)

محسنین اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں

اللہ تعالیٰ نے متقیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نیکی اور بھلائی کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ لفظ ''المحسنین'' جمع ہے اور اس کا مادہ ''احسان'' ہے۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام کو بہترین انداز اور خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ عبادت میں احسان کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیثِ جبرئیل میں واضح فرمایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۰؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۹)

بندوں کے ساتھ معاملات میں احسان یہ ہے کہ انسان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کرے اور ان کے حقوق ادا کرے۔ اس میں یہ باتیں شامل ہیں کہ قرض لینے دینے میں نرمی برتے، بڑوں کا احترام کرے، چھوٹوں پر شفقت کرے، یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کی مدد کرے، ضرورت مندوں کو کھلائے پلائے اور پہنائے، اور دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ یہی حقیقی احسان اور اعلیٰ اخلاق کی علامت ہے۔

توبہ اور استغفار کی فضیلت

اس کے بعد قرآنِ کریم میں ان مومن بندوں کی تعریف کی گئی ہے جو گناہ ہو جانے کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ یعنی جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے یا وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں اور اپنے گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔

یہ آیت توبہ کی ایک اہم شرط کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ توبہ صرف زبان سے ''استغفار'' کہہ دینے کا نام نہیں بلکہ اس میں یہ عزم بھی شامل ہونا چاہئے کہ آئندہ اس گناہ کو دوبارہ نہیں دہرایا جائے گا۔ اگر کوئی شخص زبان سے توبہ کرتا رہے لیکن گناہ کے کام جاری رکھے تو یہ حقیقی توبہ نہیں کہلائے گی۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی گناہ معاف کرنے والا نہیں

اسی سلسلے میں قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا: وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ کے سوا کون ہے جو

گناہوں کو معاف کرسکتا ہے؟

اس آیت میں مومنوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ گناہوں کی معافی کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ آیت اس غلط عقیدے کی بھی تردید کرتی ہے جو بعض لوگوں میں پایا جاتا تھا کہ انسان اپنے گناہ کسی دوسرے انسان سے معاف کرا سکتا ہے۔ بعض عیسائی فرقوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ گناہ کرنے والا شخص چرچ میں جا کر پادری یا پوپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بات عقل اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے کہ گناہ اللہ کا ہو اور معاف کوئی انسان کر دے۔

نیک بندوں کا عظیم اجر

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان نیک بندوں کے اجر اور انجام کو بیان فرمایا: أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ یعنی ایسے لوگوں کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس عظیم انعام کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ یعنی عمل کرنے والوں کے لئے یہ کتنا ہی بہترین بدلہ ہے۔

نصیحت اور عبرت

اس کے بعد قرآنِ کریم میں ایک اہم نصیحت کرتے ہوئے فرمایا گیا: قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ یعنی تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں گزر چکی ہیں۔

پھر فرمایا کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلایا، انکار اور سرکشی اختیار کی، اور بالآخر ہلاکت اور تباہی کا شکار ہوگئیں۔

اگر انسان زمین میں سفر کرے اور تاریخ کے آثار کا مطالعہ کرے تو اسے ایسی بے شمار قوموں کے نشانات ملیں گے جو کبھی بڑی طاقت اور شان وشوکت کی مالک تھیں، مگر اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے مٹ گئیں۔ ان کے کھنڈرات اور آثار آج بھی دنیا میں موجود ہیں، جو اہلِ بصیرت کے لیے ایک بڑی نصیحت اور عبرت کا سامان ہیں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۸ تک

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ
الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ
مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ
حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ
كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا
رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ
يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ
مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ترجمہ:

(۱۳۹) تم نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم سچے مؤمن ہو۔ (۱۴۰) اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے، تو تمہارے مخالفوں کو بھی ایسا ہی زخم (بدر میں) لگ چکا ہے۔ اور ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تا کہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا درجہ دے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۴۱) اور تا کہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔ (۱۴۲) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے، جب کہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو جانچا ہی نہیں؟ (۱۴۳) اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ تم اس کا سامنا کرو، تو لو! اب تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا، جب کہ تم خود دیکھ رہے تھے۔ (۱۴۴) محمد تو صرف ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی ایسا کرے گا، وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ شکر

گزاروں کو جلد ہی جزا دے گا۔ (۱۴۵) کوئی جان اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں مرتی، اور موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔ جو دنیا کا انعام چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا انعام چاہے، ہم اسے اس میں سے دیتے ہیں، اور ہم شکر گزاروں کو جلد ہی بدلہ دیں گے۔ (۱۴۶) کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والے لڑے، نہ وہ کمزور پڑے ان مصیبتوں کی وجہ سے جو اللہ کی راہ میں آئیں، نہ وہ بزدل ہوئے، اور نہ وہ جھکے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۴۷) اور ان کا قول یہی تھا کہ: اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں زیادتیوں کو بخش دے، اور ہمارے قدم جما دے، اور کافروں کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما۔ (۱۴۸) تو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی انعام دیا اور آخرت کا بہترین صلہ بھی، اور اللہ نیک عمل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۸ تک

آیت نمبر (۱۳۹) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

ترجمہ: ''تم نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم سچے مؤمن ہو''۔

ایمان والوں کو بلندی

تفسیر علامہ واحدیؒ نے اپنی کتاب اسبابُ النزول (ص ۱۲۰) میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمانوں کو وقتی طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تو مشرکینِ مکہ کی فوج دوبارہ حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھی۔ اس وقت خالد بن ولید (جو اس وقت تک اسلام قبول نہیں کر پائے تھے اور مشرکین کے لشکر میں شامل تھے) گھڑسوار دستے کے ساتھ اس ارادے سے آگے بڑھے کہ پہاڑ کے اوپر سے چڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا جائے۔ اس نازک اور خطرناک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور نہایت عاجزی کے ساتھ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ لَا يَعْلُوْنَ عَلَيْنَا، اَللّٰهُمَّ لَا قُوَّةَ لَنَا اِلَّا بِكَ، اَللّٰهُمَّ لَيْسَ يُعْبَدُ بِهٰذِهِ الْبَلْدَةِ غَيْرُ هٰؤُلَاءِ النَّفَرِ۔

ترجمہ: ''اے اللہ! انہیں ہم پر غلبہ حاصل نہ ہونے دے۔ اے اللہ! ہمیں تیرے سوا کسی کی قوت و طاقت حاصل نہیں۔ اے اللہ! اس بستی میں ان چند لوگوں کے سوا کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں''۔

اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے وہ آیات نازل فرمائیں جن میں اہلِ ایمان کو تسلی اور حوصلہ عطا کیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے چند بہادر تیرانداز پہاڑ پر چڑھ گئے اور انہوں نے دشمن کی گھڑسوار جماعت پر تیروں کی بارش کر دی۔ اس اچانک اور شدید حملے سے مشرکین کے گھڑسوار منتشر ہو گئے اور پسپا ہو کر واپس چلے گئے۔ حالانکہ مسلمانوں

کے دل پہلے ہی جنگ کی شدت سے متأثر اور ہمت کسی حد تک کمزور ہو چکی تھی، مگر ایمان کی قوت نے انہیں دوبارہ سنبھال لیا۔ انہوں نے ثابت قدمی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور دشمن کو تیروں کی بوچھار سے بھگا دیا۔ ان آیات کے اندر دراصل یہ بنیادی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ عزت، بلندی اور حقیقی کامیابی کی اصل بنیاد ایمان ہے۔

یہی وہ قوت ہے جو کمزور حالات میں بھی اہلِ ایمان کو مضبوط بنا دیتی ہے۔ اس لیے قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے یہ دائمی ہدایت ہے کہ اگر وہ کامیابی اور سربلندی چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے ایمان کا جائزہ لیں اور اسے مضبوط کریں، کیونکہ کامیابی کا حقیقی راز ایمان اور اللہ پر کامل بھروسہ ہی میں پوشیدہ ہے۔

آیت نمبر (۱۴۰-۱۴۳) اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: ''اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے، تو تمہارے مخالفوں کو بھی ایسا ہی زخم (بدر میں) لگ چکا ہے۔ اور ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا درجہ دے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے، جب کہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو جانچا ہی نہیں؟ اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ تم اس کا سامنا کرو، تو لو! اب تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا، جب کہ تم خود دیکھ رہے تھے''۔

مسلمانوں کو تسلی

تفسیر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (اور تاکہ وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مقام عطا فرمائے)۔

اس آیت کے پس منظر میں مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ابنِ ابی حاتم نے حضرت عکرمہؒ سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ اُحد کے دن جب ایک افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو مدینہ کی عورتیں گھبرا کر حالات کی خبر لینے کے لئے نکل پڑیں۔ اسی دوران انہوں نے دیکھا کہ دو آدمی اونٹ پر سوار آ رہے ہیں۔ ایک عورت نے ان

سے پوچھا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کیا خبر ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں''۔ یہ سن کر وہ عورت بے اختیار بول اٹھی: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں تو اب کسی اور بات کا کوئی غم نہیں''۔

● اسی واقعے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے شہادت کا بلند مرتبہ عطا فرمادے: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ۔ (تفسیر ابن عباس)

● اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ۔

اسباب نزول

اس آیت کے بارے میں ابن ابی حاتم نے اوفی کے واسطے سے حضرت ابن عباس ؓ کی روایت نقل کی ہے کہ بعض صحابۂ کرام یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش ہمیں دوبارہ ایسا موقع ملے جیسے بدر کے دن ملا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ پھر کفار کے ساتھ اسی طرح مقابلہ ہو، تاکہ یا تو وہ دشمن کو شکست دے کر زیادہ اجر وثواب حاصل کریں، یا شہادت پا کر جنت کے مستحق بن جائیں، یا زندہ رہیں تو مالِ غنیمت کے ساتھ واپس لوٹیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ اُحد کے دن انہیں اس آزمائش سے دوچار کر دیا۔ مگر اس کٹھن مرحلے میں صرف وہی لوگ ثابت قدم رہ سکے جنہیں اللہ تعالیٰ نے استقامت عطا فرمائی۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

''تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے، پھر جب وہ تمہارے سامنے آئی تو تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے''۔

● اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف ایک رسول ہیں)۔

غزوۂ احد کے دن

ابن منذرؒ نے حضرت عمر فاروق ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے دن ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہو گئے تھے۔ میں پہاڑ کی طرف چڑھا تو ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ جو شخص بھی یہ کہے گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اسی دوران اچانک میں نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ۔

● اسی مضمون کو ابن ابی حاتمؒ نے ربیعہؒ سے نقل کیا ہے کہ جب غزوۂ اُحد میں مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید اور زخمی ہو گئے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ اس پر بعض نے کہا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے نبی ہیں تو آپ کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ جبکہ کچھ اہلِ

بصیرت نے کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ شہید بھی ہو گئے ہوں تو جس دین کے لیے انہوں نے جہاد کیا ہے تم بھی اسی کے لیے جہاد کرتے رہو، یہاں تک کہ فتح حاصل ہو یا تم شہادت پالو۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ۔

اسی طرح امام بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں ابوالخزیمہ سے روایت نقل کی ہے کہ مہاجرین میں سے ایک شخص ایک انصاری کے پاس سے گزرا، جو اپنے بدن سے خون صاف کر رہا تھا۔ مہاجر نے کہا:

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے ہیں؟''

انصاری نے جواب دیا: ''اگر ایسا ہو بھی گیا ہو تو آپ ﷺ اپنے اصل مقام (یعنی اپنے رب کے پاس) پہنچ گئے ہیں، مگر تم اپنے دین کی حمایت میں لڑتے رہو''۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن راہویہ نے اپنی مسند میں امام زہریؒ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے دن شیطان نے بلند آواز سے پکار کر یہ افواہ پھیلائی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں پہلا شخص تھا جس نے میدان میں دور سے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔ میں نے آپ ﷺ کو دیکھتے ہی بلند آواز سے پکار کر کہا: ''لوگو! رسول اللہ ﷺ یہاں ہیں''۔ اسی پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی۔ **(تفسیر ابن عباس)**

ان آیات میں دراصل مسلمانوں کو تسلی اور حوصلہ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے تھے۔

حالات میں تبدیلی

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ دنیا کے حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ زمانے کے دن گردش کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی فریق کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔ چنانچہ گزشتہ سال بدر میں تمہارے دشمن مغلوب ہوئے تھے، اور اس سال اُحد میں وقتی طور پر انہیں برتری حاصل ہو گئی۔

یہی دنیا کا دستور ہے کہ کامیابی اور ناکامی کے دن باری باری آتے رہتے ہیں، تاکہ اہلِ ایمان کی آزمائش ہو اور ان کے درجات بلند کیے جائیں۔

غزوۂ اُحد کی حکمتیں

غزوۂ اُحد کے واقعات کے بعد قرآنِ کریم نے اس جنگ میں پوشیدہ چند اہم حکمتوں کو بیان کیا ہے، تاکہ اہلِ ایمان اس واقعے سے سبق حاصل کریں اور سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہر واقعے کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے۔

اہل ایمان کی پہچان

ایمان والوں کی پہچاننا حکمتوں میں پہلی حکمت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ ظاہر فرمادے کہ حقیقی اہلِ ایمان کون ہیں۔ مصیبت اور آزمائش کے مواقع پر ہی انسانوں کے باطن کا حال واضح ہوجاتا ہے۔ ایسے وقت میں مخلص اور غیر مخلص کے درمیان فرق کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد میں یہی ہوا کہ منافقین کا گروہ پہلے ہی واپس لوٹ گیا، جبکہ سچے اہلِ ایمان اگرچہ زخموں اور شکست سے دوچار ہوئے، مگر اس کے باوجود وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ڈٹے رہے اور میدان چھوڑ کر نہیں گئے۔

شہادت کا مقام ومرتبہ

شہادت کے مقام تک پہنچانا یعنی دوسری حکمت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز کرنا چاہتا تھا۔ شہادت دراصل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر ومنزلت وہی لوگ صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں قرآن وحدیث پر کامل ایمان ہو۔ شہید اللہ کے نزدیک بلند مقام رکھتا ہے اور اس کے درجات نہایت عظیم ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کی تطہیر

اہلِ ایمان کی تطہیر یعنی تیسری حکمت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ مصیبتوں پر صبر کرنے اور مشکلات برداشت کرنے سے انسان کے اخلاق وکردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ آزمائشیں انسان کو روحانی طور پر مضبوط بناتی ہیں اور اس کے اعمال میں اخلاص اور پاکیزگی پیدا کرتی ہیں۔

کافروں کا انجام

کافروں کا انجام یعنی چوتھی حکمت یہ بیان فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو بالآخر مٹا دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس معرکے میں انہیں وقتی کامیابی حاصل ہوئی، مگر اس کامیابی کے غرور میں وہ آئندہ بھی اسی طرح کے منصوبے بنا کر مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں گے۔ اس طرح وہ بالآخر اپنی ہلاکت اور تباہی کا سامان خود ہی پیدا کریں گے۔

علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی (جلد ۴، ص ۷۰) میں فرماتے ہیں کہ یہاں ''کافرین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوۂ اُحد کے موقع پر جنگ کے لئے آئے اور اپنے کفر پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ان سب کو نیست ونابود کردیا۔

وضاحت

پھر وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب کبھی کافروں کو وقتی فتح حاصل ہوتی ہے تو شیطان انہیں دھوکے میں ڈال دیتا ہے اور ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے کفر پر جمے رہیں، کیونکہ کامیابی انہی کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر کار انہیں ہلاک کر دیتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب کے مستحق بن جاتے ہیں۔

جہاد اور صبر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ

ترجمہ: ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ تم میں سے جہاد کرنے والے کون ہیں اور صبر کرنے والے کون ہیں''۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم جنت کے طالب ہو تو یہ جان لو کہ جنت کا حصول آسان نہیں۔ اس کے لیے محنت، مشقت، جہاد اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ جنت کے امیدوار ہیں انہیں ان تمام آزمائشوں کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہئے اور اللہ کی راہ میں اپنی جان اور توانائی لگانے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی تھی کہ وہ تمہیں آزمائش میں ڈالے، تاکہ تمہاری جہاد والی محنت اور صبر کی حقیقت ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ تم واقعی کس قدر ثابت قدم ہو۔

شہادت کی تمنا

شہادت کی تمنا یعنی آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ **ترجمہ**: ''اور تم تو موت کے سامنے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے، سو اب تم نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا''۔

اس آیت میں ان صحابۂ کرامؓ کو خطاب کیا گیا ہے جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں جنگ کا اندازہ نہ تھا، اس لیے وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں جا سکے۔ جب بدر میں جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل ہوئی اور بعض صحابہؓ کو شہادت نصیب ہوئی تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے انہیں سخت افسوس ہوا۔ وہ کہنے لگے: کاش ہم بھی بدر میں شریک ہوتے اور شہادت کا عظیم مقام حاصل کرتے۔ چنانچہ جب

غزوۂ اُحد کا موقع آیا تو انہیں جہاد میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

ابتدا میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی، لیکن بعد میں حالات بدل گئے اور مشرکین نے دوبارہ حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کی صفیں متزلزل ہوگئیں۔ اس موقع پر بعض ایسے لوگ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے جو پہلے شہادت کی تمنا کر رہے تھے۔ (روح المعانی، جلد ۴، ص ۱۷)

دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرنا

اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اہم ہدایت بھی ارشاد فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت طلب کرو، لیکن اگر دشمن سے مقابلہ پیش آجائے تو ثابت قدم رہو، اور یہ جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۹۶۶ (کتاب الجہاد والسیر)

یہ حدیث ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ مسلمان کو آزمائش کی خواہش نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ہمیشہ اللہ سے سلامتی اور عافیت مانگنی چاہئے۔ تاہم اگر حق کی راہ میں آزمائش آ ہی جائے تو پھر ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ کے نزدیک عزت اور جنت انہی لوگوں کے لئے ہے جو ایمان، صبر اور جہاد کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہتے ہیں۔

آیت نمبر (۱۴۴-۱۴۵) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

ترجمہ: ''محمد تو صرف ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی ایسا کرے گا، وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ شکر گزاروں کو جلد ہی جزا دے گا۔ کوئی جان اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں مرتی، اور موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔ جو دنیا کا انعام چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا انعام چاہے، ہم اسے اس میں سے دیتے ہیں، اور ہم شکر گزاروں کو جلد ہی بدلہ دیں گے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفات کی افواہ

تفسیر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ غزوۂ اُحد کے آغاز میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن جب دشمن کی شکست ظاہر ہونے لگی تو وہ تیر انداز، جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پہاڑی پر متعین فرمایا تھا اور تاکید کی تھی کہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں، لیکن جنگ کے خاتمے کی امید میں اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرکین نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا اور ستر صحابۂ کرامؓ شہید ہو گئے۔ انہی شہداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ بھی شامل تھے، اور وہ مجاہدین بھی شہید ہوئے جو پہاڑی پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے۔

اس معرکے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سخت تکلیف پہنچی۔ آپ کے مبارک چہرے پر زخم آئے اور ایک تیر لگنے سے آپ کے سامنے کے مبارک دانت شہید ہو گئے۔ اسی دوران ایک مشرک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت حضرت مصعب بن عمیرؓ جھنڈا اٹھائے ہوئے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع میں بہادری سے مقابلہ کیا، مگر اسی کوشش میں خود شہید ہو گئے۔ دشمن نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو چکے ہیں، چنانچہ اس نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا ہے''۔ بعض روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ اس اعلان کو ابلیس نے پھیلایا۔ **(سیرت ابن ہشام)**

یہ آواز سنتے ہی مسلمانوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور کچھ لوگ گھبرا کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اس نازک موقع پر بعض منافقین نے مسلمانوں کو بہکاتے ہوئے کہا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کر دئے گئے ہیں تو اب اپنے اپنے سابقہ دین کی طرف لوٹ جاؤ۔ منافقین تو پہلے ہی دل سے اسلام کے وفادار نہ تھے، وہ صرف ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔ اس لیے جب یہ موقع آیا تو انہوں نے سچے مسلمانوں کو بھی اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار

● اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند آواز سے پکارا: ''اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ'' (اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔) یہ آواز سن کر تقریباً تیس صحابۂ کرامؓ آپ کے گرد جمع ہو گئے اور جان کی بازی لگا کر آپ کی حفاظت کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے مشرکین کو پسپا کر دیا۔ **(سیرت ابن ہشام، بخاری حدیث نمبر: ۴۰۶۳)**

اس موقع پر بعض صحابۂ کرامؓ نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس قدر کثرت سے تیر چلاتے رہے کہ ان کی کمان کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے انہیں تیر دیتے

جاتے اور فرماتے جاتے:

''اِرْمِ سَعْدُ، فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي'' ''اے سعد! تیر چلاتے رہو، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں''۔

(صحیح بخاری حدیث نمبر: ۴۰۵۵)

حضرت طلحہؓ کا ہاتھ

اسی طرح حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا۔ اس جدوجہد میں ان کے ہاتھ پر ایسا شدید زخم آیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مفلوج ہو گیا۔

ایک اور صحابیؓ حضرت قتادہؓ کی آنکھ پر تیر لگنے سے اپنے حلقے (آنکھ کے گڑھے) سے نکل کر چہرے پر آ گری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ان کی آنکھ کو دوبارہ اس کے مقام پر رکھ دیا، اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر اور تندرست ہو گئی۔ (مجمع الزوائد، حدیث نمبر ۱۴۰۹۸)

حضرت کعبؓ کی پکار

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دوبارہ جمع ہونے لگے تو سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا۔ ان کی نظر آپ کی مبارک آنکھوں پر پڑی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بدستور روشن اور درخشاں ہیں۔ انہوں نے خوشی سے بلند آواز میں پکار کر کہا: ''لوگو! خوشخبری سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ فرمایا، غالباً اس مصلحت کے تحت کہ دشمن کو اس بات کی اطلاع نہ ہو اور وہ دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ مگر حضرت کعبؓ کی آواز سن کر صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ گئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم لوگ میدان چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے ماں باپ اور ہماری اولاد آپ پر قربان ہوں۔ جب ہم نے یہ خبر سنی کہ آپ شہید کر دئے گئے ہیں تو اس صدمے سے ہمارے دلوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا اور ہم پر ایک طرح کی بے حسی چھا گئی''۔

اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ یعنی ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف ایک رسول ہیں''۔ اس آیت کے ذریعے مسلمانوں کو یہ حقیقت یاد دلائی گئی کہ دینِ اسلام کسی ایک شخصیت کے وجود پر موقوف نہیں، بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

حضرت انس بن نضرؓ کی شہادت

جب میدانِ اُحد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو مسلمانوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ بعض لوگ غم اور حیرت کے باعث بیٹھ گئے اور ان پر ایک طرح کی بے بسی طاری ہو گئی۔ اسی موقع پر حضرت انس بن نضرؓ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تم لوگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں، اب ہم کیا کریں؟'' یہ سن کر حضرت انس بن نضرؓ نے نہایت جرأت اور ایمانی غیرت کے ساتھ فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کے بعد زندہ رہ کر تم کیا کرو گے؟ اٹھ کھڑے ہو اور اسی دین پر جان دے دو جس دین پر رسول اللہ ﷺ نے جان دی ہے''۔

پھر انہوں نے بلند آواز میں کہا: ''قُومُوا فَمُوتُوا عَلَى مَا مَاتَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ'' ''اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور اسی مقصد پر جان دے دو جس مقصد پر رسول اللہ ﷺ نے جان دی ہے''۔ یہ کہہ کر وہ پوری بہادری کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھے اور مسلسل لڑتے رہے، یہاں تک کہ راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔

حضرت ثابتؓ کی حوصلہ افزا تقریر

اسی موقع پر حضرت ثابتؓ نے بھی صحابۂ کرامؓ کو اسی طرح کا حوصلہ دلایا۔ انہوں نے فرمایا:

''اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ ﷺ قَدْ قُتِلَ فَإِنَّ اللهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ، فَقَاتِلُوا عَنْ دِينِكُمْ، فَإِنَّ اللهَ مُطَهِّرُكُمْ وَنَاصِرُكُمْ'' یعنی: ''اگر محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو کیا ہوا، اللہ تو ہمیشہ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اس لئے اپنے دین کے خاطر لڑتے رہو۔ (سیرت ابن ہشام) اللہ تمہیں پاک کرے گا اور تمہاری مدد فرمائے گا''۔

''ان کی اس پر جوش تقریر سے چند انصاری صحابہؓ جمع ہو گئے اور انہوں نے دوبارہ دشمن کے مقابلے میں جنگ شروع کر دی۔ وہ بڑی بہادری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ خالد بن ولید کے نیزے سے شہید ہو گئے۔

ایک زخمی انصاری کا ایمان افروز جواب

اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مہاجر صحابیؓ ایک زخمی انصاری کے پاس سے گزرے جو اپنے خون میں لت پت پڑے تھے۔ انہوں نے اس انصاری سے کہا: ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں؟'' اس زخمی انصاری نے اسی حالت میں جواب دیا:

''اگر رسول اللہ ﷺ شہید بھی ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنی رسالت کا فرض پورا کر دیا۔ اب ہمارا فرض باقی ہے۔ اس لیے تم ان کے دین کی خاطر لڑتے رہو''۔ یہ الفاظ اس بات کی گواہی تھے کہ صحابۂ کرامؓ کے دلوں میں دینِ

اسلام کی محبت اور استقامت کس قدر مضبوط تھی۔

حضرت سعد بن ربیعؓ کا ایمان افروز واقعہ

اسی طرح حضرت سعد بن ربیعؓ کا واقعہ بھی بے مثال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ان کی خبر لینے کے لئے بھیجا اور فرمایا کہ اگر وہ مل جائیں تو انہیں میرا اسلام کہنا۔ حضرت زید بن ثابتؓ میدانِ جنگ میں شہداء کے درمیان انہیں تلاش کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے انہیں زخمیوں میں پایا۔ اس وقت ان کے جسم پر ستر زخم لگ چکے تھے اور زندگی کی چند سانسیں باقی تھیں۔

حضرت زید بن ثابتؓ نے انہیں رسول اللہ ﷺ کا سلام پہنچایا اور فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا ہے کہ تمہارا کیا حال ہے؟'' حضرت سعد بن ربیعؓ نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ پر میرا اسلام پہنچا دینا اور یہ کہنا کہ میں جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ اور میری قوم انصار سے کہنا کہ اگر رسول اللہ ﷺ تک دشمن پہنچ جائے اور تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھتی رہ جائے (یعنی تم میں سے کوئی زندہ ہو) تو پھر اللہ کے نزدیک تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہے گا''۔ یہ الفاظ کہہ کر ان کی روح پرواز کر گئی اور وہ راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔

(مستدرک حاکم حدیث نمبر:۴۹۰۶)

ابوسفیان کا نعرہ

جب رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی اور مسلمانوں کے حوصلے وقتی طور پر پست ہو گئے تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوسفیان، جو اس وقت مشرکین کے لشکر کا قائد تھا پہاڑ کے دامن سے بلند آواز میں پکارنے لگا: ''**اُعْلُ هُبَل**'' ''ہبل سربلند ہو جائے'' ہبل مشرکین کا ایک مشہور بت تھا، اور اس نعرے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ آج ان کے بت کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ مگر یہ وقتی غرور تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں اسلام کو وہ عظیم غلبہ عطا فرمایا جس کے سامنے باطل کی تمام طاقتیں مٹ گئیں۔ **(بخاری حدیث نمبر ۳۰۳۹)**

ابوسفیان کے نعرہ کا جواب

حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم اس کا جواب نہ دیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، جواب دو''۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کے مقابلے میں بلند آواز سے نعرہ لگایا: **اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلّ** — یعنی اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے برتر ہے۔ اس پر ابوسفیان نے کہا: **لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ** — ہمارے پاس عُزّٰی ہے اور تمہارے پاس عُزّٰی نہیں۔ (عُزّٰی ان لوگوں کا ایک معبود یعنی بت تھا۔) **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۰۳۹)**

حضرت عمرؓ کا ابوسفیان کو جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عمرؓ اس کا جواب اس طرح دو: اللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ -اللہ ہمارا مددگار اور کارساز ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں''۔ چنانچہ اسی انداز میں جواب دئے جاتے رہے۔ پھر ابوسفیان نے پوچھا: ''فلاں اور فلاں کہاں ہیں؟'' اس کا اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف تھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں، یہ ابوبکرؓ ہیں، اور میں بھی یہاں موجود ہوں''۔

اس پر ابوسفیان نے کہا: ''یہ بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور دن تو بدلتے رہتے ہیں؛ کبھی کسی کو فتح حاصل ہوتی ہے اور کبھی لڑائی برابر رہتی ہے''۔

حضرت عمرؓ نے فوراً جواب دیا: ''یہ برابر نہیں ہے۔ ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین دوزخ میں ہیں''۔ ابوسفیان نے کہا: ''اگر تمہارا یہی عقیدہ ہے تو پھر ہم تو یقیناً تباہ ہو گئے''۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صرف بارہ صحابہؓ رہ گئے تھے۔ بعد میں دیگر صحابہؓ بھی واپس آ گئے۔ باقی صحابہؓ میں سے کچھ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے اور کچھ پہاڑ کی طرف چڑھ گئے تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت حارث بن سماءؓ اور چند دیگر صحابہؓ موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی حضرات کے ساتھ اس گھاٹی کی طرف روانہ ہوئے جہاں جنگ سے پہلے قیام کیا تھا۔

اُبی بن خلف کا قتل

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گھاٹی میں ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے تو مشرک اُبَیّ بن خلف نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا اور پکار کر کہا: ''میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دوں گا''۔ وہ مکہ مکرمہ میں بھی پہلے سے یہی بات کہا کرتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ میں تمہیں قتل کروں گا''۔ وہ شخص پورے جنگی لباس اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی ہنسلی (گردن کے نیچے کا حصہ) نظر آئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر ایک نیزہ مارا، جس سے وہ اپنے گھوڑے سے گر پڑا۔ بظاہر نیزے سے اسے معمولی سی خراش آئی تھی، مگر وہ جانور کی طرح چیخنے لگا۔ اس کے ساتھی اس کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے: ''اتنا کیوں چیخ رہے ہو؟ صرف ایک معمولی خراش ہی تو آئی ہے''۔

وہ کہنے لگا: ''میں مر جاؤں گا، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا تھا کہ وہ مجھے قتل کریں گے''۔ پھر اس نے کہا: ''جو تکلیف مجھے ہو رہی ہے، اگر اسے تمام اہلِ حجاز پر تقسیم کر دیا جائے تو سب مر جائیں''۔ چنانچہ وہ واپس جاتے ہوئے

راستے ہی میں مر گیا اور اپنے وہ انجام کو پہنچا۔ (سیرت ابن ہشام روح المعانی، تفسیر ابن کثیر)

سخت عذاب کا مستحق

پورے غزوات میں یہ واحد شخص تھا جو رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھ سے قتل ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو، یا جس نے اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کیا ہو۔ اسی طرح تصویر بنانے والوں کو بھی سخت عذاب دیا جائے گا، اور اس عالم کو بھی جس نے اپنے علم سے فائدہ حاصل نہ کیا''۔ (مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۴۵۰۹)

رسول اللہ ﷺ کا منصب و مرتبہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ محمد ﷺ اپنے منصب اور مرتبے کے اعتبار سے اللہ کے رسول ہیں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ انہیں موت نہیں آئے گی؟ ہمیشہ زندہ رہنا تو صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ محمد ﷺ اللہ کی طرف دعوت دینے والے ہیں، معبود نہیں ہیں۔ حقیقی معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی دعوت کے ذریعے لوگوں کو شرک سے نکال کر توحید کی طرف بلایا اور اللہ کی عبادت کا راستہ دکھایا۔

لہٰذا اگر آپ ﷺ اس دنیا سے وفات پا جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ کیا تم دینِ حق کو چھوڑ کر دوبارہ گمراہی اختیار کر لو گے؟ یاد رکھو کہ یہ دین اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ جس کا یہ دین ہے وہ ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے ہمیشہ اسی کی عبادت کرتے رہو اور اسی پر قائم رہو۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کا دن

غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نہ شہید ہوئے تھے اور نہ آپ کو موت آئی تھی، لیکن جب حقیقت میں آپ ﷺ کی وفات کا دن آیا تو حضراتِ صحابہؓ پر شدید حیرت اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت عمرؓ جیسے بہادر، ثابت قدم اور صاحبِ فہم صحابیؓ بھی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور کہنے لگے:

''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کو موت نہیں آئی۔ آپ تو اپنے رب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ چالیس راتوں کے لئے اپنے رب کی ملاقات کو گئے تھے اور پھر واپس آ گئے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی واپس تشریف لے آئیں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو موت آ گئی ہے، میں ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دوں گا''۔

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تشریف لائے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''اے

عمرؓ! ٹھہرو، خاموش ہوجاؤ''۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا:

''اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو چکا ہے، اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، اسے کبھی موت نہیں آئے گی''۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ.....(آیت کے آخر تک)

یہ آیت سن کر صحابۂ کرامؓ کو اس طرح محسوس ہوا جیسے وہ اس آیت سے پہلے واقف ہی نہ تھے۔ جب یہ آیت سنی گئی تو سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا یقین ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی فرمایا: ''جب میں نے یہ آیت سنی تو مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو چکا ہے''۔ **(البدایہ والنہایہ)**

آیت کا مفہوم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوجائیں یا قتل کردئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ چنانچہ فرمایا: وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللهَ شَيْئًا یعنی جو شخص پیچھے پلٹ جائے اور دینِ حق کو چھوڑ دے، اس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

یہاں یہ حقیقت بھی واضح کردی گئی کہ جو شخص دینِ حق یعنی اسلام پر قائم ہے، اسے یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اس کے ایمان، عبادت اور اطاعت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔

اگر وہ دین چھوڑ دے یا اللہ کی عبادت ترک کردے تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر فائدے اور نقصان سے بلند وبالا ہے۔ البتہ جو شخص ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس کے ایمان اور نیک اعمال کا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

درحقیقت ایمان اور نیک اعمال کا فائدہ خود مومن ہی کو پہنچتا ہے۔ صاحبِ روح المعانی فرماتے ہیں: ''اسلام پر ثابت قدمی اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو اس کی سچائی کا کامل یقین ہو۔ اسلام پر قائم رہنا شکر ہے اور اسے چھوڑ دینا کفر ہے''۔

ہر جان کے لئے موت کا وقت

اس کے بعد فرمایا گیا: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا یعنی کوئی جان اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں مرسکتی۔ جس کو بھی موت آئے گی، وہ اللہ کے حکم سے اور اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے گی۔ جس شخص کے لئے جو وقت مقرر کردیا گیا ہے، نہ اس سے پہلے موت آسکتی ہے اور نہ اسے مؤخر کیا جاسکتا ہے۔

صاحبِ روح المعانی (حصہ ۴، ص ۷۵) لکھتے ہیں کہ اس آیت میں جہاد کی ترغیب بھی ہے اور اس بات پر

تنبیہ بھی کہ قتل کے خوف سے جہاد کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔

مزید یہ کہ اس میں مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ کی وفات کی خبر سنی گئی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اللہ کے حکم سے ہر جان کو موت آنی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ کے حکم سے وفات آ سکتی ہے تو پھر ان کی وفات کے بعد دین چھوڑ دینا کسی طرح درست نہیں۔

دنیا اور آخرت کے اجر کا فرق

پھر فرمایا: وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا جو شخص اپنے اعمال کے بدلے دنیا کا فائدہ چاہتا ہے، جیسے جہاد میں صرف مالِ غنیمت کا طالب ہو، تو ہم اسے دنیا میں سے کچھ دے دیتے ہیں، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ اسے لازماً مل ہی جائے۔ اور جو شخص آخرت کے اجر کا ارادہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے آخرت کا اجر عطا فرماتا ہے، بلکہ دنیا میں بھی اس کے لئے بھلائی کے دروازے کھول دیتا ہے۔

پھر فرمایا کہ ہم جلد ہی شکر گزار بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ عطا کریں گے۔ اس میں ان لوگوں پر تنبیہ ہے جنہوں نے جنگ کے دوران مالِ غنیمت کی طرف توجہ کر لی اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی حکمت پر غور نہ کیا، اور ساتھ ہی ان حضرات کی تعریف بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے اور میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے۔

تنبیہ اور نصیحت

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں عظیم حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی تو مسلمانوں میں شدید اضطراب پیدا ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر تنبیہ کی کہ اگر محمد ﷺ وفات پا جائیں یا شہید ہو جائیں تو کیا تم اللہ کے دین سے پھر جاؤ گے اور دوبارہ باطل مذہب اختیار کر لو گے؟ اس طرح ہمیشہ کے لیے یہ سبق دے دیا گیا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے، اور عبادت بھی اسی کی کرنی ہے۔ اللہ ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اسی آیت کو سامنے رکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دن حضرت عمرؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کو خاموش کیا اور انہیں تسلی دی۔ ساتھ ہی قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لیے یہ تعلیم بھی دے دی کہ اگر کسی شخص کی وفات پر غم ہو تو ہو، لیکن عقل و فہم کے ساتھ یہ حقیقت سمجھنی چاہیے کہ ہر انسان کو موت آنی ہے۔ کسی خادمِ دین، مفتی، مرشد یا محدث کی وفات پر صرف غم میں ڈوب کر بیٹھ جانا دانشمندی نہیں۔ جس محنت، دعوت اور نیک کاموں میں انہوں نے اپنی زندگی صرف کی، انہی کاموں کو آگے بڑھانا ہی صحیح طرزِ عمل ہے۔ اس لئے نہ ضرورت سے

زیادہ غم میں ڈوبنے کی ضرورت ہے اور نہ جاہلانہ آہ وفغاں کی کہ اب کیا ہوگا۔

جو شخص دنیا سے رخصت ہو گیا وہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔ اس لئے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جب وہ موجود نہیں تھے تب بھی تو اسلام قائم تھا، اور ان کے بھی اساتذہ اور مشائخ تھے جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب دین اللہ کا ہے اور اللہ ہمیشہ زندہ اور باقی ہے تو انسان کو اسی کے دین پر قائم رہنا چاہئے۔ آنے والے آتے رہیں گے اور جانے والے جاتے رہیں گے۔

بعض اوقات لوگ غم کے موقع پر ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن سے کفر تک لازم آ سکتا ہے۔ مثلاً کوئی کہہ دیتا ہے کہ قدرت نے ہمیں ایسے وقت پر اس شخص سے محروم کر دیا جب ہمیں اس کی شدید ضرورت تھی، یا یہ کہ اب اس جیسا کوئی پیدا نہیں ہوگا، یا یہ کہ وہ ہمیں بے سہارا اور یتیم چھوڑ گیا۔ گویا وہ وقت مقرر سے پہلے اور اللہ کے حکم کے بغیر چلا گیا۔ (العیاذ باللہ)

یہ آیت دراصل اسی طرح کی ماتمی اور غلط باتوں کا رد کرتی ہے۔ مسلمان کو چاہئے کہ اللہ کی قضا وقدر پر راضی رہے اور نیک اعمال میں مشغول رہے۔ جب تک اللہ چاہے گا اس کا دین دنیا میں قائم رہے گا۔ دین کا کام کسی شیخ، محدث، مفتی یا پیر ومرشد کی زندگی یا وفات کا محتاج نہیں۔

غزوۂ اُحد کے اس واقعہ سے حضرت حسینؓ کے سالانہ ماتم کرنے والوں کی بھی تردید ہوتی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ اُحد کے بعد سات سال تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت پر کوئی ماتمی رسم یا سالانہ سوگ نہیں کیا۔

آیت نمبر (۱۴۶-۱۴۸) وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۴۶ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۴۷ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۴۸

ترجمہ: ”کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والے لڑے، نہ وہ کمزور پڑے ان مصیبتوں کی وجہ سے جو اللہ کی راہ میں آئیں، نہ وہ بزدل ہوئے، اور نہ وہ جھکے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اور ان کا قول یہی تھا کہ: اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں زیادتیوں کو بخش دے، اور ہمارے قدم جما دے، اور کافروں کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی انعام دیا اور آخرت کا بہترین صلہ بھی، اور اللہ نیک عمل کرنے

والوں سے محبت کرتا ہے''۔

دنیا کی تاریخ میں آغاز ہی سے ایمان اور کفر کے درمیان کشمکش جاری رہی ہے۔حضرت آدمؑ کی اولاد میں جب سے کفر کا ظہور ہوا، اسی وقت سے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے درمیان مقابلہ اور جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔انبیائے کرامؑ کے رفقاء اور پیروکاروں کو اپنے اپنے زمانوں میں کافروں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنی پڑی۔انہوں نے دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی کے ساتھ اپنی جانوں کی بازی لگائی اور حق کے دفاع کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔

حق کے داعی

ان آیات میں انہی لوگوں کی مدح وستائش بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے نہ کم ہمتی دکھائی، نہ سستی اختیار کی اور نہ ہی دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے۔وہ ہر حال میں ثابت قدم رہے اور حق کے علم کو بلند رکھنے کے لئے ڈٹے رہے۔ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ مسلسل اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے رہتے تھے اور اپنے اعمال میں جو بھی کوتاہیاں یا لغزشیں ہو جاتی تھیں، ان پر بھی معافی مانگتے تھے، ساتھ ہی وہ کافروں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے نصرت اور مدد کی دعا کرتے رہتے تھے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی کامیابی اور نصرت عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی انہیں بہترین بدلہ عطا کرے گا، یعنی اپنی رضا اور جنت کی نعمتوں سے نوازے گا۔

واضح نصیحت

ان واقعات میں امتِ محمدیہ کے لئے واضح نصیحت موجود ہے۔تم سے پہلے کی امتوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، مصیبتوں اور آزمائشوں سے نہیں گھبرائے۔لہٰذا تمہارے ساتھ جو حالات پیش آئے ہیں، وہ کوئی نئی بات نہیں۔اللہ والوں کو آزمائشوں اور سختیوں کا سامنا ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔

دشمن اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں، اس لئے بعض اوقات ان سے جنگ بھی کرنا پڑتی ہے، اور اس راہ میں اپنے لوگ شہید بھی ہوتے ہیں۔اس لئے اہلِ ایمان کو چاہئے کہ وہ ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کریں، کمزوری اور سستی کو اپنے قریب نہ آنے دیں اور دشمن کے سامنے بے بسی کا اظہار نہ کریں۔

پچھلی قوموں کی دعائیں

پہلی قوموں کی جو دعائیں قرآن میں نقل کی گئی ہیں، وہ اس طرح ہیں: ''اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمارے کاموں میں جو حد سے تجاوز ہو گیا ہے اسے معاف فرما، اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں ثابت

قدمی عطا فرما''۔اس دعا میں یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ نیک اعمال انجام دیتے ہوئے بھی استغفار کی ضرورت باقی رہتی ہے، کیونکہ کائنات کے مالک و خالق کی شان کے مطابق کامل عمل بندوں سے ہو ہی نہیں سکتا؛ انسان سے کسی نہ کسی درجے میں کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔اس لئے جو لوگ جہاد یا کسی بھی نیک کام میں مصروف ہوں، انہیں چاہئے کہ استغفار کو اپنا معمول بنائے رکھیں۔

استغفار کے ذریعے نہ صرف گناہوں کی معافی حاصل ہوتی ہے بلکہ اعمال میں جو کمی اور کوتاہیاں رہ جاتی ہیں ان کی بھی تلافی ہوجاتی ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نیک کام میں مشغولیت کے باعث دوسرے اہم نیک اعمال رہ جاتے ہیں اور اس طرح حد سے تجاوز یا اسراف کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔استغفار اس کمی کی بھی معافی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح کافروں کے مقابلے میں ثابت قدمی کی دعا کرنے میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مسلمان اپنے اسلحہ، طاقت یا تعداد پر کبھی غرور نہ کریں، بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کریں اور اسی کی ذات پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے اسی کی طرف رجوع کرتے رہیں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۴۹ سے ۱۵۵ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

ترجمہ:

(۱۴۹) اے ایمان والو! اگر تم ان کافروں کی بات مانو گے، تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹا دیں گے، اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۱۵۰) بلکہ اللہ ہی تمہارا مددگار ہے، اور وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ (۱۵۱) عنقریب ہم اُن لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے جنہوں نے کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کیا جن کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ ظالموں کا بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ (۱۵۲) اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، جب تم اس کے حکم سے دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم

کمزور ہو گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے اور (رسولؐ کے) حکم کی نافرمانی کی، اس کے بعد کہ وہ چیز تمہیں دکھا دی گئی جسے تم پسند کرتے تھے۔ تم میں سے کچھ دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے، پھر اللہ نے تمہیں ان (کافروں) سے پیچھے ہٹا دیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے، اور یقیناً اس نے تمہیں معاف کر دیا، اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (۱۵۳) جب تم چڑھتے جا رہے تھے اور پیچھے مڑ کر کسی کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے، اور رسول تمہیں پیچھے سے آواز دے رہے تھے، تو اس نے تمہیں غم کے بدلے غم دیا، تاکہ تم نہ غم کرو اس پر جو تم سے فوت ہو گیا اور نہ اس (تکلیف) پر جو تمہیں پہنچی اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (۱۵۴) پھر اللہ نے اس غم کے بعد تم پر ایک امن والی اونگھ نازل کی، جو تم میں سے ایک جماعت پر چھا گئی، جبکہ دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں اپنی جانوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ اللہ کے بارے میں ایسا گمان کر رہے تھے جو گمان زمانۂ جاہلیت کے لوگ کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: کیا ہمارے اختیار میں کچھ بھی ہے؟ کہہ دو: سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تب بھی وہ لوگ جن پر شہادت لکھ دی گئی تھی، ضرور اپنی موت کی جگہوں پر آ جاتے۔ تاکہ اللہ آزمالے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے، اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اسے پاک کرے۔ اور اللہ دلوں کے رازوں کو خوب جانتا ہے۔ (۱۵۵) یقیناً وہ لوگ جو اس دن پیچھے ہٹ گئے جب دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں، انہیں شیطان نے بہکا دیا تھا ان کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے، اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بردبار ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۴۹ سے ۱۵۵ تک

آیت نمبر (۱۴۹-۱۵۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اگر تم ان کافروں کی بات مانو گے، تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹا دیں گے، اور تم نقصان اٹھانے 1 والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ ہی تمہارا مددگار ہے، اور وہی سب سے بہتر

مدد کرنے والا ہے۔عنقریب ہم اُن لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے جنہوں نے کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کیا جن کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی۔ان کا ٹھکانا جہنم ہے،اور وہ ظالموں کا بہت ہی برا ٹھکانا ہے''۔

کافروں کی اطاعت

تفسیر پہلی آیت میں کافروں کی اطاعت سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے اور اس کے نتائج بھی واضح کر دئے گئے ہیں۔فرمایا گیا کہ اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو وہ تمہیں الٹے قدموں واپس پھیر دیں گے،یعنی دوبارہ شرک کی طرف لوٹا دیں گے۔اگر ایسا ہوا تو تم شدید خسارے میں پڑ جاؤ گے اور دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی سے محروم ہو جاؤ گے۔اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ یعنی اللہ ہی تمہارا سرپرست اور مددگار ہے؛ لہٰذا اسی کی اطاعت کرو اور اسی سے مدد طلب کرو، کیونکہ وہ سب مددگاروں سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔

الذین کفرو کا مفہوم

تفسیر روح المعانی (جلد ۴،ص ۸۷) میں لکھا ہے کہ آیت میں مذکور الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے بعض مفسرین کے نزدیک منافقین مراد ہیں۔جب مسلمانوں کو وقتی شکست پیش آئی تو انہوں نے کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ۔یہ قول حضرت علیؓ سے منقول ہے۔

بعض دیگر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں،یعنی مکہ کے مشرکین جو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں سے جنگ کے لیے آئے تھے۔اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہ کرو اور نہ ان سے پناہ طلب کرو، کیونکہ اس موقع پر بعض لوگوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہتھیار ڈال کر دشمن سے امان طلب کر لی جائے۔

● ایک تفسیر یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہو سکتے ہیں۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کے مشوروں کو سچا نہ سمجھو اور ان کی باتوں کی پیروی نہ کرو۔امام ابنِ جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

اس طرح یہ آیت تمام مسلمانوں کے لئے دائمی ہدایت بن جاتی ہے کہ وہ کافروں کے مشوروں اور ان کی رہنمائی کو معیار نہ بنائیں۔مومن کا اصل سہارا اللہ ہی ہونا چاہیے؛ اسی سے مدد مانگے، اسی کو اپنا مددگار سمجھے، اور کافروں کے سامنے نہ جھکے اور نہ انہیں اپنا قریبی دوست بنائے۔اسی وجہ سے جہاں شرک اور مشرکانہ ماحول غالب ہو وہاں بلا

ضرورت قیام کرنا مناسب نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کسی مشرک کے ساتھ اکٹھا رہے اور اس کے ساتھ مستقل قیام کرے تو وہ اسی کی طرح ہے''۔

(سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الاقامہ بارض الشرک، حدیث نمبر: ۲۷۸۷)

یعنی ایسے مسلمان اور مشرک کے درمیان امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو ایسے غیر مسلم معاشرے میں اس انداز سے نہیں رہنا چاہیے کہ وہ اپنے دینی شعائر اور اعمال کو کھلے طور پر ادا نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں اس پر لازم ہے کہ ہجرت کر کے وہاں سے چلا جائے۔ البتہ اگر شرعی عذر یا دعوت وتبلیغ کے مقصد سے قیام کرے تو اس کی اجازت ہے۔

دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالنے کا وعدہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ یعنی ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔

سبب نزول: تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے نزول کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ جب ابوسفیان اور اس کے ساتھی غزوۂ اُحد کے بعد مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور کچھ دور پہنچے تو انہیں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی۔ انہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہم مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کر دیتے تا کہ کوئی باقی نہ رہتا۔ چنانچہ انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہیں سے واپس لوٹ گئے اور مدینہ کی طرف آنے کی ہمت نہ کر سکے۔

اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم ان کے دلوں میں خوف اور دہشت ڈال دیں گے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، حالانکہ اللہ نے اس کے حق میں کوئی دلیل یا سند نازل نہیں فرمائی۔

دنیا میں اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال کر اہلِ ایمان کو محفوظ رکھا، اور آخرت کے انجام کے بارے میں فرمایا کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ ظالموں کا نہایت برا انجام ہے۔ اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شرک انسان کے دل میں خوف اور کمزوری پیدا کرتا ہے، جبکہ توحید انسان کے اندر عزتِ نفس، شجاعت اور استقامت پیدا کرتی ہے۔

● حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے جامع اور مختصر مگر جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہے، اور میری مدد دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر کی گئی ہے۔ نیز جب میں سو رہا تھا تو مجھے زمین

کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئیں''۔(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۲۹۷۷)

یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی معنوی قوت اور اثر عطا فرمایا جس کے نتیجے میں دشمنوں کے دلوں میں خوف اور ہیبت پیدا ہو جاتی تھی، اور اسی کے ذریعے اسلام کو غلبہ اور کامیابی نصیب ہوئی۔

خالق اور مخلوق

اس مقام پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ زندگی گزارنے کا صحیح اور درست طریقہ وہی ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دلیل اور سند پر ہو۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ مخلوق ہے اور اس کا کوئی خالق، مالک اور معبود ہے۔ لیکن جن لوگوں نے انبیائے کرامؑ کی بتائی ہوئی راہ کو اختیار نہیں کیا، انہوں نے اپنے حقیقی خالق و مالک کی عبادت میں شرک کی آمیزش کر دی۔ چنانچہ وہ بظاہر اپنے خالق کی بھی عبادت کرتے ہیں اور ساتھ ہی مخلوق کو بھی عبادت میں شریک کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے اپنے خالق و مالک کے بارے میں ایسے عقائد قائم کر لیے جو حقیقت میں گمراہی پر مبنی ہیں۔ عقائد اور عبادات کے معاملات میں اپنی طرف سے تصورات گھڑ لینا اور نئے طریقے ایجاد کر لینا سراسر گمراہی ہے۔

دنیا میں اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب رائج ہیں، ان میں جو عبادات کے طریقے اور عقائد اختیار کئے جاتے ہیں، ان کے پیروکار عموماً یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ عقائد اور اعمال براہِ راست اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں یا ان کے انبیاءؑ نے اسی صورت میں ان کی تعلیم دی تھی۔ درحقیقت ان میں سے بہت سے عقائد اور اعمال بعد کے لوگوں کی ایجاد اور اضافہ ہیں۔

عقیدہ اور عمل

جو عقیدہ اور عمل خالقِ حقیقی کی طرف سے نہ بتایا گیا ہو، اسے زندگی کا مقصد بنا لینا اور اس کے ذریعے نجات کی امید رکھنا کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ ایسے عقائد اور اعمال کو اختیار کر کے یہ توقع رکھنا کہ موت کے بعد کامیابی حاصل ہوگی اور عذاب سے بچاؤ ہو جائے گا، ایک بڑی غلطی ہے جو عقل اور دانش کے بھی خلاف ہے۔ اسی لیے ہر انسان کے سامنے یہ سوال رکھا جانا چاہئے کہ وہ اپنے خالق کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد رکھتا ہے اور جس طریقے سے اس کی عبادت کرتا ہے، کیا اس کے پاس اس کی کوئی معتبر دلیل موجود ہے؟ کیا اس کے پاس کوئی ایسی سند ہے جس سے ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے خود یہ عقائد اور عبادات اسے بتائی ہیں؟

دنیا کے معروف مذاہب میں عیسائیت بھی شامل ہے، مگر عیسائیوں کے پاس اس بات کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ فرمایا ہو کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں، یا یہ پیش گوئی کی ہو کہ لوگ انہیں قتل کر دیں گے اور ان کے قتل کے بعد جو شخص انہیں اللہ کا بیٹا مانے گا وہ نجات پا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے عقائد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت عرصہ بعد اختیار کئے گئے۔

لہٰذا ہر مذہب کے ماننے والے کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ جس مذہب پر وہ قائم ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا اس کے پاس اس بات کی کوئی دلیل اور سند موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی مذہب کی پیروی کا حکم دیا ہے اور اسی کے ذریعے آخرت میں نجات حاصل ہوگی؟

قرآن مجید کا واضح اصول

قرآن مجید نے واضح طور پر یہ اصول بیان کر دیا ہے کہ صحیح عقیدہ اور درست عبادت وہی ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے خود دی ہو اور جو معتبر سند کے ساتھ انسانوں تک پہنچی ہو۔ مضبوط دلائل اور تاریخی شواہد سے یہ حقیقت واضح ہے کہ دینِ اسلام کے علاوہ کوئی ایسا مذہب موجود نہیں جو یہ دعویٰ ثابت کر سکے کہ اس کا دین خالصتاً اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی مذہبی کتابیں بغیر کسی تبدیلی کے اپنی اصل صورت میں محفوظ ہیں۔

اسی لئے جب دوسرے مذاہب اپنے دین کے صحیح ہونے کی مستند سند پیش نہیں کر سکتے تو ہر انسان کو اس دین کی طرف آنا چاہئے جسے اللہ تعالیٰ نے خود نازل فرمایا اور جس میں تمام انسانوں کی کامیابی اور فلاح رکھی ہے۔ اس دین کا نام اسلام ہے۔ اَدَامَنَا اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَمَاتَنَا عَلَیْہِ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں اسی دین پر قائم رکھے اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرمائے۔

آیت نمبر (۱۵۲-۱۵۵) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَىْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

ترجمہ: ''اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، جب تم اس کے حکم سے دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم کمزور ہو گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے اور (رسولؐ کے) حکم کی نافرمانی کی، اس کے بعد کہ وہ چیز تمہیں دکھا دی گئی جسے تم پسند کرتے تھے۔ تم میں سے کچھ دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے، پھر اللہ نے تمہیں ان (کافروں) سے پیچھے ہٹا دیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے، اور یقیناً اس نے تمہیں معاف کر دیا، اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ جب تم چڑھتے جا رہے تھے اور پیچھے مڑ کر کسی کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے، اور رسولؐ تمہیں پیچھے سے آواز دے رہے تھے، تو اس نے تمہیں غم کے بدلے غم دیا، تاکہ تم نہ غم کرو اس پر جو تم سے فوت ہو گیا اور نہ اس (تکلیف) پر جو تمہیں پہنچی اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ پھر اللہ نے اس غم کے بعد تم پر ایک امن والی اونگھ نازل کی، جو تم میں سے ایک جماعت پر چھا گئی، جبکہ دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں اپنی جانوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ اللہ کے بارے میں ایسا گمان کر رہے تھے جو گمان زمانۂ جاہلیت کے لوگ کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: کیا ہمارے اختیار میں کچھ بھی ہے؟ کہہ دو: سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: "اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تب بھی وہ لوگ جن پر شہادت لکھ دی گئی تھی، ضرور اپنی موت کی جگہوں پر آ جاتے۔ تاکہ اللہ آزمالے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے، اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اسے پاک کرے۔ اور اللہ دلوں کے رازوں کو خوب جانتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو اس دن پیچھے ہٹ گئے جب دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں، انہیں شیطان نے بہکا دیا تھا ان کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے، اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بردبار ہے''۔

غزوۂ اُحد کی وقتی ناکامی

تفسیر ان آیات میں غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کو پیش آنے والی اس وقتی ناکامی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کو جو غلبہ اور کامیابی حاصل ہوئی تھی، وہ کس طرح اللہ کی مدد سے حاصل ہوئی۔ پھر اس حالت کا بھی تذکرہ ہے جب شدید غم اور پریشانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک خاص کیفیت طاری فرمادی اور ان پر اونگھ غالب کردی، تاکہ ان کے دلوں کا اضطراب کم ہوجائے اور انہیں کچھ سکون نصیب ہو۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیراندازوں کے ایک دستے کو ایک مخصوص پہاڑی پر مقرر فرمایا تو انہیں واضح ہدایت دی کہ کسی صورت اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم اپنی جگہ پر ثابت قدم رہو گے ہم غالب رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے جو وعدہ فرمایا تھا، اس کے مطابق ابتدا میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور وہ دشمنوں کو اللہ کی راہ میں قتل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرکین کی عورتیں، جن میں ہند بنت عتبہ بھی شامل تھی، گھبرا کر میدان سے بھاگنے لگیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اپنے سامان میں سے کچھ اٹھانے کی بھی فرصت نہ رہی۔

لیکن جب مسلمانوں نے واضح فتح کے آثار دیکھے جو طبعاً ان کے لئے خوشی اور رغبت کا باعث تھی تو پہاڑی پر مقرر تیراندازوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس میں باہمی اختلاف ہوگیا۔ قرآن نے اس کیفیت کو تَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ پھر ان میں سے اکثر افراد اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں اتر آئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔

قرآن نے اس حالت کو یوں بیان فرمایا:

وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ اور مالِ غنیمت کی رغبت کے بارے میں فرمایا:

مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا جب دشمنوں نے دیکھا کہ پہاڑی خالی ہوچکی ہے تو انہوں نے فوراً پلٹ کر حملہ کردیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمانوں کی صفوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور وہ اس شدت سے مقابلہ نہ کرسکے۔

تیراندازوں کے امیر

● حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن جبیرؓ کو تیر اندازوں کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ جب حالات بگڑنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں واپس بلایا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صرف بارہ صحابہؓ باقی رہ گئے تھے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۶۱)

اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے بارے میں فرمایا کہ یہ سب تمہاری آزمائش کے لئے تھا: لِيَبْتَلِيَكُمْ اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا:

وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ یعنی اللہ نے تمہیں معاف فرمادیا، اور وہ اہلِ ایمان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

ایک غم کے بدلے میں دوسرا غم

جب دشمنوں نے دوبارہ حملہ کیا تو بعض مسلمان گھبرا گئے اور میدان سے ہٹنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں پکار رہے تھے: إِلَىٰ عِبَادَ اللّٰهِ (اے اللہ کے بندو! ادھر آؤ)۔ لیکن اس بھاگ دوڑ اور اضطراب کے نتیجے میں مسلمانوں کو ایک غم کے بدلے دوسرا غم برداشت کرنا پڑا۔ قرآن نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ

لفظ تُصْعِدُوْنَ بابِ اِفعال سے ہے۔ تفسیر روح المعانی کے مطابق اس کے معنیٰ زمین میں دور نکل جانے یا بھاگنے کے ہیں، جبکہ بعض مفسرین نے اس کے معروف معنیٰ بھی لئے ہیں اور اسے گھوڑوں کے اوپر چڑھ کر تیزی سے نکل جانے کے مفہوم میں لیا ہے۔

آیت کے الفاظ غَمًّا بِغَمٍّ کی ایک تفسیر وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو تکلیف پہنچی اس کے بدلے مسلمانوں کو غم کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم مفسرین نے اس کے دیگر معانی بھی ذکر کئے ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ ایک غم تو مسلمانوں کو اس وجہ سے لاحق ہوا کہ بہت سے صحابہؓ شہید یا زخمی ہو گئے اور مشرکین وقتی طور پر غالب آ گئے، جبکہ دوسرا غم اس خبر کے پھیلنے سے پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ **(تفسیر روح المعانی)**

مسلمانوں کی آزمائش

غزوۂ اُحد مسلمانوں کے لئے ایک بڑی آزمائش ثابت ہوا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی اطاعت، ثابت قدمی اور نیتوں کو پرکھا۔ ابتدا میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی، مگر جب بعض تیراندازوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے خلاف اپنی جگہ چھوڑ دی تو حالات بدل گئے اور مسلمانوں کو وقتی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس واقعے نے یہ سبق دیا کہ کامیابی صرف طاقت یا تعداد سے نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت اور نظم وضبط سے وابستہ ہے۔

اس آزمائش کے نفسیاتی اثرات بھی نمایاں تھے؛ مسلمانوں کو شدید غم، پریشانی اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ بعض کے دلوں میں مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سکون دینے کے لیے ان

پر اونگھ طاری فرمادی اور انہیں یہ احساس دلایا کہ آزمائش کے ذریعے ایمان کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اس طرح غزوۂ اُحد نہ صرف ایک تاریخی واقعہ تھا بلکہ ایمان، صبر اور نفسیاتی استقامت کا عملی درس بھی تھا۔

غم پہنچانے میں بھی حکمت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ

یعنی تاکہ تم اس چیز پر زیادہ غمگین نہ ہو جو تم سے چھوٹ گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تمہیں پیش آئی۔ اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو غم اور تکلیف پہنچی، اس میں بھی اللہ کی حکمت پوشیدہ تھی۔ اس آزمائش کے ذریعے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے اندر صبر، حوصلہ اور استقامت پیدا کرنا چاہتے تھے، تاکہ آئندہ اگر کسی قسم کی محرومی یا مصیبت پیش آئے تو وہ ثابت قدمی کے ساتھ اس کا سامنا کر سکیں۔

جب انسان صبر کی عادت اختیار کر لیتا ہے تو بڑی سے بڑی مشکل بھی آسانی سے گزر جاتی ہے، اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی صبر کے ذریعے اللہ کی مدد نصیب ہوتی ہے۔

غم دور کرنے کے لیے نیند کا غلبہ

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ۔ ابنِ راہویہؒ نے حضرت زبیرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اُحد کے دن جب ہمیں دشمن کا شدید خوف لاحق ہوا تو ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر ایک پر ایک عجیب سی اونگھ طاری ہونے لگی۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس حالت میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خواب کی سی کیفیت ہو اور میں معتب بن قشیرہ کا یہ قول سن رہا تھا کہ اگر ہمیں کچھ اختیار حاصل ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ میں نے اس بات کو یاد رکھ لیا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ أَنْزَلَ سے لے کر بِذَاتِ الصُّدُورِ تک کی آیات نازل فرمائیں۔ (تفسیر ابن عباس)

مسلمانوں کو جو تکلیف اور وقتی شکست کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ اس غم کو کم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر اونگھ طاری فرمادی، جس سے دلوں کا اضطراب اور پریشانی کم ہونے لگی۔ یہ اللہ کی خاص رحمت تھی، کیونکہ جب انسان شدید صدمے میں ہوتا ہے تو نیند اس کے لئے سکون اور راحت کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ یعنی غم کے بعد اللہ نے تم پر سکون کی ایک کیفیت نازل فرمائی جو اونگھ کی صورت میں ایک جماعت پر طاری ہوگئی۔

یہ کیفیت مخلص مسلمانوں پر طاری ہوئی، جبکہ منافقین کی حالت مختلف تھی۔ انہیں صرف اپنی جانوں کی فکر تھی

اور وہ اللہ کے بارے میں جاہلیت کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اگر ہماری رائے مانی جاتی تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تمام اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور جس کی شہادت مقدر ہو وہ اپنے وقت اور جگہ پر ضرور پہنچتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ یعنی یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ تمہارے دلوں کی آزمائش کرے اور انہیں پاک وصاف کر دے۔ اس واقعے سے واضح ہو گیا کہ مصیبت کے وقت ہی سچے اور منافق کی پہچان ہوتی ہے؛ اس طرح منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا اور مخلص مسلمانوں کا ایمان مزید مضبوط ہو گیا۔

صحابہؓ کی معافی کا اعلان

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ یعنی تم میں سے جن لوگوں نے اس دن پیٹھ پھیر لی جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے تھیں، حقیقت یہ ہے کہ انہیں شیطان نے ان کے بعض اعمال کی وجہ سے لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا، کیونکہ وہ بڑا بخشنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیت میں ایک طرف مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف فرما دیا، اور دوسری طرف یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ جو لوگ میدان سے ہٹ گئے تھے انہیں شیطان نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔

اس لغزش کا سبب ان کے بعض سابقہ اعمال بنے۔ اس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کا راستہ کھول دیتا ہے اور شیطان انسان کو اسی کمزوری کے ذریعے مزید لغزشوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ غزوۂ اُحد کے بارے میں مذکورہ تفصیل حافظ ابنِ کثیرؒ کی تفسیر، البدایہ والنہایہ اور تفسیر روح المعانی سے ماخوذ ہے۔

حضرت ابوطلحہؓ بیان کرتے ہیں کہ اُحد کے دن عین جنگ کے دوران ہم پر اونگھ طاری ہونے لگی تھی۔ میری تلوار بار بار ہاتھ سے گرنے لگتی اور میں اسے دوبارہ سنبھال لیتا، پھر گرنے لگتی تو اسے تھام لیتا۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۶۲)

❁❁❁

آیت نمبر ۱۵۶ سے ۱۶۸ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ:

(۱۵۶) اے ایمان والو! ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا، اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا جب وہ سفر پر نکلے یا جنگ میں گئے کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے تا کہ اللہ ان کے دلوں میں حسرت پیدا کرے۔ اللہ ہی زندگی دیتا اور موت دیتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ (۱۵۷) اور اگر تم اللہ کی راہ

میں قتل کئے جاؤ یا مرجاؤ، تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔(۱۵۸) اور اگر تم مرجاؤ یا قتل کر دیے جاؤ، تو بالآخر تم سب اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۱۵۹) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں کے لیے نرم دل ہیں۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔ لہٰذا انہیں معاف کر دیں، ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگیں، اور ان سے مشورہ لیتے ہیں (اہم) معاملے میں۔ پھر جب آپ کسی بات کا پختہ ارادہ کر لیں، تو اللہ پر بھروسہ کریں۔ یقیناً اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۶۰) اگر اللہ تمہاری مدد کرے، تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔ اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟ پس ایمان والوں کو صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔(۱۶۱) کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ اور جو خیانت کرے گا، قیامت کے دن وہ لے آئے گا جو اس نے خیانت کی ہوگی، پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۱۶۲) کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کا تابع رہا، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا؟ اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا انجام ہے۔(۱۶۳) یہ لوگ (الگ الگ) درجوں میں ہوں گے اللہ کے یہاں، اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔(۱۶۴) یقیناً اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا، جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔(۱۶۵) کیا ہوا جب تمہیں (احد کے دن) مصیبت پہنچی، حالانکہ تم (بدر کے دن) اس سے دوگنی سزا دے چکے تھے، تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آ گئی؟ کہہ دو: یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۱۶۶) اور جو کچھ تمہیں اس دن نقصان پہنچا جب دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں، تو وہ اللہ کے حکم سے تھا، تاکہ اللہ سچے مومنوں کو پہچان لے۔(۱۶۷) اور تاکہ وہ منافقوں کو بھی پہچان لے، جن سے کہا گیا: آؤ، اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع کرو۔ تو وہ کہنے لگے: اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ آتے۔ وہ اس دن ایمان کے مقابلے میں کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں۔(۱۶۸) وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، جب کہ وہ خود بیٹھے رہے، کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دو: اگر تم سچے ہو، تو اپنی جانوں سے موت کو روک کر دکھاؤ۔

تفسیر آیت نمبر ۱۵۶ سے ۱۶۸ تک

آیت نمبر (۱۵۶-۱۵۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ

اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّی لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَی اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا، اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا جب وہ سفر پر نکلے یا جنگ میں گئے کہ ''اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے'' تا کہ اللہ ان کے دلوں میں حسرت پیدا کرے۔ اللہ ہی زندگی دیتا اور موت دیتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مر جاؤ، تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ، تو بالآخر تم سب اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

کافر اور جہاد

تفسیر یہ آیات اُس وقت نازل ہوئیں جب Battle of Uhud کے بعد منافقین نے مسلمانوں کے بارے میں طعنہ زنی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ لوگ مدینہ میں رہتے اور جنگ میں نہ جاتے تو نہ قتل ہوتے اور نہ مرتے۔ مفسرین جیسے Ibn Kathir اور Al-Tabari نے لکھا ہے کہ یہ منافقانہ سوچ دراصل مسلمانوں کے حوصلے کمزور کرنے کے لئے تھی۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ نہ وہ خود کسی نیکی کے کام میں حصہ لیتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص خیر اور بھلائی کے کاموں میں لگ جائے تو وہ اس پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور جو نیکی کسی کو نصیب ہوا سے بھی نقصان اور خسارہ قرار دیتے ہیں۔

دنیا کی محبت میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ دوسروں کی آخرت کے کاموں کو پسند نہیں کرتے۔ اللہ کی رضا کے لئے دی جانے والی جانی یا مالی قربانی بھی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ منافقین کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے وہ بھائی جو سفر پر گئے یا جہاد میں شریک ہوئے، اگر ہمارے پاس ہی رہتے، نہ سفر کرتے اور نہ جنگ میں جاتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ بظاہر ان کی یہ بات ہمدردی کے انداز میں تھی، لیکن حقیقت میں یہ محض کمزور کرنے والی بات تھی، کیونکہ سچی ہمدردی یہ نہیں کہ کسی کو نیکی اور قربانی کے راستے سے روک دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ایسے لوگوں کی طرح نہ بنو، کیونکہ اس طرح کی باتیں ان کے دلوں میں خوشی اور مسرت کا سبب بنتی ہیں۔ پھر واضح فرمایا کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہیں؛ کوئی شخص کہیں بھی چھپ جائے، وہ اللہ کی تقدیر سے نہیں بچ سکتا۔ انسان جہاں بھی ہوگا، اللہ کے حکم سے اسی جگہ اس کی موت آجائے گی۔

آیت کے آغاز میں اہلِ ایمان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ کافروں یا منافقین کی طرح نہ بنیں۔ وہ لوگ جب اپنے ساتھیوں کو سفر یا جہاد میں جاتے دیکھتے تھے اور ان میں سے کوئی وفات پا جاتا یا شہید ہو جاتا تو کہتے تھے کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو زندہ رہتے۔ قرآن اس سوچ کو غلط قرار دیتا ہے، کیونکہ یہ تقدیرِ الٰہی سے غفلت کی علامت ہے۔ انسان کا جینا اور مرنا اللہ کے اختیار میں ہے، نہ کہ کسی خاص جگہ پر رہنے یا نہ رہنے پر۔

شہادت اور موت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زندگی اور موت صرف اسی کے اختیار میں ہیں: وہی زندہ کرتا ہے وہی موت دیتا ہے اور وہ انسانوں کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص چاہے گھر میں رہے یا میدانِ جنگ میں جائے، اگر اس کی موت کا وقت آچکا ہے تو وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ اسی حقیقت کو قرآن کی دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''جہاں کہیں تم ہو گے موت تمہیں آ پکڑے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو''۔

''شہادت اور موت کی حقیقت اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک اہم حقیقت بیان کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے یا اسی راستے میں وفات پا جائے تو یہ نقصان نہیں بلکہ عظیم سعادت ہے۔ قرآن کے مطابق: اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمتیں تمام دنیاوی مال و دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں جنہیں لوگ جمع کرتے ہیں۔ یہ دراصل مسلمانوں کی فکر کو دنیا سے آخرت کی طرف متوجہ کرنے کی تعلیم ہے۔

آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی موت خواہ طبعی ہو یا میدانِ جہاد میں، ہر حال میں اسے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ یعنی انجام کار سب کو اللہ ہی کے حضور جمع ہونا ہے اور وہی اعمال کا حساب لے گا۔

مغفرت اور رحمت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤ یا اسی راستے میں وفات پا جاؤ تو یہ کسی خسارے کا سودا نہیں، بلکہ یہ تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا سبب ہے۔ اور اللہ کی مغفرت و رحمت ان تمام چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو لوگ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ دنیا کے حریص لوگ صرف دنیا کے فائدے کو دیکھتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے؛ یوں وہ کچھ اور زندگی گزار لیتے

اور کچھ مزید مال کما لیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی یہ ساری دولت اللہ کی مغفرت اور رحمت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

پھر فرمایا کہ اگر تم مرجاؤ یا قتل کردئے جاؤ تو بالآخر اللہ کی بارگاہ میں جمع کئے جاؤ گے۔ موت اور اللہ کے حضور پیشی ہر انسان کے لئے یقینی ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں زندگی گزارے اور اسی کی راہ میں جان دے۔

شہید کا مرتبہ

حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص جو مرنے کے بعد اللہ کی طرف سے اچھا مقام حاصل کر لیتا ہے، وہ دنیا میں واپس آنے کی خواہش نہیں کرتا، چاہے اسے پوری دنیا اور اس کی تمام نعمتیں دے دی جائیں۔ البتہ شہید جب اپنے مقام اور مرتبے کو دیکھتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ دوبارہ دنیا میں آئے اور پھر اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۷۷)

● اسی طرح حضرت انس بن مالک ؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں دوپہر یا چاشت کے وقت کا تھوڑا سا نکلنا بھی دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۸۲)**

● حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شہید کو قتل ہوتے وقت اتنی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جتنی کسی کو چیونٹی کے کاٹنے سے ہوتی ہے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۶۶۸)**

آیت نمبر (۱۵۹) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ: ''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپ (ﷺ) ان لوگوں کے لیے نرم دل ہیں۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔ لہٰذا انہیں معاف کر دیں، ان کے لیے اللہ سے بخشش مانگیں، اور ان سے مشورہ لیتے ہیں (اہم) معاملے میں۔ پھر جب آپ کسی بات کا پختہ ارادہ کر لیں، تو اللہ پر بھروسہ کریں۔ یقیناً اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق

غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں سے ایک بڑی کوتاہی ہو گئی تھی۔ بعض صحابہ میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے، جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو شدید غم اور تکلیف پہنچی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ

نہیں کیا، نہ انہیں ڈانٹا اور نہ ہی ان پر ناراضی ظاہر فرمائی۔ بلکہ آپ ﷺ نے نہایت حلم، بردباری اور شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی اعلیٰ اخلاق اور نرم مزاجی کی تعریف قرآن میں فرمائی، جس سے ایک طرف مسلمانوں کی دلجوئی ہوئی اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے عظیم کردار کا اظہار بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اپنی طرف سے دومرتبہ صحابہؓ کی لغزش کو معاف فرمادیا تھا، جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ آپ بھی انہیں معاف فرمادیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا بھی کریں۔

مزید یہ کہ، ان کی دلجوئی کے لیے یہ بھی حکم دیا گیا کہ آئندہ معاملات میں ان سے مشورہ لیا جائے۔ پھر فرمایا کہ جب مشورہ کے بعد آپ کا فیصلہ پختہ ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل کریں، کیونکہ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں پسند فرماتا ہے۔ امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا''۔

بلند اخلاق کا اظہار

رسول اللہ ﷺ فطری طور پر نہایت خوش اخلاق، نرم مزاج اور شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر بھی آپ کے بلند اخلاق کا نمایاں اظہار ہوا۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کردوں''۔ **(موطاامام مالک، حدیث نمبر:۱۶۲۵)**

● حضرت ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن مومن کے میزان میں سب سے زیادہ بھاری چیز اس کے اچھے اخلاق ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ بے حیائی اور بدزبانی کو پسند نہیں کرتا''۔
(جامع ترمذی، حدیث نمبر:۲۰۰۲)

● حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن اپنے حسنِ اخلاق کے ذریعے اس شخص کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو رات بھر عبادت کرتا اور دن بھر روزے رکھتا ہے''۔ اسی طرح نرمی کو بھی اچھے اخلاق کا نہایت اہم حصہ قرار دیا گیا ہے۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۷۹۸)**

● صحیح مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص نرمی سے محروم کردیا گیا۔
(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۵۹۲)
وہ خیر و بھلائی سے محروم کردیا گیا''۔ اسی لئے آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نرمی جس چیز میں بھی شامل ہو جاتی ہے اسے خوبصورتی عطا کردیتی ہے، اور جس چیز سے نرمی نکال دی جائے وہ عیب دار بن جاتی ہے۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ کون

شخص جہنم کی آگ پر حرام ہے اور جہنم کی آگ اس پر حرام ہے؟ وہ ہر وہ شخص ہے جو نرم مزاج، خوش اخلاق، لوگوں کے قریب رہنے والا اور آسانی سے مل جل جانے والا ہو''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۸۸)**

● اسی طرح سنن ابی داؤد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں سخت مزاج اور بد اخلاق شخص داخل نہیں ہوگا''۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۸۰۱)

حسن اخلاق کا پیکر

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام اہلِ حسنِ اخلاق کے سردار تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں بے شمار تکلیفیں برداشت کیں، لیکن ہر حال میں صبر، بردباری اور نرمی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ آپ نے ہر شخص کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کیا۔

قرآنِ مجید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: **وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ** یعنی اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد جمع نہ رہتے بلکہ آپ سے دور ہو جاتے۔

خلاصہ: اس آیت میں ایک طرف رسول اللہ ﷺ کے عظیم اخلاق، نرم دلی اور محبت بھرے مزاج کا بیان ہے، اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ صحابۂ کرامؓ کا آپ ﷺ کے گرد جمع ہونا اور آپ سے بے پناہ محبت کرنا اسی اعلیٰ اخلاق کا نتیجہ تھا۔ اگر آپ ﷺ سخت طبیعت اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ سے دور ہو جاتے، لیکن آپ کی شفقت، نرمی اور حسنِ اخلاق نے سب کو آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

استاذ اور مصلح کے اخلاق

انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ نرم خو، خوش مزاج اور محبت کرنے والے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا پسند کرتا ہے اور انہی سے علم و معرفت حاصل کرنے میں دل چسپی لیتا ہے۔ اس حقیقت میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نصیحت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے نائب اور دینی خدمت کے ذمہ دار ہیں؛ جیسے معلمین، محدثین، مفتیانِ کرام، مرشدین، مبلغین، داعیان اور رہنما۔ اگر وہ امت کو علم پہنچانا اور اس سے حقیقی فائدہ اٹھوانا چاہتے ہیں تو انہیں نرم مزاج، محبت کرنے والا اور مہربان ہونا چاہیے۔

بسا اوقات بعض افراد علم اور روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں، مگر ان کی سختی یا تند مزاجی کی وجہ سے لوگ ان سے فیض حاصل کرنے سے کتراتے ہیں۔

اگرچہ ہر مسلمان کے لئے اچھے اخلاق اور نرم مزاجی اختیار کرنا ضروری ہے، لیکن جو لوگ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیتے ہیں، ان کے لئے یہ صفت اور بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ گھل مل

کررہیں، خیر اور بھلائی کی تعلیم دیں، اور لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کریں۔

محض اپنی ذاتی عبادت اور نیکیوں میں مشغول ہوکر تنہائی اختیار کر لینا، تاکہ لوگوں کی تکلیف سے بچا جا سکے، اس قدر مفید نہیں جتنا کہ لوگوں تک خیر پہنچانا اور اس راستے میں آنے والی دشواریوں کو برداشت کرنا۔

مشورہ کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ''ان سے معاملات میں مشورہ کیجیے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ آپ ﷺ اس آیت کے نزول سے پہلے بھی صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور اس کے بعد بھی یہ طرزِ عمل جاری رہا۔ اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی دلجوئی فرمائی اور انہیں عزت واحترام عطا کیا۔ البتہ یہ مشورہ اُن معاملات میں ہوتا تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم موجود نہ ہوتا؛ جن امور کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا تھا، ان میں آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

مشورے کی ضرورت

اس آیت سے مشورے کی اہمیت اور ضرورت واضح ہوتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم رہنما کو بھی مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تو پھر آپ کے بعد کون ایسا ہوسکتا ہے جسے مشورے کی ضرورت نہ ہو۔ اس سے آئندہ آنے والے حکمرانوں اور ذمہ دار افراد کے لئے بھی یہ اصول قائم ہوگیا کہ وہ اہم معاملات میں مشورہ کریں۔ مشورے میں بڑی خیر اور برکت ہوتی ہے۔ چاہے رائے دینے والے عمر یا مرتبے میں چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں، انہیں بھی مشورے میں شامل کرنا چاہئے، کیونکہ اس طرح مختلف آرا سامنے آجاتی ہیں اور ان میں سے بہتر رائے کو اختیار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات بڑوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتی ہے مگر چھوٹے لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح تمام پہلو سامنے آجانے سے صحیح فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

استخارہ کی اہمیت

● حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے استخارہ کیا وہ ناکام نہیں ہوگا اور جس نے مشورہ کیا وہ پشیمان نہیں ہوگا''۔ (مجمع الزوائد حدیث نمبر ۳۶۷۰) گھریلو معاملات ہوں یا اداروں کے کام، ہر جگہ مشورہ کرنا مفید اور ضروری ہے۔ البتہ جن لوگوں سے مشورہ لیا جائے، ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ کو حاضر وناظر جانتے ہوئے وہی رائے دیں جسے وہ صحیح سمجھتے ہوں۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے''۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۸۲۲)

اگر کوئی شخص اپنے ذاتی معاملے میں بھی مشورہ طلب کرے تو اسے وہی مشورہ دینا چاہئے جو حقیقت میں اس کے حق میں بہتر ہو۔ سنن ابی داؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنے بھائی کو ایسا مشورہ دیا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے حق میں بہتر رائے کوئی اور تھی، تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی''۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۶۵۷)

● حضرت علیؓ سے بھی یہ قول منقول ہے کہ جب کسی سے مشورہ طلب کیا جائے تو اسے ایسا مشورہ دینا چاہیے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہو، اگر وہ خود اسی حالت میں ہوتا جس میں مشورہ لینے والا ہے۔ یہی بات اس حدیث کے مطابق ہے جس میں ایمان کی ایک اعلیٰ صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۵)**

مشورے کی شرعی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے مشورہ دینے کے بعد فرمایا: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ یعنی جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد جب کوئی بات طے ہو جائے اور ارادہ مضبوط ہو جائے تو پھر اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشورہ لینے کے بعد مشورہ لینے والا اس بات کا پابند نہیں کہ وہ سب کی یا کسی ایک کی رائے کو لازماً قبول کرے۔ جس رائے کی طرف اس کا رجحان ہو اور جسے وہ زیادہ مناسب سمجھے، اس پر عمل کرسکتا ہے۔

اسی طرح مشورہ دینے والوں کو بھی اس بات پر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ مشورہ دینا اور لینا دونوں بے فائدہ نہیں ہوتے۔ مشورہ دینے والوں کو اپنی رائے پیش کرنے اور غور وفکر کرنے کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد فیصلہ کرنے والا جس رائے کو بہتر سمجھے اس کے مطابق عمل کرلیتا ہے۔

اپنا ارادہ پختہ کرنے کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنے کا حکم اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام مشوروں اور تدبیروں کے باوجود اصل اعتماد اللہ ہی پر ہونا چاہئے۔ انسانوں کی آرا اور تدبیریں محض اسباب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مومن کا حقیقی بھروسہ دنیاوی وسائل پر نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

مشورے کا حکم آج بھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی مشورہ کرنے کی سنت جاری ہے۔ تاہم یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ لینے والے کے لئے خواہ وہ امیر المؤمنین ہی کیوں نہ ہو یہ لازم نہیں کہ وہ سب کی یا کسی ایک کی رائے کو قبول کرے۔ مشورہ لینے کے باوجود اسے اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ جب مشورہ لینے والا بھی مخلص ہو اور مشورہ دینے والے بھی خلوصِ نیت سے اپنی رائے پیش کریں، اور سب کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو، تو اختلاف کے باوجود دلوں میں ناراضی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب اخلاص کی جگہ ضد، بدگمانی اور دنیا طلبی آجائے تو پھر یہ اعتراضات پیدا ہوتے ہیں کہ میری رائے پر عمل کیوں نہ کیا گیا یا امیر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مشورہ کرنے کے باوجود اپنی رائے نافذ کرتا ہے۔

اگر قیادت کے انتخاب میں اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھا جائے اور ایسے شخص کو ذمہ داری دی جائے جو تقویٰ، علم اور اخلاص میں معتبر ہو، جو دنیا طلب نہ ہو اور منصب کا خواہش مند نہ ہو، تو اس کے فیصلے پر عمل کرنا لوگوں کو ناگوار محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن اگر پہلے قیادت کے انتخاب میں ہی غلطی کی جائے اور پھر اس کے خلاف مظاہرے اور جلوس نکال کر اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

مشورہ کرنا انسانی زندگی اور اجتماعی نظام کے لئے نہایت مفید عمل ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے مشورہ انسان کے اندر اطمینان، اعتماد اور ذہنی سکون پیدا کرتا ہے، کیونکہ جب مختلف لوگوں کی آرا سامنے آتی ہیں تو انسان تنہائی کے احساس سے نکل کر اجتماعی حکمت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تجرباتی طور پر یہ حقیقت بارہا ثابت ہوئی ہے کہ مختلف تجربات اور آرا کے جمع ہونے سے بہتر اور متوازن فیصلے سامنے آتے ہیں۔ تاریخی طور پر بھی بڑی کامیاب قیادتیں اور مضبوط معاشرے وہی رہے ہیں جہاں مشاورت کو اہمیت دی گئی، جیسے اسلامی تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے فیصلے اکثر مشورے سے طے ہوتے تھے۔

سائنسی نقطۂ نظر سے بھی جدید تحقیق یہ بتاتی ہے کہ collective intelligence یعنی اجتماعی ذہانت اکثر ایک فرد کے فیصلے سے زیادہ درست نتائج پیدا کرتی ہے، کیونکہ مختلف زاویۂ نظر اور معلومات مل کر مسئلے کا جامع حل پیش کرتے ہیں۔ اس طرح مشورہ نہ صرف بہتر فیصلہ سازی کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ معاشرے میں اعتماد، تعاون اور حکمت کو بھی فروغ دیتا ہے۔

موجودہ جمہوریت (Modern Democracy)

قدیم زمانوں میں دنیا کے اکثر ممالک میں بادشاہت (Monarchy) کا نظام رائج تھا۔ عموماً حکومت ولی عہد

کے اصول پر منتقل ہوتی تھی اور اسی بنیاد پر سلطنتیں قائم رہتی تھیں۔ عرب وعجم میں مختلف بادشاہ حکومت کرتے رہے؛ ان میں بعض انصاف پسند اور رحم دل بھی تھے، مگر تاریخی طور پر اکثر بادشاہوں کے بارے میں ظلم واستبداد کی شکایات ملتی ہیں۔ جب یورپ کے لوگوں نے ان ظالمانہ حکومتوں سے تنگ آ کر متبادل نظام کی تلاش کی تو انہوں نے جمہوریت (Democracy) کو رائج کیا اور اسے عوامی حکومت (Public Government) کا نام دیا۔

اس نظام کا بنیادی اصول یہ قرار دیا گیا کہ حکمرانوں کا انتخاب عوام کی رائے سے ہوگا اور بالغ شہری (adult citizens) ووٹ کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ بظاہر یہ تصور عوامی اختیار اور اجتماعی فیصلہ سازی کا مظہر معلوم ہوتا ہے، لیکن عملی طور پر اس نظام میں کئی کمزوریاں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ انتخابی عمل میں امیدوار کے لیے دیانت، دینداری یا اعلیٰ اخلاق کا ہونا لازمی شرط نہیں ہوتا۔ اس لئے بسا اوقات ایسے افراد بھی انتخابات میں کھڑے ہوجاتے ہیں جو علمی یا اخلاقی معیار پر پورا نہیں اترتے۔ سیاسی جماعتوں کی طاقت، مالی وسائل (money power) اور انتخابی مہم کے اثرات کے باعث اکثر وہی افراد کامیاب ہوجاتے ہیں جن کے پاس وسائل یا جماعتی حمایت زیادہ ہوتی ہے۔

جمہوری انتخابات

جمہوری انتخابات میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی حلقے میں کئی امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور جس شخص کو سب سے زیادہ ووٹ مل جائیں وہ منتخب قرار دے دیا جاتا ہے، چاہے مجموعی ووٹوں کی بڑی تعداد اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی انتخاب میں گیارہ امیدوار ہوں اور دس کو پندرہ پندرہ ووٹ ملیں جبکہ ایک امیدوار کو سولہ ووٹ مل جائیں تو وہ کامیاب قرار پاتا ہے، حالانکہ اکثریت اس کے خلاف ہوتی ہے۔

نمائندگی

اس طرح انتخابی نظام بعض اوقات حقیقی اکثریت کی نمائندگی نہیں کر پاتا۔ پارلیمانی نظام میں بھی عموماً وہی جماعت حکومت بناتی ہے جس کے نمائندے زیادہ تعداد میں منتخب ہوجائیں۔

اس طرح چند افراد یا ایک سیاسی جماعت ملک کے انتظام واقتدار کی ذمہ داری سنبھال لیتی ہے۔

پارٹی نظام کے تحت اکثر اراکینِ پارلیمنٹ کو اپنی ذاتی رائے کے بجائے جماعتی پالیسی کے مطابق ہی ووٹ دینا پڑتا ہے، جس سے انفرادی رائے کی آزادی محدود ہوجاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی حکومتی ڈھانچے کے اخراجات بھی ایک اہم مسئلہ بن جاتے ہیں۔ صدر، وزیراعظم، وزراء، گورنر، وزیراعلیٰ اور دیگر حکومتی عہدوں سے وابستہ رہائش، سکیورٹی، گاڑیاں اور انتظامی اخراجات قومی خزانے پر بڑا بوجھ بن

جاتے ہیں۔ جب سرکاری آمدنی ان اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتو حکومتیں بیرونی قرضوں اور مختلف ٹیکسوں جیسے income tax، customs duty اور export tax کا سہارا لیتی ہیں، جس کا اثر بالآخر عوام پر ہی پڑتا ہے۔

اسلامی نظام میں قیادت کا اصول

اسلامی نقطۂ نظر سے حکمرانی کا اصل اصول شوریٰ (consultation) ہے۔ قرآن مجید میں مشورے کی اہمیت واضح طور پر بیان کی گئی ہے اور اسلامی سیاسی فکر میں اجتماعی مشاورت کو ایک بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اسلامی تصورِ شوریٰ اور جدید مغربی جمہوریت میں فرق ہے۔ اسلامی نظام میں قیادت کا معیار تقویٰ، علم، دیانت اور اہلیت کو قرار دیا جاتا ہے، جبکہ شوریٰ کی حیثیت مشورہ اور رہنمائی کی ہوتی ہے، نہ کہ محض عددی اکثریت (numerical majority) کے اصول پر فیصلہ کرنا۔

اسلامی سیاسی فکر میں ایک سادہ اور ذمہ دار حکومتی نظام کے تصور کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں قیادت عوام کی خدمت کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اقتدار اور مراعات کے حصول کے لئے۔ ایسے نظام میں حکمران سادگی اور ذمہ داری کے ساتھ فرائض انجام دیتے ہیں اور ریاستی وسائل کو امانت سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔

اسی لیے بعض اہلِ فکر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اگرچہ جدید جمہوریت نے آمریت اور مطلق العنانیت کے مقابلے میں ایک متبادل فراہم کیا ہے، لیکن اس میں بھی کئی اصلاحات کی ضرورت باقی ہے۔ حقیقی عدل و انصاف اور اجتماعی فلاح اسی وقت ممکن ہے جب نظامِ حکومت اخلاقی اصولوں، دیانت اور ذمہ داری پر قائم ہو۔

خلفائے راشدین کا انتخاب

اسلامی تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر خلفائے راشدین کا انتخاب موجودہ طرزِ انتخاب یعنی عام ووٹنگ یا ملک گیر الیکشن کے ذریعے نہیں ہوا تھا۔ ان کا تقرر ایسے طریقے سے ہوا جو اس دور کے حالات اور صحابۂ کرامؓ کی باہمی مشاورت اور اتفاقِ رائے پر مبنی تھا۔

جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو مہاجرین اور انصار کے معزز صحابہؓ مدینہ میں سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اس اہم مسئلے پر مشورہ کرنے لگے کہ مسلمانوں کا امیر کون ہونا چاہئے۔ بعض انصاری حضرات کی رائے یہ تھی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔

اسی دوران حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ گفتگو کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: ''آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں آپ کی بیعت کروں''۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت عمرؓ نے سب

سے پہلے بیعت کی۔ اس کے بعد مہاجرین نے بیعت کی اور پھر انصار نے بھی بیعت کر لی۔ اس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مسلمانوں کا پہلا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ **(تفصیل: البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۲۶۴)**

حضرت ابوبکر صدیقؓ

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے امت کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت عمر بن خطابؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ صحابہؓ نے اس فیصلے کو قبول کیا اور حضرت عمرؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔

حضرت عمر فاروقؓ اور مجلس شوریٰ

پھر جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے تو انہوں نے خلافت کے معاملے کو چند جلیل القدر صحابہؓ کی ایک مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ خلافت کے حق دار وہ حضرات ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری ایام میں راضی تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے نام ذکر کیے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی ہدایت دی کہ ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ مشورے میں شریک ہوں مگر انہیں خلافت نہ دی جائے۔

اس مجلسِ شوریٰ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے تجویز پیش کی کہ معاملہ چند افراد کے سپرد کر دیا جائے۔ حضرت زبیرؓ نے اپنی رائے حضرت علیؓ کے حق میں دے دی، حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں اور حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے سپرد کر دی۔

پھر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی اور یہ یقین دہانی حاصل کی کہ جسے بھی خلیفہ منتخب کیا جائے گا وہ اس کی اطاعت کریں گے۔ غور و فکر اور مشاورت کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کی، پھر حضرت علیؓ نے بھی بیعت کی اور دیگر صحابہؓ نے بھی اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ تیسرے خلیفہ منتخب ہوئے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد

بعد میں جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو مسلمانوں کو دوبارہ ایک خلیفہ کی ضرورت پیش آئی۔ اس موقع پر مختلف گروہوں نے حضرت علیؓ سے خلافت قبول کرنے کی درخواست کی۔ ابتدا میں انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا، مگر جب حالات نے اس کی ضرورت پیدا کر دی تو انہوں نے امت کی مصلحت کے پیشِ نظر خلافت

قبول فرمالی۔ (البدایہ والنہایہ، ج۷، ص۲۲۶)

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کا انتخاب باہمی مشورے، اہلِ حل وعقد کی رائے اور امت کے اتفاق سے ہوا تھا۔ اس میں آج کے طرز کے ملک گیر انتخابات نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی تمام مسلمانوں نے براہِ راست ووٹنگ میں حصہ لیا تھا، بلکہ چند معتبر صحابہؓ نے مشاورت کے ذریعے فیصلہ کیا اور پوری امت نے اسے قبول کر لیا۔ قرآن مجید میں بھی مہاجرین وانصار اور ان کے پیروکاروں کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (سورۃ التوبہ:۱۰۰)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میری سنت اور میرے بعد آنے والے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھو''۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۶۰۷)

لہٰذا خلفائے راشدین کے طریقۂ انتخاب کو نظر انداز کر کے محض جدید سیاسی نظریات کے اثر میں آ کر اسلامی تاریخ اور اس کے اصولوں پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ دشمنوں کے طریقوں سے متأثر ہو کر اسلامی اصولوں میں تبدیلی یا تحریف کی کوشش کرنا ایمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔

اسلام کا سیاسی واجتماعی نظام اپنی بنیاد میں مشاورت، دیانت اور ذمہ داری پر قائم ہے، اور یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے ابتدائی اسلامی معاشرے کو مضبوط اور منصفانہ بنایا۔

آیت نمبر (۱۶۰) اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے، تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔ اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟ پس ایمان والوں کو صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے''۔

اللہ تعالیٰ کی مدد

تفسیر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کسی قوم کی کامیابی اور غلبہ دراصل اللہ تعالیٰ کی مدد پر موقوف ہوتا ہے۔ محض تعداد کی کثرت یا ساز وسامان کی فراوانی حقیقی کامیابی کی ضمانت نہیں بنتی۔

اگر اللہ تعالیٰ کسی قوم کی مدد فرمائے تو کوئی طاقت اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ اس کی واضح مثال غزوۂ بدر ہے،

جہاں مسلمان تعداد اور وسائل کے اعتبار سے کمزور تھے، مگر اللہ کی مدد سے دشمن پر غالب آ گئے۔

اس کے برعکس اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی مدد سے محروم کر دے تو پھر کوئی قوت اس کی مددگار نہیں بن سکتی۔ غزوۂ اُحد کے واقعے میں اس حقیقت کا عملی اظہار بھی سامنے آ گیا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نصرت و کامیابی کے لیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اسی سے مدد طلب کرنی چاہئے اور اسی پر کامل بھروسہ رکھنا چاہئے۔

آیت نمبر (۱۶۱) وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

ترجمہ: ''کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ اور جو خیانت کرے گا، قیامت کے دن وہ لے آئے گا جو اس نے خیانت کی ہوگی، پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

خیانت کی ممانعت

تفسیر اس آیت کے پس منظر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر ایک سرخ چادر گم ہوگئی۔ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے الگ رکھ لیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور واضح کر دیا کہ نبی کی شان ہرگز یہ نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۰۹، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۹۷۱)

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ لفظ غُلُول کے اصل معنیٰ خفیہ طور پر کسی چیز کو لے لینے کے ہیں۔ بعد میں یہ لفظ خاص طور پر مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ درحقیقت یہ بھی ایک قسم کی خیانت ہے، کیونکہ اس میں انسان کسی دوسرے کے مال کو پوشیدہ طریقے سے اپنے لیے لے لیتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے جائز نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے تنبیہ فرمائی ہے کہ جو شخص خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو لے کر حاضر ہوگا، تاکہ اس کی رسوائی ظاہر ہو جائے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ اس نے دنیا میں خیانت کی تھی۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کا طریقہ

سنن ابی داؤد میں مذکور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تو آپ حضرت بلالؓ کو حکم دیتے کہ لشکر میں اعلان کریں کہ جس کے پاس بھی مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز ہو وہ اسے جمع کرا دے۔ جب تمام مال جمع ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں سے شرعی حکم کے مطابق پانچواں حصہ بیت المال کے لئے الگ فرماتے اور باقی

مال مجاہدین کے درمیان انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیتے تھے۔

خیانت اور غلول کی سنگینی

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک دن مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد ایک شخص بالوں کی بنی ہوئی ایک رسی لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ وہ چیز ہے جو مجھے مالِ غنیمت میں ملی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے بلال کی آواز نہیں سنی تھی؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سوال تین مرتبہ فرمایا۔ اس شخص نے عرض کیا: جی ہاں، میں نے سنی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تم اسے پہلے کیوں نہ لے آئے؟ کس چیز نے تمہیں اس کے پیش کرنے سے روکا؟'' اس نے کچھ عذر پیش کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اب اسے قیامت کے دن ہی لے کر آنا، میں اب اسے تم سے قبول نہیں کروں گا''۔

مالِ غنیمت میں خیانت

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیان فرمایا: غزوۂ خیبر کے موقع پر کچھ صحابۂ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مختلف افراد کے بارے میں کہنے لگے کہ فلاں شخص شہید ہوا۔ اسی دوران ایک شخص کا ذکر کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ہرگز نہیں! میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے، اس چادر کی وجہ سے جس میں اس نے غلول کیا تھا''۔ یعنی اس نے مالِ غنیمت میں سے ایک چادر چھپالی تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''اے ابن خطاب! جاؤ اور لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے''۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ اس بات کا اعلان کیا۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۱۴)**

یہاں غلول سے مراد مالِ غنیمت میں خیانت کرنا یا تقسیم سے پہلے اس میں سے کچھ چھپالینا ہے، اور یہ ایک نہایت سنگین گناہ ہے۔ قرآن کریم میں اس پر سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو اپنے ساتھ لے کر حاضر ہوگا۔ اسی مفہوم کو واضح کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے مالِ غنیمت میں خیانت کی سختی بیان فرمائی اور اسے بڑا گناہ قرار دیا۔

قیامت کے دن

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن میں تم میں سے کسی کو اس حال میں دیکھوں کہ اس کی گردن پر کوئی بکری لدی ہو جو ممیا رہی ہو، یا گھوڑا ہو جو ہنہنا رہا ہو، اور وہ مجھ سے فریاد کرے: اے اللہ کے رسول!

میری مدد کیجئے۔تو میں کہوں گا کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا، میں نے تو دنیا میں اللہ کا حکم تم تک پہنچا دیا تھا''۔

اسی طرح کوئی شخص اونٹ اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہو جو آواز کر رہا ہو، یا سونا چاندی اپنی گردن پر لادے ہو، یا کپڑے کے ٹکڑے لادے ہوئے ہو جو ہوا میں اڑ رہے ہوں اور وہ مجھ سے مدد طلب کرے، تو میں کہوں گا کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا، میں نے تو تم تک اللہ کا حکم پہنچا دیا تھا''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر:)**

خیانت کا وبال

یہ حکم صرف مالِ غنیمت تک محدود نہیں بلکہ ہر اس مال کو شامل ہے جو انسان ناحق لے لے۔اگر کوئی شخص کسی ایسے مال پر قبضہ کرے جو اس کا حق نہ ہو تو قیامت کے دن وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے حاضر ہوگا۔اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی ازد کے ایک شخص کو صدقات وصول کرنے پر مقرر فرمایا۔جب وہ واپس آیا تو اس نے کہا:

''یہ مال آپ کے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے''۔یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: ''میں بعض لوگوں کو ان کاموں پر مقرر کرتا ہوں جن کی ذمہ داری اللہ نے مجھے سونپی ہے، پھر وہ آکر کہتے ہیں کہ یہ تمہارے لیے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے۔کیوں نہ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھا رہتا اور دیکھتا کہ اسے ہدیہ ملتا ہے یا نہیں؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! جو شخص بھی اس مال میں سے کچھ لے گا جو اس کے لئے مقرر نہیں تھا، وہ قیامت کے دن اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے آئے گا۔اگر وہ اونٹ ہوگا تو وہ آواز کر رہا ہوگا، اگر گائے ہوگی تو وہ بھی بول رہی ہوگی اور اگر بکری ہوگی تو وہ بھی ممیا رہی ہوگی''۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ اتنے بلند کئے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی، اور فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ، اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ''یعنی اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟

(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۵۹۷)

وقف کے مال میں خیانت

لہٰذا جو لوگ وقف کے مال، بیت المال یا عوامی املاک میں خیانت یا غبن کرتے ہیں، انہیں چاہئے کہ آخرت کے دن کو یاد کریں اور اس انجام پر غور کریں جو خیانت کرنے والوں کا ہوگا۔قرآن کریم کے اس ارشاد کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے: ''پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

آیت نمبر (۱۶۲-۱۶۳) اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ: ''کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کا تابع رہا، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا؟ اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا انجام ہے۔ یہ لوگ (الگ الگ) درجوں میں ہوں گے اللہ کے یہاں، اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی خوشی کے طالب

تفسیر ان دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے درمیان واضح فرق بیان فرمایا ہے جو اس کی رضا اور خوشنودی کے طالب ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان جو اپنے برے اعمال کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق بن جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ سننے والا خود بھی غور کرے اور سمجھ لے کہ یہ دونوں گروہ کسی طرح برابر نہیں ہوسکتے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے والوں کے بارے میں یہاں جنت کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اللہ کی رضا خود ایک نہایت عظیم نعمت اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس کے مقابلے میں ان لوگوں کے انجام کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اللہ کے غضب کے مستحق ہوجاتے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جو نہایت بری جگہ ہے۔

پھر ارشاد فرمایا گیا کہ یہ دونوں گروہ اللہ کے ہاں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں وہ جنت میں مختلف نعمتوں اور راحتوں سے بہرہ مند ہوں گے، جبکہ جو لوگ اللہ کے غضب کے مستحق بن جاتے ہیں وہ جہنم کے گوناگوں عذابوں میں مبتلا ہوں گے۔

ان دونوں کے درجات اور انجام اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے طے ہیں، کیونکہ وہ بندوں کے تمام اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ ہر انسان کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کوئی عمل اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں رہتا۔

آیت نمبر (۱۶۴) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: ''یقیناً اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا، جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب وحکمت

کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔

اللہ تعالیٰ نہایت کریم اور مہربان ہے۔ ایک طویل عرصے تک دنیا کے لوگ شرک اور کفر کی تاریکیوں میں گرفتار رہے۔ چند افراد کے سوا اللہ کو ماننے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ جو لوگ بظاہر اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، ان میں سے اکثر بھی شرک کی آمیزش میں مبتلا تھے۔ عرب ہو یا عجم، تقریباً پوری دنیا شیطانی اثرات کے زیرِ اثر تھی اور کفر وگمراہی عام ہو چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان

ایسے تاریک دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی جہالت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں اور ایمان کا نور دنیا میں پھیلنے لگا۔ بے شمار لوگ جو شرک وکفر کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے، اسلام قبول کر کے ہدایت کی راہ پر آ گئے۔

اس طرح نہ صرف وہ خود نجات کے راستے پر گامزن ہوئے بلکہ ان کی آنے والی نسلوں میں سے بھی جو لوگ اسلام کو اختیار کریں گے وہ اللہ کے فضل سے جنت کے مستحق ہوں گے۔

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانوں ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو انہیں حق کی تعلیم دے، اپنی عملی زندگی سے اس کی مثال پیش کرے اور انہی کے درمیان رہ کر ان کی اصلاح کرے۔ وہ انہیں اللہ کی آیات سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، یعنی ان کے دلوں کو برائیوں اور ناپسندیدہ اخلاق سے پاک کرے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا ہے، اور اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۹ میں مذکور ہے۔

اسی مفہوم کو واضح کرتے ہوئے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری پوری امت جنت میں داخل ہوگی، سوائے اس کے جو انکار کرے''۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کون ایسا ہے جو جنت میں جانے سے انکار کرے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا انکار کیا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۲۸۰)**

آیت نمبر (۱۶۵-۱۶۸) اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ

اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ: ''کیا ہوا جب تمہیں (احد کے دن) مصیبت پہنچی، حالانکہ تم (بدر کے دن) اس سے دوگنی سزا دے چکے تھے، تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آ گئی؟ کہہ دو: یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جو کچھ تمہیں اس دن نقصان پہنچا جب دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں، تو وہ اللہ کے حکم سے تھا، تا کہ اللہ سچے مومنوں کو پہچان لے۔ اور تا کہ وہ منافقوں کو بھی پہچان لے، جن سے کہا گیا: آؤ، اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع کرو۔ تو وہ کہنے لگے: اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ آتے۔ وہ اس دن ایمان کے مقابلے میں کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، جب کہ وہ خود بیٹھے رہے، کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دو: اگر تم سچے ہو، تو اپنی جانوں سے موت کو روک کر دکھاؤ''۔

مسلمانوں کو تسلی

تفسیر غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جو وقتی شکست اور تکلیف پیش آئی، اس موقع پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوا اور ان کی زبانوں سے یہ الفاظ نکلے: اَنّٰی هٰذَا (یہ مصیبت کہاں سے آ گئی؟) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ انہیں بتا دیں کہ اس ظاہری مصیبت کا سبب خود تمہاری اپنی کوتاہی تھی۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی، کیونکہ جن تیر اندازوں کو پہاڑی پر مقرر کیا گیا تھا انہوں نے تاکید کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اسی بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا یعنی تم خود اس سے دوگنی مصیبت اپنے دشمنوں کو پہنچا چکے ہو۔ گزشتہ سال غزوۂ بدر میں کفار کے ستر افراد قتل ہوئے تھے اور ستر قیدی بنائے گئے تھے جنہیں مدینہ لایا گیا۔

اس طرح مسلمانوں کو یہ تسلی دی گئی کہ اگر اس موقع پر تمہیں تکلیف پہنچ گئی ہے تو اس سے پہلے تم دشمن کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا چکے ہو۔ لہٰذا اگر تمہاری اپنی کوتاہی کے باعث تمہیں کوئی مصیبت پیش آ گئی تو اس پر حد سے زیادہ غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت

ارشاد فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ

یعنی جس دن دونوں جماعتیں آمنے سامنے آئیں، اس دن جو مصیبت تمہیں پیش آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی۔ اس کا ظاہری سبب تو تمہاری نافرمانی تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے موقع پر جو کچھ پیش آیا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق تھا، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس واقعے کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ منافقین کی حقیقت کو ظاہر کر دے۔ قرآن نے فرمایا: وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا یعنی تاکہ وہ لوگ پہچان لئے جائیں جو منافقت کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھے اور زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، مگر دل سے مخلص نہ تھے۔ جب جنگ کا وقت آیا تو انہوں نے اپنی ظاہری دوستی بھی چھوڑ دی اور ان کا نفاق کھل کر ظاہر ہو گیا۔

منافقوں کا عذر

جب انہیں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم ہمارے ساتھ رہ کر دشمن کے مقابلے میں ہماری قوت بڑھاؤ، تو انہوں نے جواب دیا: لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ یعنی اگر ہم جنگ کرنا جانتے ہوتے تو ضرور تمہارے ساتھ آ جاتے۔

اس قول کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جنگ کے فن سے ناواقف ہونے کا بہانہ بنا رہے تھے، اور دوسرا یہ کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ میں کامیابی کی کوئی امید نہیں، کیونکہ مسلمان تعداد اور سامان کے اعتبار سے کمزور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ یعنی اس وقت وہ ایمان سے زیادہ کفر کے قریب ہو گئے تھے۔ پہلے وہ ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں میں شامل رہتے تھے، مگر ان کے اقوال اور اعمال نے خود ہی اس دعوے کو باطل کر دیا۔ عقل رکھنے والا ہر شخص ان کی باتوں سے سمجھ سکتا تھا کہ وہ حقیقی مومن نہیں ہیں بلکہ کافرانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہ تھیں۔

ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم جنگ کا طریقہ جانتے یا جنگ میں فائدہ دیکھتے تو تمہارے ساتھ ہوتے، دراصل حقیقت کے خلاف تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے سے جنگ میں شریک ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے دلوں کے تمام رازوں کا علم تھا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ۔

موت سے حفاظت

منافقین کی مزید حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ وہ خود تو جنگ میں شریک نہ ہوئے اور بیٹھے رہے، پھر اپنے ان بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے جو جنگ میں شریک ہوئے تھے کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ ہوتے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو موت کو اپنے سے دور کر کے دکھاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ موت سے فرار ممکن نہیں۔ کوئی شخص جنگ سے بچ کر گھر میں بیٹھ جائے اور یہ سمجھے کہ وہ موت سے محفوظ ہو گیا ہے تو یہ محض فریب ہے۔ موت جب اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ منافق کے نزدیک اپنی جان سب سے قیمتی ہوتی ہے، اس لئے وہ اللہ کی راہ میں جان دینے سے گھبراتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے جان دینے کو بھی تیار رہتا ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑنے اور قربانی دینے سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۶۹ سے ۱۷۹ تک

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ:

(۱۶۹) اور ہرگز نہ سمجھیں آپ کہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، مردہ ہیں، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق پا رہے ہیں۔ (۱۷۰) وہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا، اور وہ خوشی مناتے ہیں ان بھائیوں کے بارے میں جو ابھی ان سے نہیں ملے، اس بات پر کہ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۱۷۱) وہ اللہ کے انعام اور فضل پر خوش ہوتے ہیں، اور اس بات پر بھی کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۱۷۲) جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم پر چلنا جاری رکھا، باوجود اس کے کہ وہ زخمی ہو چکے تھے، ان میں جنہوں نے بھلائی کی اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ (۱۷۳) جب لوگوں نے اُن سے کہا کہ تمہارے

خلاف لشکر جمع ہو چکے ہیں، ان سے ڈرو، تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (۱۷۴) چنانچہ وہ لوٹے اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ، اور ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی، اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ (۱۷۵) یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو۔ (۱۷۶) وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، وہ آپ کو غمگین نہ کریں، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ نے ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ (۱۷۷) جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا، وہ بھی اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۱۷۸) وہ لوگ جو کافر ہیں، یہ گمان نہ کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں مہلت اس لیے دے رہے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ گناہوں میں بڑھ جائیں، اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ (۱۷۹) اللہ ایسا نہیں کہ مؤمنوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر وہ ہو، جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے۔ اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے، بلکہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، چن لیتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بڑا اجر ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۶۹ سے ۱۷۹ تک

آیت نمبر (۱۶۹-۱۷۱) وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اور ہرگز نہ سمجھیں آپ کہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، مردہ ہیں، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق پا رہے ہیں۔ وہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا، اور وہ خوشی مناتے ہیں ان بھائیوں کے بارے میں جو ابھی ان سے نہیں ملے، اس بات پر کہ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کے انعام اور فضل پر خوش ہوتے ہیں، اور اس بات پر بھی کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔

شہداء کی زندگی

تفسیر پچھلی آیات میں بیان ہوا کہ منافقین اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ ہوتے۔ ان کے نزدیک شہید ہونا کوئی اچھی بات نہ تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ جنگ میں شریک نہ ہوتے تو دنیا میں زیادہ عرصہ زندہ رہتے۔ قرآنِ مجید نے ان کی اس جاہلانہ سوچ کا ردّ بھی کیا اور اہلِ ایمان کو تسلی اور خوشخبری بھی دی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اس کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نعمتیں ان کے پاس نہیں رہیں، مگر یہ کسی نقصان کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پاس سے ایسی روزی عطا فرماتا ہے جو دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بلند اور بہتر ہے۔

شہداء کا انعام

اللہ تعالیٰ نے جو فضل اور انعام انہیں عطا فرمایا ہے اس پر وہ نہایت خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں میں بسر کر رہے ہیں۔ منافقین جو بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو قتل نہ ہوتے، درحقیقت حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی راہ میں جان دینا حقیقی موت نہیں بلکہ ایک بلند اور دائمی زندگی کا آغاز ہے۔

شہداء کی خواہش

یہ شہداء نہ صرف اپنی نعمتوں پر خوش ہیں بلکہ ان اہلِ ایمان کے بارے میں بھی مسرور ہیں جو دنیا میں ابھی ان سے نہیں ملے اور پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر وہ بھی اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں تو انہیں بھی یہی عظیم انعامات نصیب ہوں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا؛ نہ اس نے ان کے اجر کو ضائع کیا ہے اور نہ بعد میں آنے والے مومنوں کے اجر کو ضائع کرے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی مایوسی۔

شہداء کی عظیم نعمتوں کا ذکر

اس مضمون کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب صحابۂ کرامؓ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان شہداء کی روحوں کو سبز پرندوں کی شکل میں بنا دیا ہے۔ وہ جنت کی نہروں سے پانی پیتے ہیں، اس کے پھلوں سے کھاتے ہیں

اور عرشِ الٰہی کے سائے میں سونے کے قندیلوں میں قیام کرتے ہیں۔ جب انہوں نے وہاں کی نعمتوں اور پاکیزہ ماحول کو دیکھا تو کہنے لگے کہ کاش ہمارے بھائیوں کو بھی معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس قدر عظیم نعمتیں عطا فرمائی ہیں، تاکہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد سے کبھی غفلت نہ کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارا یہ پیغام انہیں پہنچادوں گا۔ چنانچہ اس موقع پر شہداء کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۲۰)**

اس حدیث کا آخری حصہ امام ترمذی نے حضرت جابرؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ **(تفسیر ابن عباس)**

شہادت کی تمنا

حضرت مسروقؒ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم دریافت کیا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ہرگز مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دئے جارہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کا مفہوم رسول اللہ ﷺ سے خود معلوم کرچکے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جولوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں ان کی روحیں سبز پرندوں کے جسموں میں ہوتی ہیں۔ ان کے لیے سونے کے قندیل ہیں جو عرش کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں۔ وہ جنت میں جہاں چاہیں گھومتے پھرتے ہیں، پھر واپس آکر انہی قندیلوں میں ٹھہر جاتے ہیں''۔

پھر اللہ تعالیٰ ان پر خاص توجہ فرماتا ہے اور ان سے پوچھتا ہے: ''کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے؟'' وہ عرض کرتے ہیں: ''ہمیں کس چیز کی خواہش ہوسکتی ہے، جبکہ ہم جنت میں جہاں چاہیں گھوم پھر رہے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ تین مرتبہ اسی طرح سوال فرماتا ہے۔ جب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اب کوئی نہ کوئی خواہش ظاہر کرنا ضروری ہے، تو وہ عرض کرتے ہیں: ''اے ہمارے رب! ہماری خواہش یہ ہے کہ ہماری روحوں کو دوبارہ ہمارے جسموں میں واپس کردیا جائے تاکہ ہم پھر ایک مرتبہ آپ کی راہ میں شہید ہوجائیں''۔ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات آگئی کہ انہیں اس کے سوا کوئی اور خواہش نہیں، تو ان سے مزید سوال نہیں کیا گیا۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۸۷)**

یہ روایت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ شہداء کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔ جنت کی نعمتوں میں رہنے کے باوجود ان کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ دوبارہ دنیا میں آکر اللہ کی راہ میں جان قربان کریں۔ شہادت اور شہداء کے مقام کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی گزر چکا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ یعنی جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔

آیت نمبر (۱۷۲-۱۷۵) اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: ''جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم پر چلنا جاری رکھا، باوجود اس کے کہ وہ زخمی ہو چکے تھے، ان میں جنہوں نے بھلائی کی اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ جب لوگوں نے اُن سے کہا کہ تمہارے خلاف لشکر جمع ہو چکے ہیں، ان سے ڈرو، تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، اور وہی بہترین کارساز ہے۔ چنانچہ وہ لوٹے اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ، اور ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی، اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مفسرین میں سے امام ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ شکست خوردہ کیفیت میں مکہ واپس لوٹ گیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ابوسفیان دل میں خوف لے کر پلٹا ہے، اور یہی اللہ کی طرف سے ڈال دیا گیا رعب تھا۔

صحابہ کی بے مثال اطاعت

غزوۂ اُحد شوال میں پیش آیا، اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد، ذیقعدہ میں تجارتی قافلے مدینہ منورہ پہنچے۔ اس دوران مسلمان شدید زخمی اور جسمانی طور پر نڈھال تھے، مگر اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ جہاد کے لئے نکلنے کا اعلان فرمایا۔

شیطان نے لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ کفار نے ایک بڑا لشکر جمع کر لیا ہے، جس سے بعض لوگوں میں تردد پیدا ہوا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عزمِ صمیم کے ساتھ فرمایا: میں ضرور جہاد کے لیے نکلوں گا، چاہے میرے ساتھ کوئی نہ ہو۔

اس پر جلیل القدر صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، سعدؓ، طلحہؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور دیگر تقریباً ستر جان نثار صحابہؓ نے فوراً لبیک کہا اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ ان کی یہی بے مثال اطاعت اور جانثاری اس آیتِ مبارکہ کا مصداق بنی۔

امام طبرانیؒ کی روایت کے مطابق، جب مشرکین اُحد سے واپس ہوئے تو انہوں نے آپس میں ملامت کی کہ نہ تو تم نے محمد ﷺ کو قتل کیا اور نہ ہی کوئی نمایاں کامیابی حاصل کی، لہٰذا دوبارہ لوٹ کر حملہ کرنا چاہیے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہؓ کو دوبارہ نکلنے کا حکم دیا، اور سب نے بلا تردد اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ یہ قافلہ حمراء الاسد کے مقام تک پہنچا، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس استجابت کو سراہتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر فوراً لبیک کہا۔

جب یہ مبارک جماعت وہاں پہنچی تو دشمن کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ اس موقع پر صحابہؓ نے وہاں ایک بازار بھی قائم کیا، اور یوں وہ اللہ کے فضل وکرم کے ساتھ کامیابی اور سلامتی کے ساتھ واپس لوٹے۔

اسی کیفیت کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ کہ وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، نہ انہیں کوئی گزند پہنچی اور نہ ہی دشمن سے کوئی نقصان ہوا۔

یہ واقعہ صحابۂ کرامؓ کی بے مثال اطاعت، استقامت اور اللہ و رسول ﷺ کے حکم پر کامل یقین کا روشن ثبوت ہے، جو رہتی دنیا تک اہلِ ایمان کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

توکل علی اللہ کی درخشاں مثال

درِ منثور (حصہ دوم، صفحہ ۱۰۱) میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد جب ابو سفیان اور اس کے ساتھی واپس لوٹے تو راستے میں باہم یہ مشورہ کرنے لگے کہ ہم یوں ہی پلٹ آئے، نہ کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی اور نہ مسلمانوں کو مکمل طور پر ختم کیا؛ بہتر یہ ہے کہ دوبارہ لوٹ کر بھرپور حملہ کیا جائے۔ رسولِ اکرم ﷺ کو جب اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فوراً صحابۂ کرامؓ کو ساتھ لے کر دشمن کے تعاقب کا فیصلہ فرمایا اور حمراء الاسد تک ان کا پیچھا کیا۔

جب ابوسفیان کو معلوم ہوا کہ مسلمان اس کے تعاقب میں نکل آئے ہیں تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت واپس مکہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں ابوسفیان کی ملاقات قبیلہ بنی عبدالقیس کے چند سواروں سے ہوئی، اس نے انہیں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مسلمانوں کو ڈرائیں کہ ہم دوبارہ حملے کے لیے بڑی تیاری کے ساتھ لوٹ رہے ہیں تاکہ انہیں مرعوب کیا جاسکے۔

چنانچہ یہ لوگ حمراء الاسد میں رسول اللہ ﷺ سے ملے اور ابوسفیان کی یہ بات نقل کردی۔ مگر اس خبر نے اہلِ ایمان کے حوصلوں کو پست کرنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط کردیا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ نے کامل یقین اور استقامت کے ساتھ فرمایا:

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے)

ان کے اسی ایمان افروز رویّے پر اللہ تعالیٰ نے آیاتِ کریمہ نازل فرمائیں، جن میں ان صحابہؓ کی مدح بیان کی گئی ہے کہ وہ غزوۂ اُحد میں زخمی اور تھکے ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر فوراً لبیک کہتے ہوئے دشمن کے تعاقب کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اور جب انہیں دشمن کی طرف سے دھمکی آمیز خبریں سنائی گئیں تو انہوں نے نہایت استقامت اور یقین کے ساتھ یہی کلمہ دہرایا۔

نتیجتاً دشمن مرعوب ہوکر واپس پلٹ گیا اور مکہ معظّمہ کی طرف چلا گیا۔ ابن شہاب زہریؒ کی روایت (بحوالہ بیہقی فی الدلائل) کے مطابق، ابوسفیان نے واپسی کے وقت یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ بدر کے مقام پر جنگ ہوگی۔ اس اعلان کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کے ساتھ بدر کی جانب روانہ ہوئے اور ساتھ ہی تجارت کا سامان بھی لے لیا تاکہ اگر جنگ نہ ہو تو تجارت سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

استقامتِ صحابہؓ

راستے میں شیطان نے اپنے کارندوں کے ذریعے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی کہ دشمن نہایت بڑے لشکر اور اسلحہ کے ساتھ تیار ہے، لہٰذا احتیاط کرو اور اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ مگر اہلِ ایمان ان وسوسوں سے مرعوب نہ ہوئے، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ بدر پہنچ گئے۔ وہاں دشمن کا کوئی وجود نہ تھا، چنانچہ انہوں نے تجارت کی اور نفع کے ساتھ واپس لوٹے۔

ان آیات میں صحابۂ کرامؓ کی عظمت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ انہوں نے زخموں اور کمزوری کے باوجود اللہ کے حکم کی تعمیل کی، شیطانی پروپیگنڈے اور جھوٹی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لائے، بلکہ اپنے دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ رکھا اور پختہ یقین کے ساتھ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا ورد کیا، جس سے ان کا ایمان مزید مضبوط ہوا۔

شیطانی خوف

یہی وہ سبق ہے کہ مومن کو ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ شیطان اور اس کے مددگار ہمیشہ خوف اور وسوسوں کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اہلِ ایمان کے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ اگر اللہ کی نصرت شاملِ حال نہ ہوتی تو اسلام کا نور اس قدر وسیع نہ پھیلتا، باوجود اس کے کہ دشمنانِ اسلام نے ہر دور میں اسے مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب انہیں آگ میں ڈالا جا رہا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی کلمہ اس وقت فرمایا جب لوگوں نے یہ خبر دی کہ قریش نے جنگ کے لئے بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔ اس خبر نے صحابہؓ کے ایمان کو مزید بڑھا دیا اور انہوں نے پورے یقین کے ساتھ یہی اعلان کیا کہ: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ۱۳، حدیث ۴۵۶۳)

آیت نمبر (۱۷۶-۱۷۸) وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، وہ آپ کو غمگین نہ کریں، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ نے ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا، وہ بھی اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ لوگ جو کافر ہیں، یہ گمان نہ کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں مہلت اس لیے دے رہے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ گناہوں میں بڑھ جائیں، اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے''۔

تفسیر اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو تسلی عطا فرمائی ہے۔ اگرچہ خطاب بظاہر آپ ﷺ سے ہے، لیکن اس تسلی میں تمام اہلِ ایمان شریک ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ تیزی کے ساتھ کفر میں ڈوبتے جا رہے ہیں اور کفر کو دل سے پسند کرتے ہیں، ان کی حرکات، سازشوں اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف ان کی کوششوں

سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ نہ یہ اندیشہ دل میں لائیں کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں یا آپ کے مقابلے میں کسی کی مدد حاصل کرلیں گے۔ (جیسا کہ صاحبِ روح المعانیؒ نے لکھا: مراد یہ ہے کہ نہ آپ کو ان سے کوئی رنج ہو اور نہ یہ خوف کہ وہ آپ کو ضرر پہنچائیں گے یا آپ کے خلاف کسی کی اعانت کریں گے۔)

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ سے مراد وہ منافقین ہیں جو غزوۂ اُحد میں شریک نہ ہوئے، جبکہ حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک اس سے تمام کفار مراد ہیں۔

اگرچہ نزول کے وقت خاص افراد پیشِ نظر ہوں، لیکن آیت کا مفہوم عام ہے؛ یعنی ہر دور کے کافروں کی حرکات کو دیکھ کر بھی مسلمانوں کو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ لوگ کفر میں جلدی کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

کفار کی سازشیں

صاحبِ روح المعانیؒ کے بیان کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ: لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا یہ لوگ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بعض مفسرین نے یہاں ''دین'' کو مقدر مانا ہے، یعنی یہ اللہ کے دین کو بھی کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ چنانچہ کفار کی سازشیں ہمیشہ سے رہی ہیں اور رہیں گی، مگر اہلِ ایمان کو ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں؛ دشمن کا کام دشمنی کرنا ہے، لیکن اس کی دشمنی اللہ کے دین کو گزند نہیں پہنچا سکتی۔ جس ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، وہی تمہارا مددگار ہے، لہٰذا اسی پر بھروسہ کرو اور اسی سے مدد طلب کرو۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ کفر میں ڈوبتے جارہے ہیں اور اسلام کے خلاف تدبیریں کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ دنیا کی ظاہری کامیابی انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول نہ کرکے اپنے جان و مال کو محفوظ رکھا، مگر درحقیقت وہ آخرت کی ہر بھلائی سے محروم ہوجائیں گے اور ہمیشہ کی جہنم ان کا ٹھکانا ہوگی۔

یہ آیت مومن کو یقین، حوصلہ اور اللہ پر کامل توکل کا درس دیتی ہے کہ حق کا راستہ کبھی دشمنوں کی سازشوں سے مغلوب نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کی نصرت ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

ایمان کے بدلے کفر کا سودا

پھر ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ یعنی جو لوگ ایمان کے بدلے کفر خرید لیتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور ان کے

لیے دردناک عذاب ہے۔

''کفر کو ایمان کے بدلے خریدنے'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کو ترک کر کے کفر کو اختیار کر لیا، حق کو چھوڑ کر باطل کو پسند کر لیا۔ صاحبِ روح المعانیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا بطورِ تاکید آیا ہے، اور اس میں یہ لطیف اشارہ بھی ہے کہ یہ لوگ درحقیقت اللہ کو نہیں بلکہ اپنے ہی نفس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اللہ کی ذات ہر نقصان سے پاک ہے، البتہ ان کے اعمال انہیں دردناک عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔ پھر فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ، اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

یعنی کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں، یہ ان کے حق میں بہتر ہے؛ بلکہ ہم انہیں اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ وہ گناہوں میں اور بڑھ جائیں، اور ان کے لئے ذلت آمیز عذاب ہے۔

مہلت الٰہی کا راز

کفار عموماً اپنی ظاہری خوشحالی، مال و دولت اور اولاد کی کثرت کو اپنی کامیابی کی دلیل سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ ان سے راضی ہے۔ حالانکہ یہ ان کی ناسمجھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ مہلت دراصل آزمائش اور استدراج ہے، تاکہ وہ اپنی سرکشی میں مزید آگے بڑھیں اور پھر سخت ترین سزا کے مستحق بنیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پر بھی بیان فرمایا گیا ہے۔

● چنانچہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ، وَاُمْلِيْ لَهُمْ، اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ

یعنی جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ہم انہیں رفتہ رفتہ ایسے طریقے سے پکڑ کی طرف لے جاتے ہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی، اور ہم انہیں مہلت دیتے ہیں، بے شک ہماری تدبیر نہایت مضبوط ہے۔

● اسی طرح سورۂ توبہ میں فرمایا:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ، اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ

یعنی ان کے مال اور اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تو ان چیزوں کے ذریعے انہیں دنیا میں بھی عذاب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے اور ان کی جانیں اسی حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

نافرمانوں کو مال و دولت کی کثرت

ان آیات سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا میں مال و اولاد کی کثرت کسی کے اللہ کا محبوب ہونے کی دلیل نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں کو بھی دنیا کی نعمتیں دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات اپنے محبوب بندوں سے زیادہ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے حکمت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی میں مزید بڑھتے جائیں اور پھر اچانک سخت عذاب میں گرفتار ہوں۔

اسی طرح بہت سے فاسق و فاجر لوگ دنیاوی آسائشوں سے مالا مال ہوتے ہیں، جبکہ دیندار اور پرہیزگار بظاہر کم وسائل رکھتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے اس قانون کو نہیں سمجھتے، وہ حیران ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات اعتراض تک کر بیٹھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ اگر حلال رزق مل جائے، چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو تو وہی حقیقی نعمت ہے۔ اس کے برعکس اگر کفر یا گناہوں کے ساتھ مال و دولت حاصل ہو، تو وہ نعمت نہیں بلکہ آزمائش اور عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ اگر حلال مال بھی گناہوں میں خرچ ہو تو وہ سخت گرفت کا سبب بنتا ہے، اور اگر مال حرام ہو تو وہ سراسر عذاب ہی عذاب ہے۔

فاجر کی نعمتوں پر رشک

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی فاجر کی نعمتوں پر ہرگز رشک نہ کرو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ موت کے بعد اسے کس مصیبت کا سامنا کرنا ہے۔ اس کے لیے اللہ کے پاس ایک ایسا عذاب ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، یعنی جہنم کی آگ''۔ یہ تعلیمات مومن کو یہ بصیرت عطا کرتی ہیں کہ وہ ظاہری چمک دمک سے دھوکہ نہ کھائے، بلکہ حقیقت کو پہچانے اور ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے ایمان و عملِ صالح کو ہی اپنی اصل کامیابی سمجھے۔ **(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۵۲۴۸)**

آیت نمبر (۱۷۹) مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ: ''اللہ ایسا نہیں کہ مؤمنوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر وہ ہو، جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے۔ اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے، بلکہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، چن لیتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور

تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بڑا اجر ہے''۔

تفسیر منافقین ظاہری طور پر مخلص مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے۔ ان کے زبانی دعوے اور بعض نمازوں میں شرکت کی وجہ سے بظاہر یہ پہچاننا آسان نہ تھا کہ کون سچا مومن ہے اور کون منافق۔ اس صورتِ حال پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو متنبہ فرمایا کہ وہ تمہیں ہمیشہ اسی مخلوط حالت میں نہیں رکھنا چاہتا، بلکہ ایسے حالات اور آزمائشیں پیش آئیں گی جن کے ذریعے ناپاک (منافق) اور پاک (مخلص مومن) الگ ہو جائیں گے؛ کیونکہ مصیبت اور آزمائش ہی وہ کسوٹی ہے جس پر اپنے اور پرائے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

منافقین کا نفاق

مزید یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح مطلع نہیں کرے گا کہ تم منافقین کے دلوں کے بھید جان لو، کیونکہ یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ منافقین کا نفاق عملی طور پر ظاہر ہو، ایسے مواقع پر جب اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی درکار ہو تو وہ خود پیچھے ہٹ جائیں اور یوں ان کا باطن ظاہر ہو جائے۔

چنانچہ غزوۂ اُحد میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ منافقین نے نہ صرف عمل سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ اپنی گفتگو سے بھی اپنے اندر کے کفر کو ظاہر کر دیا۔ اگر ابتدا ہی میں مسلمانوں کو ان کے دلوں کا حال بتا دیا جاتا اور اسی بنیاد پر انہیں منافق کہا جاتا، تو وہ انکار کرتے اور دلیل کا مطالبہ کرتے۔ لیکن جب آزمائش کا وقت آیا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، تو خود ہی اپنی حقیقت ظاہر کر بیٹھے اور ان کا دعویٰ ایمان بے بنیاد ہو گیا۔

البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، غیب کی بعض خبریں عطا فرماتا ہے، جن میں کسی کے نفاق اور باطنی کیفیت کا علم بھی شامل ہو سکتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر یہ حقائق ظاہر کر دیتا ہے، اور کبھی حالات، مصائب اور قربانی کے مواقع کے ذریعے منافقین کو خود ہی بے نقاب کر دیتا ہے یہ سب اس کی کامل حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ آخر میں ہدایت دی گئی کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان میں ثابت قدم رہو، اور تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تم ایمان پر قائم رہے اور پرہیزگاری کو اپنا شعار بنایا، تو تمہارے لئے عظیم اجر اور دائمی کامیابی ہے۔

❁ ❁ ❁

آیت نمبر ۱۸۰ سے ۱۸۹ تک

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ:

(۱۸۰) جولوگ اللہ کے دیے ہوئے مال میں بخل کرتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے لیے بہت بُرا ہے۔ قیامت کے دن وہی مال طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔ (۱۸۱) اللہ نے اُن لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا کہ اللہ تو فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ ہم یہ بات اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا لکھ رہے ہیں، اور ہم کہیں گے: چکھو آگ کے عذاب کو! (۱۸۲) یہ بدلہ ہے ان اعمال کا جو تمہارے ہاتھوں نے پہلے بھیجے، اور اللہ اپنے بندوں پر

ہرگز ظلم نہیں کرتا۔ (۱۸۳) جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہم سے وعدہ لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لائے جسے آسمانی آگ کھا جائے۔ (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: مجھ سے پہلے کئی رسول تمہارے پاس آئے کھلی نشانیاں لے کر، اور وہ بھی جو تم نے کہا، تو پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا، اگر تم سچے ہو؟ (۱۸۴) اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، جو روشن نشانیاں، صحیفے اور واضح کتابیں لائے تھے۔ (۱۸۵) ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اور قیامت کے دن تمہیں تمہارا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہی کامیاب ہے، اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ (۱۸۶) تمہیں ضرور آزمایا جائے گا تمہارے مالوں اور جانوں میں، اور تم ضرور سنو گے تکلیف دہ باتیں ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور ان مشرکوں سے بھی۔ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہی بڑی ہمت کی بات ہے۔ (۱۸۷) اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ وعدہ لیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ اسے لوگوں پر واضح کریں گے اور نہ چھپائیں گے، تو انہوں نے اسے پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کی، تو یہ بہت بُرا ہے جو وہ خریدتے ہیں۔ (۱۸۸) جو لوگ اپنی بداعمالیوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی ایسی باتوں پر بھی تعریف کی جائے جو انہوں نے کی ہی نہیں، آپ ان کے بارے میں ہرگز نہ سمجھیں کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۱۸۹) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۸۰ سے ۱۸۹ تک

آیت نمبر (۱۸۰) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے مال میں بخل کرتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے لیے بہت بُرا ہے۔ قیامت کے دن وہی مال طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے''۔

کنجوسی کی مذمت

تفسیر جو لوگ ایمان سے محروم تھے، وہ جس طرح اللہ کی راہ میں جان دینے سے کتراتے تھے، اسی طرح مال

خرچ کرنے سے بھی گریز کرتے تھے۔اس آیت میں ایسے کنجوس لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ جولوگ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ طرزِ عمل ان کے لئے بہتر ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی ان کے لیے نہایت نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے، اور اس کا انجام آخرت میں نہایت دردناک صورت میں ظاہر ہوگا۔ان کا جمع کیا ہوا مال قیامت کے دن طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تو قیامت کے دن اس کا مال ایک زہریلے گنجے سانپ کی شکل اختیار کر لے گا، جس کے سر کے بال اس کے زہر کی شدت سے جھڑ چکے ہوں گے۔وہ سانپ اس کے گلے میں طوق کی طرح ڈال دیا جائے گا، پھر اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا: انا مالک، انا کنزک (میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں)''۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ..... **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۶۵)**

پھر فرمایا: وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کی میراث سب اللہ ہی کے لئے ہے، وہی حقیقی مالک ہے، اس کی ملکیت میں کوئی شریک نہیں۔انسان جس مال کو اپنا سمجھ کر جمع کرتا ہے اور جس پر بخل کرتا ہے، وہ درحقیقت ابتدا سے انتہا تک اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔اس مال میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ نہ کرنا اور اس کی رضا کو پیشِ نظر نہ رکھنا انتہائی نادانی اور غفلت ہے، کیونکہ یہ دنیاوی مال تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بطورِ میراث منتقل ہوتا رہتا ہے، مگر اصل مالک ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی رہتا ہے۔

مال ایک آزمائش ہے

اسی کے ساتھ ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یعنی تمہارے تمام اعمال چاہے سخاوت ہوں یا کنجوسی، نیکی ہو یا بدی، سب اللہ کے علم میں ہیں، اور وہ ہر عمل کا پورا بدلہ دینے والا ہے۔

یہ آیات خصوصاً ان لوگوں کے لئے سخت وعید رکھتی ہیں جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔حدیث میں مزید وضاحت آئی ہے کہ ایسا مال قیامت کے دن ایک ایسے گنجے سانپ کی صورت اختیار کرے گا جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے، اور وہ اس کے گلے کا طوق بن کر اسے جکڑ لے گا اور کہے گا: ''میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں''۔پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ.....

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ۱۴، حدیث ۴۵۶۵)

یہ تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ مال خود نعمت نہیں، بلکہ امتحان ہے۔ جو اسے اللہ کی رضا کے مطابق خرچ کرے، وہ کامیاب ہے؛ اور جو اس میں بخل کرے، وہ اپنے لیے آخرت کی سخت پکڑ کا سامان جمع کرتا ہے۔

آیت نمبر (۱۸۱-۱۸۴) لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: ''اللہ نے اُن لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا کہ ''اللہ تو فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں''۔ ہم یہ بات اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا لکھ رہے ہیں، اور ہم کہیں گے: ''چکھو آگ کے عذاب کو!'' یہ بدلہ ہے ان اعمال کا جو تمہارے ہاتھوں نے پہلے بھیجے، اور اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔ جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہم سے وعدہ لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لائے جسے آسمانی آگ کھا جائے۔ (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: ''مجھ سے پہلے کئی رسول تمہارے پاس آئے کھلی نشانیاں لے کر، اور وہ بھی جو تم نے کہا، تو پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا، اگر تم سچے ہو؟'' اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، جو روشن نشانیاں، صحیفے اور واضح کتابیں لائے تھے''۔

یہود کی گستاخی

تفسیر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ'' کے پس منظر میں مفسرین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ بیت المال تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ یہودی ایک شخص، جس کا نام فخاس تھا، کے گرد جمع تھے۔ اس نے گستاخانہ انداز میں کہا: ''اے ابوبکر! اللہ کی قسم، ہمیں اللہ کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ہمارا محتاج ہے۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض کیوں مانگتا، جیسا کہ تمہارے نبی کہتے ہیں!''

یہ گستاخی سن کر حضرت ابوبکرؓ کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے اسے ایک طمانچہ مار دیا۔ فخاس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ آپ کے ساتھی نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! اس نے نہایت سنگین اور گستاخانہ بات کہی، یہ کہتا ہے کہ (العیاذ باللہ) اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں''۔ فخاس اپنی بات سے مکر گیا، لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ نے ان گستاخوں کی بات سن لی ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق، جب یہ آیت نازل ہوئی: ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ'' تو یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے محمد! کیا تمہارا رب محتاج ہو گیا ہے جو اپنے بندوں سے قرض مانگتا ہے؟'' اس گستاخانہ اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ..''

قرآن کے اسلوب پر اعتراض

حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں نے قرآن کے اس اسلوب کو سمجھنے کے بجائے اعتراض کا نشانہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور صدقات کے حکم کے ساتھ آخرت میں اجر کا وعدہ فرمایا اور اپنی عنایت و مہربانی کے اظہار کے لیے اسے ''قرض'' سے تعبیر کیا یعنی بندوں پر خرچ کرو، ہم اس کا بہترین بدلہ دیں گے۔ حالانکہ تمام مال اور تمام بندے اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو بغیر کسی اجر کے بھی سب کچھ خرچ کرنے کا حکم دے سکتا تھا، کیونکہ وہ بالکل بے نیاز اور ہر ضرورت سے بالا ہے۔

مگر اس کی حکمت اور فضل یہ ہے کہ اس نے بندوں کو آزمانے کے لیے انہیں خرچ کرنے کا حکم دیا اور بدلے میں اجر عظیم کا وعدہ فرمایا۔ یہودی اس لطف و کرم کو سمجھ نہ سکے اور اس تعبیر پر اعتراض کرتے ہوئے گستاخی پر اتر آئے کہ (العیاذ باللہ) اللہ فقیر ہے اور وہ مالدار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی یہ بات ہم لکھ رہے ہیں، یعنی ان کے اعمال نامے میں محفوظ کر دی جائے گی اور اسی کے مطابق انہیں سزا دی جائے گی۔ یہ محض ایک گستاخانہ جملہ ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدعقیدگی اور قرآن کا استہزاء ہے۔

اس طرح یہ کوئی ان کی پہلی خطا نہیں، بلکہ ان کے اسلاف نے انبیائے کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کرنے جیسے سنگین جرائم بھی کئے۔ اور چونکہ موجودہ لوگ اپنے بڑوں کے ان اعمال پر راضی ہیں، اس لیے وہ بھی اس جرم میں شریک شمار ہوں گے اور قیامت کے دن ان کے اعمال نامے میں یہ سب درج ہوگا۔

یہ واقعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والا اور ہر عمل کو محفوظ رکھنے والا ہے، اور کوئی گستاخی یا ظلم اس کے علم اور حساب سے باہر نہیں۔

برے اعمال کا انجام اور منکرین کا طرزِ عمل

کافرانہ عقائد اور بداعمالیوں کے باعث وہ لوگ دوزخ میں داخل کیے جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا: اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ وہی سزا ہے جو تمہارے اپنے کیے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہے، جو تم دنیا میں کر کے آگے بھیج چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ عذاب تمہیں ملے گا، وہ تمہارے اپنے ہی کرتوتوں کا بدلہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرّہ برابر بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد یہودیوں کے ایک اور اعتراض کا ذکر کیا گیا اور اس کا جواب دیا گیا۔ انہوں نے کہا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم آپ پر کیسے ایمان لے آئیں؟ ہمیں تو اللہ نے تورات میں یہ حکم دیا ہے کہ جب تک کوئی مدعیِ نبوت ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آسمانی آگ آ کر جلا دے، ہم اس کی تصدیق نہ کریں۔ یہی آگ اس بات کی علامت ہوگی کہ قربانی قبول ہوگئی اور وہ شخص واقعی اللہ کا رسول ہے''۔

مطالبہ کا جواب

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہہ دیں: تم سے پہلے بھی بہت سے انبیائے کرام علیہم السلام تمہارے پاس واضح معجزات لے کر آئے، اور تمہارے اسی مطالبے کے مطابق انہوں نے وہ قربانیاں بھی پیش کیں جنہیں آگ نے آ کر جلا دیا، مگر تم نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ تم نے ان میں سے بعض کو قتل تک کر دیا۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو پہلے انبیاء پر ایمان لے آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، بلکہ محض ہٹ دھرمی کے ساتھ بہانے تراشتے ہو اور اعتراضات اٹھاتے ہو۔

پھر ارشاد فرمایا:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں؛ آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے۔

وہ رسول روشن دلائل، واضح معجزات، اور ہدایت سے بھرپور آسمانی کتابیں لے کر آئے، مگر جن کے دل ایمان سے خالی تھے، انہوں نے انکار ہی کیا اور رسولوں کی تکذیب پر اصرار کرتے رہے۔ لہٰذا اگر آپ کو بھی جھٹلایا جا رہا ہے تو اس پر دل تنگ نہ کریں، بلکہ صبر و استقامت اختیار کریں، کیونکہ یہی انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور راستہ رہا ہے۔

آیت نمبر (۱۸۵) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ

زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ: ''ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اور قیامت کے دن تمہیں تمہارا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہی کامیاب ہے، اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے''۔

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے

تفسیر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مومن ہو یا کافر، کوئی بھی اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں؛ سب کو ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ تاہم زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ تو ایک مرحلہ ہے جس کے بعد انسان کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا خواہ نیکی ہو یا بدی سب کا حساب ہوگا، اعمال پیش کئے جائیں گے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔ پس جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، حقیقی کامیابی اسی کے حصے میں آئی۔

حقیقی کامیابی کا معیار

دنیا میں لوگوں نے کامیابی کے اپنے اپنے معیار قائم کر رکھے ہیں۔ اقتدار کے حامل سمجھتے ہیں کہ وہی کامیاب ہیں، دولت مند اپنے مال وزر کو کامیابی کی علامت سمجھتے ہیں، بلند عہدوں پر فائز افراد اپنی حیثیت پر نازاں ہیں، اور عالی شان محلات میں رہنے والے اپنے آپ کو کامیاب خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ اکثر آخرت کی حقیقی کامیابی اور ناکامی سے بے خبر رہتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس آیت کے ذریعے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ دنیا کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر خود کو ناکام نہ سمجھیں۔ اگر وہ ایمان رکھتے ہیں، جنت و دوزخ پر یقین رکھتے ہیں، اور اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ مومن کا انجام جنت اور کافر کا انجام دوزخ ہے، تو انہیں اپنی نظر آخرت کی کامیابی پر رکھنی چاہئے اور اسی کو اپنی اصل کامیابی سمجھ کر مطمئن رہنا چاہئے۔

دنیا ایک فریب انگیز متاع

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی دنیا کی زندگی محض دھوکے کا سامان ہے۔ اس جملے کی وسعت ایسی ہے کہ اس کی شرح ہزاروں صفحات پر محیط ہو سکتی ہے۔ اگر انسان دنیا اور اس کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لے، تاریخ کے اوراق پلٹے، بادشاہوں اور دولت مندوں کے عروج و زوال کو دیکھے، یا اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات اور انقلابات پر غور کرے، تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی

زندگی ایک عارضی دھوکا ہے۔

اس کی مثال ایک سرسبز کھیتی کی مانند ہے جو آج لہلہا رہی ہے، مگر کل کو سوکھ جاتی ہے اور پھر کاٹ کر مٹا دی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر جاتی ہے: فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ

انسان کے سامنے تاریخ کے انقلابات، حادثات اور فنا کے بے شمار مناظر موجود ہیں، اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ہر ایک کو مرنا ہے، اس کے باوجود انسان دنیا ہی کو اپنی منزل بنا لیتا ہے، اسی کے لئے سوچتا ہے، اسی کے لیے جیتا ہے اور اسی کے لیے مرجاتا ہے، جبکہ آخرت کی دائمی زندگی اور اس کی ابدی نعمتوں کے حصول کی طرف اس کی توجہ نہایت کم رہتی ہے، اور نہ ہی وہ دوزخ کے عذاب سے بچنے کی سنجیدہ فکر کرتا ہے۔ یہی وہ غفلت ہے جس سے قرآن بار بار انسان کو بیدار کرتا ہے کہ اصل کامیابی دنیا میں نہیں، بلکہ آخرت میں ہے۔

آیت نمبر (۱۸۶) لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۡ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

ترجمہ: ''تمہیں ضرور آزمایا جائے گا تمہارے مالوں اور جانوں میں، اور تم ضرور سنو گے تکلیف دہ باتیں ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور ان مشرکوں سے بھی۔ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہی بڑی ہمت کی بات ہے''۔

اسباب نزول

تفسیر مفسرین نے اس آیت کے پس منظر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور یہودی فخاس کے درمیان جو واقعہ پیش آیا تھا جس میں اس نے (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے بارے میں گستاخانہ کلمات کہے تھے، ان ہی حالات کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

اسی طرح عبدالرزاقؒ نے معمر کے واسطے سے امام زہریؒ اور حضرت کعب بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ یہودی شاعر کعب بن اشرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی شان میں ہجو اور گستاخانہ اشعار کہتا تھا، جس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ (لباب النقول فی اسباب النزول)

ان آیات میں اہلِ ایمان کو یہ حقیقت سمجھا دی گئی ہے کہ آزمائشوں کا سلسلہ کسی ایک واقعے پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ آئندہ بھی بار بار ایسے حالات پیش آئیں گے جن کے ذریعے تمہاری آزمائش ہوتی رہے گی۔ یہ آزمائش کبھی جانوں

کے ذریعے ہوگی اور کبھی مالوں کے ذریعے۔ تمہیں چاہیے کہ ہمت، صبر اور استقامت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرو۔ اس کے باوجود اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طرف سے تمہیں اذیتیں پہنچتی رہیں گی، اور تمہیں ان کی زبانوں سے ایسے کلمات سننے کو ملیں گے جو دل کو دکھ پہنچائیں گے۔ دشمن اپنی عادت سے باز نہیں آئے گا، اس لئے تمہیں ان کی سازشوں، طعنوں اور بدزبانیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ تمہارے لئے راستہ یہی ہے کہ صبر کو اپنا شعار بناؤ اور تقویٰ کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے، اور تقویٰ ہی نیکیوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ جب انسان صبر اور تقویٰ دونوں کو اختیار کر لیتا ہے تو دشمن کی تکالیف کا مقابلہ کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کسی ضرورت کے تحت تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھ کچھ یہود و مشرکین بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ کی سواری وہاں سے گزری تو اٹھنے والی گرد پر عبداللہ بن اُبی نے ناگواری ظاہر کی۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں نے آپ ﷺ کی مدح کی، جس سے وہاں جھگڑے کی کیفیت پیدا ہوگئی، مگر آپ ﷺ نے حکمت و نرمی سے سب کو خاموش کرا دیا۔

بعد میں جب حضرت سعد بن عبادہؓ کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے لوگ عبداللہ بن اُبی کو اپنا سردار بنانے والے تھے، لیکن آپ ﷺ کی آمد کے بعد اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اسی محرومی اور حسد کی وجہ سے وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے، لہٰذا آپ درگزر سے کام لیں۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۶۶)

یہ واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ دعوتِ حق کا راستہ ہمیشہ آزمائشوں، مخالفتوں اور اذیتوں سے گزرتا ہے، اور کامیابی انہی لوگوں کے لئے ہے جو صبر اور تقویٰ کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں۔

آیت نمبر (۱۸۷-۱۸۹) وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ وعدہ لیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ اسے لوگوں پر واضح کریں گے اور نہ چھپائیں گے، تو انہوں نے اسے پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی

قیمت حاصل کی، تو یہ بہت بُرا ہے جو وہ خرید تے ہیں۔ جولوگ اپنی بداعمالیوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی ایسی باتوں پر بھی تعریف کی جائے جوانہوں نے کی ہی نہیں، آپ ان کے بارے میں ہرگز نہ سمجھیں کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

اہلِ کتاب سے عہد اور خلاف ورزی

تفسیر جن لوگوں کو امتِ محمدیہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کتاب عطا کی گئی، یعنی یہود و نصاریٰ، ان کے علماء سے یہ پختہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ کتابِ الٰہی کی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کریں گے اور کسی حق بات کو نہیں چھپائیں گے۔ لیکن انہوں نے اس عہد کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ دنیا کی معمولی لذتوں کے حصول کے لیے وہ کتاب کے احکام کو چھپاتے رہے اور حق کو بیان کرنے سے گریز کرتے رہے۔

اس طرح انہوں نے اللہ کے عہد کو نظر انداز کر کے اور سچائی کو دبا کر اپنے پیروکاروں سے دنیاوی فائدے حاصل کئے۔ حقیقت میں یہ نہایت خسارے کا سودا تھا، انہوں نے تھوڑی سی دنیا کے بدلے اپنی آخرت تباہ کر لی اور اللہ کی نافرمانی کو اختیار کیا۔

یہودیوں کا فریب

یہودیوں کی طرف سے حق چھپانے کے واقعات بارہا پیش آئے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے علماء سے تورات کی ایک بات دریافت کی، مگر انہوں نے اصل حقیقت کو چھپالیا اور اس کے بجائے غلط بات پیش کر دی۔ پھر وہاں سے نکل کر خوش ہونے لگے کہ ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی، اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی تعریف کی جائے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب بیان کر دی۔ اس موقع پر متعلقہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ کچھ منافقین جہاد میں شریک نہ ہوئے اور مدینہ میں بیٹھے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائے تو انہوں نے جھوٹے عذر پیش کئے، قسمیں کھائیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں ان کاموں پر بھی سراہا جائے جو انہوں نے کئے ہی نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (درِمنثور، حصہ ۲، ص ۱۰۸)

● حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو بلا کر دین کی ایک بات دریافت کی، انہوں نے اسے چھپالیا اور اس کے بجائے غلط جواب دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آ کر ایسا ظاہر کیا جیسے انہوں نے

درست جواب دے دیا ہو، اور اس پر تعریف کے طلبگار بھی تھے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر ۴۵۶۸)

ان دونوں روایات میں کوئی تعارض نہیں؛ ممکن ہے کہ آیت دونوں قسم کے لوگوں، یہودیوں اور منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہو، کیونکہ دونوں کا طرزِ عمل ایک جیسا تھا۔ انسان کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تعریف کا خواہاں ہوتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ ایسے کاموں پر بھی سراہا جانا چاہتا ہے جو اس نے کئے ہی نہیں۔ یہی رویہ یہودیوں اور منافقین میں پایا جاتا تھا۔

اس کے برعکس، سچے متقی اور پرہیزگار لوگ اپنے نیک اعمال پر بھی لوگوں کی تعریف کے طلبگار نہیں ہوتے، تو پھر وہ ایسے اعمال پر تعریف کی خواہش کیسے رکھ سکتے ہیں جو انہوں نے سرے سے کیے ہی نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا: فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یعنی ہرگز یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے، بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ مروان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یہود اور منافقین

اسی طرح حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض منافقین جہاد میں شریک نہ ہوتے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپسی پر جھوٹے بہانے بناتے اور اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ انہیں ان کاموں پر بھی سراہا جائے جو انہوں نے نہیں کئے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دونوں گروہوں پر صادق آتی ہے، کیونکہ دونوں ہی اس رویے کے حامل تھے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۶۷)

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اس ارشاد میں ایک جامع حقیقت بیان کر دی گئی کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اللہ ہی کی ہے، اور وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ دنیا کے معمولی فائدے کے لیے حق کو چھپاتے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اصل عطا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اگر وہ اس کی رضا کے مطابق عمل کریں تو وہی انہیں عطا کرے گا، بلکہ اپنی حکمت کے مطابق دشمنوں سے بڑھ کر بھی دے سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ دنیا کی ظاہری چمک دمک سے متأثر ہونے کے بجائے اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کو اپنا مقصد بنائے، کیونکہ ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے اور وہی ہر شئے پر قادر ہے۔

❁ ❁ ❁

آیت نمبر ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۟ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

ترجمہ:

(۱۹۰) بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات دن کے آنے جانے میں، عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ (۱۹۱) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے، اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔" (۱۹۲) اے ہمارے رب! جسے تو نے آگ میں ڈالا، تو یقیناً تو نے اسے رسوا کر دیا، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ (۱۹۳) اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، کہ اپنے رب پر ایمان

لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، لہٰذا ہمارے گناہ بخش دے، اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے، اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دے۔ (۱۹۴) اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ دے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا اپنے رسولوں کے ذریعے، اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ (۱۹۵) پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی کہ: ''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے سے ہو۔ جنہوں نے ہجرت کی، اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، لڑے اور شہید ہو گئے، میں ان کے گناہ ضرور مٹا دوں گا، اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ اللہ کی طرف سے بہترین بدلہ ہے، اور اللہ ہی کے پاس بہترین اجر ہے''۔ (۱۹۶) آپ کو کافروں کا شہروں میں آنا جانا دھوکے میں نہ ڈالے۔ (۱۹۷) یہ محض تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ (۱۹۸) لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ نیک لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے۔ (۱۹۹) اور اہل کتاب میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو ان پر نازل ہوا، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۰۰) اے ایمان والو! صبر کرو، ثابت قدم رہو، جہاد کے لیے تیار رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا سکو۔

تفسیر آیت نمبر ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک

آیت نمبر (۱۹۰) اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾

ترجمہ: ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات دن کے آنے جانے میں، عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں''۔

تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات وہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس ٹھہرے۔ رات کے آخری حصے میں نبی کریم ﷺ بیدار ہوئے، باہر تشریف لے گئے اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر ان آیات کی تلاوت فرمائی جو ''عَذَابَ النَّارِ'' تک پہنچتی ہیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۷۶۳)

اللہ کے قدرت کی نشانیاں

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ جو ذات اس عظیم کائنات کو اس حکمت اور ترتیب کے ساتھ پیدا کرے، کیا اسے کسی شریک یا مددگار کی ضرورت ہوسکتی ہے؟ ذرا کائنات کی وسعت پر غور کیجئے: سورج سے زمین تک روشنی تقریباً آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، جبکہ روشنی کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے جو اس وسیع نظامِ کائنات کی عظمت کا ادراک کراتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق، اور رات و دن کے یکے بعد دیگرے آنے کا یہ منظم سلسلہ، سب اہلِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہ تمام مظاہر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہے، کامل حکمت والا ہے، اور اس کی ہر تخلیق مقصد اور تدبیر سے بھرپور ہے۔ یہ نشانیاں وہی لوگ سمجھتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ جب اہلِ بصیرت ان حقائق پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

''اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو ہر عیب سے پاک ہے، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے''۔

یہ آیات انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ کائنات کے نظم و ضبط میں غور کرے، اپنی عقل کو استعمال کرے، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب ایک عظیم، حکیم اور قادرِ مطلق خالق کی نشانیاں ہیں۔

آیت نمبر (۱۹۱) اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

ترجمہ: ''جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے، اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے یہ سب بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے''۔

تفسیر ان آیاتِ کریمہ کے درمیان اہلِ عقل ''اولوالالباب'' کی ایک نہایت جامع اور بلند صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے ہیں؛ چاہے کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوئے ہوں، کسی بھی کیفیت میں وہ ذکرِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کا ذکر صرف زبان تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے وابستہ ہوتا ہے۔

اللہ کے ذکر کی حقیقت

اللہ کی ذات وصفات کا تذکرہ، اس کی تخلیق پر غور، اس کی قدرت اور حکمت کا بیان یہ سب ذکرِ الٰہی کے دائرے میں شامل ہے۔ حقیقی عقل مند وہی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کا پختہ یقین حاصل ہو جائے۔ ان کے عقلمند اور سچے مسلمان ہونے کی علامت یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جو ذکرِ الٰہی سے خالی ہو چاہے وہ بیٹھے ہوں، کھڑے ہوں یا چل رہے ہوں۔

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور اس میں اللہ کا ذکر نہ کریں اور اپنے نبی پر درود نہ بھیجیں، تو وہ مجلس ان کے لیے باعثِ حسرت ہوگی۔ اللہ چاہے تو انہیں عذاب دے اور چاہے تو معاف فرما دے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۳۸۰)**

حقیقت یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی ہی اس دنیا کی روح ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تک اس دنیا میں کوئی اللہ اللہ کہنے والا باقی رہے گا، قیامت قائم نہیں ہوگی''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۸)**

خالق کی معرفت

آج کے دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں عقل مند اور باشعور سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے سائنسی علوم اور دیگر دنیوی معلومات کے حصول میں بڑی محنت کی ہے، مگر ان علوم کے باوجود وہ اس کائنات کے خالق، اللہ تعالیٰ، کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ بعض تو اس کے وجود ہی کے منکر ہو گئے، اور جو اس کے وجود کو مانتے بھی ہیں، وہ اس کی صفاتِ کمال اور اس کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہ لوگ کائنات کی ظاہری ترتیب کو دیکھ کر خالق کی معرفت حاصل کرنے کے بجائے مادہ یا فطرت ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ فطرت خود بخود ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچ گئی ہے۔ درحقیقت یہ ان کی بدقسمتی اور محرومی ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچاننے سے قاصر رہے۔

اس غفلت کے باعث انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں، اور اس دنیا کے بعد ان کا انجام کیا ہوگا، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو طرزِ زندگی بھیجا ہے اسے اختیار کرنا ان پر لازم ہے۔ ان کا علم اور تحقیق صرف دنیا کی ظاہری زندگی تک محدود رہتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (سورۂ روم:۷)

اولوالالباب کی جو دعائیں قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، ان میں ایک دعا یہ بھی ہے جو ان کے ایمان، شعور اور اللہ

سے تعلق کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ بیان انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اصل عقل مندی صرف معلومات کے انبار میں نہیں، بلکہ اپنے خالق کی معرفت، اس کے ذکر میں استقامت، اور آخرت کی فکر میں پوشیدہ ہے۔

آیت نمبر (۱۹۲) رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَيۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! جسے تو نے آگ میں ڈالا، تو یقیناً تو نے اسے رسوا کر دیا، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں''۔

آخرت کی رسوائی اور ظالموں کا انجام

تفسیر اہلِ ایمان دعا کرتے ہیں: ''اے ہمارے رب! بے شک جسے تو دوزخ میں داخل کر دے، تو نے اسے رسوا کر دیا''۔ اور حقیقت یہی ہے کہ یہ ایسی رسوائی ہے جس سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں ہو سکتی۔ دوزخ کا عذاب نہ صرف تکلیف دہ ہے بلکہ انتہائی ذلت وخواری کا باعث بھی ہے، اور وہاں کی رسوائی ایسی ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری رسوائی کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

قیامت کے دن، جب تمام اولین وآخرین ایک میدان میں جمع ہوں گے، اس وقت سب کے سامنے ذلیل ہونا انتہائی بڑی رسوائی ہوگی۔ مگر افسوس کہ انسان دنیا میں تو اپنی عزت وآبرو کی بڑی فکر کرتا ہے، لیکن آخرت کی دائمی رسوائی سے بچنے کی طرف کم ہی توجہ دیتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم میں واضح فرمایا گیا: وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَخۡزٰى وَهُمۡ لَا يُنۡصَرُوۡنَ یعنی آخرت کا عذاب سب سے زیادہ رسوا کرنے والا ہے، اور وہاں کوئی مدد نہیں دی جائے گی۔

(سورۂ فصلت:۱۶)

پھر ارشاد فرمایا: وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ یعنی ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اور سب سے بڑا ظلم کفر ہے، جیسا کہ فرمایا: وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ یعنی کافر ہی درحقیقت سب سے بڑے ظالم ہیں۔ چنانچہ قیامت کے میدان میں کافروں کے لئے نہ کوئی مددگار ہوگا، نہ کوئی حمایتی اور نہ ہی کوئی سفارشی جو انہیں اس عذاب سے بچا سکے۔ یہ انجام اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اصل کامیابی دنیا کی ظاہری عزت میں نہیں، بلکہ آخرت کی نجات اور اللہ کی رضا میں ہے۔

آیت نمبر (۱۹۳) رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۟ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۚ ﴿۱۹۳﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، لہٰذا ہمارے گناہ بخش دے، اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے، اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دے۔

اولوالالباب کی دعا اور اس کے معانی

تفسیر اہلِ عقل ''اولوالالباب'' کی یہ مبارک دعا بھی قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

یعنی: اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، لہٰذا ہمارے گناہ بخش دے، اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے، اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دے۔ اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ دے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا اپنے رسولوں کے ذریعے، اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

اس دعا میں مذکور مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ کے بارے میں صاحبِ روح المعانیؒ نے مفسرین کے دو اقوال نقل کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآنِ کریم ہے، اور امام طبریؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے، کیونکہ قرآن ایک ایسی دائمی دعوت ہے جو قیامت تک ایمان کی طرف بلاتی رہے گی۔

سب کے لئے ہادی وداعی

مزید وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ جس شخص تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خبر اور آپ کی دعوت پہنچ گئی خواہ آپ آخرت کا سفر فرما چکے ہوں، وہ سب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہادی اور داعی ہیں۔ اس اعتبار سے بعد میں آنے والے لوگ بھی بجا طور پر کہہ سکتے ہیں: سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ لہٰذا پہلا قول بھی درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطبات میں بلند آواز سے نصیحت فرماتے، معجزات کا ذکر کرتے اور لوگوں کو حق کی طرف بلاتے، اور یہ بھی تاکید فرماتے: ''لِيُبَلِّغِ

الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ ''یعنی جو حاضر ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچائیں جو حاضر نہیں۔

فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس پکار کو سن کر ایمان قبول کر لیا، لہٰذا اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ یہاں ''ف'' کا استعمال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مغفرت ایمان پر موقوف ہے؛ یعنی ایمان کے بغیر گناہوں کی معافی ممکن نہیں، اور حالتِ کفر میں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

پھر فرمایا: وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا ہماری برائیوں کو مٹا دے۔ اس میں ''ذُنُوب'' اور ''سَيِّاٰت'' کے فرق کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔

سیئات سے مراد

ایک قول کے مطابق ''سیئات'' سے سابقہ گناہ مراد ہیں، جبکہ دوسرے قول کے مطابق ''ذنوب'' بڑے گناہوں اور ''سیئات'' چھوٹے گناہوں کے لیے آتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

ایک اور رائے یہ ہے کہ ''ذنوب'' وہ گناہ ہیں جو جان بوجھ کر کئے جائیں، اور ''سیئات'' وہ خطائیں ہیں جو لاعلمی یا غفلت سے سرزد ہوں۔ چونکہ جہالت بھی ایک تقصیر ہے، اس لیے ان کی معافی کی دعا بھی ضروری ہے۔

پھر عرض کرتے ہیں: وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ وفات عطا فرما۔ یعنی ہمیں صالحین میں شامل فرما اور مرنے کے بعد ہمارا انجام بھی نیک بندوں جیسا کر دے۔ یہی دعا حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کی تھی: ''تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ''

صاحبِ روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ ''مَعَ الْاَبْرَارِ'' کے الفاظ میں بڑی لطیف عاجزی اور ادب ہے؛ گویا بندہ عرض کر رہا ہے کہ ہم خود کو نیک لوگوں میں شمار کرنے کے لائق نہیں سمجھتے، لیکن ہمیں ان کے ساتھ شامل فرما دے، ہم اسی کی امید رکھتے ہیں۔

یہ دعا دراصل ایمان، عاجزی، استغفار اور آخرت کی کامیابی کی ایک جامع تصویر پیش کرتی ہے، جو اہلِ عقل کے دلوں کی کیفیت اور ان کے رب سے تعلق کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے۔

آیت نمبر (۱۹۴) رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ دے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا اپنے رسولوں کے ذریعے، اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا''۔

وعدۂ الٰہی کی امید اور دعا کا یقین

تفسیر اہلِ ایمان دعا کرتے ہیں: ''اے ہمارے رب! جو کچھ تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے، ہمیں وہ عطا فرما، اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔ اس دعا میں بندہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس اجر وثواب کا سوال کرتا ہے جس کا وعدہ ایمان اور نیک اعمال کے بدلے اس کے رسولوں کے ذریعے کیا گیا ہے۔ گویا عرض کرتا ہے کہ ہمارے اعمال میں جو کمی اور کوتاہی رہ گئی ہو، اس سے درگزر فرما کر اپنے فضل وکرم سے ہمیں وہ مکمل اجر عطا فرما دے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے ''مَا وَعَدْتَّنَا'' سے مراد دشمنوں پر نصرت اور غلبہ بھی لیا ہے، یعنی وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو دنیا میں مدد دینے کے بارے میں فرمایا۔ اگر یہ معنیٰ مراد لیا جائے تو اس کا تعلق دنیاوی عطا سے ہوگا، جبکہ ''وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' میں آخرت کی کامیابی اور رسوائی سے نجات کا سوال ہے۔ کیونکہ جسے آخرت میں ثواب مل گیا اور عذاب سے بچا لیا گیا، وہی دراصل حقیقی رسوائی سے محفوظ ہو گیا۔ پھر بندہ پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے: اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ یعنی بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

ان الفاظ میں دعا کی قبولیت پر کامل یقین کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے رب کے وعدوں کی سچائی پر اعتماد کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ ہماری دعائیں ضرور قبول ہوں گی، کیونکہ تو نے خود فرمایا ہے: ''اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ'' (میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے) اور: ''اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ'' (مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا)۔

دعا کی تکمیل

صاحبِ روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ جملہ دعا کی تکمیل اور اس کے حسنِ ترتیب کا اظہار ہے، یعنی بندہ اپنے مطالبات کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی وعدہ وفائی پر یقین کا اظہار کرتا ہے۔ ''المیعاد'' کے لفظ کے بارے میں بعض اہلِ علم، خصوصاً حضرت عباسؓ سے منقول ہے کہ اس سے مراد آخرت کا وعدہ اور موت بھی ہو سکتی ہے، اور یہی معنیٰ زیادہ مناسب ہے۔

اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اے ہمارے رب! تو نے جس دنِ حساب اور جزا کا وعدہ فرمایا ہے، وہ ضرور برپا ہوگا، لہٰذا اس دن ہمیں حساب کی سختی اور عذاب سے محفوظ رکھنا اور ہمیں رسوائی سے بچا لینا۔ یہ دعا دراصل امید، یقین، عاجزی اور آخرت کی فکر کا حسین امتزاج ہے، جو مومن کے دل کی گہرائیوں کو ظاہر کرتی ہے اور اسے اپنے رب کی رحمت سے جوڑے رکھتی ہے۔

آیت نمبر (۱۹۵) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: ''پھران کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی کہ: ''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے سے ہو۔ جنہوں نے ہجرت کی، اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، لڑے اور شہید ہو گئے، میں ان کے گناہ ضرور مٹا دوں گا، اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ اللہ کی طرف سے بہترین بدلہ ہے، اور اللہ ہی کے پاس بہترین اجر ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی یعنی ان کے رب نے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ہرگز ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اس ارشاد میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل کی قدر جنس کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ایمان اور اخلاص کی بنیاد پر ہے۔ جو بھی بندہ مرد ہو یا عورت ایمان لاتا ہے، نیک اعمال اختیار کرتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے، اس کی کوئی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ جس طرح مردوں کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اسی طرح عورتوں کے اعمال بھی مقبول اور عنداللہ معتبر ہیں۔

پھر فرمایا: بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یعنی تم میں سے بعض، بعض سے ہیں۔ اس جملے کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ اطاعتِ الٰہی میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے مانند ہیں؛ یعنی جو بھی اللہ کا فرمانبردار ہوگا، وہ اپنے اعمال کا پورا اجر و ثواب پائے گا۔ (معالم التنزیل، حصہ ۱، ص ۳۲۷)

اطاعت میں مرد و عورت کی یکسانیت

اس کا مفہوم یہ ہے کہ نیکی اور اطاعت کے میدان میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے کے لیے خیر و بھلائی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآنِ کریم نے سورۂ توبہ میں بھی بیان فرمائی: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یعنی مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے معاون، مددگار اور خیر خواہ ہیں۔ یہ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ کے نزدیک اصل قدر ایمان، اخلاص اور عملِ صالح کی ہے، اور جو کوئی بھی اس راہ کو اختیار کرے

گا، وہ اللہ کی رحمت اور قبولیت سے محروم نہیں رہے گا۔

مہاجرین ومجاہدین کا عظیم ثواب

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چند عظیم اعمالِ خیر کا ذکر فرمایا اور پھر ان اعمال کے حاملین کے لیے جو اجر و ثواب مقرر ہے، اسے بیان کیا۔ ان کے بدلے میں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے گناہوں کا کفارہ کر دیا جائے گا اور انہیں جنت میں داخل فرمایا جائے گا۔ جن اعمال کا ذکر آیا ہے، ان میں ایک نمایاں عمل ہجرت ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے دینِ حق پر ثابت قدم رہنے کے لئے اپنے گھروں، جائیدادوں، مال ومتاع اور حتیٰ کہ اپنے عزیز واقارب کو بھی چھوڑ دیا ان کی قربانی نہایت عظیم ہے۔ انہوں نے دنیا کی ہر آسائش کو اللہ کی رضا کے مقابلے میں حقیر جانا اور ایمان کی حفاظت کو ترجیح دی۔

اسی طرح وہ اہلِ ایمان بھی قابلِ ستائش ہیں جنہیں اللہ کی راہ میں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں، مگر انہوں نے صبر واستقامت کا دامن نہ چھوڑا، اپنے ایمان پر قائم رہے اور نیک اعمال میں مشغول رہے۔ یہ بھی ایک بلند درجے کی عبادت اور عظیم عمل ہے۔ پھر اللہ کی راہ میں جہاد کا ذکر فرمایا گیا، وہ جہاد جس میں اہلِ ایمان دشمنوں کے مقابلے میں لڑتے ہیں، کافروں کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی شہادت کا جام نوش کرتے ہیں۔

اسی حقیقت کو قرآن نے وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا کے جامع الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ جہاد دین کا نہایت اعلیٰ اور بلند مرتبہ عمل ہے، جیسا کہ حدیث میں اسے اعمال کی چوٹی قرار دیا گیا ہے: ''ذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ''۔ (مشکوٰۃ ص ۱۴)

ان تمام عظیم اعمالِ خیر کا صلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو مٹا دے گا اور انہیں جنت جیسی ابدی نعمت عطا فرمائے گا۔ یہ اجر دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ جو بندے اللہ کی راہ میں اپنی جان، مال اور راحتیں قربان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے نواز کر ہمیشہ کی کامیابی عطا فرماتا ہے۔

عظیم بشارت

آخر میں ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ اس جملے میں نہایت جامع انداز میں یہ حقیقت بیان کر دی گئی کہ نیک اعمال کا جو بدلہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ملنے والا ہے، وہ سراسر بہترین اور نہایت اعلیٰ ہوگا۔

یعنی بندہ جو کچھ بھی اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، خواہ وہ ہجرت ہو، صبر ہو، عبادت ہو یا جہاد، اس کا اجر اللہ کے ہاں ضائع نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسا عمدہ، کامل اور بے مثال بدلہ عطا فرماتا ہے جو انسان کے تصور سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ دراصل مومن کے لئے ایک عظیم بشارت اور اطمینان کا پیغام ہے کہ اللہ کے خزانے میں کسی نیکی کا صلہ کم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے فضل وکرم سے اسے بہتر سے بہتر صورت میں عطا فرماتا ہے۔

آیت نمبر (۱۹۶-۱۹۸) لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

ترجمہ: ''آپ کو کافروں کا شہروں میں آنا جانا دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ نیک لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے''۔

کافروں کے حالات اور ان کا انجام

تفسیر حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ ہی کسی دل میں ان کا مکمل تصور آ سکا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۴۴)

گزشتہ آیات میں اہلِ ایمان کے اجر وثواب کا ذکر ہوا، اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اہلِ ایمان میں بہت سے لوگ دنیاوی اعتبار سے تنگدست اور کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تسلی کے لئے فرمایا گیا کہ کافروں کو جو دنیا میں آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے، تجارت کرنے اور مال کمانے کی قوت دی گئی ہے، اسے کوئی بڑی کامیابی نہ سمجھا جائے۔ ان کی یہ خوشحالی محض چند دنوں کی عارضی بہار ہے، جس کے بعد ان کے لئے دائمی عذاب مقدر ہے۔ یہ عذاب بھی معمولی نہیں، بلکہ جہنم کی وہ آگ ہے جس میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ ایسی عارضی خوشحالی پر فخر کرنا کہاں کی عقل مندی ہے، جس کا انجام ہمیشہ کی جلن اور عذاب ہو؟

اسباب نزول

اسباب النزول میں مذکور ہے کہ یہ آیت مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، جو تجارت اور دنیاوی وسائل کے اعتبار سے خوشحال تھے۔ بعض اہلِ ایمان نے ان کی خوشحالی کو دیکھ کر دل میں خیال کیا کہ اللہ کے دشمن تو آسائش میں ہیں اور ہم فقر ومشقت میں مبتلا ہیں، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ان کی چمک دمک تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ قرآنِ کریم نے جہنم کے انجام کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے:

کہیں وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ فرمایا، کہیں وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ یہاں ''برا بچھونا'' کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ دنیا میں اہلِ ثروت نرم بستروں اور آرام دہ زندگی کے عادی ہوتے ہیں، مگر آخرت میں ان کا بستر آگ ہوگا، جہاں نہ آرام ہوگا، نہ سکون اور نہ نیند کا کوئی تصور۔

قرآن کے نزول کے زمانے میں سفر کے ذرائع گھوڑے، اونٹ اور خچر تھے، مگر آج کے دور میں ہوائی جہاز اور ریل گاڑیاں اس ''**تقلب فی البلاد**'' (شہروں میں گردش) کی وسعت کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ ایک شخص چند گھنٹوں میں براعظموں کا سفر طے کر لیتا ہے، مگر یہ ساری نقل وحرکت اور ظاہری ترقی بھی اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ یہ سب عارضی ہے۔

اسی حقیقت کو سورۂ مومن میں اس طرح بیان فرمایا گیا: فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ یعنی شہروں میں ان کی آمد ورفت اور خوشحالی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔

متقیوں کا انجام

اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ اہلِ ایمان کے لئے ایک عظیم تسلی ہے کہ تمہاری اصل کامیابی وہ ہے جو ہمیشہ کے لیے ہے۔ کافروں کی دنیاوی نعمتوں کو حقیر سمجھو، کیونکہ وہ ان کے لئے آزمائش اور بالآخر عذاب کا سبب بنیں گی، جبکہ تمہارے لیے وہ نعمتیں تیار ہیں جو حقیقی، دائمی اور بے مثال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کو اپنی طرف سے مہمانی قرار دیا:

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ

یعنی یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ رہنے والی ہے، کامل ہے، اور ہر لحاظ سے اعلیٰ ہے؛ جبکہ کافروں کے پاس جو کچھ ہے، وہ تھوڑا، عارضی اور فانی ہے۔ یہ بیان مومن کو یہ بصیرت دیتا ہے کہ وہ دنیا کی چمک دمک سے متأثر نہ ہو، بلکہ آخرت کی دائمی کامیابی کو اپنی نگاہ کا مرکز بنائے۔

آیت نمبر (۱۹۹) وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

ترجمہ: ''اور اہل کتاب میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو ان پر نازل ہوا، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں امام نسائیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی جو ایمان لا چکے تھے کے وصال کی خبر مدینہ پہنچی، تو رسولِ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ ان کی نمازِ جنازہ ادا کرو۔ صحابہؓ نے تعجب سے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم ایک حبشی کی نماز پڑھیں؟ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر واضح کیا کہ اصل معیار رنگ و نسل نہیں بلکہ ایمان و اخلاص ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ''اہلِ کتاب میں سے جو شخص اپنے نبی پر ایمان لایا، پھر اس نے مجھے پایا اور مجھ پر بھی ایمان لے آیا، اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اسی طرح وہ غلام جو اپنے مالک کے حقوق بھی ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی، اس کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔

اور وہ شخص جس کے پاس کوئی لونڈی ہو، وہ اسے عمدہ خوراک دے، بہترین تعلیم و تربیت فراہم کرے، پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے، اس کے لئے بھی دوہرا اجر ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۹۷)**

بعض اہل کتاب کی خصوصیات

ان ارشادات کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب سب کے سب عناد و انکار پر قائم نہیں رہتے، بلکہ ان میں ایسے اہلِ حق بھی موجود ہیں جو نہ صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کتابِ ہدایت پر بھی ایمان لاتے ہیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئی، اور اپنی سابقہ آسمانی کتابوں کو بھی سچ مانتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ضد و ہٹ دھرمی نہیں ہوتی، بلکہ وہ عاجزی کے ساتھ اللہ کے حضور جھک جاتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات کو دنیاوی مفادات کے عوض فروخت نہیں کرتے، نہ ہی وہ چند سکوں کے بدلے حق کو چھپاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں دنیا کی فانی آسائشوں پر نہیں بلکہ آخرت کی دائمی کامیابی پر مرکوز ہوتی ہیں۔ وہ اللہ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں اور حق کو کھلے دل سے بیان کرتے ہیں، اپنی قوم سے کسی قسم کی رشوت یا مفاد کے خواہاں نہیں ہوتے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر، ثابت قدمی اور حق پر استقامت کے سبب دوہرا اجر عطا کیا جائے گا۔

صاحبِ روح المعانی کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں وہ مکمل جزا دی جائے گی جس کا وعدہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے، جیسا کہ سورۂ قصص میں بیان ہوا ہے۔ حضرت مجاہدؒ، ابنِ جریرؒ اور ابنِ زیدؒ کے اقوال کے مطابق یہ آیت ان تمام اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام قبول کر کے ایمانِ کامل سے سرفراز ہوئے۔ اس طرح اس بشارت میں ہر وہ شخص شامل ہے جو صدقِ دل سے حق کو قبول کرے۔

نیکیوں کا صلہ

آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ پس نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے گا اور کافروں و ظالموں کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ دنیا کی یہ مختصر مہلت اگرچہ بظاہر طویل محسوس ہوتی ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک عارضی وقفہ ہے؛ اصل فیصلہ تو اس دن ہونا ہے جب ہر عمل اپنے انجام کو پہنچے گا۔

آیت نمبر (۲۰۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰

ترجمہ: ''اے ایمان والو! صبر کرو، ثابت قدم رہو، جہاد کے لیے تیار رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاسکو''۔

تفسیر یہ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت ہے، جس میں اہلِ ایمان کو زندگی گزارنے کا مکمل اور جامع لائحۂ عمل عطا کیا گیا ہے۔ ان مختصر مگر معنیٰ خیز ہدایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام حالات میں مومن کا طرزِ زندگی کیا ہونا چاہئے اور جب باطل قوتوں سے مقابلہ درپیش ہو تو اسے کس حکمت اور استقامت کے ساتھ ڈٹ جانا چاہئے۔

پہلی نصیحت (صبر و استقامت)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اصْبِرُوْا صبر اختیار کرو۔ صبر کا مفہوم وسیع اور ہمہ گیر ہے، جس کے تین بنیادی پہلو ہیں: (۱) نیکیوں پر ثابت قدم رہنا اور انہیں پوری پابندی کے ساتھ ادا کرنا۔ (۲) گناہوں سے بچنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنا۔ (۳) مصیبتوں، آزمائشوں اور تکلیفوں کے وقت دل کو مضبوط رکھتے ہوئے شکوہ و

شکایت سے گریز کرنا۔

دوسری نصیحت (مقابلے میں ثابت قدمی)

پھر فرمایا: وَصَابِرُوْا یعنی دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگرچہ صبر کے مفہوم میں یہ معنیٰ پہلے سے شامل ہے، لیکن یہاں اسے جداگانہ انداز میں ذکر کیا گیا تاکہ معرکۂ حق و باطل کے موقع پر صبر کی اہمیت اور اس کی عظمت مزید واضح ہو جائے۔ ایسے مواقع پر صرف صبر کافی نہیں بلکہ استقامت، جرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کا سامنا کرنا بھی ضروری ہے۔

تیسری نصیحت (ہمہ وقت تیاری اور سرحدوں کی حفاظت)

اس کے بعد ارشاد ہوا: وَرَابِطُوْا یعنی اپنے آپ کو ایک نظم وضبط کے ساتھ کسی مقصد پر جمائے رکھو۔ اس کا ایک اہم مفہوم یہ بھی ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لئے ہمہ وقت تیار رہو، اپنے وسائل کو منظم رکھو، اور دفاعی قوت کو مضبوط بنائے رکھو۔ اسی لئے گھوڑوں کو باندھ کر رکھنا، ان کی دیکھ بھال کرنا اور جنگ کے لیے تیار رکھنا بھی ''رباط'' کے مفہوم میں شامل ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ

یعنی دشمن کے مقابلے کے لئے اپنی بھرپور طاقت اور وسائل کو تیار رکھو، تاکہ تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رعب قائم رکھ سکو۔ یہ تیاری صرف میدانِ جنگ تک محدود نہیں بلکہ اسلامی معاشرے کی سرحدوں کی حفاظت، نگرانی اور دفاعی نظم وضبط کو قائم رکھنا بھی اسی میں شامل ہے۔ چونکہ دشمن کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اس لیے سرحدوں پر مستعد رہنا اور افواج کا قیام بھی ایک عظیم عبادت اور باعثِ اجر عمل ہے۔

صاحبِ روح المعانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے: سرحدوں پر مضبوطی سے ڈٹے رہو، اپنے گھوڑوں کو تیار رکھو، جہاد کے مواقع کی نگرانی کرتے رہو، اور ہر وقت مکمل تیاری کے ساتھ آمادہ رہو، یہاں تک کہ تمہاری تیاری دشمنوں کی تیاری سے بڑھ کر ہو۔ یہ تمام ہدایات دراصل ایک کامل مومن کی تصویر پیش کرتی ہیں، جو عبادت میں بھی ثابت قدم ہو، کردار میں بھی مضبوط ہو، اور دفاعِ حق کے لئے ہر لمحہ تیار اور بیدار ہو۔

سرحد کے پہرے داروں کی فضیلت

اسلام نے سرحدوں کی حفاظت اور دین وملت کے دفاع کو نہایت عظیم اور بابرکت عمل قرار دیا ہے۔ رسولِ

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ کی راہ میں ایک دن سرحد کی نگرانی کرنا، دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۸۹۲)**

● حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ایک دن اور ایک رات اسلامی سرحد کی حفاظت میں گزارتا ہے، اس کے لئے یہ عمل ایک مہینے کے روزوں اور قیامِ لیل سے بڑھ کر ہے۔ اور اگر اسی حالت میں اس کی وفات ہو جائے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے، اس کی روزی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا، اور وہ قبر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۹۱۳)**

● اسی طرح حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے وفات پا جائے، وہ قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رہے گا، اسے قبر میں صبح و شام رزق عطا کیا جائے گا، اور اسے برابر رباط (نگرانی) کا ثواب ملتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے اٹھایا جائے گا''۔ **(طبرانی)**

● حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رباط کے اجر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ایک رات سرحد کی نگرانی میں گزارے اور مسلمانوں کی حفاظت کرے، اسے ان تمام لوگوں کا ثواب ملتا ہے جو اس کے پیچھے روزہ رکھتے اور نماز ادا کرتے ہیں''۔ **(طبرانی)**

● حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں ایک دن رباط پر خرچ کرنا، دیگر عبادات میں خرچ کرنے سے کہیں زیادہ افضل ہے''۔ **(سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۶۶۴)**

● حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو آنکھیں ایسی ہیں جنہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی ہو، اور دوسری وہ جو اللہ کی راہ میں حفاظت کرتے ہوئے رات بھر جاگتی رہی ہو''۔ **(ترمذی، حدیث نمبر: ۱۶۳۹)**

● حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسی رات نہ بتاؤں جو شبِ قدر سے بھی افضل ہو؟ وہ رات جس میں ایک شخص حفاظت کے فریضے میں مصروف ہو اور اسے یہ بھی یقین نہ ہو کہ وہ اپنے گھر واپس لوٹ سکے گا''۔ **(مستدرک للحاکم حدیث نمبر: ۲۴۲۴)**

رباط کا وسیع مفہوم

ان احادیث سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ سرحد پر پہرہ دینا ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے وقت صرف کیا جائے خواہ شہر کے اندر ہو یا باہر وہ سب رباط کے مفہوم میں شامل ہے اور عظیم اجر و ثواب

کا باعث ہے۔ حتیٰ کہ بعض نیک اعمال پر مسلسل قائم رہنا بھی ''رباط'' کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسے اعمال نہ بتاؤں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور درجات بلند فرماتا ہے؟''

صحابہؓ نے عرض کیا: ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (۱) ناگواری کے باوجود وضو کو مکمل اور اچھی طرح ادا کرنا، (۲) مسجدوں کی طرف کثرت سے جانا، (۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ پھر فرمایا: فَذٰلِكُمُ الرِّبَاط — یہی رباط ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۲۵۱)

بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ دو یا تین مرتبہ دہرایا، تاکہ اس کی اہمیت دلوں میں راسخ ہو جائے۔ اسی وسیع مفہوم کے پیش نظر قرآنِ کریم کے حکم وَرَابِطُوْا کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ نیکی کے کاموں میں اپنے آپ کو جمائے رکھو اور مسلسل ان پر قائم رہو۔

چوتھی اور آخری نصیحت (تقویٰ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔

تقویٰ ہی وہ صفت ہے جو انسان کو نیکیوں کی طرف راغب کرتی اور گناہوں سے بچاتی ہے، اسی لئے قرآن میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے۔

آخر میں فرمایا: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ - یعنی اگر تم ان ہدایات پر عمل کرو گے تو کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔ اور حقیقی کامیابی وہی ہے جو آخرت میں نصیب ہو، جو ایمان، عملِ صالح اور تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں۔

فائدہ

● حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے گھر ٹھہرے جو ام المؤمنین تھیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نمازِ تہجد کا مشاہدہ کریں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو بیدار ہوئے تو آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور سورۂ آلِ عمران کی آخری آیات کی تلاوت فرمائی۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۷۰، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۷۶۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کے لیے بیدار ہونے پر ان آیات کی تلاوت کرنا مسنون عمل ہے۔

● حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص رات میں سورۂ آلِ عمران کا آخری حصہ پڑھ لے، اسے پوری رات قیام کرنے کا ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ (سنن الدارمی، حدیث نمبر ۳۴۳۹)

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے: ''جس نے سورۂ آلِ عمران کی تلاوت کر لی، گویا وہ مالدار ہو گیا''۔ **(سنن الدارمی، حدیث نمبر ۳۴۳۸)**

● اور ایک روایت میں ہے: ''فقیر کا اصل خزانہ سورۂ آلِ عمران ہے، جسے وہ تہجد میں پڑھتا ہے''۔

(سنن الدارمی، حدیث نمبر: ۳۴۴۱)

یہ تمام ارشادات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیات نہ صرف ایمان کو تازگی بخشتی ہیں بلکہ عمل، استقامت اور روحانی بلندی کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ نساء کا مختصر تعارف

سورۂ النساء قرآنِ مجید کی چوتھی سورت ہے جو قرآن مجید میں شامل ہے۔ یہ مدنی سورت ہے اور اس میں کل ۱۷۶ آیات ہیں۔ اس کا نام ''النساء'' اس لئے رکھا گیا کہ اس میں خواتین کے حقوق، وراثت، نکاح، اور خاندانی نظام سے متعلق اہم احکام بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

یہ سورت اسلامی معاشرت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے نازل ہوئی، خصوصاً ایسے وقت میں جب مدینہ میں ایک منظم اسلامی معاشرہ تشکیل پا رہا تھا۔ اس میں عدل و انصاف، یتیموں کے حقوق، اور کمزور طبقات کے تحفظ پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس سورت کا مرکزی مضمون ایک صالح اور منصفانہ معاشرے کی تشکیل ہے، جہاں ہر فرد کو اس کا حق دیا جائے۔ اس میں ایمان، تقویٰ، اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول ﷺ کی تاکید کے ساتھ ساتھ منافقین کے طرزِ عمل کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

نیز مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط، باہمی تعلقات کی درستگی، اور عدل کے قیام کی تعلیم دی گئی ہے۔ سورۂ النساء ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتی ہے جس میں انفرادی، خاندانی اور اجتماعی زندگی کے اصول نہایت جامع انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

اسباب نزول

سورۂ النساء ایک جلیل القدر مدنی سورت ہے جو قرآن مجید کے اس حصے سے تعلق رکھتی ہے جہاں اسلامی معاشرے کی عملی تشکیل اپنے عروج کی طرف گامزن تھی۔ اس کا نزول زیادہ تر غزوۂ احد کے بعد کے ان پُرآشوب حالات میں ہوا، جب مدینہ کی فضا میں غم، آزمائش اور سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ یکجا ہو چکا تھا۔ اس معرکے میں متعدد صحابۂ کرامؓ کی شہادت کے نتیجے میں معاشرے میں یتیموں اور بیوہ خواتین کی تعداد بڑھ گئی، جس نے ایک نئے نوعیت

کے معاشرتی مسائل کو جنم دیا۔

انہی نازک حالات میں یہ سورت نازل ہوئی اور اس نے نہایت حکیمانہ انداز میں یتیموں کے حقوق، وراثت کے منصفانہ اصول، اور نکاح و خاندانی نظام کے واضح ضابطے مقرر کئے۔ گویا یہ سورت کمزور اور بے سہارا طبقات کے لیے ایک مضبوط ڈھال اور ایک عادلانہ معاشرے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

اس کے اسبابِ نزول پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت محض نظری تعلیمات کا مجموعہ نہیں بلکہ عملی زندگی کے حقیقی مسائل کا براہِ راست جواب ہے۔ جاہلی معاشرے میں یتیم لڑکیوں کے ساتھ ظلم و استحصال عام تھا؛ ان کے سرپرست ان کے مال پر قبضہ کرنے کے لئے ان سے نکاح کر لیتے اور ان کے حقوق ادا نہ کرتے۔ اس ظلم کے سدباب کے لئے قرآن نے یہ بلیغ تنبیہ نازل فرمائی:

''وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى'' جس نے نہ صرف اس غلط روش کو ختم کیا بلکہ نکاح کے اصولوں کو بھی عدل وتقویٰ کے تابع کر دیا۔

اسی طرح وراثت کے باب میں بھی انقلابی احکام نازل ہوئے، کیونکہ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم رکھا جاتا تھا۔ سورۃ النساء نے اس ناانصافی کو ختم کرتے ہوئے ایک ایسا متوازن اور عادلانہ نظامِ وراثت قائم کیا جو انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

شانِ نزول کے اعتبار سے یہ سورت مختلف اوقات اور مواقع پر نازل ہونے والی ہدایات کا حسین امتزاج ہے، جس میں اسلامی ریاست کے نظم ونسق، منافقین کے طرزِ عمل، اور اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات کے اصول نہایت بصیرت افروز انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

وضاحت

مفسرینِ کرام جیسے ابن کثیرؒ اور امام قرطبیؒ نے وضاحت کی ہے کہ یہ سورت تدریجاً نازل ہوئی اور اس کا بڑا حصہ ۳ رہجری سے ۵ رہجری کے درمیانی عرصے میں نازل ہوا۔ مزید یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے اس کے مدنی ہونے کی صراحت منقول ہے۔

البتہ بعض مفسرین کے نزدیک ایک آیت ''إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا'' فتح مکہ کے موقع پر حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

اسی طرح صحیح بخاری میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورۃ النساء اس وقت نازل ہوئی جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھیں، اور چونکہ آپ کی رخصتی مدینہ میں ہوئی تھی (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۴۹۹۳)، اس

سے بھی اس کے مدنی ہونے کی مزید تائید ہوتی ہے۔

مزید یہ کہ اس سورت کے مضامین، قانونی احکام، معاشرتی تنظیم، اور ریاستی اصول، خود اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ ایک منظم اسلامی معاشرے کے قیام کے دور میں نازل ہوئی۔ اس طرح سورۂ النساء اپنے زمانۂ نزول کے تقاضوں کا جواب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ہمہ گیر ضابطۂ حیات پیش کرتی ہے جو ہر دور کے لئے رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

سورہ کا خلاصہ

سورۃ النساء کا آغاز تقویٰ، اللہ کے خوف اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی تاکید سے ہوتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں، اس لئے سب کے درمیان باہمی حقوق اور ذمہ داریاں قائم ہیں۔ خاص طور پر یتیموں کے حقوق کی حفاظت، ان کے ساتھ حسنِ سلوک، اور ان کے مال کی خیانت سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

اسی طرح نکاح کے احکام بیان کرتے ہوئے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت کو عدل کے ساتھ مشروط کیا گیا اور ناانصافی کی صورت میں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنے کی ہدایت دی گئی۔ مہر کی ادائیگی، بیواؤں اور کمزوروں کے حقوق کا تحفظ بھی اس میں شامل ہے۔

وراثت کے احکامات

● اس سورت میں وراثت کے تفصیلی قوانین بیان کیے گئے ہیں، جن میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے اصول واضح کئے گئے ہیں اور ان احکام کی پابندی پر جنت کی بشارت اور نافرمانی پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

زنا کی حرمت

● اس سورت میں اخلاقی اصلاح کے طور پر زنا کی حرمت اور اس کی سزا بیان کی گئی ہے، جبکہ توبہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے کہ سچی توبہ وہی ہے جو گناہ کے فوراً بعد اخلاص کے ساتھ کی جائے۔ جاہلیت کے دور کی ظالمانہ رسموں جیسے بیواؤں پر ظلم اور باپ کی بیوی سے نکاح کو سختی سے ممنوع قرار دیا گیا۔ نکاح کے حرام اور حلال رشتوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

بیوی شوہر کے تعلقات

● اس سورت میں معاشرتی زندگی کے اصولوں میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مال و جان میں ناجائز تصرف

سے روکا گیا اور باہمی عدل وانصاف کی تاکید کی گئی۔ میاں بیوی کے تعلقات کے حوالے سے مرد کو قوام قرار دیا گیا، عورتوں کی نیکی اور اطاعت کی صفات بیان کی گئیں، اور گھریلو اختلافات کے حل کے لئے تدریجی طریقہ بتایا گیا۔ ساتھ ہی والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا۔

پاکیزگی کی اہمیت

● اسی طرح اس میں عبادات میں پاکیزگی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے نشے کی حالت میں نماز سے منع کیا گیا ہے، اور تیمم کا حکم بھی بتایا گیا۔ اہلِ کتاب کی گمراہیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو ایمان کی دعوت دی گئی اور شرک کو ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا۔

اس سورت میں بار بار ایمان اور عملِ صالح کی ترغیب دی گئی اور کفار ومشرکین کے انجام سے خبردار کیا گیا۔ انصاف کے قیام پر زور دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ فیصلہ ہمیشہ عدل کے ساتھ کیا جائے اور کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ اختلاف کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت دی گئی۔

منافقین کی دوغلی پالیسی کا ذکر

● اس سورت میں منافقین کی دوغلی پالیسیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ وہ بظاہر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر درحقیقت اللہ اور رسول کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ ان کی سزا بیان کی گئی اور سچے ایمان والوں کو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت کی بشارت دی گئی ہے۔

اس میں جہاد کے احکام میں دشمن سے ہوشیار رہنے، ہر وقت تیار رہنے اور اللہ کی راہ میں قتال کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ واضح کیا گیا کہ موت سے کوئی نہیں بچ سکتا اور منافقین کے بزدلانہ رویے کی مذمت کی گئی۔ اور سلام کا جواب بہتر طریقے سے دینے اور اچھے اخلاق کی تعلیم بھی دی گئی۔

قتلِ مومن کے احکامات

● اس میں قتلِ مومن کے متعلق سخت احکام بیان ہوئے کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا جہنم کا مستحق ہے، جبکہ غلطی سے قتل کی صورت میں کفارہ اور دیت لازم ہے۔ ہجرت کی ترغیب دی گئی اور دین پر عمل میں رکاوٹ ہو تو وطن چھوڑنے کا حکم دیا گیا، البتہ معذور افراد مستثنیٰ ہیں۔ نماز کی اہمیت کو ہر حال میں برقرار رکھنے کا حکم دیا گیا، حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں بھی نماز ترک نہ کی جائے۔ عدل وانصاف میں کسی قسم کی جانبداری سے منع کیا گیا اور ہر حال میں حق کی گواہی

دینے کی تاکید کی گئی۔

حسن سلوک اور انصاف کا حکم

● اسی طرح اس سورت میں بار بار اصلاحِ معاشرہ، خیر خواہی، صدقہ، اور نیک مشوروں کی ترغیب دی گئی جبکہ فتنہ وفساد اور بری سازشوں سے روکا گیا ہے۔ اور شرک کی مذمت کرتے ہوئے واضح کیا گیا کہ نجات کا دارومدار ایمان اور عملِ صالح پر ہے، نہ کہ محض آرزوؤں پر۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک، یتیموں کے حقوق اور ازدواجی زندگی میں عدل وصلح کی اہمیت کو دوبارہ اجاگر کیا گیا۔ مسلمانوں کو ہر حال میں انصاف پر قائم رہنے، خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، کی تعلیم دی گئی۔

نماز میں سستی کا انجام

● اس سورت میں منافقین کی علامات میں سستی سے نماز پڑھنا اور دکھاوے کا عمل شامل بتایا گیا ہے اور ان کے انجام کو جہنم کا نچلا درجہ قرار دیا گیا ہے، جبکہ توبہ کی صورت میں ان کے لیے بھی نجات کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔

یہود ونصاریٰ کی سرکشی

آخر میں اہلِ کتاب خصوصاً یہود ونصاریٰ کی سرکشی، انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب، اور غلط عقائد کا ذکر کیا گیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں صحیح عقیدہ بیان کیا گیا کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے، نہ کہ اللہ یا اس کے بیٹے۔ سورت کا اختتام اس دعوت پر ہوتا ہے کہ تمام انسان رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لائیں، کیونکہ یہی ہدایت کا نور ہے اور اسی میں دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔ ساتھ ہی کلالہ کے وراثتی مسئلے کو بیان کر کے سورت کو مکمل کیا گیا ہے۔

سورہ نساء کی فضیلت

سورۂ النساء ان عظیم سورتوں میں سے ہے جن میں ایمان، عدل، توبہ، اور حقوق العباد کے ایسے جامع اصول بیان ہوئے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ اس کی بعض آیات کو پوری دنیا سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جسے امام حاکمؒ نے نقل کیا ہے کہ سورۂ النساء میں پانچ ایسی آیات ہیں کہ اگر ان کے بدلے مجھے دنیا اور اس کی تمام نعمتیں بھی دے دی جائیں تو میں قبول نہ کروں۔

(المستدرک علی الصحیحین، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ النساء، جلد ۲، صفحہ ۳۰۵)

تقریباً اسی طرح عبدالرزاق صنعانی نے بھی یہی مضمون نقل کیا ہے کہ یہ پانچ آیات میرے نزدیک پوری دنیا

سے زیادہ محبوب ہیں۔ (مصنف عبدالرزاق، کتاب التفسیر)

یہ اثر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآن کی ہدایت اور اللہ کی مغفرت کی بشارت، دنیا کی ہر دولت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ دونوں روایتوں میں مندرجہ ذیل آیتوں کا ذکر ہے:

- إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ... (النساء:۴۰)
- إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ... (النساء:۳۱)
- إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ... (النساء:۴۸)
- وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ... (النساء:۶۴)
- وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ... (النساء:۱۱۰)

مزید یہ کہ سورۃ النساء کی فضیلت اس کے مضامین سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں عدلِ اجتماعی یتیموں کے حقوق، خواتین کے حقوق، اور وراثت جیسے اہم قوانین بیان ہوئے ہیں، جو ایک مثالی اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمومی طور پر قرآن کی تلاوت، تدبر اور عمل کی فضیلت بیان فرمائی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔'' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں، حالانکہ قرآن آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔'' چنانچہ میں نے سورۂ نساء پڑھنا شروع کی، یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچا:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اب بس کرو۔'' حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، حدیث:۵۰۵۰)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے کسی مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی بار سوال نہیں کیا جتنا کلالہ کے مسئلے میں کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی معاملے میں مجھ پر اتنی سختی نہیں فرمائی جتنی اس معاملے میں فرمائی، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگلی میرے سینے پر رکھ کر فرمایا: ''اے عمر! کیا تمہارے لیے وہ آیت کافی نہیں جو گرمی کے موسم میں نازل ہوئی اور سورۂ نساء کے آخر میں ہے؟''۔ (صحیح مسلم، کتاب الفرائض، حدیث:۱۶۱۷)

❁❁❁

ترجمہ وتفسیر-سورہ النساء
آیت نمبر ۱ سے ۱۰ تک

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①
وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ②وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ③ۭ
وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــًٔا مَّرِيْۗـــًٔا ④ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ⑥ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ⑦ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑧ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ⑨ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ⑩ۧ

ترجمہ:

(۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی جان (آدم) سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا (حوّا) بنایا، اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت پھیلا دیے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔ (۲) یتیموں کا مال ان کے حوالے

کر دو، اور خالص چیز کو ناپاک کے ساتھ بدلنے کی کوشش نہ کرو، اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (۳) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے، تو ان کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند آئیں، دو، تین یا چار۔ لیکن اگر تمہیں ڈر ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے، تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو، یا وہ عورتیں جن کے تم مالک ہو (لونڈیاں)۔ یہ طریقہ تمہیں ناانصافی سے بچانے کے زیادہ قریب ہے۔ (۴) اور عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے ادا کیا کرو، لیکن اگر وہ خود اپنی رضا سے کچھ چھوڑ دیں، تو اُسے خوشی سے کھا سکتے ہو۔ (۵) اور کم عقل یتیموں کو اپنے وہ مال نہ دو (جو تم نے ان کی کفالت میں لے رکھے ہیں) جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کا سہارا بنایا ہے۔ انہیں اس مال میں سے کھلاؤ، پہناؤ اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔ (۶) اور یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں سمجھ داری دیکھو تو ان کے مال انہیں لوٹا دو، اور جلد بازی سے ان کا مال نہ کھاؤ (ایسا نہ ہو کہ) وہ بڑے ہو جائیں (اور تم سے مطالبہ کریں)۔ اور جو مال دار ہے، وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے، اور جو غریب ہے، وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ پھر جب ان کا مال واپس دو تو گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔ (۷) مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی۔ چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ (۸) اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت کچھ رشتہ دار، یتیم یا مسکین آ جائیں، تو انہیں بھی کچھ دے دیا کرو اور ان سے نرمی سے بات کرو۔ (۹) اور انہیں چاہئے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑتے تو انہیں ان کی فکر ہوتی۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو۔ (۱۰) جو لوگ ناحق یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

تفسیر آیت نمبر ا سے ۱۰ تک

آیت نمبر (۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

ترجمہ: ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی جان (آدم) سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا (حوّا) بنایا، اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پھیلا دیے۔ اور اس اللہ سے

ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے''۔

تفسیر عربی زبان میں ''نساء'' کے معنیٰ ''عورتوں'' کے ہیں۔ چونکہ اس سورت میں عورتوں سے متعلق وہ تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں جو قرآنِ مجید کی کسی اور سورت میں اس جامعیت کے ساتھ موجود نہیں، اس لئے اس کا نام ''سورۂ نساء'' رکھا گیا۔ یہ سورہ مدنی ہے، یعنی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ ترتیبِ قرآن کے اعتبار سے یہ چوتھی سورہ ہے، جبکہ نزول کے لحاظ سے اس کا شمار سو نمبر پر ہوتا ہے، یعنی اس سے پہلے ننانوے سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور اس کے بعد چودہ سورتیں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں ۱۷۶ آیات، ۲۴ رکوع، ۳۷۲۰ کلمات اور ۱۶۶۶۷ حروف ہیں۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ مسلمان اپنی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو کس طرح اسلامی اصولوں کے مطابق درست اور منظم کریں۔

خاندانی نظام کے لئے جامع قوانین

سنہ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا اور اس کے بعد ۳ ہجری میں غزوۂ احد واقع ہوا، جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔ ان جنگوں کے بعد معاشرے میں یتیموں، بیواؤں اور غلاموں سے متعلق متعدد مسائل پیدا ہوئے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت پر خاص زور دیا گیا، اور ساتھ ہی انسانی معاشرے، خصوصاً خاندانی نظام کی اصلاح کے لیے جامع قوانین عطا کئے گئے۔

اسی پس منظر میں تمہیدی آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تلقین کی گئی، اور دوسری طرف یہ حقیقت دلوں میں بٹھائی گئی کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس یاد دہانی کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان باہمی اخوت، محبت اور ہمدردی پروان چڑھے، اور ہر فرد یہ سمجھے کہ ہم سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، اس لئے ایک دوسرے پر ہمارے حقوق ہیں۔

یہی احساس انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے رشتوں جیسے اولاد، والدین، میاں بیوی، یتیموں اور دیگر اقرباء کے حقوق کو حسنِ سلوک، احترام، دلداری اور خیر خواہی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ وہ لطیف اور اخلاقی اقدار ہیں جنہیں نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے، اور نہ ہی محض قانونی معاہدوں کے ذریعے ان کی مکمل ادائیگی ممکن ہے۔

آخرت کی جواب دہی کا احساس

لہٰذا ان حقوق کی صحیح ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں اللہ کا خوف، اس کی بندگی کا شعور اور

آخرت کی جواب دہی کا احساس موجود ہو اور اسی کیفیت کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اور خوفِ خدا کی یہ باطنی قوت، کسی بھی ظاہری قانون یا حکومتی طاقت سے کہیں زیادہ مؤثر اور مضبوط ہوتی ہے۔ اسی لیے اس عظیم سورت کا آغاز تقویٰ کے حکم سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: '' یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا ..... ''''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو.....''

قیامت تک کے تمام انسان

یہاں خطاب ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ: کہہ کر کیا گیا اور ''الناس'' ایک جامع لفظ ہے جو تمام انسانوں کو محیط ہے، مرد و عورت، چھوٹے بڑے، نیک و بد، مسلمان و کافر، حتیٰ کہ قیامت تک آنے والے تمام انسان اس میں شامل ہیں۔ اس خطاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کی یاد دہانی کرا کے انسان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی جب وہی تمام انسانوں کا خالق، پروردگار، رازق اور ان کی ضروریات کا کفیل ہے، تو انسان پر لازم ہے کہ وہ ہر معاملے میں، ہر حال میں اور ہر لمحہ اس کی رضا اور اس کے احکام کو پیشِ نظر رکھے، اور اس کی نافرمانی اور ناراضی سے بچنے کی کوشش کرے۔

پیدائش کی حکمتیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ ربوبیت کے بیان کے ساتھ اپنی دوسری عظیم صفت، یعنی خالقیت کا بھی ذکر فرمایا:

رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ''وہ تمہارا رب ہے جس نے تمہیں پیدا کیا''۔ یعنی اس نے اپنی کامل حکمت اور بے پایاں رحمت سے انسان کو عدم سے وجود بخشا، پھر اسے باقی رکھا اور اس کی پرورش فرمائی۔ ایسی عظیم ہستی سے ڈرنا اور اس کے حضور جواب دہی کا احساس رکھنا نہایت ضروری ہے۔

پھر انسان کی تخلیق کی مختلف صورتیں ممکن تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے جس خاص اور حکیمانہ طریقے کو اختیار فرمایا، اس کی وضاحت اس طرح فرمائی:

مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ تمام انسانوں کی اصل وہی ہیں، اور پھر اسی جان سے اس کا جوڑا، یعنی حضرت حوا کو پیدا فرمایا، اور ان دونوں سے بے شمار مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔

حضرت حوّاؑ کی تخلیق

● حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق کے طریقے کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ حضرت حوا، حضرت آدم علیہ السلام ہی سے پیدا کی گئیں، یعنی ان کی بائیں

پسلی سے۔اسی مضمون کو ایک حدیث میں نہایت حکیمانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اور پسلی کا سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اس کا اوپری حصہ ہوتا ہے۔اگر تم اسے بالکل سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس کے فطری میلان (ٹیڑھے پن) کے ساتھ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہو''۔(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۳۳۱)

اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں جو نرمی، لطافت اور ایک خاص انداز ہے، اسے زبردستی بدلنے کی کوشش نقصان دہ ہوسکتی ہے، جبکہ اس کی فطری خصوصیات کو سمجھ کر، حکمت اور محبت کے ساتھ برتاؤ کیا جائے تو زندگی میں خیر و برکت حاصل ہوتی ہے۔

پیدائش کی تین صورتیں

اس مبارک آیت میں انسان کی پیدائش کی تین حکیمانہ صورتوں کی طرف نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔پہلی صورت یہ ہے کہ جاندار کو بے جان سے پیدا کیا جائے، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا گیا۔

دوسری صورت یہ کہ جاندار کو جاندار سے پیدا کیا جائے، مگر عام طبعی طریقے کے خلاف، جیسے حضرت حوا علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا، جس کی وضاحت احادیثِ مبارکہ میں بھی ملتی ہے۔

اور تیسری صورت وہ ہے جو عام مشاہدے میں آتی ہے، یعنی جاندار کو جاندار سے معروف طریقۂ پیدائش کے مطابق پیدا کرنا، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک تمام انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے۔

ان تینوں صورتوں کے بیان سے دو نہایت اہم حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔پہلی یہ کہ تمام انسانوں کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور دوسری یہ کہ تمام انسان ایک ہی اصل، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے تعلق رکھتے ہیں۔اس سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ ہمارا حقیقی تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، لہٰذا اس کی اطاعت اور فرمانبرداری ہم پر لازم ہے، کیونکہ وہی ہمارا خالق اور پروردگار ہے۔مزید یہ کہ، جب تمام انسان ایک ہی جان سے پیدا کئے گئے ہیں تو ان کے درمیان باہمی رشتہ نہایت گہرا اور مضبوط ہے، اور سب ایک ہی اخوت اور انسانیت کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر یہ ضروری ہے کہ انسان آپس میں ہمدردی، خیر خواہی اور حسنِ سلوک کے تقاضوں کو پورا کریں۔کوئی شخص بلاوجہ دوسرے کو نقصان نہ پہنچائے، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی، شفقت اور اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔

اللہ کے نام پر تعلقات کی پاسداری

اسی انسانی رشتے کی یاددہانی کے بعد ارشاد ہوتا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ یعنی

تمہیں دوبارہ تاکید کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس لیے کہ وہی تمہارا خالق ہے۔ مزید یہ کہ تم اپنی باہمی ضروریات اور حقوق کے حصول کے لئے بھی اسی اللہ کا واسطہ دیتے ہو، اپنے معاملات میں اسی کا نام لے کر ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، لہٰذا اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حق اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے۔

● پھر خاص طور پر ''وَالْأَرْحَامَ'' فرما کر رشتہ داری کے تعلقات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، چاہے وہ رشتے باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے اور تاکید کی گئی کہ ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے، نہ ہی قطعِ رحمی، بدسلوکی یا بے اعتنائی اختیار کی جائے۔

اللہ ہر حال سے باخبر ہے

آیت کے اختتام پر فرمایا: إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا بے شک اللہ تعالیٰ تم سب پر نگہبان ہے۔ یعنی وہ تمہارے تمام حالات، اعمال اور نیتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر تم اس کے احکام کی پیروی کرو گے تو اجر وثواب کے مستحق ٹھہرو گے، اور اگر نافرمانی کرو گے تو عذاب کے سزاوار بنو گے۔

یہ پوری آیت دراصل ان احکام کی تمہید ہے جو اس سورت میں آگے بیان ہونے والے ہیں۔ ایک طرف اللہ کے حقوق کو سامنے رکھ کر اس کی نافرمانی سے روکا گیا ہے، اور دوسری طرف تمام انسانوں کو ایک ہی باپ کی اولاد قرار دے کر ان کے درمیان محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو ابھارا گیا ہے، تاکہ رشتہ داروں، یتیموں اور بیویوں کے حقوق خلوصِ دل سے ادا کئے جائیں۔

اسی سلسلے میں سب سے پہلے یتیموں کے حقوق اور ان کے مال وجائیداد کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے۔

● نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

(صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ۱۱، حدیث نمبر: ۵۹۸۴)

یہ ارشاد اس بات کی سخت تنبیہ ہے کہ رشتہ داری کو توڑنا نہایت سنگین گناہ ہے، اور ایک مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تمام رشتوں کو محبت، احترام اور حسنِ سلوک کے ساتھ قائم رکھے۔

آیت نمبر (۲) وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

ترجمہ: ''یتیموں کا مال ان کے حوالے کر دو، اور خالص چیز کو ناپاک کے ساتھ بدلنے کی کوشش نہ کرو، اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے''۔

تفسیر سب سے پہلے اس سورت میں یتیموں کے بارے میں احکام الٰہی بیان کئے گئے ہیں۔ ''یتامیٰ'' دراصل ''یتیم'' کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے ''یتیم'' کے معنیٰ ''اکیلا'' کے ہیں، لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس نابالغ بچے کو یتیم کہا جاتا ہے جس کے والد کا انتقال ہو چکا ہو۔ جب وہ بچہ بالغ ہو جائے تو شرعی اعتبار سے اسے یتیم نہیں کہا جاتا، جیسا کہ احادیثِ مبارکہ میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ بلوغت کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی۔

یتیموں کے حقوق

دورِ جاہلیت میں یتیموں کے حقوق بری طرح پامال کئے جاتے تھے۔ ان کے مال پر ناجائز قبضہ کیا جاتا اور ان کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ چونکہ یتیم اپنی کمزوری اور بے بسی کے باعث خصوصی توجہ، شفقت اور حفاظت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے سب سے پہلے انہی کے حقوق کو نمایاں کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ ''اور یتیموں کو ان کے مال پہنچاتے رہو''۔

ولی کو ہدایت

اس حکم کے تحت یتیم کے سرپرست، ولی یا ذمہ دار کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ یتیم کے مال کو اسی کے مفاد اور ضروریات میں صرف کرے، اور جب وہ یتیم بالغ اور سمجھدار ہو جائے تو اس کا مال اور جائیداد مکمل طور پر اس کے حوالے کر دے۔

اگر یتیم کے پاس کوئی مال ہو، چاہے وہ کسی کی طرف سے عطیہ ہو یا میراث کے طور پر ملا ہو، تو اس کی حفاظت بھی اس کے ولی کی ذمہ داری ہے۔ تاہم جب تک وہ بچہ نابالغ اور ناسمجھ ہے، اس کا مال اس کے اپنے قبضے میں نہ دیا جائے، کیونکہ وہ اسے ضائع کر سکتا ہے۔ اسی لئے اس سورت کی بعد کی آیات میں بھی اس بات کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یتیم کے سرپرست کی ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ وہ اس کا مال خود نہ کھائے یا اسے برباد نہ کرے، بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ پوری امانت داری کے ساتھ اس مال کی حفاظت کرے، اسے سنبھال کر رکھے اور اس میں اضافہ و بہتری کی کوشش کرے، تاکہ جب یتیم سمجھدار ہو جائے تو اس کا حق اسے صحیح سلامت مل سکے۔

اچھی چیز کو بری چیز سے نہ ملاؤ

یتیموں کے سرپرستوں کو ایک اور اہم ہدایت ان الفاظ میں دی گئی ہے: وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ''اور تم پاکیزہ (اچھی) چیز کو ناپاک (بری) چیز سے تبدیل نہ کرو''۔

اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ جب یتیم کا مال تمہاری تحویل میں ہو تو ہرگز ایسا نہ کرو کہ اس کی قیمتی اور عمدہ چیزیں اپنے لئے نکال لو اور اس کے بدلے میں اپنی گھٹیا یا کم درجے کی چیزیں اس کے مال میں شامل کر دو۔ بظاہر مال کی مقدار تو برقرار رہتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ صریح خیانت اور بددیانتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر یتیم کے مال میں کوئی قیمتی چیز، جیسے ایک عمدہ گاڑی امانت کے طور پر موجود ہو، تو یہ جائز نہیں کہ واپسی کے وقت اس کے بدلے میں کم قیمت یا ناقص چیز رکھ دی جائے۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے مال موجود رہے، مگر معیار میں کمی کر دینا دراصل اس کے حق میں خیانت ہے۔

قرآنِ کریم نے اس طرزِ عمل کو واضح طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔ اس ممانعت میں صرف یہ صورت ہی شامل نہیں کہ انسان اپنی خراب چیز دے کر یتیم کی اچھی چیز لے لے، بلکہ یہ بھی شامل ہے کہ کسی تیسرے شخص کے ساتھ ایسا تبادلہ کیا جائے جس میں یتیم کو نقصان پہنچے۔

گویا یتیم کے مال میں کسی بھی قسم کی کمی، تبدیلی یا ایسا تصرف جو اس کے مفاد کے خلاف ہو، سختی سے منع ہے، اور سرپرست پر لازم ہے کہ وہ کامل دیانت داری کے ساتھ اس امانت کی حفاظت کرے۔

یتیم کے مال کا حکم

آیتِ کریمہ کے اگلے الفاظ میں یتیم کے مال کے بارے میں تیسرا نہایت اہم حکم بیان فرمایا گیا ہے: **وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ** ''اور اُن کے مال کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ''۔

اس ارشادِ الٰہی میں یتیم کے مال کو ناجائز طور پر ہڑپ کرنے سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے، خواہ وہ اپنے مال میں ملا کر کھایا جائے یا الگ رکھ کر استعمال کیا جائے۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لیا جاتا، پھر اسی میں خود بھی کھاتے اور یتیم کو بھی کھلاتے، مگر اس طرح لاشعوری یا دانستہ طور پر یتیم کے مال میں زیادتی ہو جاتی تھی۔

مثال کے طور پر یتیم کے مال سے کھانا تیار کیا جائے اور اس میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے کہ پورا گھرانہ اس سے فائدہ اٹھانے لگے تو یہ بھی درحقیقت یتیم کے مال میں تصرفِ ناروا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے خاص طور پر اپنے مال کے ساتھ یتیم کا مال ملا کر کھانے کو حرام قرار دیا اور تاکید فرمائی کہ یتیم کے مال کو الگ رکھا جائے اور اسی کے لیے خرچ کیا جائے، تاکہ کسی قسم کی زیادتی یا خیانت کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

البتہ اگر سرپرست کے لئے مال کو بالکل جدا رکھنا دشوار ہو اور کسی مجبوری کے تحت ملا کر رکھنا پڑے، تو ایسی صورت میں مکمل احتیاط اور واضح حساب ضروری ہے، تاکہ یقین رہے کہ یتیم کا مال ذاتی خرچ میں استعمال نہیں ہوا۔ شریعت نے اس درجہ کی رعایت دی ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ آیت ۲۲۰ میں گزر چکی ہے۔

یتیم کے مال کا مفہوم

یہاں ''نہ کھاؤ'' کا لفظ محض کھانے تک محدود نہیں، بلکہ عربی محاورے کے مطابق اس میں ہر قسم کا ناجائز استعمال شامل ہے، چاہے وہ کھانے کے ذریعے ہو یا کسی اور صورت میں۔ لہٰذا یتیم کے مال کو کسی بھی طریقے سے ناحق استعمال کرنا حرام ہے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ اکثر وہی لوگ یتیم کے مال میں خیانت کرتے ہیں جن کے پاس خود اپنا مال موجود ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ حرام طریقے سے یتیم کا مال ہڑپ کر لیتے ہیں۔

شدید وعید اور گناہ کی سنگینی

ان احکام کے بعد ارشاد فرمایا گیا: إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ''بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے''۔ یعنی یتیم کے مال میں کسی بھی قسم کی خیانت چاہے وہ حفاظت میں کوتاہی ہو، اچھی چیز کو بدل کر گھٹیا چیز رکھ دینا ہو، یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اسے کھا جانا ہو یہ سب انتہائی سنگین گناہ ہیں۔

اسی رکوع کے آخر میں اس گناہ کی مزید سخت وعید بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سات گناہ ایسے ہیں جو انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں'':

(۱) یتیم کا مال کھانا (۲) شرک کرنا (۳) جادو کرنا (۴) کسی کو ناحق قتل کرنا (۵) جہاد سے پیٹھ پھیرنا (۶) پاک دامن عورت پر تہمت لگانا (۷) سود کھانا۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۸۹)**

یہ حدیث اس حقیقت کو مزید واضح کرتی ہے کہ یتیم کے مال میں خیانت نہ صرف ایک اخلاقی جرم ہے بلکہ دینِ اسلام میں اسے ہلاکت خیز کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، جس سے ہر صاحبِ ایمان کو انتہائی احتیاط کے ساتھ بچنا چاہئے۔

آیت نمبر (۳) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

ترجمہ: ''اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے، تو ان کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند آئیں، دو، تین یا چار۔ لیکن اگر تمہیں ڈر ہو کہ انصاف نہیں کر

سکو گے، تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو، یا وہ عورتیں جن کے تم مالک ہو (لونڈیاں)۔ یہ طریقہ تمہیں ناانصافی سے بچانے کے زیادہ قریب ہے''۔

یتیموں کے مال کے علاوہ بعض ایسے معاملات بھی تھے جن میں ان کے حقوق بری طرح پامال ہوتے تھے۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں یتیم لڑکیاں ہوتیں، اگر وہ خوبصورت ہوتیں یا ان کے پاس کچھ مال وجائیداد ہوتی، تو ان کے اولیاء انہیں اپنے ہی پاس روک لیتے۔ پھر یا تو خود ان سے نکاح کر لیتے یا اپنی اولاد کے نکاح میں دے دیتے، اور اپنی مرضی سے نہایت کم مہر مقرر کر دیتے، نیز ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کرتے، کیونکہ وہی ان کے نگران اور ذمہ دار ہوتے تھے۔

اس طرح بعض سرپرستوں کے پاس متعدد یتیم لڑکیاں جمع ہو جاتیں، جس کے نتیجے میں ان کے حقوق شدید متأثر ہوتے۔ چنانچہ اس ظلم کے ازالے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی اور یتیم لڑکیوں کے حقوق کی مکمل ادائیگی کا واضح حکم دیا گیا۔

یتیم لڑکیوں کے حقوق

حضرت عروہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کا مفہوم دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا: ''اے بھانجے! اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یتیم لڑکی اپنے ولی کی پرورش میں ہو اور وہ اس سے نکاح کرنا چاہے۔

ولی کو اس کا مال اور حسن تو پسند ہو، مگر وہ اسے اتنا مہر دینے پر آمادہ نہ ہو جتنا دوسرے لوگ دیتے ہیں، تو ایسی صورت میں اسے اس لڑکی سے نکاح نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر وہ پورا اور مناسب مہر ادا کرے، تو نکاح جائز ہے، ورنہ وہ دوسری عورتوں سے نکاح کر لے جو اسے پسند ہوں''۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۴۵۷۴)

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے: ماؤں کی نافرمانی، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا، اپنے ذمہ واجب حقوق ادا نہ کرنا اور لوگوں سے ناحق مطالبہ کرنا۔ اور تمہارے لیے ناپسند فرمایا ہے: فضول گفتگو، کثرت سے سوال کرنا اور مال کو ضائع کرنا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۷۷)

یہ تعلیمات اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام نے نہ صرف یتیم لڑکیوں کے حقوق کی حفاظت کی بلکہ ہر قسم کی ناانصافی، استحصال اور بے اعتدالی سے سختی کے ساتھ روکا، تاکہ معاشرہ عدل، رحم اور دیانت پر قائم ہو سکے۔

تعددِ ازواج اور عورتوں کے حقوق

آج کے دور میں بعض لوگ، جو خود کو عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا علمبردار سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اپنے گمان میں

اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے بھی بڑھ کر عورتوں کے خیر خواہ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اسلام میں تعددِ ازواج (ایک سے زیادہ شادی) کے حکم پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے اس معاملے میں ایک واضح حد مقرر کر کے اسے منضبط اور متوازن بنا دیا، یعنی چار بیویوں تک کی اجازت دی، جبکہ اس سے پہلے ایسی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، ان سب کے ہاں ایک سے زائد ازواج کا ہونا تاریخی و دینی روایات سے ثابت ہے۔

مغربی معاشرے کا حال

مزید یہ کہ جس مغربی معاشرے کو بعض لوگ آئیڈیل سمجھ کر اس کی تقلید میں مگن ہیں، خود اسی کا خاندانی نظام شدید بحران کا شکار ہے، اور وہاں کے لوگ اس بگاڑ سے پریشان ہیں۔ مختلف رپورٹوں کے مطابق یورپ میں ۱۲ سے ۱۸ سال کی عمر تک تقریباً ۸۰ رفیصد لڑکے اور ۷۵ رفیصد لڑکیاں جنسی سرگرمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح Home Medical Guide 1995, Columbia University کے مطابق امریکہ میں اگر تمام بالغ مردوں اور عورتوں کی شادیاں بھی کر دی جائیں، تب بھی تقریباً آٹھ ملین خواتین ایسی رہ جائیں گی جن کے لیے کوئی شریکِ حیات دستیاب نہ ہوگا، جیسا کہ وہاں کے سماجی رجحانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

خواتین کی اضافی تعداد کا حل

اس طرح کی صورتِ حال میں معاشرے میں خواتین کی اضافی تعداد (overproduction) کا ایک معقول اور باوقار حل تعددِ ازواج ہی ہے، جو عورت اور مرد دونوں کے لیے ایک رحمت اور سہولت ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے فطری اور معاشرتی مسائل کو ایک جائز اور قانونی دائرے کے اندر رہ کر حل کر سکتے ہیں۔ البتہ چار سے زیادہ شادیوں کی اجازت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص تھی، امت کے کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں۔

نکاح کی ترغیب

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ نکاح کر لے، کیونکہ یہ نگاہ کو جھکانے اور پاکدامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزہ اس کے لئے (شہوت کو قابو کرنے میں) ڈھال بن جاتا ہے''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۰۶۶)

یتیم کے ساتھ انصاف

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا: ایک شخص کی سرپرستی میں ایک یتیم لڑکی تھی جو اس کے ایک باغ میں شریکِ ملکیت تھی۔ اس شخص نے اس یتیم لڑکی سے خود نکاح کر لیا، مگر اس کے ساتھ انصاف کرنے کے بجائے، اسے مہر دینے کے بجائے اسی کے باغ کے حصے پر قبضہ جما لیا۔ چنانچہ اس ظلم و ناانصافی کے ازالے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر ۴۵۷۴)**

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ اگرچہ یتیموں کے مال کے بارے میں تو کسی حد تک احتیاط کرنے لگے تھے، لیکن عورتوں کی تعداد کے معاملے میں کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ جاہلیت کے زمانے میں نکاح کی تعداد پر کوئی حد مقرر نہ تھی، اور بعض افراد کے نکاح میں آٹھ آٹھ بلکہ دس دس عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

چار بیویوں کی حد

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کے لئے نکاح کی ایک واضح حد مقرر فرما دی کہ ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس حکم کے نزول کے بعد متعدد واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن سے اس قانون کی عملی تطبیق واضح ہوتی ہے۔

حضرت گیلان بن اسلمہ ثقفیؓ کے نکاح میں

روایت میں آتا ہے کہ گیلان بن اسلمہ ثقفیؓ جب اسلام لائے تو اس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ سب مسلمان بھی ہو چکی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے چار کو اختیار کر لیں اور باقی کو طلاق دے کر آزاد کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چار کو اپنے نکاح میں رکھا اور باقی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۲۸، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۹۵۳)**

حضرت قیس بن الحارث الاسدیؓ کے نکاح میں

اسی طرح حضرت قیس بن الحارث الاسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ اسلام لائے تو ان کے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں۔ انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے چار کو رکھ لو اور باقی کو طلاق دے دو''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۲۴۴)**

اس نوعیت کے دیگر واقعات بھی احادیث میں مذکور ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عہدِ نبوی

میں ہی یہ حکم قطعی طور پر نافذ ہو چکا تھا کہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویوں کو نکاح میں رکھنا حرام اور ممنوع ہے۔ اسی آیت میں یہ بھی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا کہ یتیموں کے مال پر قبضہ کرنے کا کوئی حیلہ یا بہانہ جائز نہیں، بلکہ سرپرستوں پر لازم ہے کہ وہ کامل دیانت داری کے ساتھ ان کے حقوق ادا کریں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں خصوصاً ان کے مہر کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے، تو ان سے نکاح نہ کرو، بلکہ دوسری حلال عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو''۔

پھر نکاح کی اجازت کو ایک واضح حد کے ساتھ مشروط کیا گیا کہ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ نکاح کرنا چاہے تو وہ دو، تین یا چار تک محدود رہے۔ یعنی ایک مرد دو عورتوں سے، یا تین سے، یا چار سے نکاح کر سکتا ہے، مگر اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔

عدل کی شرط

البتہ اس کے ساتھ ایک نہایت اہم شرط بھی عائد کی گئی ہے اور کہا گیا کہ اگر کسی کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل و انصاف قائم نہ رکھ سکے گا اور کسی کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، تو پھر اسے صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

اور اگر ایک بیوی کے حقوق بھی پورے کرنے کی استطاعت نہ ہو، تو پھر وہ اسی پر اکتفاء کرے جو شریعت کے مطابق اس کی ملکیت میں ہو (یعنی باندی)، کیونکہ اس صورت میں برابری کے تقاضے اس درجہ لازم نہیں ہوتے جیسے آزاد بیویوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

باندی کے حقوق نکاح والی بیوی کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں، مثلاً اس میں مہر لازم نہیں ہوتا، اس لیے ظلم اور ناانصافی کا اندیشہ نسبتاً کم رہتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلام نے تعددِ ازواج کو بے قید آزادی نہیں بنایا، بلکہ اسے عدل، ذمہ داری اور حدودِ شرع کے ساتھ مشروط کر کے ایک منصفانہ اور متوازن نظام عطا فرمایا ہے۔

پہلا حکم:

اس آیت میں سب سے پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے، تو اُن سے نکاح کرنے سے باز رہو۔ یہ دراصل ایک تنبیہ حکم ہے، اور اگر یقین ہو جائے کہ انصاف ممکن نہیں، تو اس صورت میں یتیم لڑکیوں سے نکاح کا ارادہ ہی ترک کر دینا بہتر ہے، کیونکہ دوسری بہت سی حلال عورتیں موجود ہیں جن سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا حکم:

دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر دوسری آزاد اور حلال عورتوں سے نکاح کیا جائے، تو ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار عورتوں تک نکاح کی اجازت ہے، اس سے تجاوز جائز نہیں۔ اس طرح اسلام نے بیویوں کی تعداد کو ایک معین حد میں مقید کر دیا اور چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام قرار دے دیا۔

تیسرا حکم:

تیسرا حکم یہ ہے کہ اگر ایک وقت میں چار تک عورتیں نکاح میں ہوں، تو ان کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھنا واجب ہے، اور اس میں کوتاہی کرنا سنگین گناہ ہے۔ اس تعلیم کے ذریعے یہ رہنمائی دی گئی کہ جب بھی ایک سے زیادہ نکاح کا ارادہ کیا جائے تو پہلے اپنے حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے کہ کیا تمام بیویوں کے حقوق انصاف کے ساتھ ادا کرنے کی استطاعت موجود ہے یا نہیں۔ اگر یہ خدشہ ہو کہ عدل قائم نہ رہ سکے گا، تو ایک سے زیادہ نکاح کرنا خود کو ایک بڑے گناہ میں ڈالنے کے مترادف ہے، جس سے بچنا ضروری ہے، اور ایسی صورت میں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

چوتھا حکم:

چوتھا حکم یہ دیا گیا کہ اگر انصاف قائم رکھنے کی قدرت نہ ہو، تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا جائے، یا اس صورت پر اکتفاء کیا جائے جو شریعت کے دائرے میں ہو۔ یہاں ''شرعی لونڈی'' کا جو ذکر آیا ہے، اس کے لئے مخصوص شرائط ہیں جو موجودہ زمانے میں عملاً پائی نہیں جاتیں، اس لئے آج کے دور میں اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا اور کسی کے لیے بغیر نکاح ایسی صورت اختیار کرنا جائز نہیں۔

اس آیت، احادیثِ مبارکہ اور امت کے اجماع سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ چار عورتوں سے زیادہ کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ مزید یہ کہ اگر تمام بیویوں کے درمیان نان ونفقہ اور دیگر حقوق میں برابری قائم نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو، تو ایک سے زیادہ نکاح کرنا بھی ممنوع ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے مفہوم میں تحریف کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ گویا یہ آیت تعددِ ازواج کی نفی کرتی ہے، کیونکہ یہاں فرمایا گیا کہ اگر برابری نہ ہو سکے تو ایک ہی پر اکتفاء کیا جائے، اور اسی سورت میں آگے بھی ایک مقام پر اس مضمون کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ یہ استدلال درست نہیں، بلکہ اس کا صحیح مفہوم عدل کی شرط کو بیان کرنا ہے، نہ کہ اصل اجازت کی نفی کرنا۔

بیویوں کے درمیان مساوات اور اعتدال کا حکم

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ

''اور تم ہرگز اس بات پر قادر نہ ہوسکو گے کہ بیویوں کے درمیان (دل کے میلان کے اعتبار سے) کامل مساوات قائم رکھ سکو''۔

اس آیت میں ایک نہایت لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کے لحاظ سے دل کا جھکاؤ، محبت اور میلان پوری طرح برابر رکھنا ممکن نہیں۔ اس لئے شریعت نے اس طبعی کمزوری کو تسلیم کرتے ہوئے انسان پر وہ ذمہ داری نہیں ڈالی جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔

البتہ ظاہری معاملات، جیسے نان ونفقہ، رہائش، وقت کی تقسیم اور حقوق کی ادائیگی میں عدل وانصاف قائم رکھنا بدستور لازم اور واجب قرار دیا گیا ہے۔

اسلام کا معتدل نظام

بعض کم فہم افراد اسلام کے قانونِ تعددِ ازواج پر اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں اسلامی شریعت ایک نہایت معتدل اور متوازن نظام پیش کرتی ہے۔ اس میں نہ تو عیسائی راہبوں اور بعض ہندو جوگیوں کی طرح ترکِ دنیا اور رہبانیت کی اجازت ہے کہ انسان فطری تقاضوں سے کلیتاً کنارہ کش ہو جائے، اور نہ ہی اسے صرف ایک ہی شادی تک محدود کر دیا گیا ہے، بلکہ انسانی ضرورتوں، معاشرتی حالات اور فطری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سے لے کر چار تک نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔

تاہم یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا کوئی لازمی حکم نہیں، بلکہ ایک مشروط اجازت ہے، جس کی بنیاد عدل وانصاف پر ہے۔ اس لئے چار تک نکاح کی اجازت تو دی گئی ہے، مگر اس حد سے تجاوز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

تعددِ ازدواج (تاریخی تناظر)

تاریخِ انسانی اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اسلام سے پہلے تقریباً تمام اقوام اور مذاہب میں ایک مرد کے لیے متعدد بیویاں رکھنا نہ صرف رائج تھا بلکہ جائز بھی سمجھا جاتا تھا۔ عرب، ہندوستان، ایران، مصر اور بابل جیسی قدیم تہذیبوں میں یہ ایک عام سماجی روایت تھی کہ ایک شخص اپنی خواہش اور استطاعت کے مطابق جتنی چاہے عورتیں نکاح میں رکھ سکتا تھا، اور اس پر کوئی متعین حد موجود نہ تھی۔

اسلام نے آ کر اس بے قاعدہ اور غیر محدود نظام کو ایک منصفانہ دائرے میں مقید کیا، تعداد کو چار تک محدود کیا، اور اس کے ساتھ عدل وانصاف کی کڑی شرط عائد کی، تاکہ عورتوں کے حقوق محفوظ رہیں اور معاشرہ ظلم وزیادتی سے پاک ہو۔

اعتدال اور حکمت کا جامع نظام

اس طرح اسلام نے نہ تو فطرتِ انسانی کا انکار کیا اور نہ ہی اسے بے لگام آزادی دی، بلکہ ایک ایسا معتدل راستہ اختیار کیا جس میں انسان کی ضروریات بھی پوری ہوں اور اخلاقی وسماجی توازن بھی برقرار رہے۔ تعددِ ازواج کی اجازت دراصل ایک ذمہ داری ہے، نہ کہ محض خواہش کی تکمیل کا ذریعہ اور اس کی بنیاد عدل، تقویٰ اور جواب دہی کے احساس پر قائم ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور تعددِ ازدواج

انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ تعددِ ازدواج کوئی نیا یا اجنبی تصور نہیں، بلکہ سابقہ امتوں میں بھی یہ رائج رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو ازواج، حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ، تاریخ میں معروف ہیں۔

اسی طرح حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے یہاں بھی ایک سے زائد نکاح کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بھی روایات میں متعدد ازواج کا تذکرہ موجود ہے، حتیٰ کہ بعض روایات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ازواج کی تعداد ساٹھ سے زائد بیان کی گئی ہے۔

تورات، انجیل اور دیگر صحفِ سماویہ میں بھی انبیائے کرام کے متعدد نکاحوں کا ذکر تو ملتا ہے، مگر کہیں اس پر ممانعت یا نکیر کا کوئی صریح اشارہ نہیں پایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل اپنی اصل کے اعتبار سے جائز اور معروف رہا ہے۔

حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰؑ

البتہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے جلیل القدر نبی ہیں جنہوں نے نکاح نہیں فرمایا۔ لیکن اگر ان حضرات کی مثال کو معیار بنایا جائے تو پھر اصولاً ایک نکاح بھی نہیں ہونا چاہئے، حالانکہ ایسا کسی شریعت میں لازم نہیں کیا گیا۔ مزید یہ کہ احادیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب نزول کے بعد نکاح فرمائیں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی۔

اس پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو مذہبی اعتبار سے تعددِ ازواج پر اعتراض کرنے کا کوئی جواز حاصل نہیں، کیونکہ ان کے اپنے مذہبی متون میں بھی ایک سے زائد نکاح کی ممانعت موجود نہیں۔ اسی طرح

ہندومت یا دیگر مذاہب میں بھی نکاح کی تعداد کو ایک تک محدود کرنے کا کوئی قطعی حکم نہیں ملتا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کا معاشرتی پس منظر

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل دنیا کے تقریباً تمام خطوں بی عرب، ہندوستان، ایران، مصر اور دیگر اقوام میں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج بغیر کسی حد کے موجود تھا۔ نہ یہود نے اس پر کوئی پابندی عائد کی، نہ نصاریٰ نے، نہ ہندوؤں نے اور نہ ہی پارسیوں نے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں بھی یہی صورتِ حال تھی کہ لوگ متعدد نکاح تو کر لیتے تھے، مگر ان کے حقوق ادا کرنے کی نہ تو پابندی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی مؤثر نظام۔ نتیجتاً بہت سی عورتیں نکاح کے باوجود ایک طرح کی بے بسی اور قید کی زندگی گزارتی تھیں۔ جس سے دل اُچٹ جاتا، اس کے حقوق کی کوئی پرواہ نہ کی جاتی، اور عدل وانصاف کا تصور مفقود تھا۔

اسلامی قانون نے اس بگاڑ کی اصلاح کی۔ بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کیا، اس سے تجاوز کو حرام قرار دیا، اور ساتھ ہی یہ سختی سے لازم کیا کہ جو عورتیں نکاح میں ہوں ان کے حقوق عدل وانصاف کے ساتھ ادا کئے جائیں۔ اس کے برعکس طرزِ عمل پر سخت وعید سنائی گئی۔

عصرِ حاضر اور مغربی معاشرہ

آج کے دور میں مغربی معاشروں میں اگرچہ بظاہر ایک ہی بیوی کے اصول کو اختیار کیا گیا ہے، مگر اس کے ساتھ غیر قانونی اور غیر اخلاقی تعلقات کی کثرت ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ ایسے معاشروں میں نکاح کی پابندی تو محدود ہے، لیکن غیر شرعی تعلقات پر کوئی حقیقی روک نہیں، جس کے نتیجے میں خاندانی نظام کمزور اور اخلاقی بحران شدید ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ زیادہ معقول ہے کہ نکاح جیسے پاکیزہ اور ذمہ دارانہ تعلق کو محدود کر دیا جائے، مگر غیر قانونی تعلقات کو عملاً کھلی چھوٹ حاصل ہو؟ یا پھر ایک ایسا متوازن نظام اختیار کیا جائے جس میں نکاح کے دائرے میں رہتے ہوئے انسانی ضروریات کو پورا کیا جائے اور معاشرتی نظم واخلاق بھی برقرار رہے؟

اسلام نے اسی حکمت اور اعتدال کے ساتھ ایک ایسا نظام پیش کیا ہے جس میں نہ بے لگام آزادی ہے اور نہ غیر فطری پابندیاں، بلکہ عدل، ذمہ داری اور تقویٰ کے اصولوں کے تحت ایک منصفانہ اور باوقار راستہ اختیار کیا گیا ہے۔

قانونِ اسلام اور عصرِ حاضر کا تضاد

افسوس کی بات ہے کہ اہلِ مغرب، جو خود کو تہذیب وترقی کا علمبردار سمجھتے ہیں، اسلام کے اس فطری اور معتدل

قانون پر عیش پسندی اور نفس پروری کا الزام عائد کرتے ہیں، جبکہ دوسری طرف ناجائز تعلقات اور بلا نکاح رشتوں کو معاشرتی آزادی اور تہذیب کا نام دیتے ہیں۔

حالانکہ زنا جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں صریح حرام رہا ہے اور ہر دور کے اہلِ دانش کے نزدیک ایک قبیح عمل سمجھا گیا ہے آج مغربی معاشروں میں عام ہوتا جا رہا ہے اور اس کی قباحت محسوس تک نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس تعددِ ازواج، جو انبیاء، مصلحین اور دانشوروں کے نزدیک ایک جائز اور بعض حالات میں مفید نظام رہا ہے، اسے ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قانونِ فطرت کو بالآخر اپنا اثر دکھانا ہوتا ہے، اور وہ غالب ہو کر رہتا ہے۔

چنانچہ اب خود یورپ کے بعض اہلِ علم اور مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ معاشرتی توازن کے لئے بیویوں کی تعداد میں وسعت کی گنجائش ایک معقول حل ہو سکتی ہے۔ ایک معروف عیسائی مفکر، مسٹر ڈیوٹ پورٹ، اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انجیل کی متعدد آیات نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''ان آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تعددِ ازواج نہ صرف قابلِ قبول ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک خاص برکت رکھی ہے''۔

یتیم لڑکیوں کے حقوق کی حفاظت

اسی سلسلے میں قرآنِ کریم یتیم لڑکیوں کے حقوق کی حفاظت پر خاص زور دیتے ہوئے یہ حکم دیتا ہے کہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے، تو ان سے نکاح کا ارادہ ترک کر دو اور دوسری حلال عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کرو۔

البتہ اس اجازت کو بھی ایک واضح حد کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، یعنی ایک وقت میں چار تک نکاح کی اجازت ہے، بشرطیکہ ان کے درمیان مکمل عدل و انصاف قائم رکھا جا سکے۔ اس حد سے تجاوز کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی۔ چونکہ یہاں نکاح کا ذکر آیا، اور مہر نکاح کے بنیادی لوازمات میں سے ہے، اس لیے اس کے بعد کی آیات میں بیویوں کے مہر کی ادائیگی سے متعلق احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تاکہ نکاح کا یہ مقدس بندھن انصاف، ذمہ داری اور حسنِ سلوک کے اصولوں پر قائم رہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: سورۂ النساء آیت 3 میں مرد کو ایک وقت میں چار بیویاں تک رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، تو پھر عورت کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت کیوں نہیں؟

جواب: یہ اعتراض بظاہر مساوات (equality) کے نام پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ انسانی فطرت، جسمانی ساخت، نفسیاتی تقاضوں اور سماجی نظام کی گہرائیوں سے صرفِ نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کا قانون محض ظاہری برابری (equality) پر قائم نہیں، بلکہ عدل (justice)، حکمت (wisdom) اور فطرت کے مطابق توازن (natural balance) پر مبنی ہے۔

درحقیقت ''برابری'' اور ''عدل'' میں بنیادی فرق ہے: برابری یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک ہی چیز دی جائے، چاہے وہ اس کے لیے مناسب ہو یا نہ ہو؛ جبکہ عدل یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی فطرت، صلاحیت اور ضرورت کے مطابق حق دیا جائے۔ اسلام اسی عدل کا قائل ہے، نہ کہ اندھی مساوات کا۔

● انسانی معاشرہ صرف حقوق کی تقسیم کا نام نہیں بلکہ ذمہ داریوں، تعلقات اور نتائج کا ایک مربوط نظام ہے۔ اگر صرف مساوات کے ظاہری اصول کو بنیاد بنایا جائے اور فطری فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ توازن کے بجائے انتشار (disorder) کی صورت میں نکلتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا مقابل (rival) نہیں بلکہ مکمل کرنے والا (complementary) قرار دیا ہے۔

اسلامی شریعت کا حکم

اسلامی شریعت کا ہر حکم کسی وقتی یا محدود سماج کے لیے نہیں بلکہ ایک آفاقی (universal) نظام کے طور پر دیا گیا ہے، جو ہر زمانے، ہر تہذیب اور ہر حالت میں قابلِ عمل رہے۔ اس لیے اس میں ایسے اصول رکھے گئے ہیں جو انسانی فطرت کے مستقل حقائق سے ہم آہنگ ہوں، نہ کہ بدلتی ہوئی خواہشات یا وقتی رجحانات کے تابع۔ لہٰذا تعددِ ازدواج کے مسئلے کو بھی اسی زاویے سے دیکھنا ضروری ہے کہ یہ محض ایک اجازت نہیں بلکہ ایک حکیمانہ، متوازن اور ذمہ داری سے مشروط نظام ہے، جس کا مقصد انسانی جذبات، معاشرتی ضرورتوں اور اخلاقی حدود کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کرنا ہے جو فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے مفید ہو۔

انسان کی حیاتیاتی (Biological) حقیقت

انسانی تخلیق میں مرد و عورت یکساں نہیں بلکہ مکمل کرنے والے (complementary) ہیں اور انسانی جسمانی ساخت اس مسئلے کی بنیادی کلید ہے: عورت ایک وقت میں صرف ایک ہی مرد سے حمل ٹھہرا سکتی ہے اگر ایک عورت کے متعدد شوہر ہوں تو بچے کی نسب (Paternity) متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس سے وراثت، خاندانی شناخت، سرپرستی اور خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جبکہ مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں ہر بچے کی ماں واضح اور متعین ہوتی ہے، اس لیے نسب واضح رہتا ہے۔ البتہ جدید سائنس (DNA ٹیسٹ) آج نسب معلوم کر سکتی ہے جو کہ ایک محدود حل ہے جبکہ شریعت ایک ہمہ گیر (universal) نظام دیتی ہے جو ہر زمانے اور ہر معاشرے کے لیے قابلِ عمل ہو شریعت کا نظام صرف جدید ٹیکنالوجی پر نہیں بلکہ آفاقی اور ہر زمانے کے لیے قابلِ عمل اصولوں پر قائم ہے خاندانی نظام صرف حیاتیاتی نہیں بلکہ سماجی اور نفسیاتی استحکام سے بھی جڑا ہوتا ہے۔

طبی وجسمانی پہلو

عورت کی جسمانی ساخت حمل (Pregnancy)، ولادت (Childbirth) اور رضاعت (Breastfeeding) جیسے مراحل سے گزرتی ہے یہ ایک مسلسل ہارمونل اور جسمانی دباؤ کا نظام ہے اگر ایک عورت کے کئی شوہر ہوں تو مختلف مردوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی وجہ سے انفیکشنز اور بیماریوں (STDS) کا خطرہ بڑھاتا ہے اور لیدی نظام (Reproductive system) پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ جبکہ مرد کے جسم میں ایسی جسمانی رکاوٹ نہیں جو اسے متعدد بیویوں کی ذمہ داری اٹھانے سے روکے۔

نفسیاتی پہلو

عورت کی فطرت میں استحکام (Stability) ایک مرکز سے جذباتی وابستگی (Emotional Bonding) اور تحفظ کی شدید خواہش ہوتی ہے، ایک عورت کے کئی شوہر ہونے کی صورت میں شدید ذہنی کشمکش (Conflict)، حسد، مقابلہ، عدم تحفظ پیدا ہوتا ہے اور بچوں کی ذہنی تربیت متأثر ہوتی ہے۔

جبکہ مرد کی فطرت کے بارے میں یہ بات عام مشاہدہ اور نفسیاتی مطالعہ دونوں سے واضح ہوتی ہے کہ اس میں تنوع (variety) کی طرف ایک فطری میلان پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مرد لازماً ایسا کرے یا یہی اس کی خوبی ہے، بلکہ یہ ایک ممکنہ رجحان (tendency) ہے جو بعض حالات میں ظاہر ہوتا ہے۔

اسی لیے اگر اسے بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ انسان کو بے راہ روی، ناانصافی اور اخلاقی انتشار کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اسلام نے اس فطری میلان کو نظر انداز بھی نہیں کیا اور نہ ہی اسے بے لگام چھوڑا، بلکہ اسے ایک منظم اور ذمہ دارانہ دائرے میں لانے کے لیے تین بنیادی اصول مقرر کیے:

(۱) حد بندی (Limitation): یعنی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں/: اسلام سے پہلے مردوں کے لیے بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی، مگر اسلام نے آ کر اسے چار تک محدود کر دیا۔ یہ دراصل اجازت نہیں بلکہ ایک پابندی (restriction)

ہے، تاکہ خواہشات بے قابو نہ ہوں اور نظامِ خاندان بکھرنے نہ پائے۔

(۲) عدل کی شرط (Condition of Justice): صرف تعداد کی اجازت دینا کافی نہیں تھا، اس لیے قرآن نے واضح طور پر شرط لگا دی: اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔ یہ عدل/رہائش، خرچ، وقت اور حقوق میں برابری، عزت و احترام میں توازن پر مشتمل ہے۔

(۳) خواہش کو ذمہ داری میں بدل دینا: اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک ممکنہ فطری میلان کو: آزادی (freedom) نہیں بنایا بلکہ ذمہ داری (responsibility) میں تبدیل کر دیا اب: ہر نکاح کے ساتھ نان ونفقہ، رہائش، حقوق اور جوابدہی جڑی ہوئی ہے آخرت میں بھی اس پر حساب ہوگا۔

سماجی و خاندانی نظام

اسلام کا قانون صرف فرد نہیں بلکہ پورے معاشرے کو دیکھتا ہے: اگر عورت کے کئی شوہر ہوں:

(۱) باپ کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) خاندان کا ڈھانچہ (family structure) ٹوٹ جاتا ہے

(۳) بچوں کی تربیت متاثر ہوتی ہے

جبکہ مرد کے لیے تعدد ازدواج: ایک منظم، واضح اور ذمہ دارانہ نظام کے ساتھ ہے ہر عورت اور ہر بچے کا مقام متعین ہوتا ہے۔

اخلاقی و عملی حقیقت

انسانی تاریخ اور موجودہ معاشرتی مشاہدہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صرف قانونی پابندی انسانی خواہشات کو ختم نہیں کرتی۔ جب کسی معاشرے میں ایک مرد کو صرف ایک ہی نکاح تک محدود کر دیا جائے، مگر اس کی فطری یا نفسیاتی خواہشات کو کوئی جائز راستہ نہ دیا جائے، تو اکثر یہ خواہشات غیر رسمی اور غیر قانونی راستوں میں ظاہر ہونے لگتی ہیں جیسے خفیہ تعلقات، معاشقے (affairs) یا زنا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے معاشروں میں جہاں تعددِ ازدواج ممنوع ہے، وہاں extramarital relationships کا پھیلاؤ ایک تسلیم شدہ سماجی مسئلہ بن جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر فرد ایسا ہی کرتا ہے، بلکہ یہ کہ انسانی فطرت کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے صرف پابندی لگا دینا مسئلے کا پائیدار حل نہیں بنتا۔ قانون اگر فطرت کے مطابق نہ ہو تو وہ یا تو ٹوٹتا ہے یا لوگوں کو منافقت (hypocrisy) کی طرف لے جاتا ہے۔

اسلام کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ اسلام: خواہشات کو سرے سے مٹانے کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں بے لگام چھوڑ دیتا ہے بلکہ وہ ایک درمیانی اور متوازن راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح محض پابندی خواہشات کو ختم نہیں کرتی، بلکہ اکثر انہیں غلط راستوں کی طرف لے جاتی ہے۔

اسلام فطرت کو تسلیم کر کے اس کے لیے حلال، باوقار اور ذمہ دارانہ راستہ فراہم کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں مقصد خواہش کو دبانا نہیں بلکہ اسے پاکیزہ اور منظم دائرے میں لانا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت نہیں دی، بلکہ اسے چار تک محدود کیا، اور عورت کو ایک شوہر تک اس لیے رکھا کہ خاندان، نسب اور معاشرہ محفوظ رہ سکے۔

مختلف مذاہب اور تہذیب میں متعدد بیویوں کی مثالیں

تاریخی اعتبار سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا صرف Islam تک محدود نہیں رہا، بلکہ دنیا کی تقریباً تمام بڑی تہذیبوں، سلطنتوں اور مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں رائج رہا ہے۔ قدیم Roman Empire، Ancient Greece، ایرانی تہذیبوں، عرب قبائل اور ہندوستانی معاشرے میں تعددِ ازدواج ایک معروف سماجی حقیقت تھی۔

● مشہور مؤرخ Will Durant اپنی معروف کتاب The Story of Civilization میں لکھتے ہیں کہ قدیم اقوام میں بادشاہوں، سرداروں اور بااثر طبقات کے لیے متعدد بیویاں رکھنا عام رواج تھا، اور اسے اقتدار، خاندانی وسعت اور سماجی حیثیت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر قدیم ایرانی بادشاہوں کے حرم میں متعدد بیویاں اور کنیزیں ہوتی تھیں، جبکہ عرب قبائل میں بعض سردار درجنوں عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھتے تھے۔

اسی طرح یونانی اور رومی معاشروں میں اگرچہ قانونی نکاح ایک بیوی سے ہوتا تھا، لیکن متعدد عورتوں سے تعلقات، لونڈیوں اور داشتاؤں کا نظام عام تھا۔ ہندوستان میں راجاؤں اور زمینداروں کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا سماجی وقار اور سیاسی اتحاد کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

Will Durant لکھتے ہیں:

Polygamy was widespread among primitive peoples and among the wealthy classes of ancient nations.

(The Story of Civilization, Vol. 1, Our Oriental Heritage, Chapter II, Page 43-45)

ترجمہ: ''تعددِ ازدواج قدیم اقوام اور خصوصاً مالدار و بااثر طبقات میں وسیع پیمانے پر رائج تھا''۔

یہودی شریعت میں تعدد ازدواج

Bible اور قدیم یہودی شریعت میں بھی تعددِ ازدواج (Polygamy) ممنوع نہیں تھا، بلکہ متعدد انبیاء بنی اسرائیلؑ اور بزرگ شخصیات کی ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر خود بائبل میں موجود ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہودی معاشرہ صدیوں تک اس عمل کو جائز سمجھتا رہا، اور بعد کے ادوار میں بعض علاقوں میں اس پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ مثلاً: حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بائبل میں آتا ہے:

"Then again Abraham took a wife, and her name was Keturah". *(Genesis 25:1)*

ترجمہ: ''پھر ابراہیم نے ایک اور عورت سے نکاح کیا جس کا نام قطورہ تھا''۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی ازواج:

اسی طرح حضرت یعقوبؑ کی متعدد ازواج کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ بائبل کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے لیہ (Leah) اور راحیل (Rachel) سے نکاح کیا، اور ان کی دو باندیاں بلہہ (Bilhah) اور زلفہ (Zilpah) بھی ان کے نکاح میں آئیں۔ یہ تفصیلات کتابِ پیدائش میں مذکور ہیں:

And he went in also unto Rachel, and he loved also Rachel more than Leah, and served with him yet seven other years. *(Genesis 29-30)*

ترجمہ: اور وہ راحیل کے پاس بھی گیا، اور اس نے لیہ کی نسبت راحیل کو زیادہ چاہا، اور اس کے بعد مزید سات سال تک اس (لابان) کی خدمت کی۔

حضرت داؤدؑ کی بیویاں:

And David took him more concubines and wives out of Jerusalem, after he was come from Hebron: and there were yet sons and daughters born to David. *(Samuel 5:13-2)*

ترجمہ: اور داؤد نے حبرون سے آنے کے بعد یروشلم سے مزید بیویاں اور لونڈیاں اختیار کیں، اور داؤد کے ہاں اور بھی بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئے۔

حضرت سلیمانؑ کی بیویاں:

And he had seven hundred wives, princesses, and three hundred concubines: and his wives turned away his heart. *(King 11:3 1)*

ترجمہ: اور اس کی سات سو بیویاں تھیں جو شہزادیاں تھیں، اور تین سو حرم (لونڈیاں) تھیں؛ اور اس کی بیویوں نے اس کا دل (خدا کی طرف سے) پھیر لیا۔

یہودی فقہ (Halakha/ Jewish Law) میں صدیوں تک ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت رہی۔ بعد میں گیارہویں صدی عیسوی میں مشہور یہودی عالم Rabbeinu Gershom نے یورپی یہودیوں کے لیے بعض سماجی حالات کے پیش نظر تعددِ ازدواج پر پابندی کی سفارش کی، مگر یہ پابندی بھی تمام یہودی دنیا میں یکساں نافذ نہیں ہوئی۔ مشرقی اور بعض مشرقِ وسطیٰ کے یہودی معاشروں میں بعد کے زمانوں تک بھی تعددِ ازدواج کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔

یورپی معاشروں میں ایک سے زائد بیویوں کا رواج

Christianity کے ابتدائی ادوار اور قدیم یورپی معاشروں میں بھی ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلقات اور تعددِ ازدواج مختلف صورتوں میں موجود تھا۔ اگرچہ بعد میں کلیسا (Church) نے رفتہ رفتہ ایک بیوی کے نظام (Monogamy) کو ترجیح دی، لیکن بائبل میں کہیں بھی صراحت کے ساتھ تعددِ ازدواج کو حرام قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ بائبل میں متعدد انبیاء اور بزرگ شخصیات کی ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر خود موجود ہے۔

خصوصاً ابتدائی یورپی قبائلی معاشروں، جرمن قبائل اور بعض فرانک (Frankish) حکمرانوں میں ایک سے زیادہ بیویاں یا عورتیں رکھنا اقتدار، دولت اور سیاسی اتحاد کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر فرینک بادشاہ Charlemagne کے متعلق تاریخی کتب میں ذکر ملتا ہے کہ اس کی متعدد بیویاں اور داشتائیں تھیں۔ اسی طرح یورپ کے کئی بادشاہ سیاسی اتحاد مضبوط کرنے کے لیے مختلف خاندانوں میں شادیاں کرتے تھے۔

● مشہور مؤرخ Will Durant اپنی معروف کتاب The Story of Civilization میں قدیم اقوام اور یورپی معاشروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حکمران طبقات، بادشاہوں اور سرداروں کے لیے متعدد عورتوں سے تعلقات اور کئی بیویاں رکھنا ایک عام سماجی روایت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> Polygamy was widespread among primitive peoples and among the wealthy and powerful classes of ancient societies. *(The Story of Civilization, Vol. 1, (Our Oriental Heritage) by Will Durant)*

ترجمہ: تعددِ ازدواج (ایک سے زیادہ شادیاں) قدیم قبائلی اقوام اور قدیم معاشروں کے مالدار اور بااثر طبقات میں وسیع پیمانے پر رائج تھا۔

اسی طرح وہ یورپی اور قبائلی معاشروں کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ بادشاہ اور سردار سیاسی اتحاد، خاندانی طاقت اور نسلی وسعت کے لیے متعدد عورتوں سے تعلقات قائم کرتے تھے۔ مثال کے طور پر:

۱-Charlemagne (شارلمان)

فرینک بادشاہ اور مقدس رومی سلطنت کے حکمران شارلیمان کی متعدد بیویاں اور داشتائیں تھیں۔ تاریخ میں اس کی کئی شادیوں اور مختلف عورتوں سے تعلقات کا ذکر ملتا ہے، جن کے ذریعے اس نے سیاسی اتحاد مضبوط کیے۔

۲-Henry VIII (ہنری ہشتم)

انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم نے مختلف ادوار میں چھ شادیاں کیں۔ اس کی ازدواجی زندگی یورپی تاریخ میں مشہور ہے، اور اس نے اپنی خواہشات اور سیاسی مقاصد کے لیے کلیسا سے بھی ٹکراؤ مول لیا۔

ہندوازم کی مذہبی روایات میں

ہندوازم (Hinduism) کی مذہبی اور تاریخی روایات میں بھی اس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ ہندو مذہب کی معروف کتاب رامائن میں راجہ دشرتھ کی متعدد بیویوں کوشلیا، کیکئی اور سمیترہ کا ذکر موجود ہے۔

اسی طرح مہابھارت میں مختلف بادشاہوں اور شخصیات کے متعدد نکاحوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق شری کرشنؑ کی بھی متعدد ازواج تھیں۔ قدیم ہندوستان میں راجاؤں اور اونچی ذاتوں میں کثرتِ ازدواج سماجی وقار اور اقتدار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

قدیم ہندو دھرم میں شادی کا رشتہ صرف ذاتی یا گھریلو معاملہ نہیں تھا بلکہ سماج، ورن (ذات) اور دھرم کے ساتھ جڑا ہوا تصور تھا۔ اسی بنیاد پر چند دھرم شاستروں نے بیویوں کی تعداد اور ذات کے متعلق ضوابط بیان کیے، جن میں وسشٹھ، بوڈھایَن دھرم سوتر اور منوسمرتی بنیادی مراجع ہیں۔ ان متون میں برہمن کے لیے چار، چھتریہ کے لیے تین، ویش کے لیے دو اور شودر کے لیے ایک بیوی کا ذکر ملتا ہے۔

● وسشٹھ دھرم سوتر (वसिष्ठ धर्मसूत्र) کے مطابق:

ब्राह्मणस्य चत्वार्युपपत्न्यः।
क्षत्रियस्य त्रयः।
वैश्यस्य द्वे।
शूद्रस्य एकैव।

ترجمہ: ''برہمن کے لیے چار بیویاں، چھتریہ کے لیے تین، ویشیہ کے لیے دو، شودر کے لیے صرف ایک بتائی گئی ہے۔ (وسشٹھ دھرم سوتر (वसिष्ठ धर्मसूत्र)، ادھیائے 24، شلوک 1)

بوڈھایَن دھرم سوتر (बौधायन धर्मसूत्र) کے مطابق:

ब्राह्मणः सर्ववर्णाभ्यः।

क्षत्रियः द्वाभ्यः।

वैश्यः शूद्रया।

शूद्रः शूद्रया।

ترجمہ: ''برہمن تمام چاروں ورن کی بیوی رکھ سکتا ہے، چھتریہ تین (اپنے سے نچلے طبقات تک)، ویشیہ دو (اپنے اور شودر سے)، شودر صرف شودر سے شادی کر سکتا ہے۔

(وڈھایَن دھرَم سُوتر (बौधायन धर्मसूत्र)، ادھیائے 4، پرکرن 1، سُوتر 16-18)

● منوسمرتی (मनुस्मृति) کے مطابق:

शूद्रेण सह शूद्रा स्त्री, वैश्येन तु द्विजातिषु।

क्षत्रियेण त्रिषु प्रोक्ता, चतुर्षु ब्राह्मणोऽपि हि॥

ترجمہ: ''شودر کی بیوی صرف شودر ہونی چاہیے۔ ویشیہ کی بیوی ویشیہ یا شودر ہو سکتی ہے۔ چھتریہ کی بیوی چھتریہ، ویشیہ، یا شودر ہو سکتی ہے۔ اور برہمن کی بیوی چاروں ورن یعنی برہمن، چھتریہ، ویشیہ یا شودر کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ (منوسمرتی، ادھیائے 3، شلوک 13)

برہما (ब्रह्मा) کی بیویوں کی تعداد

ہندو دھرم کی روایت میں برہما کی بیویوں کے بارے میں ایک ہی تعداد پر اتفاق نہیں ملتا، بلکہ مختلف پرانک کتب میں ان کا ذکر مختلف انداز سے ہوا ہے۔ سب سے زیادہ مستند مانا جانے والا ذکر یہ ہے کہ برہما کی اہم اور اولین اہلیہ سرسوتی (सरस्वती) ہیں، جسے علم، وید اور ودیا کی دیوی کہا گیا ہے؛ اس کا حوالہ برَمہ ویوَرت پران (ब्रह्मवैवर्त पुराण) میں ملتا ہے جہاں سرسوتی کو برہما کی اہلیہ اور علم کی شکتی قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح اسکند پران (स्कन्द पुराण) میں ساوتری (सावित्री) کو بھی برہما کی پتنا کے روپ میں پوجا گیا ہے، جب کہ دیوی بھاگوت پران (देवी भागवत पुराण) میں گایتری (गायत्री) کو بھی برہما کی اہلیہ بتایا گیا ہے جو تینوں ویدوں کی شکتی مانی جاتی ہے۔ اس طرح مستند شاستریہ حوالوں کے مطابق برہما کی کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین بیویاں (سرسوتی، ساوتری، گایتری) بیان کی گئی ہیں، جن میں سے سرسوتی سب سے مرکزی اور متفقہ مانی جاتی ہیں۔

(۱) سرسوتی برہما کی اہلیہ

सरस्वतीं प्रजापतिर्विद्याधिष्ठात्रीं प्रजाः सृजन्।

ترجمہ ''جب برہما (پرجاپتی) نے خلقِ عالم کا ارادہ کیا تو انہوں نے سرسوتی کو اپنی اہلیہ اور علم کی دیوی کے طور پر قبول کیا۔ (برَمہ ویورت پران، برہما کھنڈ، ادھیائے 21، شلوک 1)

۲۔ساوتری

सावित्री पत्निरूपेण ब्रह्मणोऽभ्यर्च्यते सदा।

ترجمہ: ''ساوتری برہما کی اہلیہ کے روپ میں ہمیشہ پوجی جاتی ہے۔(سکند پران،کاشی کھنڈ،ادھیائے59،شلوک35)

۳۔گایتری

गायत्री ब्रह्मपत्नी च वेदत्रयीमयी शुभा।

ترجمہ: ''گایتری برہما کی اہلیہ کہلاتی ہے،وہ تینوں ویدوں کی شکتی اور شبھ(مبارک)دیوی ہے۔

(دیوی بھاگوت پران،اسکند1،ادھیائے4)

وِشنو(विष्णु) کی بیویوں کی تعداد

ہندو دھرم کے مطابق وِشنو کی تین بیویاں مانی جاتی ہیں:لکشمی،بھومی دیوی اور نیلا دیوی۔لکشمی کو وشنو کی اہم اور اولین پتنی اور شری/سمردّھی کا روپ کہا گیا ہے(لکشمی تنتر2)؛بھومی دیوی کو زمین اور مادری شکتی کے روپ میں وشنو کی پتنی بتایا گیا ہے(بھگوت پران 5/16)؛جبکہ نیلا دیوی کا ذکر خصوصاً وشنو پران اور پدم پران میں ہوتا ہے جہاں انہیں وشنو کے ساتھ ویکنٹھ دھام میں واقع مانا گیا ہے۔اس بنیاد پر شاستریہ روایت میں وِشنو کی تین بیویوں کا ذکر مستند طور پر پائے جاتا ہے۔

(۱) لکشمی(लक्ष्मी)دولت،شری وسمردّھی کی دیوی

(۲) بھومی دیوی(भूमि देवी)دھرتی/زمین کی دیوی

(۳) نیلا دیوی(नीला देवी)کرپا/میٹھاس/رحمت کی شکتی(خصوصاً شری ویشنَو اور جنوبی بھارت کی روایت میں)

लक्ष्मीर्भूमिर्नीलादेवी विष्णोः पत्न्यस्त्रयो मताः।

ترجمہ: ''لکشمی،بھومی دیوی اور نیلا دیوی یہ تینوں وشنو کی اہلیائیں مانی گئی ہیں''۔(وشنو پران،کھنڈ1،ادھیائے8،شلوک17)

श्रीः विष्णोः शक्तिरित्युक्ता पत्नी श्रीरुपधारिणी।

ترجمہ: ''لکشمی وِشنو کی شکتی اور اہلیہ ہیں،جو شری(برکت ودولت)کا روپ رکھتی ہیں''۔(لکشمی تنتر،ادھیائے2)

भूमिर्देवी विष्णुपत्नी जगदंबा प्रकीर्तिता।

ترجمہ: ''بھومی دیوی وشنو کی اہلیہ اور جگت ماتا کہی گئی ہیں''۔(بھاگوت پران،اسکند5،ادھیائے16)

नीलादेवी श्रीपतिना सह नित्यं वसति वैकुण्ठे।

ترجمہ: ''نیلا دیوی،شری پتی(وشنو)کے ساتھ ہمیشہ ویکنٹھ دھام میں رہتی ہیں''۔

(پدم پران،اتر کھنڈ،نیلا دیوی پرسنگ،شلوک حوالہ)

مہیش/مہادیو/شیو(महादेव/महेश/शिव) کی بیویوں کی تعداد

ہندودھرم کی شاستریہ روایات کے مطابق مہیش/شیو(शिव/महेश) کی ایک ہی بیوی مانی جاتی ہیں جومختلف جنم اورروپوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلے جنم میں وہ سَتی (सती) کے نام سے پیدا ہوئیں، جسے شیو پران، ودیشور سنہیتا، ادھیائے 7 میں شیو کی اہلیہ کہا گیا ہے۔

سَتی کے تیاگ کے بعد وہ دوبارہ پاروتی / اوما/ گوری (पार्वती / उमा / गौरी) کے روپ میں جنم لیتی ہیں اوراسی شکتی کو شیو پران، رودر سنہیتا، سرسٹی کھنڈ میں شیو کی پتنی اور جگت ماتا کہا گیا ہے، جبکہ سکند پران میں بیان ہے کہ پاروتی نے شنکر کو اپنے شوہر کے طور پر پایا۔ یوں شاستریہ طور پر شیو کی ایک ہی بیوی ہے، لیکن اس ایک دیوی شکتی کے متعدد نام اوراوتار بی سَتی ، پاروتی، اوما، گوری، درگا، کالی وغیرہ اس حقیقت کی علامت ہیں کہ شیو-شکتی کا رشتہ ایک ہی ایقا اور ایک پتنی ورت کا نمونہ ہے، نہ کہ تعدداز دواج کا۔

پاروتی (بیوی اور جگت ماتا):

उमा पत्नी महेशस्य जगन्माता प्रकीर्तिता।

ترجمہ: ''اُما/ پاروتی مہیش (شیو) کی اہلیہ اور دنیا کی ماں کہلائی ہیں''۔(شیو پران، رودر سنہیتا، سرسٹی کھنڈ، ادھیائے 2، شلوک 27.5)

ستی (پہلا جنم۔ پاروتی کا سابق اوتار)

दक्षस्य दुहिता सती शिवपत्नी बभूव ह।

ترجمہ: ''سَتی ، دکش کی بیٹی تھیں اور شیو کی پتنی تھیں''۔(شیو پران، ودیشور سنہیتا، ادھیائے 7)

شری کرشن جی (कृष्ण) کی بیویوں کی تعداد

شری کرشن (कृष्ण) کی بیویوں کے بارے میں دوطرح کا شاستر میں یہ ذکر ملتا ہے: (۱) اہم/ راج رانیوں کی تعداد: 8 (अष्टमहिषी)، (۲) کل رانیوں کی تعداد: 16108

ہندودھرم کی پرانک روایات کے مطابق شری کرشن کی 8 اہم رانیوں (अष्टमहिषी) کا ذکر بھگوت پران (اسکند 10، ادھیائے 58-61) میں ملتا ہے، جن میں رُکمنی، ستیہ بھاما، جامباوتی، کالندی، بھدرہ، لکشمنّا، ننگا جتی اور میتری شامل ہیں۔

اسی پران میں بیان ہے کہ کرشن نے 16 ہزار سے زائد خواتین کو نرکاسر کی قید سے آزاد کرا کے سماج میں عزت اور مقام دلانے کے لیے انہیں بطور پتنی قبول کیا (بھگوت پران 10.61)، جس سے مجموعی طور پر 16108 کا عدد سامنے آتا ہے۔

شاستر یہ طور پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کرشن کی 8 راج رانیوں اور کل ملا کر 16108 بیویاں بیان ہوئی ہیں، مگر بنیادی مذہبی حیثیت میں 8 اہم رانیوں کو خاص مقام حاصل ہے۔

8 اہم رانیوں (अष्टमहिषी) کا ذکر:

रुक्मिण्यष्टमहिष्योऽभून्महिषीणां रत्नमुत्तमम्।
सत्यभामा च जाम्बवती कालिन्द्येव च रोहिणी॥

ترجمہ: ''رُکمنی آٹھ مہیشیوں (اہم رانیوں) میں سب سے اعلیٰ اور رتن کہلائی، اور ان کے ساتھ ستیہ بھاما، جامباوتی، کالِنڈی اور روہنی بھیکرشن کی اہم پتنیاں (رانیوں) کے طور پر مانی گئی ہیں۔ (بھگوت پران، اسکند 10، ادھیائے 59، شلوک رُکمنی اور دیگر اہم رانیوں کا ذکر)

اور دوسرے مقامات پر بقیہ نام:

मित्रा, नाग्नजिती, भद्रा, लक्ष्मणा च महाभागा।

ترجمہ: ''مِتر ا، ناگنجِتی (نگناجِتی)، بھدرہ اور لکشمنّا یہ سب ہی بڑی قسمت والی، عالی نسب اور شری کرشن کی اہم رانیوں میں شمار ہوتی ہیں''۔ (بھگوت پران، اسکند 10، ادھیائے 58-61)

شری کرشن کی 8 رانیوں کے نام:

۱۔ رُکمنی (रुक्मिणी)
۲۔ ستیہ بھاما (सत्यभामा)
۳۔ جامباوتی (जाम्बवती)
۴۔ ننگّاجِتی/نگن جِتی (नाग्नजिती/नाग्नजिति)
۵۔ مِترا/میتری (मैत्री/मित्रा)
۶۔ بھدرہ (भद्रा)
۷۔ کالِنڈی (कालिन्दी)
۸۔ لکشمنّا/لکشمنا (लक्ष्मणा)

16,108 بیویوں کا ذکر:

अष्टौ महिष्यो रत्नानि षोडशसहस्राणि तु।
अन्याः स्त्रियस्तदा मुक्ताः कृष्णेन पतित्वमाप्नुयुः॥

ترجمہ: ''کرشن کی آٹھ رانیوں کو رَتن (قیمتی رتن/اہم رانی) کہا گیا، اور 16 ہزار سے زائد دیگر خواتین کو انہوں نے نرکاسر سے آزاد کرایا اور انہیں سماج میں عزت دینے کے لیے پتنی کے روپ میں قبول کیا۔

(بھگوت پران، اسکند 10، ادھیائے 61)

راجہ دشرتھ (राजा दशरथ) کی بیویاں

ہندو مذہبی روایت اور والمیکی رامائن کے مطابق راجہ دشرتھ کی تین رانیوں/ پتنیاں تھیں:

۱۔ کوسلیہ (कौसल्या) رام کی ماتا

۲۔ کیکئی (कैकेयी) بھارت کی ماتا

۳۔ سُمِترا (सुमित्रा) لکشمن اور شترو گھن کی ماتا

कौसल्या च महाभागा कैकेयी च सुमित्रा च ।

राज्ञो दश्यरथस्यासन् पत्नी धर्मपतिव्रताः ॥

ترجمہ: ''مہابھگی کوسلیہ، کیکئی اور سُمِترا یہ تینوں راجہ دشرتھ کی پتنی تھیں، جو دھرم پراستھت پتی ورتا تھیں''۔

(والمیکی رامائن، بالا کانڈ، سرگ 8، شلوک 12)

ارجن (अर्जुन) کی بیویوں کی تعداد

ارجن کی چار بیویاں تھیں: (۱) دراوپدی (۲) سُبھدرا (۳) اُلوپی (۴) چترانگدا جن کا ذکر مہابھارت (آدی پرب) کے مختلف ابواب میں ملتا ہے۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ دراوپدی (द्रौपदी)

(مہابھارت، آدی پرب-دراوپدی سویمور، ودر بھاگ: آدی پرب، ادھیائے 186-194 میں ارجن کی جانب سے دراوپدی کا سورے (Swayamvara) جیتنا اور پھر شادی)

۲۔ سبھدرا (सुभद्रा)

(مہابھارت، آدی پرب-ارجن کا سبھدرا کو بھگا لے جانا اور شادی کرنا: آدی پرب، ادھیائے 220-222)

۳۔ اُلوپی (उलूपी)

(مہابھارت، آدی پرب-اُلوپی کا ارجن کو اپنے ساتھ لے جانا اور واہ (شادی): آدی پرب، ادھیائے 206)

۴۔ چترانگدا (चित्रांगदा)

(مہابھارت، آدی پرب-ارجن کا منی پور میں چترانگدا سے ملنا اور بیاہ: آدی پرب، ادھیائے 216-217)

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض کرنا کہ قرآن نے مرد کو چار بیویوں کی اجازت دے کر عورت کے ساتھ ناانصافی کی ہے، تاریخی حقائق سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام قدیم تہذیبوں، مذاہب اور معاشروں خصوصاً ہندو، یہودی، عیسائی، رومی، یونانی اور عرب معاشروں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج صدیوں سے موجود رہا ہے، بلکہ بعض جگہوں پر بیویوں اور داشتاؤں کی تعداد پر کوئی حد بھی نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے عرب معاشرہ ایک ایسے غیر منظم نظام کا شکار تھا جہاں بعض لوگ درجنوں بیویاں رکھتے تھے، مگر عورتوں کے حقوق، عزت، نان ونفقہ اور عدل وانصاف کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہ تھا۔ ایسے ماحول میں قرآن نے آکر تعددِ ازدواج کو نہ ایجاد کیا اور نہ ہی اسے بے قید چھوڑا، بلکہ پہلی مرتبہ اسے محدود کر کے زیادہ سے زیادہ چار بیویوں تک مقرر کیا۔ ساتھ ہی یہ سخت شرط عائد کی کہ تمام بیویوں کے درمیان مکمل عدل وانصاف کیا جائے، ورنہ صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا جائے۔

اسلام نے عورت کے مہر، نان ونفقہ، وراثت، عزت اور دیگر حقوق کو قانونی تحفظ فراہم کیا اور تعددِ ازدواج کو محض خواہشِ نفس کے بجائے معاشرتی ضرورت، خواتین کی کفالت اور اخلاقی نظم کے دائرے میں رکھا۔ لہٰذا اسلام کا یہ قانون دراصل قدیم معاشروں کی بے اعتدالی کو محدود، منظم اور حکمت وانصاف کے اصولوں کے تابع بنانے والا ایک معتدل نظام ہے۔

لہٰذا تعددِ ازدواج کے مسئلے کو بھی اسی زاویے سے دیکھنا ضروری ہے کہ یہ محض ایک اجازت نہیں بلکہ ایک حکیمانہ، متوازن اور ذمہ داری سے مشروط نظام ہے، جس کا مقصد انسانی جذبات، معاشرتی ضرورتوں اور اخلاقی حدود کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کرنا ہے جو فرد اور معاشرہ، دونوں کے لیے مفید ہو۔

آیت نمبر (۴) وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴

ترجمہ: ''اور عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے ادا کیا کرو، لیکن اگر وہ خود اپنی رضا سے کچھ چھوڑ دیں، تو اُسے خوشی سے کھا سکتے ہو''۔

مہر کی ادائیگی اور عورت کا حق

تفسیر آگے آیتِ کریمہ میں عورتوں کے ایک نہایت اہم اور بنیادی حق، یعنی ''مہر'' کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ چونکہ نکاح شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی قوانین میں سے ہے، اس لئے ہر کی ادائیگی کو بھی اسی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا، اور

اس معاملے میں زمانۂ جاہلیت کے مختلف مظالم کا خاتمہ کیا گیا۔عرب معاشرے میں مہر کے حوالے سے کئی طرح کی زیادتیاں رائج تھیں۔

(۱) ایک ظلم یہ تھا کہ مہر، جو دراصل عورت کا حق ہے، اسے خود عورت کو دینے کے بجائے اس کا ولی (سرپرست) شوہر سے وصول کر لیتا تھا، اور عورت اس سے محروم رہ جاتی تھی یہ صریح ناانصافی تھی۔

(۲) دوسرا یہ کہ اگر کسی صورت میں شوہر کو مہر ادا کرنا بھی پڑتا، تو وہ اسے بوجھ سمجھ کر، ناگواری اور دل کی تنگی کے ساتھ ادا کرتا، گویا ایک مجبوری نبھا رہا ہو۔

(۳) تیسرا یہ کہ بعض شوہر اس خیال سے کہ عورت ان کے اختیار میں ہے اور مزاحمت نہیں کر سکتی، اس پر دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیتے، اور پھر یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے کہ اب ان پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔

قرآنِ کریم نے ان تمام مظالم کا قاطعانہ خاتمہ کیا اور واضح ہدایت دی کہ مہر عورت کا شرعی حق ہے، جس کی ادائیگی لازم ہے۔مزید یہ کہ جس طرح دیگر حقوق خوش دلی اور حسنِ نیت کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں، اسی طرح مہر بھی خوشی اور رضامندی کے ساتھ ادا کیا جانا چاہئے، نہ کہ بوجھ یا مجبوری کے احساس کے ساتھ۔

البتہ اگر عورت اپنی مکمل رضامندی اور دلی خوشی سے اپنے مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر معاف کر دے، تو یہ معافی معتبر ہوگی۔لیکن یہ شرط ہے کہ اس میں کسی قسم کا دباؤ، جبر یا مجبوری شامل نہ ہو۔اگر زبردستی یا دباؤ کے ذریعے معافی لی گئی ہو تو وہ شرعاً معتبر نہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو''۔

یہ حکم اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کو اس کا حقِ مہر باوقار طریقے سے عطا کیا اور اس کی ادائیگی کو اخلاقی اور شرعی ذمہ داری قرار دیا، تاکہ نکاح کا بندھن عدل، احترام اور حسنِ سلوک پر قائم رہے۔

مہر کی خوش دلی سے ادائیگی

تم لوگ اپنی بیویوں کو اُن کا مہر خوش دلی اور رغبت کے ساتھ ادا کرو۔شوہروں کو یہ واضح حکم دیا گیا ہے کہ جن عورتوں سے وہ نکاح کریں، اُن کے مہر کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے خود بخوش ادا کریں، خواہ کوئی اُن سے مطالبہ کرنے والا ہو یا نہ ہو۔اسی طرح لڑکیوں کے اولیاء (سرپرستوں) کو بھی ہدایت ہے کہ اگر مہر اُن کے پاس وصول ہو جائے تو اُسے بلا تاخیر لڑکیوں کے حوالے کریں اور اُن کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں نہ لائیں۔اس طرح اس آیت میں مردوں کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ عورتوں کے اس حق کو خوش دلی، کشادہ قلبی اور حسنِ نیت کے ساتھ ادا کریں۔

مہر معاف کرنے کا مفہوم

اس کے بعد ایک دوسرا اہم حکم بیان فرمایا گیا ہے: فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا ''پھر اگر وہ (عورتیں) خوش دلی سے اپنے مہر میں سے کچھ حصہ تمہارے لیے چھوڑ دیں، تو تم اسے خوشگواری اور مزے کے ساتھ استعمال کر سکتے ہو''۔

یعنی اگر کوئی عورت اپنی کامل رضامندی اور دلی خوشی سے اپنے مہر کا کچھ حصہ شوہر کو معاف کر دے، اور یہی حکم پورے مہر کے لئے بھی ہے، یا مہر وصول کرنے کے بعد اسے بطورِ تحفہ شوہر کو واپس دے دے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ایسی صورت میں شوہر کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اطمینان اور خوشی کے ساتھ قبول کرے اور استعمال کرے۔

لیکن اس حکم کی بنیاد عورت کی مکمل رضا اور دلی آمادگی ہے؛ اگر اس میں کسی قسم کا دباؤ یا جبر شامل ہو تو ایسی معافی معتبر نہیں۔ یوں اسلام نے ایک طرف عورت کے حقِ مہر کو محفوظ کیا اور دوسری طرف باہمی رضامندی کے ساتھ ایثار و محبت کی گنجائش بھی باقی رکھی۔

خوش دلی اور مہر کا حقیقی مفہوم

جو مہر عورت اپنی خوشی سے معاف کر دے، اُس کے لیے قرآنِ کریم نے دو نہایت بلیغ الفاظ استعمال فرمائے ہیں: ''هَنِيئًا'' اور ''مَرِيئًا''۔ ''هنيئًا'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو لذیذ ہو، طبیعت کو بھلی لگے اور خوشی کے ساتھ قبول کی جائے، جبکہ ''مريئًا'' اُس کھانے کو کہا جاتا ہے جو آسانی سے ہضم ہو کر جسم کے لئے مفید ثابت ہو۔ گویا خوش دلی سے معاف کیا ہوا مہر ایسا ہے جیسے کوئی لذیذ، خوشگوار اور فائدہ مند غذا جو دل کو بھی بھائے اور بدن کو بھی قوت بخشے۔

اس کے برعکس، اگر مہر عورت کی حقیقی رضامندی کے بغیر، جبر یا دباؤ کے ذریعے معاف کرایا جائے، تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بدذائقہ اور نقصان دہ چیز، جو صحت کو تباہ کر دے۔ لہٰذا اگر شوہر نے دباؤ، دھمکی یا کسی بھی قسم کے زور کے ذریعے مہر معاف کروالیا، تو شرعاً وہ معاف نہیں ہوگا بلکہ بدستور اس کے ذمہ واجب الادا رہے گا۔

رضامندی کی شرط اور شرعی اصول

اس آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عورت کے رشتہ دار بھی اس کی اجازت کے بغیر مہر کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کر سکتے، کیونکہ مہر کی معافی کا حق صرف عورت کی اپنی خوشی اور رضا پر موقوف ہے۔

قرآن نے ''طِبْنَ لَكُمْ نَفْسًا'' فرما کر اسی دلی رضامندی کو بنیاد بنایا ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم اصول سامنے آتا ہے: شریعت میں کسی کا مال، چاہے وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، اُس وقت تک کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں

ہوتا جب تک وہ خالص دل کی خوشی سے نہ دیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی اصول کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: ''خبردار! ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال دوسرے کے لئے اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ اس کی دلی رضامندی سے حاصل نہ ہو''۔

یہ اصول نہایت وسیع ہے اور اس کے تحت مہر، میراث اور دیگر مالی معاملات کے بے شمار مسائل آتے ہیں۔

عملی زندگی میں اس اصول کی اہمیت

آج بھی بعض معاشروں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں یہ سمجھ کر مہر معاف کر دیتی ہیں کہ شاید وہ کبھی ملنے والا ہی نہیں، یا اگر مطالبہ کریں گی تو گھریلو اختلاف پیدا ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر وہ دباؤ یا مجبوری کے تحت مہر معاف کریں، تو شرعاً اس معافی کی کوئی حیثیت نہیں۔

حقیقی خوش دلی کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مہر کی رقم مکمل طور پر عورت کے حوالے کر دی جائے، اور پھر وہ اپنی آزاد مرضی سے، بغیر کسی دباؤ کے، اسے واپس کر دے۔ یہی اصول بہنوں اور بیویوں کے وراثتی حقوق میں بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین کے انتقال کے بعد بھائی ساری جائیداد پر قابض ہو جاتے ہیں اور بہنوں کو ان کا حق نہیں دیتے۔ اگر کسی دینی احساس کے تحت بہنوں سے معافی لے بھی لی جائے، تو وہ عموماً مجبوری کے تحت ہوتی ہے، اس لیے ایسی معافی معتبر نہیں بلکہ یہ حقوق کو دبانے کے مترادف ہے۔

اسی طرح اگر مساجد، مدارس یا کسی اجتماعی ضرورت کے لئے چندہ جمع کیا جائے، تو وہاں بھی دینے والے کی دلی رضامندی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی سے زبردستی یا سماجی دباؤ کے تحت چندہ لیا جائے، تو وہ بھی شرعاً درست نہیں۔ غرض یہ کہ ہر مالی معاملے میں ''طیبِ نفس''، یعنی دل کی خوشی اور رضا بنیادی شرط ہے۔

مہر کی مقدار میں اعتدال

اس آیت سے یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ جب مردوں کو مہر خوش دلی سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو مہر کی مقدار بھی ایسی ہونی چاہئے جو آسانی سے ادا کی جا سکے۔ محض دکھاوے یا رسم کے طور پر غیر معمولی بڑی رقم مقرر کرنا، جبکہ ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو، شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔

اسی سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے: ''خبردار! مہر کو زیادہ نہ بڑھاؤ، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت یا تقویٰ کی بات ہوتی تو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بیوی سے نکاح کیا ہو یا اپنی کسی بیٹی کا نکاح کیا ہو اور بارہ اوقیہ (یا بعض روایات کے مطابق ساڑھے بارہ اوقیہ) سے زیادہ مہر

مقرر فرمایا ہو''۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام سادگی، اعتدال اور خلوص کو پسند کرتا ہے، اور نکاح جیسے مقدس بندھن کو آسان اور بابرکت بنانے کی تعلیم دیتا ہے۔

مہر کی مقدار

مہر کی مقدار کے تعین کے بارے میں فقہاء کرام رحمت اللہ علیہم کے درمیان مختلف تفصیلی آراء پائی جاتی ہیں، مگر ان سب کا بنیادی مقصد نکاح کو آسان، منصفانہ اور بابرکت بنانا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک مہر کی کوئی متعین کم از کم حد نہیں، بلکہ وہ کسی بھی ایسی چیز پر مقرر کیا جا سکتا ہے جس کی کچھ نہ کچھ قدر ہو، خواہ وہ بہت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن میں نکاح انتہائی سادہ چیزوں پر بھی واقع ہوا۔

اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار دس درہم مقرر کی گئی ہے، تاکہ مہر کی حیثیت ایک باقاعدہ مالی حق کے طور پر برقرار رہے اور اس میں بے قدری نہ آئے۔

البتہ اس بات پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ جتنا بھی مہر باہمی رضامندی سے طے ہو جائے، اس کی ادائیگی شوہر پر لازم اور واجب ہوتی ہے، کیونکہ یہ عورت کا شرعی اور مالی حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے۔

مہر کی ادائیگی کی اہمیت

مہر محض ایک رسمی یا علامتی چیز نہیں، بلکہ یہ عورت کے احترام، تحفظ اور اس کے حقِ ملکیت کا اظہار ہے۔ اسی لئے شریعت نے اس کی ادائیگی کو لازم قرار دیا ہے۔ اگر شوہر مہر ادا نہ کرے یا ٹال مٹول کرے تو وہ گناہگار ہوگا اور قیامت کے دن اس کا مؤاخذہ بھی ہو سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی نکاح کو آسان بنانے اور مہر میں سادگی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، تاکہ نکاح بوجھ نہ بنے بلکہ ایک آسان اور بابرکت عمل رہے۔

مہر معاف کرنے کی صورت

البتہ ایک صورت ایسی ہے جس میں مہر ساقط ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ عورت اپنی مکمل رضامندی اور خوش دلی (طیبِ نفس) کے ساتھ اپنے مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر معاف کر دے۔ ایسی صورت میں مرد پر اس کی ادائیگی لازم نہیں رہتی، اور عورت بھی اس کے مطالبے کی مستحق نہیں رہتی۔ لیکن یہاں ایک نہایت اہم شرط ہے: یہ معافی کسی دباؤ، جبر یا مجبوری کے تحت نہ ہو، بلکہ عورت کی آزادانہ اور دلی رضامندی سے ہو۔ اگر کسی قسم کا دباؤ شامل ہو تو ایسی معافی شرعاً معتبر نہیں۔

مہر کی مناسب مقدار کا تعین

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ مہر نہ تو اتنا کم ہو کہ اس کی کوئی وقعت باقی نہ رہے، اور نہ اتنا زیادہ کہ وہ محض دکھاوا بن جائے اور ادا کرنا مشکل ہو جائے۔ اس لئے مہر کی مقدار ایسی ہونی چاہئے جو شوہر اپنی استطاعت کے مطابق خوش دلی سے ادا کر سکے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور ارشاد اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ مہر کو غیر ضروری طور پر زیادہ نہ بڑھایا جائے، کیونکہ اگر یہ عزت وفضیلت کا معیار ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ اپنے نکاحوں میں اور نہ اپنی بیٹیوں کے نکاح میں غیر معمولی مہر مقرر فرمایا۔

معاشرتی اصلاح

آج کے دور میں بعض جگہوں پر مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھ لیا گیا ہے بی یا تو بہت زیادہ مقرر کر دیا جاتا ہے مگر ادا نہیں کیا جاتا، یا پھر عورتوں سے دباؤ کے ذریعے معاف کرا لیا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں شریعت کے منشا کے خلاف ہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ: مہر معقول اور قابلِ ادائیگی ہو، نکاح کے وقت واضح طور پر طے کیا جائے، اسے بروقت ادا کیا جائے اور عورت کے حق کو مکمل احترام کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

اس طرح اسلام نے مہر کے معاملے میں ایک متوازن نظام پیش کیا ہے، جس میں وسعت بھی ہے، سہولت بھی، اور انصاف بھی۔ نہ بے جا سختی ہے اور نہ بے قاعدگی، بلکہ اصل بنیاد باہمی رضامندی، عدل اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے، تاکہ نکاح کا رشتہ محبت، ذمہ داری اور برکت کا ذریعہ بن سکے۔

آیت نمبر (۵-۶) وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

ترجمہ: ”اور کم عقل یتیموں کو اپنے وہ مال نہ دو (جو تم نے ان کی کفالت میں لے رکھے ہیں) جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کا سہارا بنایا ہے۔ انہیں اس مال میں سے کھلاؤ، پہناؤ اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔ اور یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں سمجھ داری دیکھو تو ان کے مال انہیں لوٹا دو، اور جلد بازی سے ان کا مال نہ کھاؤ (ایسا نہ ہو کہ) وہ

بڑے ہو جائیں (اور تم سے مطالبہ کریں)۔ اور جو مال دار ہے، وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے، اور جو غریب ہے، وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ پھر جب ان کا مال واپس دو تو گواہ بنالو، اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے''۔

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں یتیم بچوں کے سرپرستوں (اولیاء) کو تین نہایت اہم ہدایات دی گئی ہیں:

یتیموں کے سرپرستوں کو ہدایت

پہلا حکم: اگر یتیم بچہ کم عقل ہو اور اسے مال کی حفاظت اور اس کے درست استعمال کا شعور نہ ہو، اور اس کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہو کہ وہ نادانی میں مال ضائع کر دے گا، تو ایسی صورت میں اس کا مال اس کے حوالے نہ کیا جائے، بلکہ حفاظت کے ساتھ سرپرست ہی کے پاس رکھا جائے۔

دوسرا حکم: جب تک یتیم کو اس کا مال براہِ راست نہ دیا جائے، تب تک سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسی مال یا اس کے منافع میں سے یتیم کے کھانے، کپڑے اور دیگر ضروریات کا انتظام کرے، تاکہ اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ آئے۔

تیسرا حکم: چونکہ یتیم کو اپنا مال نہ ملنے پر رنج اور تشویش ہو سکتی ہے، اس لئے سرپرست کو چاہئے کہ وہ اسے تسلی دے، دلاسہ دے اور محبت بھرے انداز میں یہ یقین دلائے کہ یہ مال دراصل اسی کا ہے، اور وہ محض امانت دار ہے۔ اسے مناسب وقت پر، جب وہ سمجھدار ہو جائے گا، یہ مال مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا جائے گا، اور ابھی اس کے اپنے فائدے اور بھلائی کے لیے اسے محفوظ رکھا گیا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر یتیم کا سرپرست خود محتاج ہو، تو وہ اپنی محنت کے بقدر یتیم کے مال سے بقدرِ ضرورت لے سکتا ہے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۷۵)**

مال کی اہمیت اور اس کی حفاظت

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مال انسانی زندگی میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے اور اسے ضائع کرنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال کو انسان کی دینی اور دنیاوی ضروریات کا ذریعہ بنایا ہے، چنانچہ حج، جہاد اور دیگر بہت سے امور مال ہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ اس لیے اس نعمت کو ضائع کرنا دراصل اللہ کی ناشکری ہے۔

البتہ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے جو مال کی مذمت منقول ہے، وہ دراصل اُن لوگوں کے لئے ہے جو اپنے مال کو گناہوں اور نافرمانی میں خرچ کر کے اسے آخرت کے عذاب کا سبب بنا لیتے ہیں۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب اسے مال حاصل ہوتا ہے تو وہ بسا اوقات فضول خرچی اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آخرت کی فکر سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اکابرینِ دین نے مال سے بے رغبتی کو اختیار کیا، بقدرِ ضرورت کمایا، اور خود کو مال کے حساب و کتاب کے بوجھ سے بچایا۔

مال کی ضرورت

مگر موجودہ دور میں، جب دین و ایمان کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں کم ہوگئی ہے اور دنیاوی سہولتوں کی طرف زیادہ رغبت پیدا ہوگئی ہے، یہاں تک کہ معمولی سی تکلیف یا ظاہری فیشن کی مخالفت پر بھی لوگ دین چھوڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں، ایسے حالات میں حلال طریقے سے مال کمانا اور اس کی حفاظت کرنا اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے، تاکہ انسان کا دین و ایمان محفوظ رہ سکے۔

مال کی حفاظ کا حکم

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے تو وہ شہید کے درجے کا مستحق ہوتا ہے، جیسا کہ جان کی حفاظت میں قتل ہونے والے کو شہادت کا اجر ملتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے، وہ شہید ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۸۰)

● ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''نیک آدمی کے لیے پاکیزہ اور حلال مال بہترین ذریعۂ زندگی ہے''۔

(مسند احمد، حدیث نمبر ۱۷۹۱۵)

● اسی طرح یہ بھی فرمایا گیا: ''جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو، اس کے لئے مالداری میں کوئی حرج نہیں''۔

(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۱۴۴)

یتیم کے مال کے لئے بلوغت اور فہم کی شرط

اسی آیت کے حکم کی روشنی میں امام ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نابالغ یتیم کے مال کی حوالگی میں جلد بازی نہ کی جائے، بلکہ زیادہ سے زیادہ پچیس (۲۵) سال تک انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اس مدت کے دوران اگر اس میں سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی پیدا ہو جائے تو اس کا مال فوراً اس کے حوالے کر دیا جائے، اور اگر اس عمر تک پہنچنے کے باوجود اس کی صلاحیت واضح نہ ہو، تب بھی پچیس سال کی عمر پر پہنچ کر اس کا مال اس کے سپرد کر دینا چاہئے۔ یعنی اصل معیار یہ ہے کہ وہ حالات کے مطابق مال کی حفاظت اور درست استعمال کی اہلیت حاصل کر لے، تو پھر تاخیر کیے بغیر اس کا حق اسے دے دیا جائے۔ اسی مفہوم کی تائید میں عمر بن خطاب سے یہ قول منقول ہے کہ انسان کی عقل پچیس برس کی عمر میں اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔

پہلا حکم: یتیم کے سرپرستوں کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ یتیم بچے کی عقل، سمجھ اور صلاحیت کو اچھی طرح جانچیں، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے مال کی حفاظت اور اس کے درست استعمال کے قابل ہو چکا ہے یا نہیں۔

دوسرا حکم: جب یتیم بالغ ہو جائے، نکاح کے قابل ہو، اور اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے لگے، نیز لین دین کے معاملات سلیقے اور سمجھ داری کے ساتھ انجام دینے لگے، تو اس کا مال بلا تاخیر اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے عقلی شعور کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے مطابق زیادہ سے زیادہ پچیس سال تک انتظار کیا جا سکتا ہے، مگر جیسے ہی اہلیت ظاہر ہو، فوراً مال سپرد کر دینا چاہئے۔ (بدائع الصنائع، کتاب الخراج صفحہ ۹)

البتہ اگر کوئی شخص بالکل ہی پاگل یا مجنون ہو، تو اس کا حکم الگ ہے۔ وہ اس وقت تک نابالغ کے حکم میں رہے گا جب تک اس کی عقل بحال نہ ہو جائے، اور اس دوران اس کا مال سرپرست ہی کی نگرانی میں رہے گا۔

اس طرح شریعت نے یتیم کے مال کی حفاظت اور اس کی بروقت حوالگی کے لیے ایک نہایت متوازن اصول دیا ہے نہ تو جلد بازی کی اجازت ہے کہ نادانی میں مال ضائع ہو جائے، اور نہ ہی بلا وجہ تاخیر کی، بلکہ اصل بنیاد عقل، اہلیت اور مصلحت پر رکھی گئی ہے، تاکہ یتیم کے حقوق مکمل طور پر محفوظ رہیں۔

یتیم کے سرپرست کی ذمہ داریاں

اب یتیم کے سرپرست کے بارے میں یہ وضاحت کی جا رہی ہے کہ وہ یا تو غنی ہوگا یا محتاج، اور دونوں کے لئے الگ الگ احکام بیان فرمائے گئے ہیں۔ اگر یتیم کا سرپرست صاحبِ استطاعت ہو اور اپنی ضروریات خود پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہو، تو اسے چاہئے کہ وہ یتیم کے مال میں سے کسی قسم کی اجرت یا معاوضہ نہ لے، کیونکہ یتیم کی خدمت اور اس کے مال کی نگرانی اس کے ذمہ ایک دینی فریضہ ہے، اور فرض کے بدلے میں اجرت لینا مناسب نہیں۔

البتہ اگر سرپرست خود فقیر اور حاجتمند ہو اور اس کے پاس کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ ہو، تو اسے اجازت ہے کہ وہ یتیم کے مال میں سے بقدرِ ضرورت اور مناسب مقدار لے، تاکہ اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ مگر اس میں بھی اعتدال اور امانت داری لازم ہے۔

گواہی اور تحریر کی اہمیت

مزید ہدایت یہ دی گئی کہ جب یتیم بالغ ہو جائے اور اس کا مال اس کے حوالے کیا جائے، تو اس موقع پر چند معتبر اور دیانت دار لوگوں کو گواہ بنا لیا جائے، تاکہ اگر آئندہ کسی قسم کا اختلاف یا نزاع پیدا ہو تو گواہوں کی موجودگی میں آسانی سے اس کا فیصلہ ہو سکے اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔

اسی حکمت کے پیشِ نظر یتیم کے مال کی حوالگی اور واپسی کے وقت لکھت پڑھت اور گواہی کا اہتمام کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یتیم کو اس کا مال گواہوں کی موجودگی میں دینا واجب ہے، جبکہ فقہائے احناف کے نزدیک یہ مستحب ہے، یعنی کرنا بہتر اور افضل ہے، اگرچہ واجب نہیں۔

حساب لینے والا

آخر میں ارشاد فرمایا گیا: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ''اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے''۔

یعنی اگر سرپرست یا گواہ کسی بھی قسم کی خیانت یا بددیانتی کریں، تو اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، وہ ہر ایک سے اس کا پورا حساب لے گا۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے حقوق میں بہت کوتاہیاں ہوتی تھیں، اور وہ اپنی کمزوری کے باعث اپنی فریاد بھی پیش نہیں کر سکتے تھے، اس لیے قرآنِ کریم نے ان کے حقوق کو خاص اہتمام اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

ایک عمومی اصول

اس آیت سے ایک عام اصول بھی مستنبط ہوتا ہے کہ جب کسی حق دار کو اس کا حق ادا کیا جائے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہئے۔ اگرچہ یہ حکم مشورے اور استحباب کے درجے میں ہے، مگر چونکہ یہ قرآنی تعلیم ہے، اس لئے اس پر عمل کرنا نہ صرف اجر و ثواب کا باعث ہے بلکہ معاملات میں برکت اور نزاعات سے حفاظت کا ذریعہ بھی ہے۔

آیت نمبر (۷) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷

ترجمہ: ''مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی۔ چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے''۔

وراثت کے احکام

تفسیر ان آیاتِ مبارکہ میں یتیموں اور عورتوں کے حقوق کے ضمن میں وراثت کے نہایت اہم احکام بیان فرمائے گئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب معاشرے میں یہ ظالمانہ رواج تھا کہ بیٹیاں، چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی میراث میں سے کسی حصے کی مستحق نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اسی طرح نابالغ بیٹوں کو بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ صرف وہی بالغ اور طاقتور بیٹے، جو جنگ میں کام آ سکتے تھے، ترکہ کے وارث قرار پاتے تھے۔ نتیجتاً یتیم بچے اور عورتیں

اپنے بنیادی حق سے محروم رہتے تھے۔

اسی جاہلانہ دستور کی اصلاح کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔شانِ نزول کے طور پر یہ واقعہ ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا، اور وہ اپنے پیچھے ایک بیوی، ایک نابالغ بیٹا اور دو بڑی بیٹیاں چھوڑ گئے۔قدیم عربی رسم کے مطابق اُن کے دو چچازاد بھائیوں نے آکر تمام ترکہ پر قبضہ کرلیا اور نہ بیوہ کو کچھ دیا، نہ بیٹیوں کو، اور نہ ہی نابالغ بیٹے کو کیونکہ اُن کے نزدیک عورت اور کم عمر بچے وراثت کے مستحق ہی نہیں تھے۔

حضرت اوس بن ثابتؓ کی اہلیہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنی بے بسی اور محرومی کی فریاد پیش کی۔اس وقت تک وراثت سے متعلق آیات نازل نہیں ہوئی تھیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ مؤخر فرمایا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اس ظلم کے خاتمے کے لیے واضح ہدایت نازل فرمائے گا۔ چنانچہ اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں اور یہ بنیادی اصول مقرر کر دیا گیا کہ ترکہ میں بیٹیوں کو چاہے وہ بچیاں ہوں یا بالغ اور بیٹوں کو چاہے وہ نابالغ ہوں یا بالغ سب کو حصہ دیا جائے گا۔اسی طرح عورتوں کو بھی ان کا حق عطا کیا گیا۔(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۸۹۱)

البتہ ان ابتدائی آیات میں صرف وراثت کے حق کو بیان کیا گیا، جبکہ حصوں کی تفصیلی تقسیم بعد کے رکوع میں بیان فرمائی گئی، جس میں اولاد، والدین، بیوی اور شوہر سب کے حصے مقرر کئے گئے۔اس طرح پہلے اصولی حق واضح کیا گیا، اور پھر اس کی تفصیل بیان کر دی گئی کہ ہر مستحق کو اس کا متعین حصہ ملے گا، خواہ مال کم ہو یا زیادہ۔

اس تاکید کے ساتھ گویا یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، اور ان کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہے۔اس طرح جاہلیت کی ایک نہایت گھناؤنی رسم کا خاتمہ کیا گیا اور یتیموں اور عورتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا۔

قانونِ وراثت کا امتیاز

اسلام کا قانونِ وراثت دنیا کے تمام نظاموں میں ایک مثالی اور منصفانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی بہت سی اقوام میں صرف مردوں، خصوصاً بڑے بیٹوں کو وارث سمجھا جاتا تھا، جبکہ عورتیں اور لڑکیاں اس حق سے محروم رہتی تھیں۔ بعض معاشروں میں تو چھوٹے یا کمزور بیٹوں کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے برعکس عدل و انصاف کا کامل نمونہ پیش کرتے ہوئے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کو بھی وراثت میں حق دار قرار دیا، اور نہ صرف بالغوں بلکہ نابالغوں کو بھی ان کا حصہ دیا۔ یوں اسلام نے معاشرتی توازن، انصاف اور انسانی وقار کو قائم کرتے ہوئے ہر فرد کو اس کا جائز حق عطا کیا، اور ایک ایسا نظام پیش کیا جو فطرت، عقل اور عدل کی تینوں کے عین مطابق ہے۔

قانونِ وراثت کی تمہید اور اسلامی اصلاح

یہ آیات دراصل اُس عظیم قانونِ وراثت کی تمہید ہیں جو آگے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ یتیموں کے بعد معاشرے کا دوسرا کمزور طبقہ عورتوں کا تھا، جنہیں طویل عرصے تک اُن کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا۔ زمانۂ جاہلیت میں نہ عورتوں کو وراثت میں کوئی حصہ دیا جاتا تھا اور نہ ہی بچوں کو حقیقی وارث سمجھا جاتا تھا، بلکہ صرف مردوں کو ہی ترکہ کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔

اُن کا یہ تصور تھا کہ چونکہ جنگ کرنے کی صلاحیت مردوں میں ہوتی ہے، اس لیے وہی میراث کے حقدار ہیں، جبکہ عورتیں اور بچے اس قابل نہیں، لہٰذا انہیں ترکہ میں حصہ نہیں ملنا چاہئے۔ اس ظالمانہ سوچ کے نتیجے میں بیوائیں، یتیم بچے اور بچیاں اپنے بنیادی حق سے مکمل طور پر محروم کر دئے جاتے تھے۔

اسلام نے اس جاہلانہ اور غیر منصفانہ قانون کو باطل قرار دیا اور یہ واضح اعلان فرمایا کہ جس طرح مرد وارث ہیں، اسی طرح عورتیں بھی وراثت میں برابر کی شریک ہیں۔ اسی طرح بچوں کو بھی باقاعدہ وارث تسلیم کیا گیا اور سب کے حصے مقرر کئے گئے۔

یہ انسانی تاریخ میں ایک عظیم سماجی اور قانونی انقلاب تھا، جس نے نہ صرف عرب معاشرے بلکہ دنیا کی دیگر اقوام کی سوچ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس سے پہلے بیشتر قوموں میں عورت کا مقام بھی کسی مال و جائیداد سے زیادہ نہ تھا، بلکہ بعض جاہل معاشروں میں تو عورت خود ایک وراثتی شے سمجھی جاتی تھی، جسے ترکہ میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس لیے انہیں خود ترکہ میں حصہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسلام نے اس غیر انسانی تصور کو ختم کر کے عورت کو باوقار مقام دیا، اسے اس کے حقوق عطا کئے اور ایک ایسا منصفانہ نظام قائم کیا جس میں ہر فرد کو اس کا حق مل سکے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بالغ ہو یا نابالغ۔

"Women do not inherit because they are themselves the property of their husbands". *(Encyclopaedia of Religion and EthicsVol. VIII, Page 306)*

ترجمہ: ''عورتیں وراثت کی حق دار نہیں ہوتیں، کیونکہ وہ خود اپنے شوہروں کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں''۔

وضاحت: یہ عبارت دراصل اس قدیم اور جاہلانہ تصور کی عکاسی کرتی ہے جو مختلف قدیم معاشروں میں رائج تھا، جہاں عورت کو ایک مستقل شخصیت اور حق دار انسان کے طور پر نہیں بلکہ ایک ملکیت (property) کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اسی ذہنیت کی بنا پر نہ صرف اسے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا بلکہ بعض جگہ وہ خود بھی ترکہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے آ کر اس غلط تصور کو جڑ سے ختم کیا، عورت کو مستقل قانونی و معاشرتی حیثیت عطا کی، اور اسے وراثت

میں با قاعدہ حق دار قرار دے کر اس کے انسانی وقار کو بحال کیا۔

"Women as inheritable property—many primitive peoples, especially in Africa, regard wives and daughters as an important part of the estate to be transmitted in accordance with the regular rules of inheritance with the rest of property. The explanation is to be sought partly in the economic value of women either as workers, or, in the case of daughters, as potential wealth in the shape of bride-price". *(Encyclopaedia of Religion and Ethics Vol. VIII, Page 290)*

ترجمہ: ''عورت بطورِ قابلِ وراثت جائیداد بہت سی ابتدائی (قدیم) قومیں، خصوصاً افریقہ میں، بیویوں اور بیٹیوں کو ترکہ کا ایک اہم حصہ سمجھتی ہیں، جنہیں دیگر اموال کے ساتھ با قاعدہ وراثتی اصولوں کے مطابق منتقل کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ عورت کی معاشی حیثیت ہے، کہ وہ محنت کرنے والی کے طور پر فائدہ مند ہوتی ہے، یا بیٹیوں کے معاملے میں مستقبل میں دلہن کے مہر (bride-price) کی صورت میں دولت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے''۔

وضاحت: یہ اقتباس اس تلخ حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ بعض قدیم معاشروں میں عورت کو ایک خود مختار انسان کے بجائے ''اثاثہ'' سمجھا جاتا تھا۔ وہ یا تو محنت و مزدوری کے اعتبار سے مفید سمجھی جاتی تھی یا بیٹی کی صورت میں نکاح کے وقت حاصل ہونے والے مالی فائدے (bride-price) کی وجہ سے ایک سرمایہ تصور کی جاتی تھی۔

اسی بنا پر بعض معاشروں میں عورت کو خود ترکہ کا حصہ سمجھ کر منتقل کیا جاتا تھا۔ اسلام نے آ کر اس غیر انسانی تصور کو ختم کیا، عورت کو ''مال'' نہیں بلکہ ''حق دار انسان'' قرار دیا، اور اسے وراثت میں با قاعدہ حصہ دے کر اس کے مقام و وقار کو بلند کیا۔

یہ آیت اس بنیادی قانون کو بھی واضح کرتی ہے کہ میت کی چھوڑی ہوئی جائداد ہر حال میں تقسیم کی جائے، خواہ وہ مقدار میں بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ وراثت کا یہ حکم ہر قسم کے مال پر لاگو ہوتا ہے، چاہے وہ زیادہ ہو یا کم، قلیل ہو یا کثیر، ہر صورت میں مستحقین تک اس کا حق پہنچانا ضروری ہے۔ اگر ترکہ میں کوئی ایسی چیز شامل ہو جو براہِ راست تقسیم کے قابل نہ ہو، جیسے کوئی مکان، زمین کا ٹکڑا یا کوئی ایسی شئے جسے حصوں میں بانٹنا ممکن نہ ہو تو اس کا درست طریقہ یہ ہے کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت حاصل کی جائے، اور پھر وہ رقم تمام وارثوں میں اُن کے مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کر دی جائے۔

اس حکم کے ذریعے یہ اصول قائم کیا گیا کہ کسی بھی صورت میں وراثت کو روکا نہ جائے، بلکہ ہر حق دار کو اس کا حق پہنچایا جائے، تاکہ عدل و انصاف برقرار رہے اور کسی کے حق میں کمی یا زیادتی نہ ہو۔

آیت نمبر(۸) وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸

ترجمہ: ''اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت کچھ رشتہ دار، یتیم یا مسکین آ جائیں، تو انہیں بھی کچھ دے دیا کرو اور ان سے نرمی سے بات کرو''۔

محروم رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

تفسیر اس آیت میں اُن دور کے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے بارے میں ایک نہایت لطیف اور اخلاقی ہدایت دی گئی ہے، جو میراث میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ارشاد یہ ہے کہ ایسے موقع پر وراثت حاصل کرنے والوں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اپنی خوش دلی سے اُس مال میں سے کچھ حصہ اُن محروم افراد کو بھی دے دیں۔ یہ دینا دراصل ایک صدقہ اور باعثِ ثواب عمل ہے۔

خصوصاً ایسے وقت میں، جب ورثاء کو بغیر کسی محنت اور کوشش کے محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے مال حاصل ہو رہا ہو، تو اُن کے دل میں خود بخود ایثار، ہمدردی اور خیرات کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ اگر وہ اس موقع پر کچھ نہ کچھ دے دیں، تو اس سے اُن دور کے رشتہ داروں کے دل کی حسرت اور تکلیف کم ہو جائے گی اور باہمی محبت و اخوت کو فروغ ملے گا۔ مزید یہ کہ ایسے محروم افراد کے ساتھ گفتگو میں بھی نرمی، دلاسہ اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جائے، اور کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے اُن کے دل کو رنج یا اذیت پہنچے۔

حکم کی نوعیت

یہ حکم واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، یعنی اس پر عمل کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے، اگرچہ لازم نہیں۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اگر ابتدائی طور پر اس میں وجوب کا پہلو تھا بھی، تو بعد میں جب وراثت کے حصے باقاعدہ متعین کر دیے گئے، تو اس کا وجوب منسوخ ہو گیا۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایسے موقع پر جو کچھ دیا جائے، وہ ورثاء کے اپنے حصے میں سے دیا جائے گا، نہ کہ اصل ترکہ میں سے۔ لہٰذا نابالغ یا غیر حاضر وارثوں کے حصے میں سے کچھ دینا جائز نہیں، کیونکہ نابالغ کی اجازت معتبر نہیں ہوتی، اور جو بالغ وارث موجود نہ ہوں، اُن کے حصے میں اُن کی اجازت کے بغیر تصرف درست نہیں۔

ایک اہم اخلاقی نتیجہ

اس ہدایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی یتیم پوتا شرعی طور پر وارث نہ بن رہا ہو اور دادا نے اس کے حق

میں کوئی وصیت بھی نہ کی ہو، تو وارثوں کو چاہئے کہ اس کے قریبی تعلق اور یتیمی کی بنا پر اُس کے ساتھ ہمدردی کریں اور دادا کے ترکہ میں سے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اسے دے دیں، تاکہ اس کا دل رکھا جا سکے اور اس کی ضرورت کا کچھ مداوا ہو۔ یوں اسلام نے جہاں قانونی تقسیم کے اصول مقرر کئے، وہیں اخلاقی سطح پر ایثار، ہمدردی اور حسنِ معاشرت کی تعلیم دے کر معاشرے کو ایک متوازن اور رحمت بھرا نظام عطا فرمایا۔

آیت نمبر (۹) وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹

ترجمہ: ''اور انہیں چاہئے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑتے تو انہیں ان کی فکر ہوتی۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو''۔

نرمی اور دلجوئی کا حکم

تفسیر ایسے لوگوں کے ساتھ نہ زبان سے کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی کسی عمل کے ذریعے انہیں اذیت دی جائے، بلکہ موقع ومحل کے مطابق اُن سے ایسی بات کہی جائے جس میں نرمی، تسلی اور دلجوئی ہو۔ اس ہدایت میں نہ صرف اخلاقی حسن شامل ہے بلکہ ایک تربیتی پہلو بھی ہے، کہ انسان دوسروں کے دل کو سنبھالے اور اُن کے جذبات کا خیال رکھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے جان و مال، دونوں کے معاملات میں اصلاح اور بھلائی کی کوشش کی جائے، تاکہ وہ معاشرتی طور پر محفوظ اور مطمئن رہیں۔

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: وہ کون سے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا (۲) جادو کرنا (۳) کسی کو ناحق قتل کرنا (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال ناحق کھانا (۶) جہاد کے موقع پر پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا (۷) پاک دامن اور بے خبر عورتوں پر تہمت لگانا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۶۶)**

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دوسروں کے حقوق کی پامالی خصوصاً یتیموں اور بے گناہ افراد کے ساتھ ظلم نہایت سنگین گناہ ہے، جس سے ہر حال میں بچنا ضروری ہے۔ اسلام انسان کو نہ صرف ظاہری اعمال میں پاکیزگی کی تعلیم دیتا ہے بلکہ اخلاق، گفتار اور باطنی رویّوں میں بھی اعلیٰ معیار اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

آیت نمبر (۱۰) اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

ترجمہ: ''جو لوگ ناحق یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں جھونک دیے جائیں گے''۔

یتیم کے مال میں خیانت پر سخت وعید

یتیم کے مال کو بغیر تحقیق اور احتیاط کے استعمال کرنے پر قرآن وحدیث میں نہایت سخت تاکید اور وعید بیان کی گئی ہے۔ یہاں یہ اصول اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے، اسی طرح اسے کسی دوسرے کو کھلا دینا even اگر بظاہر خیرات یا نیکی کے نام پر ہو تب بھی ناجائز اور حرام ہے۔

یہی حکم ہر بالغ انسان کے مال کے بارے میں بھی ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف درست نہیں، خواہ وہ یتیم ہو یا غیر یتیم۔ اس معاملے میں بہت سے لوگ غفلت اور لاپروائی کا شکار ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ نہایت سنگین گناہ ہے۔

احادیث میں اس کی ہولناکی کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب صحابۂ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شبِ معراج کے مشاہدات کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ نیچے لٹک رہے تھے، فرشتے انہیں گھسیٹ کر ان کے منہ کھول دیتے اور جہنم کے دہکتے ہوئے پتھر ان کے منہ میں ٹھونس دیتے، جو ان کے پیٹ میں جا کر پیچھے کے راستے سے نکل جاتے، اور وہ شدتِ تکلیف سے چیختے چلاتے تھے۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں، درحقیقت یہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے''۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر یتیم کا مال کھاتا ہے، قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے پیٹ کے اندر سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے، جو اس کے ناک، کان اور آنکھوں سے ظاہر ہوں گے۔

● ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک قوم قیامت کے دن اس حال میں اٹھائی جائے گی کہ ان کے چہرے آگ سے دہک رہے ہوں گے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟''

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا

وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ''یعنی: ''جولوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں، اوروہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے''۔ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر:۵۵۶۶)

یہ تمام نصوص اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یتیم کے مال میں ناحق تصرف نہایت سنگین جرم ہے، جس پر سخت ترین وعید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس عظیم ظلم سے محفوظ فرمائے۔

اس تنبیہ کے بعد اب آگے وراثت کے حقداروں اور ان کے حصوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، تاکہ ہر شخص کو اس کا حق واضح طور پر مل سکے اور کسی قسم کی ناانصافی باقی نہ رہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۱ سے ۱۶ تک

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ⑫ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۧ ⑭ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ⑯

ترجمہ:

(۱۱) اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر صرف لڑکیاں ہوں، دو یا اس سے زیادہ، تو انہیں مرنے والے کے ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو، تو آدھا۔ اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اگر مرنے والے کے اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اگر اس کے کئی بھائی بہن ہوں، تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی

ادائیگی کے بعد۔ یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ (۱۲) اگر تمہاری بیویاں تمہارے بعد مر جائیں اور ان کی اولاد نہ ہو، تو تمہیں ان کے ترکے سے آدھا حصہ ملے گا۔ اگر ان کی اولاد ہو، تو تمہیں چوتھائی حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور اگر تم مر جاؤ اور تمہاری بیویاں زندہ ہوں، تو انہیں تمہارے ترکے سے چوتھائی ملے گا اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر ہو تو آٹھواں حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی وراثت تقسیم کی جائے جس کے نہ والدین ہوں نہ اولاد (کلالہ)، اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو، تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر بہن بھائی زیادہ ہوں، تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بردبار ہے۔ (۱۳) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اسے وہ باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ (۱۴) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور ان کی مقررہ حدود سے آگے بڑھے، اسے اللہ آگ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ (۱۵) تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں، ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دیں، تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔ (۱۶) اور تم میں سے جو مرد یہ برائی کریں، انہیں سزا دو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو انہیں چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۱ سے ۱۶ تک

آیت نمبر (۱۱) يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪

ترجمہ: ''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر

ہے۔ اگر صرف لڑکیاں ہوں، دو یا اس سے زیادہ، تو انہیں مرنے والے کے ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو، تو آدھا۔ اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اگر مرنے والے کے اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اگر اس کے کئی بھائی بہن ہوں، تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے''۔

تفسیر پچھلی آیات میں میراث کا اجمالی بیان گزرا تھا کہ مرنے والے کے تمام قریبی رشتہ دار خواہ مرد ہوں یا عورت، بالغ ہوں یا نابالغ سب اپنے اپنے حق کے مطابق وارث قرار پاتے ہیں اور ترکے میں ہر ایک کا حصہ مقرر ہے۔ اب آئندہ آیات میں انہی رشتہ داروں اور ان کے حصوں کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔ چنانچہ بعض احکام اسی آیت کی تفسیر میں مذکور ہیں، جن میں خصوصاً باپ اور اولاد کے حصوں کی وضاحت کی گئی ہے، جبکہ میاں بیوی اور بھائی بہن کے حصص کی تفصیل اگلی آیات میں آئے گی۔

پھر سورۂ نساء کے اختتام پر ''کلالہ'' (یعنی وہ شخص جس کے نہ والدین ہوں اور نہ اولاد) کی میراث کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں۔ مزید بعض تفصیلات احادیثِ نبویہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ان تمام احکام و جزئیات کو فقہاء نے دلائلِ شریعت کی روشنی میں جمع کر کے ''علم الفرائض'' کی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔ تاہم میراث کے یہ دقیق اور باریک مسائل عام لوگوں کے لئے از خود سمجھنا آسان نہیں، اس لئے ضرورت کے وقت اہلِ علم سے رجوع کرنا ہی مناسب اور محتاط طریقہ ہے۔

اگر میت کے پس ماندگان میں والدین بھی ہوں اور اولاد بھی، تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) دیا جائے گا۔ اس مقام پر مرد و عورت کے حصے میں برابری نظر آتی ہے۔ باقی دو تہائی (۲/۳) حصہ اولاد کو ملے گا۔ اگر صرف ایک بیٹی ہو تو وہ نصف (۱/۲) کی حق دار ہوگی۔ اس صورت میں تقسیم یوں ہوگی کہ ماں کو ۱/۶ اور باپ کو ۱/۶ دیا جائے گا، اور باقی بچنے والا ۱/۶ حصہ بطورِ عصبہ باپ ہی کو مل جائے گا۔ گویا اس ترتیب سے بیٹی کو نصف، باپ کو دو حصے (۱/۶+۱/۶)، اور ماں کو ایک حصہ (۱/۶) ملے گا، اور اس طرح کل ترکہ مکمل طور پر تقسیم ہو جائے گا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے حصصِ میراث

اللہ تعالیٰ نے وراثت یعنی چھوڑے ہوئے مال کی تقسیم میں لڑکے کا حصہ لڑکی کے مقابلے میں دوگنا مقرر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ عورت کا درجہ مرد سے کم ہے؛ اگر ایسا ہوتا تو کسی حال میں بھی عورت کا حصہ مرد کے برابر نہ

رکھا جاتا۔ حالانکہ شریعت میں متعدد صورتیں ایسی ہیں جہاں عورت اور مرد کا حصہ برابر مثلاً اگر میت کے پس ماندگان میں اولاد موجود ہو تو باپ کو چھٹا حصہ (۱/۶) ملتا ہے اور ماں کو بھی اتنا ہی (۱/۶) دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ماں شریک بھائی بہن کے حصص میں بھی برابری رکھی گئی ہے۔

لڑکے کا حصہ دو گنا رکھنے کی حکمت

درحقیقت لڑکے کے حصے کو دوگنا رکھنے کی بنیاد معاشی ذمہ داریوں کا فرق ہے۔ اسلام نے کمانے اور گھر کا نظام چلانے کی ذمہ داری مرد کے سپرد کی ہے؛ وہ بیوی کے نان ونفقہ کا بھی ذمہ دار ہے اور بچوں کی کفالت بھی اسی کے ذمے ہے۔ اس کے برعکس عورت پر نہ اپنی روزی کمانا لازم کیا گیا ہے اور نہ ہی خاندان کا مالی بوجھ اس پر ڈالا گیا ہے۔ مزید یہ کہ ادائیگی بھی مرد ہی کے ذمہ رکھی گئی ہے۔ ان ذمہ داریوں کے پیشِ نظر عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مرد کا حصہ عورت کے مقابلے میں زیادہ رکھا جائے۔

لڑکے کے حصے کے دوگنا ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مرنے والے نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی ہو، تو دیگر وارثوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا؛ ان میں سے ایک حصہ بیٹی کو اور دو حصے بیٹے کو ملیں گے۔

اگر بیٹے اور بیٹیاں زیادہ ہوں تو اصول یہی ہوگا کہ ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے۔ اور اگر صرف بیٹے ہی ہوں تو وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حقیقی اولاد کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں ہوتے، بالکل اسی طرح جیسے باپ کی موجودگی میں دادا وارث نہیں بنتا۔

اگر صرف بیٹیاں ہوں

اگر مرنے والے نے صرف بیٹیاں چھوڑی ہوں اور وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں، تو ان سب کو مجموعی طور پر دو تہائی (۲/۳) حصہ دیا جائے گا، جو آپس میں برابر تقسیم ہوگا۔ یہی حکم دو بیٹیوں کا بھی ہے کہ انہیں بھی دو تہائی ہی ملے گا۔ اس کی حکمت کلام کے اسلوب سے واضح ہوتی ہے؛ کیونکہ پہلے یہ اصول بیان کیا گیا کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہونے کی صورت میں بیٹے کو دو تہائی (۲/۳) اور بیٹی کو ایک تہائی (۱/۳) ملے گا، اور یہی دو تہائی دو لڑکیوں کے برابر ہیں۔ اسی لئے دو سے زیادہ بیٹیوں کا حکم صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔

مزید یہ کہ سورۂ نساء کی آیت ۱۷۶ میں دو بہنوں کا حصہ بھی دو تہائی بیان کیا گیا ہے، جس سے اس حکم کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح احادیثِ نبویہ سے بھی اس مسئلے کی وضاحت ملتی ہے۔

چنانچہ امام ترمذی کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ربیعؓ کی اہلیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ ان کی دو بیٹیاں ہیں، ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہو گئے اور ان کے چچا نے سارا مال اپنے قبضے میں لے لیا ہے، اب ان بچیوں کے نکاح کا کیا ہوگا؟ اس پر میراث سے متعلق آیت نازل ہوئی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے چچا کو بلا کر فرمایا کہ دو تہائی مال ان بیٹیوں کو دو، آٹھواں حصہ (۱/۸) ان کی ماں کو دے دو، اور جو باقی بچے وہ تم لے لو۔

یہ دو تہائی حصہ تمام بیٹیوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا، جبکہ باقی ایک تہائی دوسرے وارثوں کو ملے گا۔ اور اگر صرف ایک بیٹی ہو اور اس کے ساتھ کوئی بیٹا نہ ہو تو اسے نصف (۱/۲) دیا جائے گا، اور باقی نصف دیگر وارثوں کا حق ہوگا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر صرف ایک بیٹا ہو تو وہ مکمل ترکہ کا وارث ہوگا، البتہ اگر والدین یا دیگر وارث موجود ہوں تو ان کے حصے ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے گا وہ بیٹے کو ملے گا۔

ماں باپ کے حصصِ میراث

اولاد ایک ہو یا زیادہ، اور خواہ لڑکی ہو یا لڑکا ہر حال میں میت کے ماں اور باپ میں سے ہر ایک چھٹے حصے (۱/۶) کا مستحق ہوتا ہے۔ بلاشبہ والدین کا حق اپنی اولاد کے مقابلے میں زیادہ عظیم اور مقدم ہے، لیکن میراث کی تقسیم میں اولاد کا حصہ زیادہ اور والدین کا حصہ نسبتاً کم رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ والدین عموماً اس عمر کو پہنچ چکے ہوتے ہیں جہاں انہیں مال کی شدید ضرورت نہیں رہتی، جبکہ اولاد اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے اور اسے معاشی وسائل کی زیادہ حاجت پیش آتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظامِ تقسیم کس قدر علم، حکمت اور فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

البتہ اگر میت کے وارثین میں ماں باپ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو، تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی (۱/۳) اور باقی تمام ترکہ باپ کو ملے گا۔ اور اگر مرنے والے کے بھائی بہن بھی موجود ہوں، تو ماں کا حصہ ایک تہائی کے بجائے کم ہو کر چھٹا حصہ (۱/۶) رہ جائے گا، جبکہ باقی جائداد باپ کو دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، اس لئے اسے زیادہ حصہ دیا جاتا ہے۔

وصیت کا حق اور اس کی حکمت

شریعتِ اسلامی نے انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی جائداد میں سے ایک تہائی (۱/۳) تک وصیت کر سکتا ہے، جیسا کہ احادیثِ نبویہ سے اس کی صراحت ہوتی ہے۔ تاہم کسی وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، اور اگر کی بھی جائے تو وہ اس وقت تک نافذ نہ ہوگی جب تک دیگر وارث اس کی اجازت نہ دے دیں۔

ایک تہائی کی یہ حد اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ ایسے قریبی افراد، جو شرعی طور پر وارث نہیں بنتے مگر مدد کے مستحق ہوتے ہیں، مثلاً یتیم پوتا، پوتی یا بیوہ بہو، ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کیا جا سکے۔ اسی طرح کسی نیک کام، صدقہ یا دیگر دینی وفلاحی امور کے لئے بھی وصیت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ترکہ کی تقسیم کا اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے میت کا قرض ادا کیا جائے گا، اس کے بعد وصیت کو پورا کیا جائے گا، اور پھر باقی ماندہ جائداد وارثوں میں تقسیم ہوگی۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے آیا ہے، مگر اس کی حکمت یہ ہے کہ لوگ وصیت کے معاملے میں کوتاہی نہ کریں؛ کیونکہ وصیت ایک ایسا حق ہے جو بغیر کسی معاوضے کے ادا کیا جاتا ہے اور عموماً لوگوں پر گراں گزرتا ہے، جبکہ قرض ایک ثابت شدہ اور لازم الادا حق ہے جس کی ادائیگی میں لوگ عموماً سنجیدہ ہوتے ہیں۔

درحقیقت جائداد اور اس کے وارثوں کے باب میں انسان اپنی محدود عقل اور فہم کے بل پر درست فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ نہ وہ خود سے وارثوں کا صحیح تعین کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے حصوں میں حقیقی انصاف قائم رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی انسان نے وحیِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر میراث کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی، تو وہ خواہشات کی پیروی میں غلط اور غیر منصفانہ فیصلوں تک جا پہنچا۔ دورِ جاہلیت میں عورتوں کو میراث سے بالکل محروم رکھا جاتا تھا، جبکہ جدید جاہلیت نے انہیں مردوں کے برابر لا کھڑا کیا، حالانکہ دونوں کی ذمہ داریاں یکساں نہیں ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقی عدل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کے مطابق ہو۔

دنیاوی قوانین اور شریعتِ اسلامی کا امتیاز

دنیا کے مختلف قانونی نظاموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ میراث کی تقسیم کے باب میں انسانی قوانین اکثر خواہشات، وقتی نظریات اور محدود فہم کا نتیجہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر Napoleon Bonaparte کے مرتب کردہ سِول کوڈ میں خونی رشتہ داروں کی موجودگی میں شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ اسی طرح ہندو قانون (ہندو کوڈ) اولاد کی موجودگی میں باپ کے حق کو تسلیم نہیں کرتا، البتہ ماں کے حصے کو اہمیت دیتا ہے۔ مزید یہ کہ Indian Succession Act 1925 کے مطابق اگر اولاد موجود ہو تو میت کے ماں باپ دونوں کو جائداد میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔

یہ مثالیں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ انسان جب اپنی عقل اور خواہشات کی بنیاد پر قوانین وضع کرتا ہے تو وہ اکثر عدل وتوازن سے دور ہو جاتا ہے، کیونکہ ان قوانین کی بنیاد کسی کامل اور ہمہ گیر علم پر نہیں ہوتی۔ اس

کے برعکس اسلام کا نظامِ میراث اللہ تعالیٰ کے کامل، وسیع اور غیر محدود علم پر مبنی ہے، اسی لیے اس میں اعلیٰ درجے کا اعتدال، انصاف اور حکمت پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے، یعنی ہر چیز کا کامل علم رکھنے والا اور حکیم بھی ہے، یعنی ہر فیصلہ حکمت اور دور اندیشی کے ساتھ کرنے والا۔ لہٰذا اس کی مقرر کردہ تقسیم میں کسی خطا یا ناانصافی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے برعکس انسانی سوچ، اصول اور اندازے بسا اوقات غلط، محدود اور انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ انسان کے حقیقی نفع ونقصان اور مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کی شریعت پر کامل اعتماد کیا جائے اور اسی کے قوانین کی پابندی اختیار کی جائے۔

چند اہم فقہی نکات

''عَصَبَۃٌ'' اُس قریبی مرد خونی رشتہ دار کو کہا جاتا ہے جسے فرض حصے ادا ہونے کے بعد باقی ماندہ مال دیا جاتا ہے۔ اگر مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو، اور یہاں پوتا اور پوتی بھی اولاد میں شامل ہیں تو ماں کو ایک تہائی (۱/۳) اور باقی دو تہائی (۲/۳) باپ کو بطورِ عصبہ ملے گا۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کسی وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، اور وصیت کی زیادہ سے زیادہ حد ایک تہائی مقرر کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا میں اپنے سارے مال کی وصیت کر دوں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ انہوں نے پوچھا: ''آدھا؟'' فرمایا: ''نہیں''۔ پھر عرض کیا: ''ایک تہائی؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک تہائی (کی اجازت ہے)، اور یہ بھی زیادہ ہے۔ تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۴۲)**

یہ تعلیمات اس بات کو اجاگر کرتی ہیں کہ اسلام نہ صرف عدل وتوازن پر مبنی نظام دیتا ہے بلکہ انسان کی معاشی اور سماجی بھلائی کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں وراثت اور اسلامی اصلاحات

زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں میراث کے جاری ہونے کے تین بنیادی اسباب تھے:

اوّل: نسب (خونی رشتہ) نسب کی بنیاد پر بھی وراثت صرف اُن مردوں کو دی جاتی تھی جو میت یا اس کے قبیلے کی طرف سے جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ بچے، عورتیں اور ضعیف افراد اس حق سے محروم سمجھے جاتے

تھے، کیونکہ انہیں جنگ کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

دوم: عہد وحلف (باہمی معاہدہ) اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دو افراد آپس میں یہ عہد کر لیتے کہ ''میرا خون تیرا خون ہے، میری جان تیری جان ہے، میں تیرا وارث اور تو میرا وارث''۔ اس معاہدے کے بعد وہ ایک دوسرے کے وارث بن جاتے، یہاں تک کہ اس صورت میں حقیقی رشتہ دار جیسے بھائی یا بیٹے بھی میراث سے محروم رہ جاتے تھے۔

سوم: متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) کسی شخص کو منہ بولا بیٹا بنا لینا بھی وراثت کا سبب سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ بعض دیگر اقوام میں بھی اس کا رواج رہا ہے۔ مرنے کے بعد یہی منہ بولا بیٹا اس کی جائداد کا حقدار قرار پاتا تھا۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے تو ابتدا میں ان رسوم کو فوری طور پر ختم نہیں کیا گیا، بلکہ حکمت کے ساتھ تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد کچھ عرصہ تک مہاجرت اور مؤاخات (اسلامی بھائی چارے) کی بنیاد پر بھی وراثت جاری رہی۔

چنانچہ جب کوئی مہاجر مدینہ آتا تو ایک دوسرا مہاجر اس کا وارث بن جاتا، خواہ وہ نسبی رشتہ دار نہ بھی ہو۔ اسی طرح مؤاخات کے تحت دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بنایا جاتا اور وہ ایک دوسرے کے وارث قرار پاتے تھے۔

لیکن بعد میں جب میراث کے متعلق قرآنی احکام نازل ہوئے تو یہ تمام سابقہ طریقے منسوخ کر دیے گئے اور وراثت کا مکمل، عادلانہ اور منظم نظام قائم کر دیا گیا۔

شانِ نزول سے متعلق روایات

صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ وہ بیمار تھے، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ بنو سلمہ کے محلے میں پیدل ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت وہ بے ہوش تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی منگوا کر وضو فرمایا اور اس کا کچھ پانی ان پر چھڑکا، جس سے انہیں ہوش آ گیا۔ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنے مال کی تقسیم کس طرح کروں؟'' اسی موقع پر میراث سے متعلق آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۷۷)

اسی طرح ایک اور روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ربیعؓ کی اہلیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! یہ سعد کی دو بیٹیاں ہیں، ان کے والد جنگِ احد میں آپ کے ساتھ شریک تھے اور وہیں شہید ہو گئے۔ ان کے چچا نے ان کا سارا مال لے لیا ہے اور ان بچیوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، حالانکہ ان کا نکاح بغیر مال کے ممکن نہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود فرمائیں گے''۔ چنانچہ میراث کی آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے چچا کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ دو تہائی مال ان دونوں بیٹیوں کو دے، آٹھواں حصہ ان کی والدہ کو دے، اور باقی مال خود رکھ لے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ اسلام میں سب سے پہلا ترکہ تھا جسے باقاعدہ اسلامی اصولوں کے مطابق تقسیم کیا گیا، اور اسی کے ذریعے ایک منصفانہ اور الٰہی نظامِ میراث کی بنیاد رکھی گئی۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۴۲)

اولاد کی میراث

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے اولاد کے حصوں کو نہایت وضاحت اور تاکید کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتے ہیں'' یعنی یہ ایک تاکیدی اور لازمی حکم ہے ''کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا''۔ اس کی وضاحت یوں سمجھنی چاہئے کہ اگر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوں تو کل مال کا آدھا حصہ بیٹے کو اور آدھا دونوں بیٹیوں کو ملے گا۔ اور اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو تو دو تہائی حصہ بیٹے کا اور ایک تہائی بیٹی کا ہوگا۔ گویا اصول یہ ہے کہ تقسیم میں ہر لڑکے کو دو حصے اور ہر لڑکی کو ایک حصہ دیا جائے گا، اور اسی نسبت سے ترکہ تقسیم ہوگا۔

صرف لڑکیاں ہوں تو حکم

آگے ایک دوسری صورت بیان کی گئی ہے کہ اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہوں اور ان کی تعداد دو یا اس سے زیادہ ہو، تو انہیں مجموعی طور پر ترکے کا دو تہائی (۲/۳) حصہ دیا جائے گا۔ اس صورت میں باقی ایک تہائی حصہ دیگر مستحق وارثوں کو ملے گا۔

اگر ایک ہی لڑکی ہو

اور اگر میت کے پس ماندگان میں صرف ایک ہی لڑکی ہو تو وہ کل ترکے کے نصف (۱/۲) کی حق دار ہوگی۔ باقی نصف دیگر قریبی رشتہ داروں میں تقسیم ہوگا، اور اگر کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو تو وہ بقیہ مال بھی اسی لڑکی کو دیا جائے گا، جیسا کہ علم الفرائض کی تفصیلات میں مذکور ہے۔ یہاں تک اولاد کے حصص کا بیان ہوا، اس کے بعد آیت میں دیگر وارثوں کے حصوں اور ان کے حقوق کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، تاکہ میراث کی تقسیم مکمل عدل اور حکمت کے ساتھ انجام پائے۔

ماں باپ کے حصص اور ترکہ کی ترتیب

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے میں سے چھٹا حصہ (۱/۶) دیا

جائے گا، بشرطیکہ میت کی کوئی اولاد موجود ہو، خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹیاں۔ اور اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں، تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی (۱/۳) اور باقی دو تہائی (۲/۳) باپ کو ملے گا۔ مزید یہ کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں، تو ایسی حالت میں ماں کا حصہ کم ہو کر چھٹا (۱/۶) رہ جائے گا، اور باقی تمام ترکہ باپ کو ملے گا۔

گویا اللہ تعالیٰ نے والدین کی میراث کے سلسلے میں تین واضح صورتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی صورت: اگر میت کے ماں باپ کے ساتھ اس کی اولاد (بیٹا یا بیٹی) بھی موجود ہو، تو ماں اور باپ دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) دیا جائے گا۔

دوسری صورت: اگر میت کی نہ کوئی اولاد ہو اور نہ ہی بھائی بہن، بلکہ صرف ماں باپ ہی وارث ہوں، تو ماں کو ایک تہائی (۱/۳) اور باقی دو تہائی (۲/۳) باپ کو ملے گا۔

تیسری صورت: اگر میت کی اولاد نہ ہو، لیکن ایک سے زیادہ بھائی بہن موجود ہوں، تو ماں کو چھٹا حصہ (۱/۶) دیا جائے گا اور باقی تمام مال باپ کو ملے گا، جبکہ بھائی بہن اس صورت میں کسی حصے کے حق دار نہیں ہوں گے۔

ترکہ کی تقسیم سے پہلے

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جو حصے اب تک بیان کئے گئے ہیں، وہ سب وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد وارثوں کو دئے جائیں گے۔ یعنی ترکہ کی تقسیم سے پہلے چند مراحل طے کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے میت کے کفن دفن کے اخراجات اس کے مال سے ادا کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے تمام قرضے چکائے جائیں گے۔ اگر قرضے اتنے زیادہ ہوں کہ پورا مال ہی ان میں صرف ہو جائے، یا اس سے بھی زیادہ ہوں، تو ایسی صورت میں نہ کسی کو میراث ملے گی اور نہ ہی کوئی وصیت نافذ ہوگی۔

البتہ اگر قرض ادا کرنے کے بعد کچھ مال باقی بچ جائے، یا سرے سے کوئی قرض نہ ہو، تو اگر میت نے کوئی جائز وصیت کی ہو تو اس کو پورا کیا جائے گا، لیکن صرف ایک تہائی مال کی حد تک۔ اگر کسی نے اپنی پوری جائداد کی وصیت بھی کر دی ہو، تب بھی صرف ایک تہائی ہی نافذ ہوگی۔ اس لئے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ مناسب ہے اور نہ ہی شرعاً پسندیدہ، خصوصاً اگر اس کا مقصد وارثوں کو محروم کرنا ہو تو یہ گناہ کا باعث بھی ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سب سے پہلے کفن دفن کے اخراجات نکالے جائیں گے، پھر قرض ادا کیا جائے گا، اس کے بعد وصیت پوری کی جائے گی، اور آخر میں جو کچھ باقی بچے گا اسے وارثوں میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

میراث کے تقسیم کی حکمتیں

ان آیات کے بعد ورثاء کے درمیان میراث کی تقسیم کی حکمت نہایت بلیغ انداز میں واضح کی گئی ہے کہ میراث کے حصے انسان کی اپنی رائے اور خواہش پر نہیں چھوڑے گئے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے ان کے اصول اور حدود مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ''تم یقینی طور پر نہیں جان سکتے کہ تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہیں دنیوی یا اخروی نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے''۔

کیونکہ بسا اوقات انسان یہ گمان کرتا ہے کہ بیٹا زیادہ نفع دینے والا ہوگا، اس لیے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیے، حالانکہ حقیقت میں کبھی باپ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنے علم وحکمت کے تحت خود مقرر فرمایا، اور یہ ایک قطعی اور یقینی حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے۔ لہٰذا میراث کی تقسیم میں وہی حکمتیں قابلِ اعتماد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم پر مبنی ہیں، نہ کہ انسان کی محدود اور غیر یقینی رائے پر۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر انسان کو اپنی رائے پر تقسیمِ میراث کا اختیار دے دیا جاتا، تو وہ اپنے گمان کے مطابق دینی یا دنیوی فائدے کو معیار بناتا، اور جس سے زیادہ نفع کی توقع ہوتی، اسے زیادہ حصہ دیتا۔ لیکن چونکہ انسان کے پاس اپنی رائے کی درستی کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں، اس لئے اس کے فیصلے غلطی سے خالی نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا علم کامل، یقینی اور ہر خطا سے پاک ہے، اس لئے اس کا مقرر کردہ نظام بھی حقیقت اور عدل کے عین مطابق ہے۔

اسی حکمت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے میراث اور تقسیمِ ترکہ کا معاملہ انسانوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑا، بلکہ خود اپنے ذمہ لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں مکمل عدل وانصاف قائم رہے اور مرنے والے کا ترکہ اس کے حقیقی حقداروں تک منصفانہ طور پر پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم کی یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، وہ ایک حتمی اور طے شدہ حکم ہیں، جن میں کسی کو اپنی رائے سے کمی بیشی کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ یہاں اولاد اور والدین کے حصوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جبکہ آگے آنے والی آیات میں میاں بیوی اور بھائی بہن کے حصوں کی مزید وضاحت فرمائی جائے گی۔

آیت نمبر (۱۲) لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا

تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: ''اگر تمہاری بیویاں تمہارے بعد مر جائیں اور ان کی اولاد نہ ہو، تو تمہیں ان کے ترکے سے آدھا حصہ ملے گا۔ اگر ان کی اولاد ہو، تو تمہیں چوتھائی حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور اگر تم مر جاؤ اور تمہاری بیویاں زندہ ہوں، تو انہیں تمہارے ترکے سے چوتھائی ملے گا اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر ہو تو آٹھواں حصہ ملے گا، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی وراثت تقسیم کی جائے جس کے نہ والدین ہوں نہ اولاد (کلالہ)، اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو، تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر بہن بھائی زیادہ ہوں، تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے، وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بردبار ہے''۔

کلالہ کی میراث کا حکم

تفسیر اس سے قبل اولاد، والدین اور میاں بیوی کے حصصِ میراث کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اب اس آیت کے اس حصے میں ایسے شخص کی میراث کا حکم بیان کیا جا رہا ہے جس کے وارثوں میں نہ باپ دادا ہوں اور نہ اولاد یا پوتے، بلکہ صرف ماں شریک بھائی یا بہن ہوں۔ ایسے شخص کو فقہ و شریعت کی اصطلاح میں ''کلالہ'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ مرد یا عورت جس کے نہ اصول (باپ دادا) ہوں اور نہ فروع (اولاد یا اولاد کی اولاد)۔

جس کے نہ اصول ہو نہ فروع

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی میت خواہ مرد ہو یا عورت ایسی ہو جس کے نہ اصول ہوں اور نہ فروع، اور اس کے وارثوں میں ایک ماں شریک بھائی یا ایک ماں شریک بہن ہو، تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) دیا جائے گا۔

اور اگر ایسے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب مل کر ایک تہائی (۱/۳) کے برابر کے شریک ہوں گے، جبکہ باقی میراث دیگر مستحق وارثوں کو ملے گی، اور اگر کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو تو پھر یہی حصہ انہی میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

وصیت کے بعد

یہ دونوں صورتیں اس شرط کے ساتھ ہیں کہ پہلے میت کی وصیت اگر اس نے کی ہو اور اس کے قرض ادا کئے جائیں، اس کے بعد ہی وراثت تقسیم ہوگی۔ البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ وصیت کے ذریعے کسی وارث کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ نقصان کی ظاہری صورت یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کر دی جائے، جو شرعاً نافذ نہیں ہوگی۔

اور باطنی صورت یہ ہے کہ اگر چہ وصیت ایک تہائی کے اندر ہو، مگر نیت یہ ہو کہ کسی وارث کا حصہ کم کر دیا جائے، تو اگر چہ وہ وصیت ظاہری طور پر نافذ ہو جائے گی، لیکن یہ عمل گناہ کا موجب ہوگا۔

یہ تمام احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں، اور وہ خوب جاننے والا ہے کہ کون ان احکام کو دل سے قبول کرتا ہے اور کون ان سے روگردانی کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا، کیونکہ وہ حلیم بھی ہے، یعنی مہلت دینے والا اور بردبار۔

یہاں ''کلالہ'' کی میراث کا حکم بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسے شخص کی میراث جس کے نہ باپ دادا ہوں اور نہ اولاد یا پوتے، بلکہ صرف ماں شریک بھائی بہن ہوں۔ اس آیت کی مزید وضاحت کے لئے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ بھائی بہن تین قسم کے ہوتے ہیں، جن کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

بھائی بہن کی اقسام اور ان کے حصص

شریعت میں بھائی بہن کی تین بنیادی قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) اوّل وہ جو ایک ہی ماں باپ سے ہوں، جنہیں ''حقیقی'' بھائی بہن کہا جاتا ہے۔

(۲) دوم وہ جو صرف باپ میں شریک ہوں، یعنی باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں، انہیں ''علّاتی'' یا باپ شریک بھائی بہن کہا جاتا ہے۔

(۳) سوم وہ جو صرف ماں میں شریک ہوں، یعنی ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں، انہیں ''اخیافی'' یا ماں شریک بھائی بہن کہا جاتا ہے۔

یہاں آیت میں تیسری قسم، یعنی ماں شریک (اخیافی) بھائی بہن کے حصے کا بیان کیا گیا ہے، جبکہ حقیقی اور باپ شریک بھائی بہن کے حصص کی تفصیل اسی سورت کے آخر میں بیان کی گئی ہے۔

تیسرے قسم کی تفصیل

چنانچہ یہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت اس حال میں وفات پا جائے کہ اس کے نہ باپ ہوں، نہ

دادا، نہ اولاد ہو اور نہ اولاد کی اولاد، اور اس نے صرف ایک ماں شریک بھائی یا ایک ماں شریک بہن چھوڑا ہو، تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ (۱/۶) دیا جائے گا۔ اور اگر ماں شریک بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں خواہ دو ہوں، تین ہوں یا اس سے زیادہ تو وہ سب مل کر ایک تہائی (۱/۳) میں برابر کے شریک ہوں گے۔

اس کے بعد جو مال بچے گا وہ دیگر مستحق وارثوں کو دیا جائے گا، اور اگر کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو تو وہ باقی حصہ بھی انہی میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اب تک جتنے بھی وارثوں کے حصے بیان کئے گئے ہیں، ان سب کی ادائیگی ایک ترتیب کے ساتھ ہوگی۔ سب سے پہلے میت کے کفن دفن کے اخراجات اس کے ترکے سے ادا کئے جائیں گے، اس کے بعد اس کے تمام قرضے چکائے جائیں گے، پھر اس کی جائز وصیت کو پورا کیا جائے گا، اور آخر میں باقی ماندہ مال کو وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

یہاں ''کلالہ'' کی میراث کے بیان کے اختتام پر یہ وضاحت بھی فرمائی گئی ہے کہ یہ تمام تقسیم وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہی نافذ ہوگی، بشرطیکہ وصیت کے ذریعے کسی وارث کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اگرچہ یہ قید یہاں خاص طور پر ذکر کی گئی ہے، لیکن اس سے پہلے جہاں جہاں وصیت اور قرض کا ذکر آیا ہے، وہاں بھی یہی اصول اپنایا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ وصیت یا قرض کے ذریعے اپنے وارثوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ قرض کی ادائیگی یا وصیت کے نام پر وارثوں کے حق میں کمی کرنا مختلف صورتوں میں ممکن ہے، اس لئے شریعت نے اس باب میں نہایت احتیاط اور عدل کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ہر حق دار کو اس کا پورا حق پہنچ سکے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

وارثوں کو نقصان پہنچانے کی ناجائز صورتیں

اگر کوئی شخص جھوٹا قرض اپنے ذمہ ظاہر کر لے تاکہ کسی دوست یا خاص فرد کو مال پہنچایا جا سکے، یا اپنے کسی ذاتی مال کو یہ کہہ کر بچانے کی کوشش کرے کہ یہ فلاں شخص کی امانت ہے تاکہ وہ میراث میں شامل نہ ہو۔

اسی طرح ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کر دینا، یا کسی پر اپنا واجب الادا قرض ہو اور اس کے باوجود یہ جھوٹ کہہ دینا کہ وہ وصول ہو چکا ہے تاکہ وارثوں کو اس سے محروم رکھا جا سکے، یا مرضِ موت میں ایک تہائی سے زیادہ مال کسی کو ہبہ (تحفہ) کر دینا، یہ سب ایسی صورتیں ہیں جن کے ذریعے وارثوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

شریعت نے ان تمام طریقوں کو سختی سے ممنوع قرار دیا ہے، اور یہ گناہِ کبیرہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو دنیا سے رخصت ہونے کے قریب ہو، اسے چاہئے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اس قسم کی حرکات

سے مکمل اجتناب کرے، کیونکہ میراث کے یہ احکام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم وصیت اور نہایت اہم فریضہ ہیں، جن پر عمل کرنا لازم اور ان کی خلاف ورزی سے بچنا ضروری ہے۔

آخر میں ''وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ'' فرما کر اس حقیقت کی طرف متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ جو شخص ان احکام کی پابندی کرے گا، وہ اپنے عمل کا اجر پائے گا، اور جو ان کی خلاف ورزی کرے گا، اس کی یہ بدکرداری بھی اللہ کے علم میں ہے اور وہ اس پر سزا کا مستحق ہوگا۔

البتہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور حلم کی بنا پر بعض اوقات فوری گرفت نہیں فرماتا، اس لئے نافرمانوں کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ بچ گئے ہیں۔

فائدہ: میراث کی تقسیم سے متعلق یہ مسائل واحکام، جو ''علم الفرائض'' کہلاتے ہیں، نہایت دقیق اور باریک ہیں۔ اس لئے جب بھی کوئی عملی صورت پیش آئے تو کسی معتبر عالمِ دین یا مفتی کے سامنے مکمل تفصیل رکھ کر صحیح رہنمائی حاصل کرنی چاہئے، تاکہ ہر حق دار کو اس کا حق درست طریقے سے پہنچ سکے۔

جائداد میں حصہ پانے والے افراد

نمبر	وارث	تفصیل	ایک شخص ہونے کی صورت میں	دو یا زیادہ شخص ہونے کی صورت میں	جائداد پانے کی شرتیں
۱	لڑکا	عصبہ Residuary	لڑکی کے دوگنا	ہر لڑکے کا حصہ لڑکی کے دوگنا	جب کہ میت کے لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں اور صرف وہی وارث ہوں
	لڑکا	عصبہ Residuary	کل	کل میں برابر کے شریک	جبکہ اکیلے ایک لڑکا یا کئی لڑکے وارث ہوں
	لڑکا	عصبہ Residuary	اصحاب فریضہ کو دینے کے بعد جو باقی بچے	اصحاب فریضہ کو دینے کے بعد جو باقی بچے اس میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کے ماں، باپ، شوہر یا بیوی موجود ہوں تو ان کو دینے کے بعد جو باقی بچے
۲	لڑکی	صاحب فریضہ (قرآن نے جن کا حق طے کیا ہو) قرآن کا مقرر کیا ہوا حصہ پانے والی	۱/۲	۲/۳ میں برابر کی شریک	جبکہ میت کا لڑکا نہ ہو
	لڑکی	عصبہ	لڑکے کا آدھا	ہر لڑکی کا حصہ لڑکے کا آدھا	جبکہ میت کا لڑکا موجود ہو

۳	والد والد والد	صاحبِ فریضہ صاحبِ فریضہ اور عصبہ عصبہ	۱/۶ ۱/۶ اور اصحاب فروض کو دینے کے بعد جو باقی بچے کل		جبکہ میت کا لڑکا موجود ہو جبکہ میت کی لڑکی موجود ہو اور لڑکا نہ ہو جبکہ میت کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ اُس کی ماں، شوہر یا بیوی موجود ہو
۴	والدہ والدہ والدہ	صاحبِ فریضہ (Quranic Sharer) صاحبِ فریضہ (Quranic Sharer) صاحبِ فریضہ (Quranic Sharer)	۱/۶ ۱/۳ ۱/۳		جبکہ میت کی اولاد یا اس کے بھائی بہن دو یا زیادہ تعداد میں موجود ہوں جبکہ میت کے کوئی اولاد نہ ہو اور نہ اُس کے بھائی بہن کم سے کم دو کی تعداد میں موجود ہوں جبکہ میت کا باپ، بیوی یا شوہر موجود ہو، اس صورت میں شوہر یا بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد بقیہ جائداد کا ۳/۱ والدہ کو دیا جائے گا
۵	شوہر شوہر	صاحبِ فریضہ صاحبِ فریضہ	۱/۲ ۱/۴		جبکہ میت کی کوئی اولاد نہ ہو جبکہ میت کی کوئی اولاد ہو
۶	بیوی بیوی	صاحبِ فریضہ صاحبِ فریضہ	۱/۴ ۱/۸	۴/۱ میں سب برابر کے شریک ۸/۱ میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کی کوئی اولاد یا باپ موجود نہ ہو جبکہ میت کی اولاد اور باپ موجود ہو
۷	ماں شریک بھائی یا بہن ماں شریک بھائی یا بہن	صاحبِ فریضہ محجوب (چھپا ہوا) (Excluded)	۱/۶ کچھ نہیں	۳/۱ میں سب بھائی بہن برابر شریک کچھ نہیں	جبکہ میت کے کوئی اولاد یا باپ موجود نہ ہو جبکہ میت کی اولاد یا باپ موجود ہو

۸	سگی بہن	صاحبِ فریضہ	۱/۲	۲/۳	جبکہ میت کا باپ اس کی اولاد اور اس کا سگا بھائی ان میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو
	سگی بہن	عصبہ	لڑکی کو دینے کے بعد بقیہ حصہ	لڑکی کو دینے کے بعد بقیہ حصے میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کی لڑکی موجود ہو، لیکن اس کا باپ، نر اولاد اور سگا بھائی ان میں سے کوئی موجود نہ ہو
۸	سگی بہن	عصبہ	بھائی کا آدھا	ہر بہن کو بھائی کا آدھا	جبکہ میت کا سگا بھائی موجود ہو لیکن اس کا باپ یا نر اولاد موجود نہ ہو
	سگی بہن	محجوب	کچھ نہیں	کچھ نہیں	جبکہ میت کا باپ یا نر اولاد موجود ہو
۹	سگا بھائی	عصبہ	کل	کل میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کا باپ، نر اولاد، بیوی یا شوہر اور ماں شریک بھائی بہن میں سے کوئی موجود نہ ہو
	سگا بھائی	عصبہ	اصحابِ فروض (میت کے اصل وارث) کو ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے	اصحابِ فروج (میت کے اصل وارث) کو ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے اُس میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کا باپ نر اولاد موجود نہ ہو لیکن لڑکی، ماں، ماں شریک بھائی بہن اور شوہر یا بیوی میں سے کوئی موجود ہو تو اس کو دینے کے بعد جو بقیہ بچے گا وہ سگے بھائی کو ملے گا
	سگا بھائی	محجوب	کچھ نہیں	کچھ نہیں	جبکہ میت کا باپ یا نر اولاد موجود ہو
۱۰	باپ شریک بہن	صاحبِ فریضہ	۱/۲	۲/۳	جبکہ میت کے سگے بھائی بہن، باپ شریک بھائی باپ اور اولاد میں سے کوئی موجود نہ ہو
	باپ شریک بہن	صاحبِ فریضہ	۱/۶	۱/۶	جبکہ میت کی صرف ایک سگی بہن موجود ہو اور باپ شریک بھائی، باپ اور اولاد میں سے کوئی موجود نہ ہو

۱۱	باپ شریک بہن	عصبہ	لڑکی کو دینے کے بعد بقیہ حصہ	لڑکی کو دینے کے بعد بقیہ حصے میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کی لڑکی موجود ہو لیکن سگے بھائی ،بہن، باپ شریک بھائی، ماں شریک بھائی بہن، شوہر یا بیوی باپ اور نر اولاد میں سے کوئی موجود نہ ہو
	باپ شریک بہن	عصبہ	بھائی کا آدھا	بھائی کا آدھا	جبکہ میت کا باپ شریک بھائی موجود ہو لیکن سگا بھائی، باپ، شوہر یا بیوی اور نر اولاد میں سے کوئی نہ ہو
	باپ شریک بہن	محجوب	کچھ نہیں	کچھ نہیں	جبکہ میت کی دو سگی بہنیں، سگا بھائی، باپ نر اولاد میں سے کوئی موجود ہو ایک سگی بہن بطور عصبہ کے ہوں
۱۲	باپ شریک بھائی	عصبہ	کل جائداد	کل جائداد میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کے ماں باپ، اولاد، شوہر یا بیوی، سگے بھائی بہن، علاتی (باپ شریک) بہن، ماں شریک بھائی بہن میں سے کوئی موجود نہ ہو
	باپ شریک بھائی	عصبہ	اصحاب فروض کو دینے کے بعد جو باقی بچے	اصحاب فریضہ کو دینے کے بعد جو باقی بچے اُس میں سب برابر کے شریک	جبکہ میت کی لڑکی، ماں، شوہر یا بیوی، سگی بہن، ماں شریک بھائی بہن میں سے کوئی موجود ہو اگر باپ شریک بہن موجود ہو تو اس کے دوگنا باپ شریک بھائی کو ملے گا
	باپ شریک بھائی	محجوب	کچھ نہیں	کچھ نہیں	جبکہ میت کا باپ، لڑکا، سگا بھائی یا سگی بہن موجود ہو

آیت نمبر (۱۳) تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اسے وہ باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے''۔

تفسیر میراث کے احکام بیان فرمانے کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ — اس میں نہایت بلیغ

تاکید اور گہری تنبیہ مضمر ہے کہ میراث سے متعلق بیان کردہ تمام اصول وقوانین دراصل اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ ''حد'' اس آخری سرحد اور واضح لکیر کو کہتے ہیں جس کے آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

لہٰذا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ الٰہی ضوابط، قوانین اور پابندیاں ہیں جنہیں توڑنے یا ان سے تجاوز کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔

میراث کے احکام کے ذکر کے بعد اس جملے کا لانا گویا اس حقیقت کو اجاگر کرنا ہے کہ یہ کوئی عام ہدایات نہیں بلکہ ربِّ کائنات کا قطعی اور ناقابلِ تغیر فرمان ہیں۔

● یہ اس مثال کی مانند ہے کہ کوئی بااختیار بادشاہ اپنے ملک میں کوئی حکم جاری کرے اور آخر میں تاکید کے ساتھ اعلان کرے: ''یہ شاہی فرمان ہے'' تاکہ کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہ کرے۔

● اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ اپنے اندر ایسی ہی ہیبت، قطعیت اور تاکید رکھتا ہے۔

پھر صرف یہی نہیں، بلکہ ان احکام کی پابندی کرنے والوں کے لئے عظیم بشارت بھی سنائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۝ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کرے گا اور ان مقرر کردہ قوانین کی پاسداری کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے۔

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر جنت میں داخلے کو کبھی ''ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' اور کبھی ''فَوْزٌ كَبِيْرٌ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''فوز'' کے مفہوم میں کامیابی، فتح، ہر قسم کی مصیبت سے نجات، اور اپنے اعلیٰ ترین مقصد کا حصول وہ بھی کامل امن وسلامتی کے ساتھ سب شامل ہیں۔

پس جنت میں اس شان کے ساتھ داخل ہونا کہ نہ کوئی عذاب ہو، نہ رسوائی، نہ ادنیٰ سی ذلت یہی دراصل حقیقی کامیابی، کامل فلاح، اور مرادِ زندگی کا حصول ہے۔

آیت نمبر (۱۴) وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور ان کی مقررہ حدود سے آگے بڑھے، اسے اللہ آگ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے''۔

تفسیر؛ اِن آیاتِ مبارکہ میں اُن لوگوں کا انجام نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

یعنی جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اُس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے، اس طرح کہ وہ ان احکام کی پابندی کو لازم نہ سمجھے، اُنہیں رد کر دے اور اُن کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرے تو گویا اُس نے اللہ تعالیٰ کی تقسیم کو ناپسند کیا اور اُس کے فیصلے کو حق نہ مانا۔

یہ درحقیقت کفر کی حالت ہے، اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ ایسا شخص جہنم کی آگ میں داخل کیا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا۔ مزید یہ کہ اُس کے لئے ایسا عذاب ہوگا جس میں محض تکلیف ہی نہیں بلکہ ذلت، رسوائی اور اہانت بھی شامل ہوگی۔

انسانوں کی قسمیں

ان آیات میں بنیادی طور پر انسانوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک وہ جو کامل اطاعت گزار ہیں، اور دوسرے وہ جو سراسر نافرمان اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اطاعت گزار لوگ بلا تاخیر جنت میں داخل کئے جائیں گے اور ہمیشہ اُس کی نعمتوں میں رہیں گے، جبکہ مکمل نافرمان جن کی روش کفر تک پہنچ چکی ہو، جہنم میں ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ اُس میں رہیں گے۔

تیسری قسم

البتہ اِن دو واضح طبقات کے علاوہ ایک تیسری قسم بھی ہے، جس کا یہاں صراحتاً ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ تو درست اور فرمانبرداری پر قائم ہوتا ہے، لیکن عملی زندگی میں کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔

دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افراد اپنے اعمال کے باعث سزا کے مستحق تو ہوں گے، مگر بالآخر نجات پا جائیں گے۔ خود اِن آیات میں بھی تدبر کرنے سے اشارہ ملتا ہے کہ جب اُن کی کیفیت درمیانی ہے تو اُن کی جزا بھی درمیانی ہوگی یعنی کچھ عرصہ عذاب کے بعد رحمتِ الٰہی سے بہرہ مند ہو کر ثواب اور نجات حاصل کریں گے۔

حضرت عمرؓ کی نصیحت

حضرت عمرؓ کا ارشاد تھا: ''اے لوگو! فرائض (میراث کے احکام) کو اُسی اہتمام، محنت اور سنجیدگی کے ساتھ سیکھو جس طرح تم قرآنِ مجید سیکھتے ہو''۔ اور کبھی آپؓ یہ بھی فرماتے کہ ''اے مسلمانو! فرائض کے علم کو حاصل کرو، کیونکہ یہ تمہارے دین کا نہایت اہم اور بنیادی حصہ ہے''۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نصیحت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ''جو شخص قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے، اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فرائض کا علم بھی سیکھے؛ یعنی جس طرح قرآن سیکھنا لازم ہے، اسی طرح میراث کی تقسیم کے اصولوں سے واقف ہونا بھی ناگزیر ہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ کی نصیحت

اسی طرح حضرت ابوموسیٰؓ فرمایا کرتے تھے: ''جو شخص قرآن سیکھے مگر فرائض کا علم حاصل نہ کرے، وہ ایسے ہے جیسے ایک سر ہو مگر اُس پر چہرہ نہ ہو''۔

افسوس کہ موجودہ دور میں جب خود قرآنِ کریم کے معانی، مطالب اور احکام ہی سے غفلت برتی جارہی ہے، تو علمِ فرائض کی طرف توجہ کس کو اور کہاں نصیب ہوگی۔

آیت نمبر (۱۵-۱۶) وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ: ''تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں، ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دیں، تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو مرد یہ برائی کریں، انہیں سزا دو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں، تو انہیں چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے''۔

زنا کا جرم

تفسیر عہدِ جاہلیت میں عرب معاشرہ یتیموں اور میراث کے معاملات کی طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی شدید بے اعتدالیوں کا شکار تھا۔ عورتوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے، انہیں اذیتیں دی جاتیں، اور نکاح کے معاملے میں بھی ایسی حرکات رائج تھیں جو شریعت کی رو سے صریحاً ناجائز اور حرام تھیں۔

چنانچہ سابقہ آیات میں یتیموں اور میراث کے احکام کی اصلاح کے بعد، ان آیات میں عورتوں سے متعلق ان

گھناؤنی رسموں کی اصلاح فرمائی گئی، اور جہاں شریعت کے خلاف کوئی سنگین جرم ثابت ہو، وہاں مناسب سزا کی اجازت بھی دی گئی۔ اسی مضمون کو دورکوع میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ان آیات میں جو ابتدائی حکم ذکر ہوا ہے، اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ شریعت کے ابتدائی دور کا حکم تھا۔ بعد میں جب سورۃ النور کی آیات (اٹھارہویں پارے میں) زنا کی سزا کے بارے میں نازل ہوئیں، تو یہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس سے پہلے، جب تک سورۃ النور کی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں، زنا کی سزا وہی تھی جو ان آیات میں بیان کی گئی۔

زانی کی سزا کا حکم

قرآن وحدیث کی روشنی میں شریعتِ اسلامیہ نے زنا کے جرم کے لیے واضح حدود مقرر کی ہیں۔ اگر مرد یا عورت غیر شادی شدہ ہو تو اُس کی سزا سو کوڑے ہے، اور اگر شادی شدہ ہو تو اُس کے لیے رجم (پتھروں سے مار کر ہلاک کرنا) کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیلات فقہ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہیں۔

چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدکار مرد وعورت کے لئے مستقل سزا مقرر کر دی گئی ہے، اسے اچھی طرح یاد رکھو: کنوارے مرد اور عورت کے لئے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، جبکہ شادی شدہ مرد وعورت کے لئے سو کوڑے اور رجم (سنگسار کر کے قتل کرنا) ہے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۶۹۰)**

(اس موضوع کی مزید وضاحت کے لیے سورۃ النور آیات ۱، ۶-۹، سورۃ النساء آیت ۲۵ اور سورۃ المائدہ آیت ۳۳ کا مطالعہ مفید ہے)۔

بہر حال، ابتدائی دور میں جب کسی مرد یا عورت سے زنا کا ارتکاب ہو جاتا، تو اس کی سزا انہی آیات کے مطابق دی جاتی تھی۔ خاص طور پر عورتوں کے بارے میں یہ حکم دیا گیا کہ اگر چار معتبر مردوں کی گواہی سے جرم ثابت ہو جائے، تو ایسی عورت کو گھر سے باہر نکلنے سے روک دیا جائے اور اُسے گھر ہی میں محبوس رکھا جائے، یہاں تک کہ یا تو اُس کی موت واقع ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی نیا حکم نازل فرما دے۔

● چنانچہ بعد میں جب نیا حکم نازل ہوا، تو اس سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لئے رجم کی سزا ہے، یعنی اسے پتھروں سے اس قدر مارا جائے کہ وہ ہلاک ہو جائے۔

چار گواہوں کی شرط

زنا کے ثبوت کے لئے چار مرد گواہوں کی شرط جس طرح اس آیت میں بیان ہوئی ہے، وہی حکم سورۃ النور میں

بھی برقرار رکھا گیا۔ چنانچہ آج بھی زنا کے ثبوت کے لیے چار عادل مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے، اور اس معاملے میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔

چونکہ زنا کا معاملہ نہایت سنگین ہے، جس سے نہ صرف فرد کی عزت مجروح ہوتی ہے بلکہ خاندان کی آبرو اور سماجی وقار بھی متاثر ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے اس کے ثبوت کے لئے غیر معمولی احتیاط برتی ہے۔

اسی احتیاط کے تحت دو اہم شرائط عائد کی گئیں: پہلی یہ کہ گواہ مرد ہوں، اور دوسری یہ کہ ان کی تعداد چار ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی شرط کا پورا ہونا آسان نہیں، اور یہی سختی اس لئے اختیار کی گئی ہے تا کہ کوئی شوہر یا دوسرا شخص بلاوجہ کسی عورت پر الزام نہ لگا سکے، اور نہ ہی کوئی بدخواہ دشمنی کی بنا پر تہمت لگانے کی جسارت کرے۔

چنانچہ اگر چار سے کم افراد گواہی دیں تو اُن کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار پاتے ہیں، اور ایک پاکدامن مسلمان پر الزام لگانے کے جرم میں اُن پر حدِ قذف جاری کی جاتی ہے، یعنی اسی کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں واضح حکم موجود ہے۔

چار گواہوں کے شرط کی حکمت

بعض مفسرین نے چار گواہوں کی شرط کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زنا کا معاملہ دو افراد، ایک مرد اور ایک عورت سے متعلق ہوتا ہے، گویا یہ ایک واقعہ دو پہلو رکھتا ہے، اور ہر پہلو دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے؛ لہٰذا مجموعی طور پر چار گواہ ضروری قرار دئے گئے: دو مرد کے لئے اور دو عورت کے لئے۔

ان آیات میں پہلے بدکار عورتوں کا ذکر آیا ہے، اور اس کے بعد بدکار مردوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ مفسرین کے بیان کے مطابق نزولِ قرآن کے اعتبار سے ان احکام کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدا میں زنا کرنے والوں کے لیے سزا کا حکم نازل ہوا، پھر خاص طور پر زنا کار عورتوں کے لیے گھروں میں قید کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس مرحلے پر سزا کی نوعیت کو کسی خاص طریقے سے متعین نہیں کیا گیا بلکہ اسے حاکم (عدالت) اور قاضی (جج) کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

● حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہاں ''تکلیف دینے'' سے مراد یہ ہے کہ ایسے افراد کو زبانی طور پر ملامت کی جائے، اُنہیں شرمندہ کیا جائے، اور بسا اوقات جسمانی طور پر بھی سزا دی جائے، جیسے جوتوں وغیرہ سے مارنا۔ غرض کہ ابتدائی دور میں زنا کی سزا یہی تھی کہ حاکم اور قاضی مناسب سمجھ کر تعزیری سزا دیں، اور عورتوں کو گھروں میں محبوس رکھا جائے۔

تاہم یہ حکم ابتدائی مرحلے کا تھا، جو بعد میں شرعی حدود کے نازل ہونے سے منسوخ ہو گیا۔ اب شریعتِ اسلامیہ میں زنا کی مقررہ حد یہ ہے کہ غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے، اور شادی شدہ کے لئے رجم یعنی سنگساری ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ اگر وہ دونوں (مرد و عورت) توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اُن کے خلاف مزید سختی نہ کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دئے جانے کے بعد اگر وہ سچے دل سے توبہ کریں تو پھر اُنہیں ملامت نہ کی جائے اور نہ ہی مزید اذیت دی جائے۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا ساقط ہو جاتی ہے، کیونکہ یہاں توبہ کا ذکر سزا کے بعد آیا ہے۔ چونکہ یہاں توبہ کا بیان آ گیا ہے، اس لئے آگے کی آیات میں توبہ کی قبولیت کی شرائط اور عدمِ قبولیت کی صورتیں بھی تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۷ سے ۲۳ تک

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ:

(۱۷) اللہ کے ذمہ صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے، حکمت والا ہے۔ (۱۸) اور توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت آ پہنچے، تو وہ کہے: اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۱۹) اے ایمان والو! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ، اور نہ ہی انہیں اس لیے روکے

رکھو کہ ان سے کچھ مہر واپس لے لو، ہاں اگر وہ کھلی بے حیائی کریں۔ اور ان کے ساتھ نیکی سے زندگی گزارو، اور اگر تمہیں وہ ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔ (۲۰) اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری سے نکاح کرنا چاہو، اور تم نے پہلی کو بہت سا مال دے رکھا ہو، تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اُسے بہتان اور کھلے گناہ کے ساتھ واپس لو گے؟ (۲۱) اور تم کیسے واپس لے سکتے ہو (وہ مہر)، حالانکہ تم ایک دوسرے سے میل ملاپ کر چکے ہو، اور انہوں نے تم سے پکا وعدہ لے لیا تھا؟ (۲۲) اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو کچھ پہلے ہو چکا (سو ہو چکا)، بے شک یہ بہت بے حیائی، ناپسندیدہ اور بری بات ہے۔ (۲۳) تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہارے بھائیوں کی بیٹیاں، تمہاری بہنوں کی بیٹیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور تمہاری رضاعی بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری گود میں پرورش پائیں، ان عورتوں سے (جن سے تم نے نکاح کیا اور تعلق قائم کیا)، لیکن اگر تم نے ان سے تعلق قائم نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور (حرام ہیں) تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں، اور یہ بھی کہ تم دو بہنوں کو (بیک وقت) نکاح میں رکھو، مگر جو کچھ پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے)، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۷ سے ۲۳ تک

آیت نمبر (۱۷) اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۷

ترجمہ: ”اللہ کے ذمہ صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے، حکمت والا ہے“۔

توبہ کی حقیقت

تفسیر لفظِ توبہ کے لغوی معنٰی ہیں: واپس آنا، پلٹنا، اور اُس مقام کی طرف رجوع کرنا جسے انسان چھوڑ چکا ہو۔ جب انسان کسی گناہ یا خطا کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے دور ہو جاتا ہے؛ لہٰذا اُس کے لئے لازم ہے کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹے۔

اس رجوع کی حقیقی صورت یہ ہے کہ بندہ اپنی لغزش کا اعتراف کرے، اپنے کیے پر ندامت محسوس کرے، اور دل کی گہرائی سے یہ پختہ عزم کرے کہ آئندہ اس گناہ کا اعادہ نہیں کرے گا۔ محض زبان سے ''توبہ توبہ'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ شریعت کی رو سے توبہ اُس وقت معتبر ہوتی ہے جب درج ذیل چار امور جمع ہو جائیں:

۱۔ گناہ کو پہچان کر فوراً ترک کر دینا۔

۲۔ اپنی خطا پر سچی ندامت اور شرمندگی محسوس کرنا۔

۳۔ آئندہ اس گناہ سے ہمیشہ کے لئے بچنے کا مضبوط ارادہ کرنا۔

۴۔ اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو اُن کی ادائیگی کرنا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہو اور اُس کی قضا ممکن ہو جیسے نماز یا روزہ تو اُس کی قضا ادا کرنا۔

جب یہ چاروں شرائط مکمل ہو جائیں تو توبہ اپنی حقیقی صورت میں معتبر اور مکمل سمجھی جاتی ہے۔

توبہ کی قبولیت

ان آیات کی تفسیر میں پہلی آیت میں توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے، جبکہ دوسری میں عدمِ قبولیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس آیت میں توبہ کی قبولیت کے لئے دو بنیادی شرطیں بیان کی گئی ہیں:

- اوّل یہ کہ گناہ نادانی، غفلت یا جہالت کی بنا پر سرزد ہوا ہو۔
- دوم یہ کہ اس کے بعد فوراً توبہ کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص لاعلمی یا کمزوری کی بنا پر گناہ کر بیٹھے اور متنبہ ہونے کے بعد بلا تاخیر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، تو اللہ کے قانون کے مطابق اُس کی توبہ یقیناً قبول ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص جان بوجھ کر نافرمانی کرے اور گناہ کا شعور ہونے کے باوجود توبہ میں تاخیر کرے، اسے ٹالتا رہے اور اسی حالت پر قائم رہے، تو عدل وانصاف کے تقاضے کے مطابق وہ معافی کا مستحق نہیں رہتا۔

البتہ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل وکرم سے جسے چاہے معاف فرما دے، یہ اُس کا احسان اور مہربانی ہے۔ مگر قطعی وعدہ اور ضمانت صرف اسی صورت میں ہے جہاں توبہ بروقت اور اخلاص کے ساتھ کی گئی ہو۔

پس جب بندہ توبہ کی قبولیت کی یہ بشارت سن لے تو اُس پر لازم ہے کہ جب بھی اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو، فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، آئندہ کے لیے اُس سے بچنے کا عہد کرے، اور اپنے رب سے معافی طلب کرے، تاکہ وہ مغفرت اور رحمتِ الٰہی کا مستحق بن جائے۔

آیت نمبر(۱۸) وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

ترجمہ: ''اور توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت آ پہنچے، تو وہ کہے: اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

توبہ کے عدمِ قبولیت کی صورت

آگے والی آیت میں اُن لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ افراد جو مسلسل گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، نہ اُن سے باز آتے ہیں، نہ اپنے اعمال پر ندامت محسوس کرتے ہیں، اور نہ کسی تنبیہ سے سبق حاصل کرتے ہیں یہاں تک کہ جب موت اُن کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور روح حلق تک پہنچ جاتی ہے، تب وہ کہتے ہیں:

''اب میں توبہ کرتا ہوں'' تو ایسے وقت کی نہ توبہ قبول ہوتی ہے اور نہ ایمان معتبر رہتا ہے۔ اس آیت میں موت کے قریب آنے کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی حالت

● پہلی حالت یہ ہے کہ انسان زندگی سے مایوس ہوجائے، علاج سے عاجز آ کر یہ یقین کرلے کہ اب موت قریب ہے، لیکن ابھی آخرت کے مناظر اُس پر ظاہر نہ ہوئے ہوں نہ فرشتے نظر آئے ہوں اور نہ عذاب کا مشاہدہ ہوا ہو۔ اس مرحلے میں اگر کافر ایمان لے آئے یا گناہگار توبہ کرلے تو وہ قبول ہوجاتی ہے۔

دوسری حالت

● دوسری حالت یہ ہے کہ عالمِ برزخ کے آثار ظاہر ہونے لگیں، روح جسم سے نکل کر حلق تک پہنچ جائے، اور آخرت کی کیفیت کا آغاز ہوجائے یعنی فرشتے دکھائی دینے لگیں اور عذاب کی جھلک سامنے آجائے۔ اس مرحلے میں نہ کفر سے ایمان لانا قبول ہوتا ہے اور نہ گناہوں سے توبہ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ جب تک سزا اور جزا پردۂ غیب میں ہیں، اُس وقت خوفِ الٰہی کے تحت گناہوں سے رجوع کرنا ایمان بالغیب کی علامت ہے؛ لیکن جب حقیقت کا مشاہدہ ہونے لگے تو

پھر یہ ایمان بالغیب نہیں رہتا، بلکہ عینی مشاہدہ بن جاتا ہے۔اسی لئے اس وقت نہ ایمان معتبر ہوتا ہے اور نہ توبہ۔

اسی حقیقت کی مثال فرعون کے واقعہ سے ملتی ہے، جس نے غرق ہوتے وقت کہا کہ ''میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لاتا ہوں''، تو جواب ملا کہ اب ایمان لاتا ہے، حالانکہ ایمان کا وقت گزر چکا تھا۔مزید یہ کہ توبہ کا اصل مقصد آئندہ زندگی کی اصلاح اور درستی ہے۔جب انسان موت کے دہانے پر پہنچ جائے اور اصلاح کا کوئی موقع باقی نہ رہے، تو ایسی توبہ اپنے حقیقی مقصد سے خالی رہ جاتی ہے۔

امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب احیاء العلوم میں گناہوں کے حوالے سے انسانوں کے تین درجات بیان فرمائے ہیں:

اوّل: وہ درجہ جس میں انسان گناہ کے قریب بھی نہ جائے یہ ملائکہ کی صفت یا انبیائے کرام علیہم السلام کی خصوصیت ہے۔

دوم: وہ درجہ جس میں انسان گناہوں میں مبتلا رہے اور اُن پر اصرار کرتا رہے، نہ ندامت ہو نہ رجوع کا خیال یہ شیاطین کا مقام ہے۔

سوم: درمیانی درجہ، جو بنی آدم کا ہے کہ اگر گناہ ہو جائے تو فوراً ندامت ہو اور آئندہ کے لئے ترکِ گناہ کا پختہ عزم پیدا ہو۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ گناہ کے بعد توبہ نہ کرنا اور اُس پر ڈٹے رہنا دراصل شیطانی روش ہے، اسی لئے توبہ کرنا ہر حال میں ضروری اور فرض ہے۔اسی حقیقت کو قرآنِ کریم میں سورۃ التحریم میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی طرف سچی توبہ کرو، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہاری برائیوں کو مٹا دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں''۔پس یہ آیات ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ توبہ کو ٹالنا نہیں چاہئے، بلکہ گناہ کے فوراً بعد اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا ہی نجات کا راستہ ہے۔

فائدہ: یہ کتنی عظیم رحمتِ الٰہی ہے کہ سچی اور خالص توبہ کے ذریعے نہ صرف بندے کے گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی صف میں شامل فرما کر جنت کی خوشخبری بھی عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، اور جو شخص سچے دل سے توبہ کر لے، وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اُس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ تھا۔

سچی توبہ

بعض روایات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے سچی توبہ کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جاتی ہے، تو نہ صرف اس سے مؤاخذہ اٹھالیا جاتا ہے بلکہ اُس کے اعمال نامہ سے وہ گناہ مٹا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُس کی رسوائی کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر حال میں سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہاں توبہ کا ذکر ایک مناسبت کے تحت درمیان میں آ گیا تھا، ورنہ اصل مضمون عورتوں سے متعلق جاری تھا۔ چنانچہ آگے بھی گفتگو انہی امور کی طرف لوٹتی ہے، جہاں دورِ جاہلیت میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر ہے اور شریعتِ اسلامیہ نے ان ظالمانہ رسوم کا خاتمہ فرما کر اُنہیں عزت، تحفظ اور حقوق عطا کئے ہیں۔

آیت نمبر (۱۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ، اور نہ ہی انہیں اس لیے روکے رکھو کہ ان سے کچھ مہر واپس لے لو، ہاں اگر وہ کھلی بے حیائی کریں۔ اور ان کے ساتھ نیکی سے زندگی گزارو، اور اگر تمہیں وہ ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے''۔

ظالمانہ رسمیں

تفسیر عہدِ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ اور قبیح رسمیں رائج تھیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب کوئی شخص وفات پا جاتا تو اُس کے وارث جس طرح اُس کے مال ومتاع کے مالک بن جاتے، اُسی طرح اُس کی بیوی کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیتے۔

اگر چاہتے تو بغیر مہر کے زبردستی اُس سے نکاح کر لیتے، اور اگر ایسا نہ کرتے تو اُسے کسی دوسرے کے نکاح میں دے کر اُس کا مہر خود وصول کر لیتے۔

بسا اوقات نہ خود نکاح کرتے اور نہ ہی اُسے کسی اور سے نکاح کرنے دیتے، صرف اس خوف سے کہ وہ اپنا مال ساتھ لے جائے گی؛ چنانچہ اُسے قید و بند کی حالت میں رکھ چھوڑتے۔ نتیجتاً یا تو وہ عورت اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنا

مال اُن کے حوالے کر دیتی، یا اسی حالت میں اُس کے گھر مر جاتی، اور پھر اُس کے ترکہ پر بھی قبضہ کر لیا جاتا۔ مزید یہ کہ، میت کے مال میں سے عورت کو کوئی حصہ دینا بھی گوارا نہ کیا جاتا۔

یہ ظلم صرف وارثوں تک محدود نہ تھا، بلکہ بعض اوقات خود شوہر بھی بلا وجہ اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرتا، اُسے تنگ کرتا تا کہ وہ خلع پر مجبور ہو جائے اور جو مہر وہ پہلے دے چکا ہے، اُسے کسی حیلے سے واپس لے لے۔ اس طرح جاہلیت کے دور میں عورتیں مختلف صورتوں میں ظلم وستم کا نشانہ بنی رہتی تھیں۔

اسلام نے ان تمام ظالمانہ اور ناپاک رسموں کا قلع قمع کیا اور ان کی صریح ممانعت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ''اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے جان و مال کے مالک بن بیٹھو''۔

عورت کے مال یا اُس پر اختیار جمانے کی تین صورتیں تھیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا:

(۱) اوّل یہ کہ جو حق اُسے شرعی میراث میں ملنا چاہئے، اُسے خود لے لیا جائے اور بیوہ کو محروم کر دیا جائے۔

(۲) دوم یہ کہ اُسے نکاح سے روک دیا جائے، یہاں تک کہ وہ وفات پا جائے اور اُس کا مال ہتھیا لیا جائے۔

(۳) سوم یہ کہ شوہر اُسے بلا وجہ مجبور کرے کہ کچھ مال دے کر ہی آزادی حاصل کرے۔

عورت کو میراث سمجھنا

اسی طرح عورت کی ذات کو بھی میت کے مال کی طرح میراث سمجھ لینا صریح ظلم تھا، جس کی مکمل ممانعت فرما دی گئی۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم عورتوں کو اس نیت سے نہ روکو کہ جو کچھ تم نے اُنہیں دیا ہے، اُس میں سے کچھ واپس لے لو۔ اس کی بھی چند صورتیں تھیں:

(۱) ایک یہ کہ وارث میت کی بیوی کو نکاح سے روک دے تا کہ وہ کچھ مال دے کر اپنی رہائی حاصل کرے۔

(۲) دوسری یہ کہ شوہر بیوی کو اس شرط پر چھوڑے کہ وہ کچھ مال واپس کرے۔

(۳) تیسری یہ کہ طلاق دینے کے بعد بھی اُسے اس وقت تک نکاح نہ کرنے دے جب تک وہ کچھ ادا نہ کرے۔ ان تمام صورتوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

البتہ ایک استثنا بیان فرمایا گیا: اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ یعنی اگر عورت کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو جائے۔

اس کے تحت بھی چند صورتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ عورت کی بدخلقی، نافرمانی یا کھلی بدتمیزی ہو، تو شوہر کو اجازت ہے کہ اُسے علیحدہ کر دے، اگرچہ مہر واپس نہ لے۔

(۲) دوسری یہ کہ اگر زنا کا ارتکاب ہو تو ابتدائی دورِ اسلام میں شوہر کو اجازت تھی کہ بطور سزا اُسے گھر میں محبوس رکھے، لیکن بعد میں جب زنا کی شرعی حد نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

(۳) تیسری یہ کہ اگر زنا ثابت ہو جائے تو شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ بطور جرمانہ اپنا دیا ہوا مال واپس لے لے اور عورت کو الگ کر دے، مگر یہ حکم بھی بعد میں منسوخ ہو گیا۔

اب شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ زنا کی وجہ سے مہر کا استحقاق ختم نہیں ہوتا، اور عورت کا حق بہرحال برقرار رہتا ہے۔

مردوں کے لیے خصوصی ہدایت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی اپنی بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے، خوش اخلاقی اور حسنِ سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرو، اور اُن کے نان ونفقہ (رہائش، خوراک اور ضروریات) کا پورا خیال رکھو۔

مزید فرمایا: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا یعنی اگر تمہیں اُن میں کوئی بات ناپسند ہو، تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسی میں تمہارے لئے بہت سی بھلائی اور فائدے رکھ دئے ہوں، خواہ وہ دنیاوی ہوں یا دینی۔

مردوں کو نصیحت

ان آیات میں یہ نہایت حکیمانہ تعلیم دی گئی ہے کہ عورتوں کے ساتھ گفتگو، معاملات اور برتاؤ میں نرمی، اخلاق اور حسنِ سلوک کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کے ساتھ جو سختی، تحقیر اور ظلم کا رویہ اختیار کیا جاتا تھا، اسلام نے اسے ختم کر کے عزت واحترام کا درس دیا۔

اگر کسی عورت کی کوئی عادت یا خصلت طبیعت کے خلاف ہو تو فوراً نفرت یا سختی کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے صبر وتحمل سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی ناپسندیدہ بات میں تمہارے لئے کوئی بڑی خیر رکھ دے، مثلاً وہی عورت تمہاری خدمت گزار، خیرخواہ اور مخلص ساتھی بن جائے، یا اُس کے ذریعے تمہیں نیک اور صالح اولاد عطا ہو، یا اگر کوئی اولاد پیدا ہو کر کم عمری میں وفات پا جائے تو وہ تمہارے لئے آخرت کا ذخیرہ بن جائے۔ اور اگر یہ سب نہ بھی ہو، تو کم از کم ناپسندیدہ امور پر صبر کرنے کی عظیم فضیلت ضرور حاصل ہوگی۔

عربوں کا حال

● حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہوجاتا تو اُس کی بیوی کو بھی اُس کے ترکہ کا حصہ سمجھا جاتا؛ اگر چاہتے تو اُس سے خود نکاح کر لیتے، اور اگر نہ چاہتے تو کسی دوسرے سے اُس کا نکاح کر دیتے، یا بغیر نکاح کے ہی اُسے روک کر رکھتے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۷۹)

ازدواجی زندگی میں اعتدال

● اسی طرح حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مومن اپنی مومنہ (بیوی) سے بغض نہ رکھے؛ اگر اُس کی کوئی عادت ناپسند ہو تو ضرور اُس میں کوئی دوسری صفت پسندیدہ بھی ہوگی''۔ یہ تعلیم ہمیں ازدواجی زندگی میں اعتدال، صبر، اور مثبت پہلوؤں کو دیکھنے کا سبق دیتی ہے، جو ایک پُرسکون اور بابرکت گھرانے کی بنیاد ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۴۶۷)

آیت نمبر (۲۰-۲۱) وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱

ترجمہ: ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری سے نکاح کرنا چاہو، اور تم نے پہلی کو بہت سا مال دے رکھا ہو، تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اُسے بہتان اور کھلے گناہ کے ساتھ واپس لوگے؟ اور تم کیسے واپس لے سکتے ہو (وہ مہر)، حالانکہ تم ایک دوسرے سے میل ملاپ کر چکے ہو، اور انہوں نے تم سے پکا وعدہ لے لیا تھا؟''۔

ظلم کی ممانعت

تفسیر ان آیات میں مزید اُن گھناؤنی اور ظالمانہ رسموں کی ممانعت بیان کی گئی ہے جو عہدِ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں، اور اُن پر ہونے والی زیادتیوں کا سدِّ باب کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ناخوش ہوتا اور کسی دوسری عورت سے نکاح کا ارادہ کرتا، تو وہ اپنی موجودہ بیوی پر بے بنیاد الزامات عائد کرتا، اُسے طرح طرح کی اذیتوں اور سختیوں میں مبتلا کرتا، تاکہ وہ مجبور ہو کر اپنا مہر واپس کر دے اور طلاق لے لے۔ یوں وہ شخص اُس مال کو دوسرے نکاح میں صرف کر لیتا۔

ان آیات میں اس ظلم کی صریح ممانعت فرما دی گئی اور یہ واضح حکم دیا گیا کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی نافرمانی یا بے حیائی کا ارتکاب نہ ہوا ہو، اور شوہر محض اپنی خواہش کی بنا پر اُسے چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو، تو ایسی صورت میں even اگر اُس نے اپنی بیوی کو مہر یا بطورِ تحفہ ڈھیروں مال و دولت ہی کیوں نہ دیا ہو، اُس کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ طلاق کے بدلے میں اُس مال کا کوئی حصہ واپس لے یا واجب مہر معاف کروانے کی کوشش کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا کوئی قصور نہیں، اور مہر کے واجب ہونے کا سبب بھی مکمل ہو چکا ہے یعنی نکاح بھی ہو گیا اور میاں بیوی کے درمیان خلوت و تعلق بھی قائم ہو چکا لہٰذا اب دیا ہوا مال واپس لینے یا مہر کو جبر کے ذریعے معاف کروانے کا شوہر کو کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی لئے یہاں عورت کو دئے گئے مال کی واپسی کو ظلم اور گناہ قرار دیتے ہوئے، قرآنِ کریم نے متعدد مضبوط دلائل کے ساتھ اس عمل سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

(۱) اوّل یہ کہ ایسا کرنا دراصل تہمت اور جھوٹے الزام کے زمرے میں آتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک سخت گناہ ہے۔

(۲) دوم یہ کہ جب میاں بیوی آپس میں خلوت میں مل چکے ہوں تو اس کے نتیجے میں عورت کا مہر مرد کے ذمہ لازم ہو چکا ہوتا ہے، لہٰذا اس کی واپسی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

(۳) سوم یہ کہ ان عورتوں نے تم سے ایک پختہ اور مضبوط عہد لے رکھا ہے، اور اس سے مراد نکاح کا وہ مقدس معاہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام پر لوگوں کے سامنے انجام پاتا ہے۔

اس طرح قرآنِ کریم کی ہر آیت اور اس کا ہر لفظ انسانیت کے لئے سراسر رحمت اور خیر کا پیام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا میں عورتوں کے ساتھ افراط و تفریط کا برتاؤ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کی برکت سے عورت کو اُس کا حقیقی مقام عطا ہوا، اور صدیوں سے رائج گمراہ کن اور گھناؤنی رسموں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ افسوس کہ آج ہم نہ ان قرآنی احکام کی قدر کرتے ہیں اور نہ ہی اُن کی صحیح معرفت رکھتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق کی حفاظت

حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا۔ اُن کے پاکیزہ احکام کو نظر انداز کر کے حقوقِ نسواں کی حفاظت ممکن نہیں، بلکہ بسا اوقات حقوق کے نام پر ہی اُن پر بدترین ظلم ڈھایا جاتا ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ یورپ کی ظاہری چمک دمک اور اُس

کے گمراہ کن راستوں کی پیروی ہی ہمیں امن وسکون فراہم کرسکتی ہے۔

مہر کی ترغیب

مزید یہ کہ ان آیات میں لفظ ''قنطار'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ بہت زیادہ، ڈھیروں اور کثیر مال کے ہیں۔ اس سے ائمۂ دین نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت کے مہر کی مقدار زیادہ بھی ہوسکتی ہے، اگرچہ یہ جواز محض صحت کے اعتبار سے ہے۔ البتہ احادیث میں کم اور ہلکے مہر کی ترغیب دی گئی ہے، جو اپنی جگہ زیادہ باعثِ برکت اور فضیلت ہے۔ یہاں صرف زیادہ مہر کے جائز ہونے کا پہلو بیان کیا گیا ہے۔

مہر کی مقدار

ان آیات کے ضمن میں ایک واقعہ بھی کتبِ حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کرو۔

اگر یہ کوئی بہتر اور پسندیدہ چیز ہوتی یا اللہ کے نزدیک تقویٰ کا باعث ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر ضرور عمل فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج اور بیٹیوں کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔

● آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ زیادہ مہر باندھنے سے انسان خود مشکلات میں گرفتار ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُس کی بیوی اُسے بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے اور دل میں اُس کے لئے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

● ایک اور روایت میں آتا ہے کہ آپؓ نے منبر پر کھڑے ہوکر اعلان فرمایا کہ آج کے بعد کوئی شخص چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کرے۔ مگر جب آپؓ منبر سے اترے تو ایک قریشی خاتون نے آکر عرض کیا: ''اے امیر المؤمنین! کیا آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر سے منع کردیا ہے؟'' آپؓ نے فرمایا: ''ہاں''۔ حوالہ

اُس خاتون نے عرض کیا: ''کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا وہ کلام نہیں سنا جس میں ارشاد ہے:

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا

یعنی اگر تم نے اپنی بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو، تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اے اللہ! مجھے معاف فرما، عمر سے تو ہر شخص زیادہ سمجھدار ہے''۔ پھر فوراً واپس منبر پر تشریف لے گئے اور اعلان فرمایا: ''اے لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ مہر سے روک دیا تھا، لیکن اب کہتا ہوں کہ ہر شخص اپنے مال میں سے جتنا چاہے مہر مقرر کرے، میں تمہیں نہیں روکتا''۔ حوالہ

● علماء کرام نے اس واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا زیادہ مہر کے جواز کو

تسلیم فرمالینا دراصل اس حکمت پر مبنی تھا کہ کہیں لوگ اسے ناجائز یا حرام نہ سمجھنے لگیں، حالانکہ شریعت میں اس کی اصل اجازت موجود ہے۔

تحفہ واپس لینا

اسی ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنا دیا ہوا صدقہ یا تحفہ واپس لیتا ہے، وہ اُس کتے کی مانند ہے جو اپنی ہی قے کو چاٹ لیتا ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۲۸۹)**

یہ حدیث اس بات کی شدت سے قباحت بیان کرتی ہے کہ جو چیز خوش دلی سے دے دی جائے، اُسے واپس لینا نہایت ناپسندیدہ اور اخلاقاً انتہائی گری ہوئی حرکت ہے۔

آیت نمبر (۲۲) وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ: ''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو کچھ پہلے ہو چکا (سو ہو چکا)، بے شک یہ بہت بے حیائی، ناپسندیدہ اور بری بات ہے''۔

عہدِ جاہلیت کی ایک قبیح رسم

تفسیر عہدِ جاہلیت کی اُن گھناؤنی رسموں کا ذکر اس رکوع کے آغاز ہی سے جاری ہے جو عورتوں کے بارے میں رائج تھیں۔ انہی میں سے ایک رسم نکاح کے باب میں بھی پائی جاتی تھی کہ لوگ بعض ایسی عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے جو شریعت کی رو سے حرام تھیں جیسے سوتیلی ماں سے نکاح کر لینا، یا ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن کو بھی جمع کر لینا۔ اس کے برعکس بعض حلال عورتوں کو حرام سمجھ لیا جاتا تھا، جیسے منہ بولے بیٹے کی بیوی۔

چنانچہ ان آیات میں ان تمام گمراہ کن اور باطل رسموں کی تردید کرتے ہوئے اُن عورتوں کی وضاحت کی گئی ہے جن سے نکاح شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں سے نکاح کی حرمت کو بیان فرمایا گیا۔

سوتیلی ماں سے نکاح

اس آیت کے نازل ہونے کے ساتھ ہی جاہلیت کی وہ قبیح رسم ختم کر دی گئی جس کے تحت لوگ اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ واضح کیا گیا کہ باپ کی بیوی سے نکاح کرنا گویا اپنی ہی ماں سے نکاح کرنے کے

مترادف ہے۔ یہ نہایت بے شرمی اور بے حیائی کی بات ہے کہ جس عورت کو انسان ماں کہتا رہا ہو، اُسے باپ کی وفات کے بعد بیوی بنالے۔ یہ عمل فطرتِ سلیم کے نزدیک بھی نہایت گھناؤنا، معیوب اور قابلِ نفرت ہے۔

قرآنِ کریم نے اس پر سخت نکیر کرتے ہوئے فرمایا: وَسَآءَ سَبِيْلًا یعنی یہ شرعاً بھی نہایت برا راستہ اور قبیح عادت ہے، کیونکہ اس میں نہ صرف باپ کی حرمت اور عزت پامال کی گئی بلکہ اُس کے نکاح کی حرمت کو بھی توڑا گیا۔ یوں اس فعل میں قباحت اور گھناؤنے پن کے تمام پہلو جمع ہو جاتے ہیں، اسی لیے اسے نہایت پست اور قابلِ نفرت عمل قرار دیا گیا، بلکہ ایسا شخص سخت سزا کا مستحق ہے۔

باپ کی بیوی سے نکاح

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ''میرے ماموں ایک نیزہ لے کر جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے، تاکہ میں اُس کا سر قلم کر دوں''۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۵۷)

فائدہ: اس آیتِ مبارکہ سے باپ کی بیوی سے نکاح کی حرمت قطعی طور پر ثابت ہو گئی، اور اسی کے تحت فقہی مسئلہ بھی یہ ہے کہ اگر (نعوذ باللہ) کسی باپ نے کسی عورت سے زنا کیا ہو، تو بیٹے کے لیے بھی اُس عورت سے نکاح جائز نہیں رہتا۔ اس کے بعد قرآنِ کریم میں اُن دیگر عورتوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جن سے نکاح حرام اور باطل ہے، اور اس کی متعدد اقسام بیان فرمائی گئی ہیں۔

آیت نمبر (۲۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہارے بھائیوں کی بیٹیاں، تمہاری بہنوں کی بیٹیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور تمہاری رضاعی بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری گود میں پرورش پائیں، ان عورتوں سے (جن سے تم نے نکاح کیا اور تعلق قائم کیا)، لیکن اگر تم

نے ان سے تعلق قائم نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور (حرام ہیں) تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں، اور یہ بھی کہ تم دو بہنوں کو (بیک وقت) نکاح میں رکھو، مگر جو کچھ پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے)، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"۔

تفسیر وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمْ۔ اس آیت کے ضمن میں مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ابن جریج نے عطاء سے نقل کیا کہ ہم آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس واقعے کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ زوجہ سے نکاح فرمایا۔

اس پر مشرکین نے اعتراضات اور چہ میگوئیاں کیں کہ تمہارے بیٹوں کی بیویاں، جو تمہاری نسل سے ہیں، تم پر حرام ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں: وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَ كُمْ اَبْنَاءَ كُمْ اور مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ، جن میں یہ واضح کر دیا گیا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کے حکم میں نہیں ہوتا۔

جن سے نکاح حرام ہے

اس آیت میں اُن عورتوں کا بیان ہے جن سے نکاح حرام ہے، اور ان محرمات کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم وہ ہے جو نسب (خونی رشتہ) کی بنیاد پر حرام ہیں، اور اس میں سات اقسام بیان کی گئی ہیں:

(۱) اُمَّهَاتُكُمْ (تمہاری مائیں): اس میں صرف حقیقی ماں ہی نہیں بلکہ دادیاں اور نانیاں بھی شامل ہیں۔ ان سب سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔

(۲) بَنَاتُكُمْ (تمہاری بیٹیاں): حقیقی بیٹی کے ساتھ ساتھ اُس کی اولاد، یعنی پوتی، پرپوتی، نواسی اور پرنواسی سب اس حکم میں داخل ہیں، اور ان سب سے نکاح حرام ہے۔

البتہ سوتیلی بیٹی (جو بیوی اپنے ساتھ لائے) کے بارے میں تفصیل آگے آئے گی۔ اسی طرح منہ بولا بیٹا یا اس کی اولاد نسبی حرمت میں داخل نہیں، لہٰذا اُن سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کسی اور سبب سے حرمت نہ آئی ہو۔ نیز اگر (نعوذ باللہ) کسی ناجائز تعلق سے کوئی لڑکی پیدا ہو، تو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے اور اُس سے نکاح جائز نہیں۔

(۳) اَخَوَاتُكُمْ (تمہاری بہنیں): اس میں تینوں قسمیں شامل ہیں: حقیقی بہن، باپ شریک بہن، اور ماں شریک بہن۔ ان سب سے نکاح حرام ہے۔

(۴) عَمَّاتُكُمْ (تمہاری پھوپھیاں): باپ کی بہن، خواہ حقیقی ہو یا سوتیلی (ماں شریک یا باپ شریک)، ہر صورت میں نکاح کے لئے حرام ہے۔

(۵) خَالَاتُكُمْ (تمہاری خالائیں): ماں کی بہن، خواہ حقیقی ہو یا سوتیلی، سب سے نکاح حرام ہے۔

(۶) بَنَاتُ الْاَخِ (بھتیجیاں): بھائی کی بیٹیاں، چاہے حقیقی ہوں یا سوتیلی (ماں شریک یا باپ شریک بھائی کی اولاد)، سب حرام ہیں۔

(۷) بَنَاتُ الْاُخْتِ (بھانجیاں): بہن کی بیٹیاں، خواہ کسی بھی قسم کی بہن کی ہوں، سب سے نکاح حرام ہے۔

یہ ساتوں اقسام وہ ہیں جو نسبی تعلق کی بنا پر ہمیشہ کے لئے حرام ہیں۔ ان کی حرمت دائمی ہے، یعنی کسی بھی حالت میں ان سے نکاح جائز نہیں ہوسکتا۔

دوسری قسم: محرماتِ رضاعیہ (دودھ کے رشتے سے حرام ہونے والی عورتیں)

اس قسم میں اللہ تعالیٰ نے آیتِ مبارکہ میں صراحت کے ساتھ رضاعی ماں اور رضاعی بہن کا ذکر فرمایا ہے، یعنی وہ عورتیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور وہ لڑکیاں جو اسی دودھ کے تعلق سے تمہاری بہن بن گئیں، یہ سب تم پر حرام ہیں۔

اگرچہ آیت میں صرف انہی دو رشتوں کا ذکر آیا ہے، لیکن درحقیقت وہ تمام سات رشتے جو نسب کے ذریعے حرام ہیں، وہی رضاعت کے ذریعے بھی حرام ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ رضاعی ماں، رضاعی بہن، رضاعی بیٹی، رضاعی پھوپھی، رضاعی خالہ، رضاعی بھتیجی اور رضاعی بھانجی، سب کے ساتھ نکاح ممنوع ہے۔ اس حقیقت کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور پر بیان فرمادیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب کوئی بچہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی دودھ پلانے کے زمانے میں کسی عورت کا دودھ پی لیتا ہے، تو وہ عورت اُس کی رضاعی ماں بن جاتی ہے، اور اُس کا شوہر رضاعی باپ قرار پاتا ہے۔

اسی طرح اُس عورت کی نسبی اولاد اُس بچے کے رضاعی بہن بھائی بن جاتے ہیں، اُس کی بہنیں اُس بچے کی رضاعی خالائیں، اُس کے شوہر کے بھائی رضاعی چچا، اور اُس کے شوہر کی بہنیں رضاعی پھوپھیاں بن جاتی ہیں۔

اس طرح رضاعت کے ذریعے وہی تمام رشتے قائم ہوجاتے ہیں جو نسب کے ذریعے ہوتے ہیں، اور جن رشتوں میں نسب کی بنیاد پر نکاح حرام ہے، وہی رضاعت کی بنیاد پر بھی حرام ہوجاتے ہیں۔

حرمت رضاعت کا دور

یہاں ایک نہایت اہم بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ حرمتِ رضاعت صرف اسی وقت ثابت ہوتی ہے جب دودھ پینا اُس عمر میں ہو جو رضاعت کا زمانہ کہلاتا ہے، یعنی بچپن کا وہ دور جس میں بچے کو دودھ پلایا جاتا ہے۔

اس میں دودھ کی مقدار یا مرتبہ شرط نہیں، چاہے تھوڑا سا دودھ پیا ہو یا زیادہ، ایک بار پیا ہو یا کئی بار، ہر

صورت میں حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔

یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر رضاعت کے ایام میں دودھ کا ایک گھونٹ بھی بچے کے معدے میں چلا جائے تو بھی نکاح حرام ہوجاتا ہے، اور اکثر علماء کا بھی یہی موقف ہے۔

رضاعت کی مدت کے بارے میں بھی فقہاء کرامؒ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مدت پیدائش سے لے کر ڈھائی (۲/۲۱) سال تک ہے، جبکہ دیگر ائمہ اور فقہاء کے نزدیک یہ مدت دو سال ہے۔ اس مدت کے بعد دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ حوالہ

شہادت

اگرچہ رضاعت کے ثبوت کے لیے دیندار گواہوں کی شہادت ضروری ہے، لیکن چونکہ یہ معاملہ حلال وحرام سے متعلق ہے، اس لئے اس میں احتیاط اختیار کرنا نہایت اہم ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی نکاح کے بارے میں ایک دیندار شخص بھی یہ گواہی دے کہ دونوں میاں بیوی رضاعی بہن بھائی ہیں، تو نکاح سے اجتناب کیا جائے۔

اور اگر نکاح کے بعد یہ بات معلوم ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ یہاں تک کہ اگر ایک دیندار عورت بھی ایسی شہادت دے، تب بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جدائی اختیار کی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اصول کو یوں بیان فرمایا: ''جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں، وہی رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوجاتے ہیں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۴۵)**

اس طرح اسلام نے رضاعت کے رشتوں کو بھی نسب کی طرح محترم اور قابلِ لحاظ قرار دے کر معاشرتی پاکیزگی اور خاندانی نظام کی حفاظت کا کامل انتظام فرمایا ہے۔

تیسری قسم: محرماتِ مصاہرت (سسرالی رشتے)

یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح کی وجہ سے سسرالی بعض رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اہم صورتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) اُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ (بیویوں کی مائیں):

بیوی کی ماں، یعنی ساس، شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ اس میں بیوی کی نانی، دادی، چاہے نسبی ہوں یا رضاعی، سب شامل ہیں۔ مزید یہ کہ جس عورت کے ساتھ (نعوذ باللہ) زنا کیا ہو یا جسے شہوت کے ساتھ چھوا ہو، اُس کی ماں بھی اسی حکم میں داخل ہو کر حرام ہوجاتی ہے۔

(۲) رَبَآئِبُكُمُ (بیویوں کی بیٹیاں):

یعنی وہ لڑکیاں جو تمہاری بیوی کی سابقہ شادی سے ہوں اور تمہاری پرورش میں ہوں۔ لیکن اس میں ایک اہم شرط ہے کہ وہ لڑکیاں اُس بیوی کی ہوں جس کے ساتھ نکاح کے بعد تمہاری باقاعدہ خلوت وہمبستری ہو چکی ہو۔ محض نکاح کرنے سے اُس کی بیٹی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب ازدواجی تعلق قائم ہو جائے تب حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اگر صرف نکاح ہوا ہو، رخصتی اور ہمبستری نہ ہوئی ہو، تو ایسی عورت کی بیٹی سے نکاح جائز ہے۔

(۳) حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ (بیٹوں کی بیویاں):

بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے، اور اس حکم میں پوتے اور نواسے کی بیویاں بھی شامل ہیں، لہٰذا اُن سے نکاح بھی ناجائز ہے۔ البتہ یہاں یہ قید ہے کہ یہ حرمت اُن بیٹوں کی بیویوں کے لئے ہے جو تمہاری اپنی نسل (صلبی بیٹے) سے ہوں۔ اس لیے منہ بولا یا گود لیا ہوا بیٹا اس حکم میں داخل نہیں، اور اُس کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔

(۴) وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (دو بہنوں کو جمع کرنا):

دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام ہے، خواہ وہ حقیقی بہنیں ہوں، یا باپ شریک، یا ماں شریک، یا رضاعی بہنیں ہر صورت میں یہ حکم یکساں ہے۔

البتہ اگر ایک بہن کا انتقال ہو جائے، یا اُسے طلاق دے دی جائے اور اُس کی عدت مکمل ہو جائے، تو اس کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے۔ عدت کے دوران نکاح کرنا جائز نہیں۔

آخر میں فرمایا: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ

یعنی جاہلیت کے زمانے میں جو کچھ ہو چکا، اُس پر اب کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اسلام لانے کے بعد اور ان احکام کے نازل ہونے سے پہلے جو اعمال سرزد ہو چکے، وہ معاف ہیں؛ البتہ آئندہ کے لئے لازم ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی گزاری جائے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۲۴ سے ۳۳ تک

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۗ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

ترجمہ:

(۲۴) اور (حرام ہیں) وہ عورتیں جو نکاح میں ہیں، سوائے ان کے جو تمہاری ملکیت میں آ جائیں (لونڈیاں)، یہ اللہ کا تم پر حکم ہے، اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لیے باقی عورتیں، بشرطیکہ تم ان کے ساتھ نکاح کا ارادہ رکھتے ہو مال کے بدلے میں، نہ کہ زنا کی نیت سے۔ پس جس سے تم فائدہ اٹھاؤ (نکاح کرو)، انہیں ان کا مقررہ مہر دو، اور اگر مہر مقرر

کرنے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے کوئی اور بات طے کرلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔(۲۵) اور جو شخص تم میں نکاح کی طاقت نہیں رکھتا آزاد مؤمن عورتوں سے، تو وہ نکاح کرے ان مؤمن لونڈیوں سے جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک جیسے ہو، لہٰذا ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے، اور انہیں ان کے مہر دو دستور کے مطابق، بشرطیکہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، اور وہ نہ ہوں بدکاری کرنے والیاں اور نہ چپکے چپکے دوست بنانے والیاں۔ پھر جب وہ نکاح میں آجائیں، پھر اگر وہ بدکاری کریں، تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی آدھی ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرتا ہو، اور اگر صبر کرو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔(۲۶) اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (اپنے احکام کو) واضح کرے، اور ان لوگوں کے طریقے کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے، اور تمہاری توبہ قبول کرے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔(۲۷) اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے، اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے بہت دور ہو جاؤ۔(۲۸) اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کردے، کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔(۲۹) اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناحق طریقے سے، مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو باہمی رضامندی سے، اور نہ خودکشی کرو۔ بے شک اللہ تم پر بڑا مہربان ہے۔(۳۰) اور جو کوئی ظلم اور زیادتی سے ایسا کرے گا، تو ہم اسے ضرور آگ میں ڈالیں گے، اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔(۳۱) اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمہیں روکا گیا ہے، تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے، اور تمہیں عزت والی جگہ میں داخل کریں گے۔(۳۲) اور تم تمنا نہ کرو اس کی جو اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ہے، اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ہے۔ اور اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔(۳۳) اور ہم نے ہر ایک کے لیے وارث مقرر کیے ہیں، ان کے لیے جو چھوڑ گئے ہوں والدین اور قریبی رشتہ دار۔ اور جن سے تم نے معاہدہ کیا ہو، انہیں بھی ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۲۴ سے ۳۳ تک

آیت نمبر (۲۴) وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

ترجمہ: ''اور (حرام ہیں) وہ عورتیں جو نکاح میں ہیں، سوائے ان کے جو تمہاری ملکیت میں آ جائیں (لونڈیاں)، یہ اللہ کا تم پر حکم ہے، اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لیے باقی عورتیں، بشرطیکہ تم ان کے ساتھ نکاح کا ارادہ رکھتے ہو مال کے بدلے میں، نہ کہ زنا کی نیت سے۔ پس جس سے تم فائدہ اٹھاؤ (نکاح کرو)، انہیں ان کا مقررہ مہر دو، اور اگر مہر مقرر کرنے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے کوئی اور بات طے کر لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے''۔

حرمت کی چوتھی قسم

تفسیر اس آیت میں ایک اور قسم کی اُن عورتوں کا بیان فرمایا گیا ہے جن سے نکاح حرام ہے، اور وہ ہیں ''محصنات''، یعنی وہ عورتیں جو پہلے سے کسی کے نکاح میں ہوں اور اُن کے شوہر زندہ موجود ہوں۔ ایسی عورتوں سے نکاح اس وقت تک حرام ہے جب تک اُن کے شوہر وفات نہ پا جائیں یا طلاق نہ دے دیں، اور وفات یا طلاق کے بعد عدت بھی مکمل نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کسی دوسرے شخص کے لئے اُن سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

البتہ اس حکم سے وہ عورتیں مستثنیٰ ہیں جو شریعت کے مطابق جنگ میں قید ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آئیں اور باندی بن جائیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمان دارالحرب کے کافروں سے جہاد کریں اور وہاں سے کچھ عورتیں قید ہو کر آئیں، جبکہ اُن کے شوہر دارالحرب میں باقی ہوں۔

ایسی صورت میں جب وہ عورتیں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم ہو کر مسلمانوں کی ملکیت میں آ جائیں، تو اُن کا سابقہ نکاح ختم ہو جاتا ہے اور وہ اُن مسلمانوں کے لئے حلال ہو جاتی ہیں جن کے حصے میں آئیں، خواہ اُن کے شوہر زندہ ہی کیوں نہ ہوں اور اُنہوں نے طلاق بھی نہ دی ہو۔ اس لئے کہ دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل ہو کر باندی بن جانے سے اُن کا سابقہ ازدواجی تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

حلال ہونے کی شرط

تاہم ایسی کافرہ عورت کے حلال ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ ایک حیض گزر جائے، اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل ہو جائے۔ اس سے پہلے اُن سے قربت جائز نہیں۔ اس طرح محرمات (حرام عورتوں) کی تفصیل بیان کرنے کے بعد، اُن کے علاوہ نکاح کے جواز اور اس کی شرائط کا ذکر فرمایا گیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ۔

فائدہ: اس کے ضمن میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ اوطاس کے قیدیوں میں کچھ

باندیاں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، جن کے شوہر موجود تھے۔ ہمیں یہ بات ناگوار محسوس ہوئی کہ اُن کے شوہروں کے ہوتے ہوئے ہم اُن سے تعلق قائم کریں۔

چنانچہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں یہ وضاحت فرمادی گئی کہ مالِ غنیمت میں ملنے والی باندیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، خواہ اُن کے شوہر دارالحرب میں موجود ہوں۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ آیت غزوۂ حنین کے موقع پر نازل ہوئی، جب مسلمانوں کو اہلِ کتاب کی کچھ ایسی عورتیں بطورِ غنیمت ملیں جن کے شوہر موجود تھے۔ جب مسلمان اُن کے پاس جاتے تو وہ کہتیں کہ ہمارے شوہر موجود ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا، تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس مسئلے کی وضاحت فرما دی گئی۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۵۶)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔

اس کے بارے میں ابن جریر نے روایت نقل کی ہے کہ بعض لوگوں نے مہر کی مقدار زیادہ مقرر کر لی، مگر بعد میں اُنہیں ادائیگی میں دشواری پیش آئی۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ اگر مہر مقرر ہونے کے بعد باہمی رضامندی سے اُس میں کمی یا زیادتی کر لی جائے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ یوں شریعتِ اسلامیہ نے نکاح اور اس کے متعلقہ مسائل میں نہایت حکمت، عدل اور آسانی کے اصول قائم فرمائے ہیں، تاکہ انسانی معاشرہ پاکیزہ، منظم اور متوازن رہے۔

باندیوں سے نکاح

اگر کسی شخص کو آزاد مسلمان عورت سے نکاح کی استطاعت حاصل نہ ہو، تو اُسے اجازت ہے کہ وہ اُن مسلمان باندیوں سے نکاح کرے جو شرعی طریقے سے مسلمانوں کے قبضے میں آئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے ایمان کی اصل حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ تم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور دین کے اعتبار سے ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہو؛ اس لئے اُن باندیوں سے اُن کے مالکوں کی اجازت سے، باقاعدہ مہر ادا کر کے نکاح کر لو، بشرطیکہ وہ پاک دامن ہوں، نہ علانیہ بدکاری میں مبتلا ہوں اور نہ خفیہ طور پر کسی سے ناجائز تعلق رکھتی ہوں۔

بے حیائی کی سزا

پھر اگر نکاح کے بعد وہ کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں، تو اُن کی سزا آزاد غیر شادی شدہ عورت کی سزا کے مقابلے میں نصف ہوگی، یعنی اُنہیں پچاس کوڑے دیے جائیں گے۔ البتہ باندیوں سے نکاح اُس شخص کے لئے مناسب ہے جو شہوت کے غلبے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رکھتا ہو اور آزاد عورت میسر نہ ہو۔

اور اگر کوئی شخص اپنے نفس پر قابو رکھ سکے تو یہ اُس کے لئے بہتر ہے، تاکہ اُس کی اولاد بلاشبہ آزاد رہے۔ اور اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے اسی لئے ضرورت کے وقت باندیوں سے نکاح کی اجازت عطا فرمائی گئی ہے۔

نکاح سے متعلق متعدد اہم احکامات

اس آیتِ مبارکہ میں نہایت جامع انداز میں کئی بنیادی احکام بیان فرمائے گئے ہیں:

(۱) اوّل: یہ اصول واضح کیا گیا کہ جو عورت کسی کے نکاح میں ہو، اُس سے دوسرا شخص نکاح نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ عورت اپنے سابق شوہر سے جدا نہ ہو جائے، خواہ وفات کے ذریعے یا طلاق کے ذریعے اور عدت بھی مکمل نہ ہو۔ البتہ وہ صورت مستثنیٰ ہے جب کوئی عورت دارالحرب سے جہاد کے نتیجے میں قید ہو کر دارالاسلام میں آئے اور شرعی طور پر باندی بن جائے۔

(۲) دوم: جن محرمات (حرام رشتوں) کا ذکر کیا گیا، اُن کی حرمت اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہے۔ یہ احکام ربانی ہیں، جن کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے اور اُن سے تجاوز کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) سوم: یہ بھی واضح فرمایا گیا کہ مذکورہ محرمات کے علاوہ دیگر عورتیں نکاح کے لئے حلال ہیں، اور اُن سے نکاح جائز ہے جیسے چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد اور پھوپھی زاد بہنیں۔

اسی طرح بعض دیگر رشتے بھی مخصوص حالات میں جائز ہو جاتے ہیں، مثلاً کسی عورت کے شوہر کی وفات یا طلاق کے بعد اُس سے نکاح، یا منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح۔ اسی طرح اگر بیوی کا انتقال ہو جائے تو اُس کی بہن وغیرہ سے نکاح بھی جائز ہے، مگر یہ سب کچھ مقررہ شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

ان شرائط میں یہ شامل ہے کہ مرد اپنے مال کے ذریعے عورت کو نکاح میں لائے، یعنی مہر ادا کرے، اور نکاح کا مقصد ایک باعزت اور پاکیزہ ازدواجی زندگی قائم کرنا ہو نہ کہ محض نفسانی خواہشات کی تسکین، جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے، جو کسی صالح مقصد سے خالی ہوتا ہے۔ نکاح کا مقصد نسل کی حفاظت، اولاد کی پرورش، اور نفس کو حرام سے بچانا ہے۔

(۴) چہارم: نکاح کے بعد جب میاں بیوی کے درمیان خلوت اور ازدواجی تعلق قائم ہو جائے، تو عورت کا پورا مہر ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے، اور بغیر اُس کی رضا کے اُس میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی۔

(۵) پنجم: اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بیوی باہمی رضامندی سے اُس میں کمی یا زیادتی کر لیں، تو یہ جائز ہے۔ مثلاً عورت اپنی خوشی سے کچھ مہر معاف کر دے، یا مرد اپنی رضا سے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کر دے تو اس

میں کوئی گناہ نہیں۔

ان تمام احکام کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں، نفع ونقصان، اور تمام حالات کو خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اُس کے ہر حکم میں گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اُس کی اطاعت میں سراسر بھلائی اور فلاح ہے، جبکہ اُس کی نافرمانی میں مکمل نقصان اور تباہی ہے۔

چونکہ میاں بیوی کا رشتہ نہایت اہم اور بنیادی ہے، اسی پر انسانی نسل کی بقا، اور اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کا دارومدار ہے، اس لئے اس رشتے سے متعلق جو قوانین اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بیان فرمائے ہیں، اُن کا سیکھنا، سمجھنا اور عملی زندگی میں نافذ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ حقیقی فلاح اور ازدواجی سکون صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں میں ہی پوشیدہ ہے، خواہ اُن کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

تعلیم وتربیت کی ترغیب

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اُس کی اچھی تربیت کرے، اُسے تعلیم دے، ادب سکھائے، پھر اُسے آزاد کر کے اُس سے نکاح کر لے، تو اُس کے لئے دوہرا اجر ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۹۷)

افسوس کہ آج کے دور میں بہت سے تعلیم یافتہ مگر حقیقت سے ناواقف لوگ احکامِ الٰہی کی عقلی توجیہات تلاش کرتے ہیں، اور اگر کوئی حکمت اُن کی سمجھ میں نہ آئے تو معاذ اللہ اُن احکام کو نامناسب یا زمانے کے خلاف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اس آیت کے اختتام پر فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یعنی تمہاری عقل محدود ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر حقیقت سے باخبر اور حکمت والا ہے۔ لہٰذا اُس کے احکام کی پیروی ہی میں خیر وبرکت ہے، اور اُن کی مخالفت میں سراسر خسارہ۔

اس طرح یہاں آزاد عورتوں سے نکاح کے احکام بیان ہوئے، اور اب آگے کنیزوں، یعنی شرعی باندیوں سے نکاح کے احکام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: قرآن کی اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ عورتیں جو تمہارے دائیں ہاتھ کی ملکیت (یعنی لونڈیاں/قیدی عورتیں) ہوں۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ: اسلام نے جنگ میں قید ہونے والی عورتوں کو مسلمانوں

کے لیے حلال قرار دے دیا۔ یہ عمل بظاہر عورتوں کے حقوق کے خلاف اور انسانی اخلاقیات کے منافی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ایک شادی شدہ عورت کے سابق شوہر ہو کے ہوتے ہوئے چونکہ وہ قید ہو کر آئیں ہیں اسے دوسرے مرد کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔ مزید یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ: یہ حکم گویا جنگی قیدی عورتوں کے ساتھ جبری تعلقات (forced relations) کی اجازت دیتا ہے، جو جدید انسانی حقوق اور اخلاقی اصولوں کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

جواب: اس آیت کو اگر اس کے سیاق وسباق، تاریخی پس منظر اور شرعی اصولوں سے الگ کر کے دیکھا جائے تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، جبکہ مکمل تناظر میں اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ دراصل اعتراض اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس دور کے حالات، معاشرتی نظام اور اسلامی حکمتِ عملی کو نظر انداز کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا موضوع ہے جسے جزوی نہیں بلکہ شرعی، تاریخی، سماجی اور اخلاقی تمام پہلوؤں کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے، تب ہی اسلام کی حکمت، عدل اور انسانیت صحیح طور پر سامنے آتی ہے۔

قدیم دنیا کا نظام

اسلام سے قبل دنیا بھر میں غلامی کا نظام پہلے سے رائج تھا، اس زمانے میں Ancient Roman Empire اور slavery system اور Persian Empire slavery practices اور دیگر بڑی تہذیبوں میں غلاموں کو انتہائی غیر انسانی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جنگی قیدی عورتوں کو قتل کر دیا جاتا تھا، عزت وآبرو لوٹا جاتا یا بدترین ظلم کا شکار بنایا جاتا تھا اور یا تو ان کے مردوں کو قتل کر کے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا تھا جبکہ اسلام نے اس کی اصلاح کی۔

اگر اسلام ایک ہی وقت میں اس نظام کو مکمل طور پر ختم کر دیتا تو معاشرے میں شدید معاشی وسماجی بحران پیدا ہو جاتا، کیونکہ ہزاروں غلام اچانک بے سہارا ہو جاتے اور جنگی قیدیوں کے لیے کوئی متبادل نظام موجود نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے حکمت کے ساتھ تدریجی اصلاح (gradual reform) کا طریقہ اختیار کیا۔

''ما ملکت ایمانکم'' کا مفہوم

''ما ملکت ایمانکم'' سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جنگ کے نتیجے میں قیدی بن کر اسلامی ریاست کے نظم وقانون کے تحت آئیں، نہ کہ عام حالات میں کسی کو غلام بنانے کی اجازت۔ یہ کوئی عمومی یا کھلی اجازت نہیں، بلکہ اس دور کے جنگی قوانین (Law of War) کا ایک حصہ تھا، جسے مخصوص شرائط اور ریاستی نظم کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے دنیا بھر میں غلامی ایک عام اور غیر منظم نظام تھا، جہاں طاقتور لوگ کمزوروں کو اغوا کر کے یا

قرض کی بنیاد پر غلام بنا لیتے تھے، اور ان کے ساتھ سخت اور غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔

اسلام نے آ کر اس بے قابو نظام کو ختم کرنے کے بجائے حکمت کے ساتھ محدود اور منظم کیا، کیونکہ اس کا فوری خاتمہ معاشرتی انتشار اور بے سہارا پن کا سبب بن سکتا تھا۔

چنانچہ اسلام نے غلامی کے تمام غیر اخلاقی ذرائع (اغوا، ظلم، قرض) بند کر دیے اسے صرف جنگی قیدیوں تک محدود کیا، جو اس زمانے میں ایک عالمی رواج تھا غلاموں کو انسانی حقوق، عزت اور حسنِ سلوک فراہم کیا اور ان کی آزادی کے لیے متعدد راستے کھول دیے۔

اس طرح ''مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ حکم ایک محدود، عارضی اور اصلاحی نظام کا حصہ تھا، نہ کہ کسی مستقل یا عمومی اجازت کا اظہار۔ اسلام کا اصل مقصد غلامی کو برقرار رکھنا نہیں بلکہ اسے تدریجاً ختم کرنا اور انسانی وقار کو بلند کرنا تھا۔

اسلام کی اصلاحی تبدیلیاں

اسلام نے اس نظام میں بڑی تبدیلیاں کیں: قتل کے بجائے زندگی دی بے سہارا چھوڑنے کے بجائے سماجی نظام میں شامل کیا ان کے لیے: کھانے، لباس، عزت کا حق، آزادی کے راستے دئے۔ اسلام نے غلامی کے ذرائع کو محدود کیا، صرف جنگی قیدیوں تک رکھا، اور اغوا، ظلم، قرض اور دیگر ذرائع کے بدلے غلام بنانے جیسے طریقوں کو ختم کر دیا۔ ساتھ ہی غلاموں کے حقوق مقرر کیے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو لازم کیا، اور آزادی کے بے شمار راستے کھول دیے، جیسے کفارات، زکوٰۃ اور مکاتبت کے ذریعہ غلاموں کی آزادی کو فروغ دیا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''اور غلاموں کو آزاد کرنا نیکی ہے''۔ (البقرہ:۱۷۷)

جنگی قیدیوں کو قتل کرنے، اذیت ناک تکلیف دینے، غلام بنانے کے بجائے قیدیوں کے لئے باعزت اور انسانی طریقہ اختیار کیا۔ اور غلامی کے خاتمے کی طرف رہنمائی اس طرح کی کہ غلام آزاد کرنا نیکی قرار دے کر غلامی کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔ اس طرح اسلام کا اصل مقصد غلامی کو برقرار رکھنا نہیں بلکہ اسے کنٹرول، اصلاح اور بتدریج ختم کرنا تھا، تاکہ انسانی وقار اور عدل کا نظام قائم ہو سکے۔

سماجی و اخلاقی حکمت

(۱) بے سہارا عورتوں کا تحفظ: جنگی قدیوں کو اگر آزاد چھوڑ دیا جائے تو نہ ان کے پاس گھر، نہ معاش اور نہ تحفظ۔ چنانچہ اسلام نے انہیں گھر دیا، تحفظ دیا اور عزت دی۔

(۲) تدریجی خاتمہ غلامی: اسلام کا اصل مقصد غلامی ختم کرنا تھا، مگر تدریجی طریقہ سے، کفارات میں غلام آزاد کرنے کا حکم دی اگیا، زکوٰۃ کے مصارف میں شامل کیا گیا۔ غلام کو آزاد کرنا نیکی کا بڑا عمل قرار دیا گیا، ان کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کرنے کا حکم دیا گیا۔

لونڈی سے نکاح کی طرح اصول

اسلام نے ان جنگی قیدی عورتوں یعنی لونڈیوں کے ساتھ اس معاملے کو ہرگز بے قاعدہ نہیں چھوڑا بلکہ اس کے لیے واضح اور محدود اصول مقرر کیے۔

اسلام نے ان کے ساتھ تعلق کو بھی بے قاعدہ نہیں چھوڑا بلکہ: ان کے ساتھ تعلق صرف اسی صورت میں جائز ہے جب: وہ مالک کی ملکیت میں باقاعدہ آئیں ان کی عدّت (استبراء رحم) پوری ہو یہ عمل زنا نہیں بلکہ ایک قانونی (legal) تعلق سمجھا جاتا تھا۔

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عورت باقاعدہ طور پر جنگی قیدی بن کر ایک منظم ریاستی نظام کے تحت کسی کے زیرِ کفالت آئے، نہ کہ ذاتی اغوا یا ظلم کے ذریعے۔ اس کے بعد فوراً تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ ''استبراء رحم'' (عدّت) لازم ہے، تاکہ نسب (بچے کی شناخت) محفوظ رہے اور سابقہ تعلقات کا مکمل اختتام ہو جائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد خواہشات کی تسکین نہیں بلکہ ایک منظم، ذمہ دار اور سماجی نظام قائم کرنا ہے، جس میں عورت کی عزت اور خاندانی نظام دونوں محفوظ رہیں۔

جبری تعلقات کی سخت ممانعت

اسلام کسی بھی صورت میں جبری تعلقات (forced relations/rape) کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ اسے ظلم اور گناہِ کبیرہ قرار دیتا ہے۔ شریعت نے ہر انسان خواہ آزاد ہو یا لونڈی کی عزت، جسم اور اختیار کو محفوظ کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں..... ان کے ساتھ نرمی کرو'' (صحیح بخاری)

اسلام نے کسی عورت کو محض خواہش کی چیز نہیں بنایا، بلکہ جنگی حالات میں ایک محدود، منظم اور وقتی قانونی نظام دیا، جہاں قیدی عورت کو بے سہارا چھوڑنے، قتل کرنے یا بدسلوکی کرنے کے بجائے ایک ذمہ دارانہ فریم ورک میں رکھا گیا۔

ا۔ جنگی قیدیوں کا عملی حل:

قدیم دنیا میں قیدیوں کو یا قتل کیا جاتا تھا یا اذیت دی جاتی تھی اسلام نے ایک انسانی متبادل دیا تاکہ ان کی جان محفوظ رہے۔

۲۔معاشرتی تحفظ:

قیدی عورت اکیلی، بے سہارا اور غیر محفوظ ہو جاتی تھیا سے کسی خاندان/گھر میں شامل کرنا اس کی حفاظت اور کفالت کا ذریعہ تھا۔

۳۔نکاح جیسے اصول:

یہ تعلق بے قاعدہ نہیں بلکہ شرائط کے ساتھ تھا (عدّت/ استبراء رحم وغیرہ) اولاد پیدا ہو تو وہ جائز اور باعزت نسب رکھتی تھی۔

۴۔غلامی کو محدود کرنا:

اسلام نے اس نظام کو پھیلایا نہیں بلکہ صرف جنگی قیدیوں تک محدود کیا اغوا، خرید و فروخت کے ظالمانہ طریقے ختم کیے۔

۵۔حقوق اور حسنِ سلوک کی پابندی:

ان کے ساتھ ظلم، جبر اور زیادتی حرام قرار دی گئی کھانے، لباس اور عزت میں انصاف لازم کیا گیا۔

۶۔آزادی کی طرف راستہ:

اگر اولاد ہو تو وہ عورت ''امّ ولد'' بن کر آزادی کے قریب آ جاتی تھی مکاتبت، کفارات اور دیگر ذرائع سے آزادی کو فروغ دیا گیا۔اسلام میں یہ کوئی کھلی اجازت نہیں تھی، نہ ہی محض جنسی خواہش کا معاملہ تھا, بلکہ یہ ایک جنگی، قانونی اور اصلاحی نظام تھا۔

سب سے اہم اصول یہ ہے کہ اسلام میں کسی بھی قسم کا جبر یا زبردستی سختی سے ممنوع ہے۔جبری تعلق (rape یا forced relations) اسلام میں حرام اور جرم ہے، خواہ وہ کسی آزاد عورت کے ساتھ ہو یا لونڈی کے ساتھ۔اس لیے یہ تصور کہ اسلام نے قیدی عورتوں کے ساتھ جبری تعلقات کی اجازت دی، بالکل غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ ظلم کو ختم کرنا، کمزور کو تحفظ دینا اور ایک ایسے نظام کی تشکیل ہے جس میں طاقت کے بجائے اخلاق اور ذمہ داری غالب ہو۔

اعتراضات کی وضاحت

۱۔چار بیویوں کی حد اور لونڈیوں کی تعداد میں کوئی قید نہیں

قرآن نے واضح حد رکھی: چار بیویاں جبکہ لونڈیوں میں کوئی حد نہیں، کیونکہ یہ کوئی خواہشاتی نظام نہیں تھا بلکہ جنگی حالات کا عارضی نظام تھا اس کی تعداد جنگ، قیدیوں کی تعداد اور ریاستی تقسیم پر منحصر تھی، ساتھ ہی ہر ایک کی کفالت، حقوق اور ذمہ داری لازم تھی۔ اسی طرح بے شمار لونڈیاں رکھنا آسان یا عام نہیں تھا اس لئے یہ خود بخود محدود رہتا تھا۔

یہ کہنا درست نہیں کہ اس میں ''کوئی قید نہیں''۔ بلکہ اس معاملے میں کئی سخت شرائط تھیں:

۱۔ یہ صرف جنگی قیدی عورت کے ساتھ مخصوص تھا، عام عورت کے ساتھ نہیں۔

۲۔ یہ ریاستی نظام کے تحت ہوتا تھا، ذاتی اغوا یا خرید و فروخت کی اجازت نہیں۔

۳۔ استبراء رحم (عدّت) لازمی تھی۔

۴۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک، نان و نفقہ، عزت دینا فرض تھا۔

۵۔ اسے آزاد کرنا، نکاح کرنا یا مکاتبت کے ذریعے آزادی دینا ترغیب دی گئی۔ یعنی یہ بے قاعدہ یا کھلی چھوٹ نہیں بلکہ ایک محدود اور منظم قانون تھا۔

۲۔ نکاح کے بغیر تعلق جائز کیوں؟

اسلام میں کسی عورت کے ساتھ جنسی تعلقات کے دو ہی جائز راستے تھے:

۱۔ نکاح: صرف چار بیویاں

۲۔ ملکِ یمین (جنگی قیدی کا نظام)

یہ دوسرا راستہ اس وقت کے عالمی جنگی نظام کا حصہ تھا، جسے اسلام نے regulate کیا۔ یہ ''زنا'' اس لیے نہیں ہے کہ: زنا وہ ہے جو کسی غیر متعلق عورت سے خفیہ/غیر قانونی تعلق ہو۔ جبکہ یہاں عورت با قاعدہ کفالت (ownership responsibility) میں ہوتی ہے، ریاستی نظام کے اجازت سے ہوتی ہے، خفیہ تعلق کے بجائے اعلانیہ ہوتی ہے۔ اس میں مرد پر ذمہ داری ہوتی ہے: خرچ کی، تحفظ کی، عزت دینے کی۔ گویا یہ ''غیر ذمہ دارانہ تعلق'' نہیں بلکہ ایک سماجی و قانونی بندھن تھا، اگرچہ نکاح جیسا نہیں۔

بے سہارا عورتوں کے لئے تحفظ

اسی طرح جنگی حالات میں بڑی تعداد میں عورتیں بے سہارا ہو جاتی تھیں۔ اگر ان قیدی عورتوں کے لیے کوئی منظم اور ذمہ دارانہ راستہ نہ ہوتا تو وہ معاشرے میں بے تحفظ رہتیں، جس سے بدامنی، استحصال، زنا کاری اور فحاشی پھیلنے کا اندیشہ ہوتا۔ اسلام نے ایک منضبط نظام دے کر اس فتنہ کو روکا۔

اگر ایسی عورتوں کو بغیر کسی کفالت کے چھوڑ دیا جاتا تو معاشی اور سماجی مجبوری انہیں غلط راستوں (زنا، جسم فروشی) کی طرف دھکیل سکتی تھی۔ اسلام نے انہیں ایک ایسے نظام میں شامل کیا جہاں ان کی بنیادی ضروریات اور عزت محفوظ رہے۔

یہ نظام دراصل ان عورتوں کو معاشرے کا حصہ بنانے کا ذریعہ تھا، نہ کہ انہیں الگ یا کمتر رکھنے کا۔ اسی لیے بعد میں ان سے نکاح کی ترغیب دی گئی، ان کی اولاد کو مکمل نسب اور حقوق دیے گئے اور ان کی آزادی کے دروازے کھولے گئے۔ گویا مجموعی طور پر یہ ایک ہنگامی اور اصلاحی سماجی حل تھا، جس کا مقصد خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ فتنہ سے بچاؤ، عورت کا تحفظ اور معاشرتی توازن قائم رکھنا تھا۔

۳۔ لونڈی سے پیدا ہونے والے بچے کا حکم (وراثت)

اسلام کا واضح اصول:

اگر لونڈی سے بچہ ہو جائے تو وہ بچہ بالکل جائز (legitimate) ہوتا ہے۔ اسے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے مکمل وراثت ملتی ہے (نکاح والی بیوی کے بچوں کی طرح)۔ فقہی اصطلاح: ایسی لونڈی کو ''اُمِّ وَلَد'' کہا جاتا ہے، ام الد کا حکم یہ ہے کہ اسے بیچنا جائز نہیں رہتا، مالک کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ یعنی: بچہ بھی مکمل حقوق والا اور ماں بھی آزادی کے قریب۔

وراثت کے تعلق سے یہ واضح رہے کہ اسلام میں نسب (Lineage) اصل بنیاد ہے نہ کہ صرف نکاح، بچہ چاہے نکاح والی عورت سے ہو یا ملک یمین (لونڈی) سے اگر وہ باپ کا مانا جائے تو وہ وارث بنتا ہے اور وراثت کا پورا حقدار ہوتا ہے اس لئے یہاں وراثت میں کوئی محرومی نہیں۔

قرآن مجید کی اس آیت کے فوراً بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۚ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ''اور جو نہ رکھتا ہو استطاعت تم میں سے (اور نہ) قدرت نکاح کرنے کی، آزاد مومن عورتوں سے، تو (وہ نکاح کر لے) اُن سے جو تمہاری ملک میں ہوں، تمہاری لونڈیاں مؤمنوں میں سے اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے ایمان کا حال، تم سب ایک دوسرے میں سے ہو، سو تم نکاح کر لو ان (لونڈیوں) سے، ان

کے مالکوں کی اجازت سے اور تم دو انہیں ان کے مہر دستور کے مطابق، جبکہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، اس حال میں کہ نہ ہوں بدکاری کرنے والیاں اور نہ بنانے والیاں ہوں چپکے چپکے دوست، پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں، تو اگر وہ کریں بدکاری (کا کام) تو ان کے لئے ہے آدھی اس سے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے (مقرر) سزا، یہ (اجازت) اس کے لئے ہے جو ڈرے تکلیف میں پڑنے سے تم میں سے اور یہ کہ تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لئے اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔

وضاحت: اس آیت (سورہ النساء:25) کو اگر اعتراض کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ دراصل پچھلی آیت (24) کی وضاحت اور اس کے غلط فہم پہلو کی اصلاح کرتی ہے۔ یہاں قرآن یہ بتا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص آزاد مؤمن عورت سے نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ مومن لونڈی سے باقاعدہ نکاح کر سکتا ہے یعنی محض ملکِ یمین کا سہارا لینا ہی واحد راستہ نہیں، بلکہ نکاح کو ترجیح دی گئی ہے۔

اس میں واضح طور پر کہا گیا کہ ان کے مالکان کی اجازت سے نکاح ہو، مہر دیا جائے، اور وہ پاکدامنی کے ساتھ نکاح میں آئیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا اصل رخ نکاح، ذمہ داری اور اخلاقی بندھن کی طرف ہے، نہ کہ غیر محدود تعلقات کی طرف۔

لونڈیوں کے لئے اخلاقی معیار

اسی آیت میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ لونڈیوں کو بھی مکمل انسانی اور اخلاقی معیار پر رکھا گیا ہے: نہ وہ بدکاری کرنے والی ہوں، نہ خفیہ تعلقات رکھنے والی۔ یعنی اسلام نے ان کے لیے بھی وہی پاکیزگی کا معیار مقرر کیا جو آزاد عورتوں کے لیے ہے۔ مزید یہ کہ اگر نکاح کے بعد وہ کسی غلطی کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا بھی متعین اور کم رکھی گئی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ان کی سماجی کمزوری اور حالات کو مدنظر رکھتا ہے اور ان پر سختی نہیں بلکہ آسانی چاہتا ہے۔

صبر کی ترغیب

آخر میں قرآن خود یہ کہہ کر معاملے کو مزید واضح کر دیتا ہے کہ ''صبر کرنا تمہارے لیے بہتر ہے''۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے تو وہ نکاح میں تاخیر کرے، یہ زیادہ افضل ہے۔ اس سے یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے کوئی کھلی چھوٹ دی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ہر قدم پر اخلاق، ذمہ داری اور ضبطِ نفس کو ترجیح دی اور ایک مشکل سماجی مسئلے کا متوازن اور انسانی حل پیش کیا۔

درحقیقت قرآن کی اس آیت (سورہ نساء: ۲۴) کو سیاق و سباق سے ہٹا کر شکوک پیدا کرنے کے لئے غلط

طریقے سے پیش کیا جاتا ہے اس لئے بعض لوگ غلط فہمی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نہ غلامی کا نظام ایجاد کیا بلکہ ایک پہلے سے موجود ظالمانہ نظام کی اصلاح کی۔

اسلام نے جنگی قیدی عورتوں کو بے سہارا چھوڑنے یا ظلم کا نشانہ بنانے کے بجائے انہیں تحفظ، باقاعدہ حقوق اور سماجی مقام دیا، اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کے جبری تعلقات کو سختی سے حرام قرار دیا۔ مزید یہ کہ اسلام نے مختلف احکام کے ذریعے غلامی کے تدریجی خاتمے کی راہ بھی ہموار کی۔

لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اسلام نے استحصال کی اجازت دی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس نے ایک غیر انسانی نظام کو انسانی، اخلاقی اور منظم شکل دے کر بالآخر اس کے خاتمے کی بنیاد رکھی۔

آیت نمبر (۲۵) وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ''اور جو شخص تم میں نکاح کی طاقت نہیں رکھتا آزاد مؤمن عورتوں سے، تو وہ نکاح کرے ان مؤمن لونڈیوں سے جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک جیسے ہو، لہٰذا ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے، اور انہیں ان کے مہر دو دستور کے مطابق، بشرطیکہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، اور وہ نہ ہوں بدکاری کرنے والیاں اور نہ چپکے چپکے دوست بنانے والیاں۔ پھر جب وہ نکاح میں آ جائیں، پھر اگر وہ بدکاری کریں، تو ان کی سزا آزاد عورتوں کی آدھی ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرتا ہو، اور اگر صبر کرو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے''۔

تفسیر آیتِ مبارکہ کی تفسیر سے قبل یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں جس ''لونڈی''، ''باندی'' یا ''کنیز'' کا ذکر آیا ہے، اُس سے مراد وہ شرعی غلام اور کنیز ہیں جو نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب اور دیگر ممالک میں موجود تھے، یا وہ قیدی جو اسلامی جہاد کے دوران کفار میں سے گرفتار کیے جاتے اور امیر المؤمنین اُنہیں مجاہدینِ اسلام میں

تقسیم فرما دیتے تھے۔ یہ قیدی، شریعت کے اصولوں کے تحت غلام اور باندی بن جاتے تھے۔ اُن میں سے بعض اپنی رضامندی سے اسلام قبول کر لیتے، جبکہ بعض اپنے سابق دین پر قائم رہتے۔

تاہم اب زمانہ بدل چکا ہے، اور تقریباً پوری دنیا سے شرعی غلامی اور باندی کا نظام ختم ہو چکا ہے۔ مسلمانوں نے بھی جہاد کے وہ شرعی اصول ترک کر دئے ہیں جو قرآن وسنت نے مقرر فرمائے تھے، اور جنگ وصلح کے معاملات میں یہود ونصاریٰ اور دیگر دشمنانِ دین کے وضع کردہ طریقوں کو اختیار کر لیا ہے، جس کے نتیجے میں مختلف پہلوؤں سے ذلت وپستی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ملازم اور خادماؤں کا حکم

مزید یہ کہ موجودہ دور میں گھروں میں کام کرنے والے نوکر، ملازم اور خادمائیں ہرگز غلام یا باندی نہیں ہیں، بلکہ وہ سب آزاد انسان ہیں۔ اسی طرح بعض علاقوں میں جو لوگ بچوں کو اغوا کر کے فروخت کر دیتے ہیں اور اُنہیں غلام یا نوکر بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام اور ناجائز عمل ہے۔ اس طرح کے غیر شرعی طریقوں سے کوئی شخص غلام یا باندی نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے۔

شرعی باندیوں سے نکاح کے احکام

اس آیت میں شرعی باندیوں اور کنیزوں سے نکاح کے احکام نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں۔ ارشاد یہ ہے کہ جو شخص آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو، یعنی اُس کے مہر، نان ونفقہ، رہائش اور دیگر ضروری اخراجات کا بوجھ اُٹھانے سے عاجز ہو تو وہ کسی مسلمان باندی سے نکاح کر سکتا ہے۔

اس صورت میں مہر اور دیگر اخراجات نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ تاہم یہ اجازت خاص طور پر اُس شخص کے لئے ہے جسے زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔

اس حکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل اور افضل یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آزاد عورت سے نکاح کیا جائے، اور باندی سے نکاح صرف مجبوری کی حالت میں کیا جائے۔

اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ باندی سے پیدا ہونے والی اولاد اُس شخص کی مملوک ہوتی ہے جو اُس باندی کا مالک ہو؛ لہٰذا اولاد کو غلامی سے محفوظ رکھنے کے لئے بہتر ہے کہ نکاح آزاد عورت سے ہو۔

تاہم چونکہ زنا کا گناہ نہایت شدید ہے، اس لئے اگر کسی شخص کو اپنے نفس پر قابو نہ رہنے کا اندیشہ ہو تو اُس کے لیے باندی سے نکاح کر لینا بہتر ہے، اور اسے حقیر یا قابلِ نفرت نہ سمجھے۔ اس کی دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ فضیلت کا معیار نسب

نہیں بلکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں، ممکن ہے وہ کنیز ایمان اور عمل میں کسی آزاد شخص سے بڑھ کر ہو۔

دوسری یہ کہ انسانوں کی اصل ایک ہی ہے؛ سب حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، اس لئے ظاہری نسبی فرق کو معیارِ برتری نہیں بنایا جاسکتا۔

اس نکاح کے لئے چند اہم شرائط

(۱) اوّل: باندیوں سے نکاح اُن کے مالکوں کی اجازت سے کیا جائے، کیونکہ باندی کو اپنے نفس پر مکمل اختیار حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ آزاد عورت کو ہوتا ہے۔

(۲) دوم: مہر باقاعدہ اور حسنِ طریقے سے ادا کیا جائے۔ یہ جائز نہیں کہ باندی ہونے کی وجہ سے مہر کو نظر انداز کیا جائے یا ادائیگی میں کوتاہی برتی جائے۔

(۳) سوم: نکاح اُس باندی سے کیا جائے جو پاک دامن ہو، نہ علانیہ بدکاری میں مبتلا ہو اور نہ خفیہ ناجائز تعلقات رکھتی ہو۔

پھر اگر ایسی باندی نکاح کے بعد بھی زنا کی مرتکب ہو جائے، تو اُس کی سزا آزاد غیر شادی شدہ عورت کی سزا کے مقابلے میں نصف ہوگی۔ یعنی جہاں آزاد کنواری عورت کے لئے سو کوڑوں کی سزا ہے، وہاں باندی کے لئے پچاس کوڑے مقرر کئے گئے ہیں۔

نکاح سے اجتناب

آخر میں یہ بھی واضح فرمایا گیا کہ باندیوں سے نکاح کی یہ اجازت اُسی شخص کے لئے ہے جسے گناہ میں پڑنے کا حقیقی اندیشہ ہو۔ اگر کوئی شخص صبر وضبط سے اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہو، تو اُس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ باندیوں سے نکاح سے اجتناب کرے، کیونکہ اس صورت میں پیدا ہونے والی اولاد آزاد نہ ہوگی، بلکہ مملوک شمار ہوگی، اور باندی بیوی ہونے کے باعث شوہر کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے مالک کی اطاعت کی بھی پابند ہوگی۔

البتہ اگر مجبوری کے تحت باندی سے نکاح کر لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے، وہ بندوں کی مجبوریوں کو جانتا ہے، اُن پر آسانی فرماتا ہے اور کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہے۔ یوں حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے احکام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہ واضح فرماتا ہے کہ یہ تمام ہدایات درحقیقت بندوں ہی کی بھلائی اور فائدے کے لئے ہیں، لہٰذا ان پر عمل کرنا ہی دنیا وآخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

آیت نمبر (۲۶) يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ

عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (اپنے احکام کو) واضح کرے، اور ان لوگوں کے طریقے کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے، اور تمہاری توبہ قبول کرے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے''۔

تفسیر انسان اپنی فطری کمزوریوں اور نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر اکثر اوقات احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کو گراں محسوس کرتا ہے اور بسا اوقات اُن کی مخالفت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کی پابندی پر مزید زور دیتے ہوئے نہایت تاکید اور تنبیہ کے ساتھ اُن پر عمل کرنے کی ترغیب دی گئی اور انحراف سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔

یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اللہ تعالیٰ جو احکام اپنے بندوں کے لیے مقرر فرماتا ہے، وہ سراسر حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، اور اُن میں بندوں کے لئے کھلا نفع اور بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔

لہٰذا ہر حکمِ الٰہی کی بجا آوری ضروری ہے، تاکہ بندہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، عنایت اور مغفرت کا مستحق بن سکے۔ اور اگر اُس کے احکام کی نافرمانی کی جائے، تو اس کا انجام گمراہی، ہدایت سے محرومی، اور سراسر نقصان وخسارے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ وہ انسان کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہے، اور جانتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات اور شہوات کے مقابلے میں کہاں تک صبر وضبط اختیار کر سکتا ہے۔ اسی لیے اُس نے شریعت کے تمام احکام میں انسان کی فطری کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھا ہے، اور دین میں کسی قسم کی بے جا سختی یا تنگی نہیں رکھی۔ بندوں کو ایسے مشکل اور ناقابلِ برداشت احکام کا پابند نہیں بنایا، بلکہ اُنہیں اپنی فطری خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز اور پاکیزہ راستے بھی سکھا دیے ہیں، تاکہ وہ اعتدال کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

آیت نمبر (۲۷) وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے، اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے بہت دور ہو جاؤ''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت وعنایت کی نظر فرمانا چاہتے ہیں، اور تمہیں سیدھی راہ پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی خواہش یہ ہے کہ تم حق کے راستے سے بھٹک کر بہت دور نکل جاؤ اور ان ہی کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اس لئے تمہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ خواہشات کے پجاریوں کی طرف ہرگز مائل نہ ہونا، بلکہ اللہ کے احکام کی پیروی کرنا اسی میں تمہاری حقیقی بھلائی اور کامیابی ہے۔

خواہشات کے غلام

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں ''شہوت پرستوں'' سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں، جبکہ کچھ نے اس سے مراد فاسق وفاجر لوگ، زناکار، یا مجوس ومشرکین لئے ہیں۔ مجوسیوں کے یہاں تو بہنوں اور بھتیجیوں سے نکاح تک کو جائز سمجھا جاتا ہے، اور یہود بھی بعض قریبی رشتوں کو حلال جانتے رہے ہیں۔

اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرماتے ہیں کہ یہ باطل مذاہب کے پیروکار، جو خواہشاتِ نفس کے غلام ہیں اور جن کے نزدیک حلال وحرام کی کوئی حقیقی تمیز نہیں، درحقیقت تمہیں بھی راہِ حق سے ہٹا کر اپنی گمراہ فکر کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے پوری طرح ہوشیار رہو، اللہ کے احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور ان کی باتوں میں ہرگز نہ آؤ۔ یہی تمہارے دین ودنیا کی سلامتی کا راستہ ہے۔

آیت نمبر (۲۸) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: ''اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کردے، کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام احکام میں انسان کی فطری کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھا ہے، اس پر ایسے سخت اور دشوار قوانین عائد نہیں فرمائے جو اس کی طاقت سے باہر ہوں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ انسان اپنی محبتوں اور خواہشات کے معاملے میں کہاں تک ضبط وتحمل سے کام لے سکتا ہے، اسی لئے اُس نے ان خواہشات کی تکمیل کے لئے پاکیزہ اور جائز راستے متعین فرمادیے۔ یہ نہیں کہ انسان کو بالکل ہی اپنی فطری تقاضوں سے روک دیا گیا ہو، بلکہ اُس کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے معتدل اور درست طریقے سکھادئے گئے۔

چنانچہ اگر کسی شخص کو آزاد عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ ہو تو ضرورت کے تحت شرعی باندیوں سے نکاح کی اجازت دی گئی۔

اسی طرح مہر کے معاملے میں بھی میاں بیوی کو باہمی رضامندی سے طے کرنے کا اختیار دیا گیا، اور اگر مقررہ مہر میں کمی بیشی شوہر خوش دلی سے قبول کرلے تو اس کی بھی گنجائش رکھی گئی۔ نیز حالات کے پیشِ نظر ایک سے زیادہ

عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی، بشرطیکہ عدل وانصاف کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے۔

الغرض نکاح اور خواتین سے متعلق جو بھی احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کئے گئے ہیں، ان میں نہ کوئی تنگی ہے اور نہ کوئی بے جا سختی، بلکہ سب کے سب حکمت، سہولت اور مصلحت پر مبنی ہیں۔ ان احکام کی پابندی انسان کے لئے سراسر نفع بخش ہے، جبکہ ان سے انحراف کا نتیجہ صرف خرابی اور نقصان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

آیت نمبر (۲۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناحق طریقے سے، مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو باہمی رضامندی سے، اور نہ خودکشی کرو۔ بے شک اللہ تم پر بڑا مہربان ہے''۔

تفسیر مال کے معاملے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ باہمی رضامندی کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس دائرے میں چوری، جھوٹ، دھوکہ، فریب، خیانت، رشوت، سودخوری، لوٹ مار، لاٹری، سٹہ اور اسی نوع کے تمام ناجائز ذرائع داخل ہیں، جن کے ذریعے مال حاصل کرنا سختی سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

کسی کے مال میں ناحق اور غیر شرعی طریقے سے تصرف کرنا حرام ٹھہرایا گیا، البتہ جائز ذرائع کو اس ممانعت سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ اسی لئے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ، یعنی وہ مال حرام نہیں جو باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے حاصل کیا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خرید وفروخت، تجارت، جائیداد یا کسی کاروبار میں شمولیت کے ذریعے، باہمی رضا و رغبت کے ساتھ مال حاصل کیا جائے تو وہ جائز اور حلال ہوگا۔

یہ رضامندی قول کے ذریعے بھی ہوسکتی ہے، عمل کے ذریعے بھی، اور عرف ورواج کے مطابق بھی معتبر سمجھی جاتی ہے۔ گویا اصل ممانعت ناجائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کی ہے، جبکہ جائز طریقوں سے باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت اور لین دین کی مکمل اجازت دی گئی ہے۔

اجازت کی شرط

تاہم یہ بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ یہ اجازت صرف انہی تجارتی صورتوں کے لئے ہے جن کا جواز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہو۔ جو خرید وفروخت شرعاً جائز ہے، وہی اس حکم کے تحت درست ہے۔ اس کے برعکس جہاں تجارت کے نام پر جوا، سٹہ، سود یا ربوی معاملات پائے جائیں، وہ درحقیقت تجارت نہیں بلکہ دھوکہ اور

فریب کی ایک شکل ہیں۔ اسی طرح خرید وفروخت کی جتنی بھی ناجائز صورتیں ہیں، وہ سب اس اجازت سے خارج ہیں۔

یہ تو مال کے بارے میں ناحق تصرف کی ممانعت کا بیان تھا، اس کے بعد انسانی جان کے بارے میں ناحق تصرف کی حرمت کو بیان کیا جاتا ہے، جہاں مزید تاکید کے ساتھ حکمِ الٰہی وارد ہوتا ہے۔

ناحق قتل

اللہ تعالیٰ کا واضح اور دوٹوک فرمان ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — ''یعنی تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرو''۔ اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کی جان کو ناحق اور بلاسبب قتل کرنا سخت حرام ہے۔ جس طرح اوپر کی آیات میں مالی حقوق کے تحفظ کی تاکید کی گئی تھی، اسی طرح یہاں جانی حقوق کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

گویا یہ اصول مقرر کر دیا گیا کہ نہ کسی کا مال دھوکے، فریب، جبر یا ظلم کے ذریعے حاصل کیا جائے، اور نہ ہی کسی بے گناہ کی جان لینے کی جسارت کی جائے۔ ہر انسان کو دوسرے کے مال کو اسی طرح محترم سمجھنا چاہئے جیسے اپنا مال، اور دوسرے کی جان کو بھی اپنی جان کی مانند عزیز جاننا چاہئے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا — ''بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے''۔

اس ارشاد کے ذریعے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تمام ہدایات دراصل اُس کی رحمت کا مظہر ہیں۔ اُس نے تم پر جان و مال کے احترام کو لازم قرار دیا، اور تمہیں اس بات سے روک دیا کہ تم بلاوجہ کسی کے مال یا جان پر دست درازی کرو۔ یہ سب احکام تمہاری بھلائی، فلاح اور خیر کے لئے ہیں، جن میں سراسر حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہے۔

تجارت میں دھوکہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت محمد ﷺ کا گزر ایک غلے کے ڈھیر کے پاس سے ہوا۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اُس میں داخل فرمایا تو انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے غلے والے! یہ کیا معاملہ ہے؟'' اس نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! بارش ہو گئی تھی''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیتے؟'' پھر ارشاد فرمایا: ''جس نے دھوکہ دیا، اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۲)**

اس تنبیہ کے بعد یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ جو شخص ان قرآنی احکام و ہدایات کی خلاف ورزی کرے گا، اور جان بوجھ کر ظلم کے ساتھ کسی کا مال ہڑپ کرے گا یا کسی کو ناحق قتل کرے گا، اُس کے لئے سخت سزا کی وعید ہے۔ ایسے اعمال نہ صرف دنیا میں فساد کا سبب بنتے ہیں بلکہ آخرت میں بھی سخت پکڑ اور عذاب کا موجب ہوں گے۔

آیت نمبر (۳۰) وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

ترجمہ: ''اور جو کوئی ظلم اور زیادتی سے ایسا کرے گا، تو ہم اسے ضرور آگ میں ڈالیں گے، اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے''۔

تفسیر یعنی جو شخص کسی کے مال پر ناحق دست درازی کرے یا کسی کی جان عمداً لے لے، تو اسے اس جرم کی پاداش میں جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ وہاں نہ اس کی ناجائز کمائی ہوئی دولت کام آئے گی، نہ حرام طریقوں سے حاصل کی گئی حکومت اور اقتدار کوئی فائدہ دے سکے گا۔ اسی مضمون کو قرآنِ کریم نے یوں واضح فرمایا: وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ــ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے مجرموں کو جہنم میں داخل کرنا اور ان کی بداعمالیوں کی سزا دینا ہرگز دشوار نہیں، بلکہ نہایت آسان ہے۔

خودکشی کی سزا

اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا کہ ''اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو''، کیونکہ خودکشی کی سزا بھی نہایت سخت ہے۔

حدیثِ مبارکہ میں وارد ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی جھوٹی قسم کھاتا ہے، وہ اپنے قول کے مطابق ہی قرار پاتا ہے، اور جو شخص اپنے آپ کو کسی تیز ہتھیار سے قتل کر لیتا ہے، اسے جہنم میں اسی ہتھیار کے ذریعے عذاب دیا جاتا رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص زخمی ہوا، مگر صبر نہ کر سکا اور اس نے خود اپنی جان لے لی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان دینے میں جلدی کی، تو میں نے اس پر جنت حرام کر دی''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۶۳)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کرے گا، وہ جہنم میں ہمیشہ اپنا گلا گھونٹتا رہے گا، اور جو شخص اپنے آپ کو کسی ہتھیار سے مار ڈالے گا، وہ جہنم میں اسی طرح اپنے آپ کو مارتا رہے گا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۷۷۸)**

قرآنِ کریم کا یہ اسلوب ہے کہ جب کسی گناہ پر وعید (ڈر) سنائی جاتی ہے تو ساتھ ہی ترغیب (امید اور شوق) کا پہلو بھی بیان کیا جاتا ہے، تاکہ بندہ خوف اور امید کے درمیان متوازن رہے۔ چنانچہ یہاں بھی ظلم کے ذریعے کسی کا مال یا جان لینے کی سخت سزا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام واکرام کی بشارت دی گئی ہے، تاکہ لوگ ان سنگین

گناہوں سے بچیں۔

یہ ترغیب اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اگر انسان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کے چھوٹے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، اور اسے پاکیزگی کے ساتھ عزت، راحت اور کامیابی کے مقام میں داخل فرما دیتا ہے۔

آیت نمبر (۳۱) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ: ''اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمہیں روکا گیا ہے، تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کر دیں گے، اور تمہیں عزت والی جگہ میں داخل کریں گے''۔

چھوٹے گناہوں کی معافی

اس آخری آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں: کبیرہ (بڑے گناہ) اور صغیرہ (چھوٹے گناہ)۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمت اور استقامت کے ساتھ بڑے گناہوں سے اجتناب کرے، تو اُس کے چھوٹے گناہوں کو معاف فرما دیا جائے گا۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بڑے گناہوں سے بچنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمام فرائض اور واجبات کی پابندی کی جائے، کیونکہ فرض اور واجب کو چھوڑ دینا خود ایک بڑا گناہ ہے۔ اس وعدۂ معافی کی تین صورتیں بیان کی جاسکتی ہیں:

(۱) اگر کسی سے کوئی چھوٹا گناہ سرزد ہو جائے، لیکن وہ بڑے گناہوں سے بچتا رہے اور اطاعتِ الٰہی میں پابندی اختیار کرے، تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اُس کے صغیرہ گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص عبادات اور طاعت کا تو پابند ہو، مگر بڑے گناہوں سے اجتناب نہ کرے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بڑے گناہوں سے تو بچتا ہو، لیکن واجبات اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہو۔

ان دونوں اخیر صورتوں میں معافی کا وعدہ نہیں ہے۔ ہاں، اللہ کا فضل الگ بات ہے، وہ چاہے تو بڑے گناہوں کے باوجود بھی معاف فرما دے، لیکن چونکہ یہاں وعدہ نہیں کیا گیا، اس لئے ایسی حالت میں آخرت میں پکڑ کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔

چونکہ آیت میں ''بڑے گناہوں'' کا ذکر آیا ہے، اس لئے یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ گناہِ کبیرہ کیا ہے اور اس کے مقابلے میں گناہِ صغیرہ کی کیا تعریف ہے۔

گناہِ کبیرہ کی تعریف

گناہِ کبیرہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن وحدیث میں کوئی مقررہ حد (دنیاوی سزا) بیان فرمائی ہو، یا اُس کے مرتکبین پر لعنت کی گئی ہو، یا آخرت میں جہنم اور سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہو بی یہ سب گناہ کبیرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

گناہِ صغیرہ کی تعریف

گناہِ صغیرہ وہ ہے جس سے منع تو کیا گیا ہو، مگر اُس پر غضب، لعنت یا شدید وعید کا ذکر نہ ہو۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان گناہوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر چھوٹے گناہوں کو لا پروائی اور جرأت کے ساتھ کیا جائے یا ان پر اصرار کیا جائے، تو یہی صغیرہ گناہ بھی کبیرہ کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

گناہ کسے کہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ گناہ اُس عمل کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اُس کی رضا کے خلاف ہو۔ اس اعتبار سے جس گناہ کو بظاہر ''چھوٹا'' کہا جاتا ہے، وہ بھی اپنی حقیقت میں معمولی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہر حال میں سنگین جرم ہے۔ چنانچہ کبیرہ اور صغیرہ کا فرق محض باہمی تقابل کے اعتبار سے کیا جاتا ہے، ورنہ دونوں ہی قسم کے گناہوں سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

بعض اہلِ علم نے اس فرق کو یوں واضح کیا ہے کہ چھوٹے اور بڑے گناہوں کی مثال چھوٹے اور بڑے بچھو یا آگ کی معمولی چنگاری اور بھڑکتے ہوئے انگارے کی سی ہے۔ اس لئے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان دونوں سے یکساں احتیاط برتے۔ البتہ اصولی طور پر بڑے گناہ بغیر سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے، جبکہ چھوٹے گناہوں کا کفارہ نیک اعمال کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ اس کے گناہ جھڑتے جاتے ہیں۔ چہرہ دھونے سے آنکھ، کان اور ناک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، کلی کرنے سے زبان کی خطائیں دھل جاتی ہیں، اور پاؤں دھونے سے قدموں کے گناہ بھی مٹ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ مسجد کی طرف بڑھتا ہے تو ہر قدم کے ساتھ مزید گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے۔

چند نمایاں گناہ کبیرہ

قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء نے گناہِ کبیرہ کی ایک طویل فہرست بیان کی ہے، جن میں سے چند نمایاں گناہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، ناحق قتل، زنا، یتیموں کا مال کھانا، والدین کی نافرمانی، لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنا، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا، ظلم وزیادتی، امانت میں خیانت، اللہ کی رحمت سے مایوسی، فرائض جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو ترک کرنا۔

قرآن پڑھ کر بھلا دینا، جھوٹ بولنا خصوصاً جھوٹی قسم کھانا، اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا یا سجدہ کرنا، سود لینا، جوا کھیلنا، بے حیائی کے مشاغل میں مشغول ہونا، کفار کی رسموں کو پسند کرنا، جہاد سے فرار اختیار کرنا، وصیت میں ظلم کرنا، جادوگری، جھوٹی گواہی، گناہوں پر اصرار، شراب نوشی، چوری، غصب، قطع رحمی، ناپ تول میں خیانت، رشوت لینا، میاں بیوی میں فساد ڈالنا، حرام جانوروں کا گوشت کھانا، یہ سب ایسے اعمال ہیں جن کی حرمت احادیث میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر قسم کے چھوٹے اور بڑے گناہوں سے محفوظ رکھے۔ جو لوگ بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور کبھی بھول چوک سے چھوٹے گناہوں میں مبتلا ہو جائیں تو اُن کے لیے اللہ تعالیٰ نے معافی کا وعدہ فرمایا ہے، بلکہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيمًا ہم تمہیں ایک باعزت مقام، یعنی جنت میں داخل کریں گے۔

آیت نمبر (۳۲) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''اور تم تمنا نہ کرو اس کی جو اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ہے، اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ہے۔ اور اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''۔

شانِ نزول اور حکمتِ الٰہی

تفسیر ان آیات کے شانِ نزول کے بارے میں روایت ہے کہ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت اُمِّ سلمیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک موقع پر بطورِ تمنا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے، تاکہ ہمیں

بھی مردوں کی طرح میراث میں دوہرا حصہ ملتا اور دیگر احکام میں بھی ہم اُن کے برابر ہوتے، کیونکہ بعض معاملات میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابیہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! مرد کو میراث میں دوگنا حصہ ملتا ہے اور عورت کی گواہی بھی مرد کے مقابلے میں آدھی ہے، تو کیا عبادات اور اعمال میں بھی ہمیں نصف ہی ثواب ملے گا؟'' اس سوال پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں حضرت اُمِّ سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تمنا اور اُس صحابیہ کے سوال، دونوں کا جامع جواب دیا گیا:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی تم اُن چیزوں کی تمنا نہ کرو جن میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو کسی معاملے میں برتری عطا فرمائی ہے، جیسے مردوں کو میراث میں دوہرا حصہ یا بعض معاملات میں گواہی کی تکمیل تو دوسرے کو اس کی خواہش اور حرص میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے حسد، باہمی بغض اور اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کا پہلو پیدا ہوتا ہے، جو ہرگز پسندیدہ نہیں۔

● حضرت اُمِّ سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''مرد غزوات میں شریک ہوتے ہیں جبکہ عورتیں نہیں ہوتیں، اسی وجہ سے میراث میں اُن کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے''۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۲۲)

صلاحیت یا کمالات کی تقسیم

ان آیات کے ذریعے یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل حکمت کے ساتھ لوگوں میں کمالات اور فضائل کو تقسیم فرمایا ہے۔ کسی کو کسی اعتبار سے برتری دی، کسی کو کسی اور جہت میں۔ کسی کو زیادہ عطا فرمایا اور کسی کو کم اور یہی تقسیم حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اپنی حالت پر راضی اور شاکر رہنا چاہئے اور دوسروں کے امتیازات کی تمنا میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے دل کے اضطراب اور حسد کے گناہ کے کچھ نہیں۔

نعمتوں کا شکر

جسے اللہ تعالیٰ نے مرد بنایا، وہ اس پر شکر ادا کرے، اور جسے عورت بنایا، وہ بھی اس پر راضی رہے اور یہ سمجھے کہ اگر وہ مرد ہوتی تو شاید مردوں کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کر پاتی اور گناہگار ہو جاتی۔ اسی طرح جسے حسن و جمال عطا ہوا، وہ اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر شکر گزار رہے، اور جسے یہ نعمت نہ ملی ہو، وہ مایوس نہ ہو بلکہ یہ یقین رکھے کہ اسی میں اس کے لئے خیر

پوشیدہ ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ حسن و جمال اسے کسی آزمائش یا فتنے میں مبتلا کر دیتا۔

اسی طرح جو شخص نسب کے اعتبار سے معزز خاندان، مثلاً سادات میں سے ہو، وہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے، اور جسے یہ نسبت حاصل نہ ہو، وہ اس کی تمنا میں نہ پڑے، کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ اس کے بجائے اسے اپنے اعمال کی اصلاح اور بہتری کی فکر کرنی چاہئے، کیونکہ نیک اعمال کے ذریعے وہ بلند نسب والوں سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔

نیکیوں کی ترغیب

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن وحدیث میں ''مسابقت فی الخیرات'' یعنی نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، تو پھر یہاں دوسروں کے فضائل کی تمنا سے کیوں روکا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ترغیب اُن امور سے متعلق ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، یعنی نیک اعمال، عبادات اور اخلاقی کمالات، جنہیں ہر شخص اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کر سکتا ہے۔

کوشش اور جدوجہد بجائے خود ایک پسندیدہ اور محمود عمل ہے۔ اس آیت کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے جس تمنا سے منع فرمایا ہے، اس سے مراد وہ غیر اختیاری فضائل ہیں جو دوسروں کو عطا کئے گئے ہوں، جیسے کسی کا عالی نسب ہونا، فطری حسن و جمال سے آراستہ ہونا یا شاہی خاندان میں پیدا ہونا۔ ایسے امور انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے، اس لئے ان کی تمنا سے روکا گیا ہے۔

البتہ وہ فضائل اور کمالات جو انسان کی محنت، عمل اور جدوجہد سے حاصل ہو سکتے ہیں، ان کی تمنا نہ صرف جائز بلکہ مفید ہے، بشرطیکہ اس تمنا کے ساتھ عملی کوشش اور مسلسل جدوجہد بھی شامل ہو۔

اسی مفہوم کی تائید اگلی آیت میں یوں فرمائی گئی: لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

یعنی مردوں کے لئے اُن کے اعمال کا حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی اُن کے اعمال کا حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو نیک اعمال مرد اپنی محنت اور کوشش سے کماتے ہیں، اُن کا اجر انہیں آخرت میں ملے گا، اور جو اعمالِ صالحہ عورتیں اپنی سعی و عمل سے حاصل کرتی ہیں، اُن کا بدلہ بھی انہیں پورا پورا عطا کیا جائے گا۔

مرد ہو یا عورت دونوں کا صلہ

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اُس کی محنت اور عمل کا مکمل صلہ دیا جائے گا۔

گویا وہ تمام کمالات جو اختیار اور کوشش سے حاصل کئے جا سکتے ہیں، ان کی طلب اور ان کے لئے جدوجہد ہرگز بے فائدہ نہیں، بلکہ ہر محنت کرنے والے کی کوشش بارآور ہوگی اور اس کی محنت ہرگز ضائع نہیں کی جائے گی۔ پھر ارشاد فرمایا:

وَاسْأَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

یعنی اللہ تعالیٰ سے اُس کے فضل وکرم کا سوال کرو، بے شک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اس ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی کو کسی ایسے کمال میں اپنے سے بڑھا ہوا دیکھو جو تمہارے اختیار میں نہیں، تو اس کی تمنا میں مبتلا ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے اُس کے فضل کی دعا کرو، کیونکہ اُس کے خزانے بے پایاں ہیں اور اُس کا فضل ہر ایک پر مختلف انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔

خیر کا سبب

درحقیقت کسی کے لئے مال و دولت اللہ کا فضل ہوتا ہے، مگر اگر وہی شخص تنگ دست ہو جائے تو ممکن ہے کہ گناہ اور کفر میں مبتلا ہو جائے؛ جبکہ کسی دوسرے کے لئے فقر و فاقہ ہی خیر کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ اگر اسے دولت مل جائے تو وہ گناہوں میں ڈوب سکتا ہے۔ اسی طرح کسی کے لئے عزت و منصب فضلِ الٰہی ہوتا ہے، جبکہ کسی کے لئے گمنامی اور سادگی ہی میں بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔

لہٰذا ہدایت یہی دی گئی کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے اُس کا فضل مانگا جائے، تاکہ وہ اپنی حکمت کے مطابق بندے پر اپنی عنایت کے دروازے کھول دے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا کامل علم رکھنے والا ہے، اس لئے اُس کی طرف سے بندوں میں جو تقسیم ہوئی ہے، وہ سراسر حکمت، عدل اور مصلحت پر مبنی ہے، ہر ایک کو اسی حال میں رکھا گیا ہے جو اُس کے حق میں بہتر اور مناسب ہے۔

آیت نمبر (۳۳) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

ترجمہ: ”اور ہم نے ہر ایک کے لیے وارث مقرر کیے ہیں، ان کے لیے جو چھوڑ گئے ہوں والدین اور قریبی رشتہ دار۔ اور جن سے تم نے معاہدہ کیا ہو، انہیں بھی ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے“۔

تفسیر جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا، بعض خواتین نے میراث کے معاملے میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اگر وہ مرد ہوتیں تو انہیں بھی دوگنا حصہ ملتا۔ اسی مناسبت سے اس دوسری آیت میں قانونِ میراث کو دوبارہ واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ تمام حصے کامل حکمت اور عدل پر مبنی ہیں۔

میراث کی تقسیم میں حکمتیں

انسانی عقل چونکہ تمام مصالح ومفاسد کا احاطہ نہیں کرسکتی، اس لئے وہ اُن گہری حکمتوں تک نہیں پہنچ سکتی جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین میں پوشیدہ ہیں۔ لہٰذا جو حصے مردوں اور عورتوں کے لیے متعین کردئے گئے ہیں، ان پر دل وجان سے راضی رہنا اور شکر ادا کرنا ہی بندگی کا تقاضا ہے، اور ان کے خلاف کسی قسم کی تمنا یا خواہش میں مبتلا ہونا مناسب نہیں۔

اسی لئے ارشاد فرمایا: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ط

یعنی جو کچھ والدین اور قریبی رشتہ دار اپنے پیچھے چھوڑ جائیں، ہم نے ہر ایک کے لئے اس کے وارث مقرر کر دئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل علم وحکمت کے تحت ہر وارث کا حصہ متعین فرمادیا ہے، لہٰذا اس میں تبدیلی کی خواہش یا تمنا کرنا درست نہیں۔

عہد و پیمان کی اہمیت

اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا

یعنی جن لوگوں سے تمہارا عہد و پیمان ہو چکا ہے، یعنی جن کے ساتھ تمہارا باہمی بھائی چارہ قائم ہو چکا ہے تو انہیں بھی ان کا مقررہ حصہ ادا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔

یہاں عہد و پیمان کی بنیاد پر حصہ دینے کا جو حکم بیان ہوا، وہ ابتدائی دور میں تھا جب مہاجرین اور انصار کے درمیان باہمی مؤاخات قائم کی گئی تھی۔

اس آیت کی تفسیر میں روایت آتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ روایت کے مطابق انہوں نے اپنے بیٹے کے اسلام قبول نہ کرنے پر قسم کھائی تھی کہ وہ اسے میراث میں سے کچھ نہیں دیں گے، لیکن جب اُس نے اسلام قبول کرلیا تو انہیں حکم دیا گیا کہ اسے اس کا حق دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عہد و پیمان اور حقوق کی ادائیگی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے ہر قسم کے ذاتی فیصلے اور جذبات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

اخوت یعنی منھ بولے بھائی

ابتدائی دورِ اسلام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابۂ کرامؓ کے درمیان باہمی اخوت قائم فرمائی تھی، جس کے تحت دو دو افراد کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا گیا، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے وارث بھی بنتے تھے۔ تاہم بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ اصول مقرر ہوا کہ میراث کا حق صرف قریبی رشتہ داروں کو حاصل ہے۔ البتہ منھ بولے

بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، اور وفات کے وقت ان کے حق میں ۲ کچھ وصیت کر دینا، ایک پسندیدہ اور مستحسن عمل قرار دیا گیا۔

خلاصہ: ان دونوں آیات میں حضرت اُمِّ سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دیگر صحابیات کے سوالات کا نہایت حکیمانہ اور عادلانہ جواب دیا گیا۔ اس میں یہ واضح کر دیا گیا کہ وہ امور جو انسان کے اختیار میں نہیں جیسے مرد یا عورت ہونا، نسب وحسب میں برتری، کسی با اثر خاندان میں پیدا ہونا، یا فطری حسن و جمال یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنی حالت پر راضی رہنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، کیونکہ اسی میں اس کے لئے خیر و مصلحت پوشیدہ ہے۔

البتہ وہ فضائل اور کمالات جو انسان کے اختیار میں ہیں اور محنت، عمل اور جد و جہد سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور جو آخرت میں نفع بخش ہیں، ان کی تمنا کرنا اور ان کے حصول کے لئے کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ مرد ہو یا عورت، جو بھی اخلاص کے ساتھ محنت اور عمل کرے گا، اس کی کوشش ہرگز ضائع نہیں جائے گی بلکہ اسے آخرت میں اس کا پورا پورا اجر عطا کیا جائے گا۔

موالی سے مراد

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''موالی'' سے مراد وارث ہیں، اور وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ کا مفہوم یہ تھا کہ مہاجر اپنے انصاری بھائی کا وارث ہوتا تھا اور انصاری کے قریبی رشتہ دار محروم رہتے تھے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہمی اخوت کا رشتہ قائم فرمایا تھا۔ پھر جب آیت وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اس طرح کی اخوت کی بنیاد پر میراث کا حق ختم کر دیا گیا۔ اب وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ قسم کھا کر دوستی اور خیر خواہی کا عہد کیا جائے؛ ان کے لیے میراث کا حق نہیں رہا، البتہ وصیت کی گنجائش باقی ہے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۸۰)**

اب تک کی آیات میں عورتوں کے حقوق کا بیان تھا، جن میں ان کے حقوق کی حفاظت اور ان پر ظلم و زیادتی سے روکنے کی تاکید کی گئی۔ اس کے بعد مردوں کے حقوق کا ذکر آتا ہے، جہاں یہ واضح کیا گیا کہ مردوں کو بعض امور میں عورتوں پر درجہ حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض فطری ذمہ داریوں اور خصوصیات کے سبب ایک خاص فضیلت عطا فرمائی ہے۔

❁ ❁ ❁

آیت نمبر ۳۴ سے ۴۳ تک

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

ترجمہ:

(۳۴) مرد عورتوں کے محافظ ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، اور اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مردوں کی غیر حاضری میں حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کی بدولت۔ اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا اندیشہ ہو، انہیں نصیحت کرو، اور انہیں بستروں میں

الگ کردو، اور (پھر بھی نہ مانیں) تو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں، تو ان پر (زیادتی کا) کوئی راستہ نہ تلاش کرو۔ بے شک اللہ سب سے بلند، بڑا ہے۔ (۳۵) اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان اختلاف کا خوف ہو، تو ایک ثالث مقرر کرو مرد کے خاندان سے، اور ایک عورت کے خاندان سے۔ اگر وہ صلح کا ارادہ کریں گے، تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، خبردار ہے۔ (۳۶) اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ حُسن سلوک کرو، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی اور اجنبی پڑوسیوں، ساتھ بیٹھنے والوں، مسافروں، اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی (حسن سلوک کرو)۔ بے شک اللہ تکبر کرنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۷) وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۳۸) اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال دکھاوے کے لیے، اور نہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ آخرت پر۔ اور جس کا شیطان ساتھی بن جائے، وہ بہت برا ساتھی ہے۔ (۳۹) اور انہیں کیا نقصان ہوتا اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آتے، اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے انہیں دیا ہے؟ اور اللہ ان کو خوب جاننے والا ہے۔ (۴۰) بے شک اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی نیکی ہو تو اس کو دوگنا کر دیتا ہے، اور اپنی طرف سے بڑا اجر عطا کرتا ہے۔ (۴۱) پھر کیا حال ہوگا اس دن جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے، اور آپ (اے رسولؐ) کو ان پر گواہ بنائیں گے؟ (۴۲) اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ (۴۳) اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو تم کہہ رہے ہو۔ اور نہ جنابت کی حالت میں، جب تک غسل نہ کرلو، مگر یہ کہ تم راستے سے گزر رہے ہو۔ اور اگر تم بیمار ہو، یا سفر پر ہو، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کر کے آئے، یا عورتوں سے ہمبستری کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ، تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۳۴ سے ۴۳ تک

آیت نمبر (۳۴) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا

عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

ترجمہ: ''مرد عورتوں کے محافظ ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، اور اس وجہ سے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مردوں کی غیر حاضری میں حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کی بدولت۔ اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا اندیشہ ہو، انہیں نصیحت کرو، اور انہیں بستروں میں الگ کر دو، اور (پھر بھی نہ مانیں) تو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں، تو ان پر (زیادتی کا) کوئی راستہ نہ تلاش کرو۔ بے شک اللہ سب سے بلند، بڑا ہے''۔

مرد کو عورت پر ایک درجے کا امتیاز

تفسیر اس سورت کے ابتدائی حصے میں عورتوں کے حقوق کو نہایت وضاحت اور حکمت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور زمانۂ جاہلیت کی وہ تمام قبیح رسمیں جو عورتوں پر ظلم و زیادتی کا باعث تھیں، اُن کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ اسلام نے عورت کو عزت، تحفظ اور انصاف عطا کیا اور اُس کے مقام کو بلند فرمایا۔ اب آگے کی آیات میں مردوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا ذکر آتا ہے، اور باہمی نظامِ حیات کو متوازن رکھنے کے اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

ان آیات کی تشریح یہ ہے کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ حاصل ہے، اور اگر عورتیں مردوں کے حقوق ادا نہ کریں تو مرد کو اصلاح کے لئے مناسب حدود کے اندر تادیب کی اجازت دی گئی ہے۔ نیز اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو اُس کو ختم کرنے کے لئے حکیمانہ طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ خاندان کا نظام بکھرنے سے محفوظ رہے۔

لفظ قوام کی تشریح

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ یعنی ''مرد عورتوں پر قوام (نگہبان اور ذمہ دار) ہیں''۔

یہاں ''قوام'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عربی زبان میں اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی نظام کو سنبھالنے، چلانے اور اس کی ذمہ داری اٹھانے والا ہو۔ اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ ''نگہبان''، ''منتظم'' یا ''ذمہ دار'' کیا جاتا ہے۔ یعنی گھریلو نظام میں مرد کو ایک ذمہ دار سربراہ کی حیثیت دی گئی ہے، جیسے کسی ریاست یا ادارے کے لئے ایک منتظم کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

مردوں کے امتیاز کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو یہ ذمہ داری دو بنیادوں پر عطا فرمائی ہے: بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ یعنی ایک تو اس وجہ سے کہ اللہ نے بعض (مردوں) کو بعض (عورتوں) پر فضیلت دی ہے، اور دوسری اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

چنانچہ مرد کی یہ حیثیت دو اسباب پر قائم ہے:

ایک فطری اور عطائی فضیلت، اور دوسرا اس کی مالی ذمہ داری۔ مرد عورت کا مہر ادا کرتا ہے، اس کے نان ونفقہ اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا کفیل بنتا ہے، اس لئے اس پر ذمہ داری بھی زیادہ عائد ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے اسے قوامیت عطا کی گئی ہے۔

فطری امتیاز

جہاں تک فطری فضیلت کا تعلق ہے، تو شریعت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مردوں کو بعض پہلوؤں میں عورتوں پر برتری عطا فرمائی ہے، جیسے عقل وفہم کی وسعت، غور وفکر اور تدبر کی صلاحیت، جسمانی قوت اور عملی میدان میں زیادہ برداشت۔ اسی طرح نبوت، امامت، خلافت، جہاد، جمعہ وعیدین کی امامت، اذان وخطبہ، اور دیگر اجتماعی ذمہ داریاں مردوں کے سپرد کی گئیں۔ میراث میں بعض صورتوں میں اضافہ، نکاح کی ولایت، تعددِ ازواج کی اجازت، طلاق کا اختیار، اور عبادات کی ادائیگی میں بعض فطری رکاوٹوں (جیسے حیض ونفاس) سے آزادی بھی مردوں کے امتیازات میں شامل ہیں۔

جواب دہی کی ذمہ داری

● یہ تمام امور اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ مرد کو جو درجہ دیا گیا ہے وہ محض فضیلت نہیں بلکہ ایک بڑی ذمہ داری اور جواب دہی بھی ہے، تاکہ وہ عدل، حکمت اور حسنِ سلوک کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرے اور گھر کے نظام کو صحیح طور پر قائم رکھے۔

● انہی فضائل اور امتیازات کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر میں کسی کو یہ حکم دیتا کہ وہ کسی کے سامنے سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۵۹)**

یہ ارشاد دراصل شوہر کے حق اور اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہے، نہ کہ حقیقی سجدے کے جواز کے لئے۔

جسمانی قوت

جسمانی قوت کے اعتبار سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کمزور کو طاقتور پر نہ

حکمرانی کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ اس کی قدرت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں نزاکت، لطافت اور نرمی رکھی ہے، جبکہ مرد کو حرارت، قوت اور جفاکشی سے نوازا ہے۔

اسی فطری تقسیم کی وجہ سے جنگ و جدال، جہاد، شجاعت و بہادری، میدانِ کارزار میں جانبازی، سلطنت و حکومت کا قیام، اور سرحدوں کی حفاظت جیسے اہم اور سخت ذمہ داری والے امور مردوں کے سپرد کئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس عورت کی فطری نزاکت، حمل اور ولادت جیسے مراحل اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کی ذمہ داریاں مختلف نوعیت کی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر ایک درجہ اور فوقیت عطا فرمائی، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

مختلف ذمہ داریاں

دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد اپنی کمائی میں سے عورت پر خرچ کرتا ہے، اسے مہر دیتا ہے، اور اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اس کا محسن بھی ہے، اور عام اصول کے مطابق محسن کو ایک درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر قدرت نے عورت کو مرد کے تابع اور اس کے زیرِ انتظام رکھا ہے۔

مرد کی اس فطری برتری اور ذمہ داری کو واضح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نیک اور بدخصلت عورتوں کا ذکر فرمایا۔ نیک عورتوں کے بارے میں ارشاد ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

یعنی نیک عورتیں وہ ہیں جو اطاعت گزار ہوتی ہیں، اور اللہ کی توفیق سے شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس کی عزت، اپنی عفت، اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے حقوق کو پہچانتی ہیں، اس کی اطاعت کو قبول کرتی ہیں، اور اس کی غیر حاضری میں بھی کسی قسم کی خیانت کا ارتکاب نہیں کرتیں۔

بہترین عورت

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہیں خوشی ہو، جب تم اسے حکم دو تو وہ اطاعت کرے، اور جب تم اس سے غائب ہو تو وہ اپنے نفس اور تمہارے مال کی حفاظت کرے''۔ اس کے بعد ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو نافرمان یا بدخصلت ہوں اور شوہروں کے حقوق میں کوتاہی کریں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ

یعنی جن عورتوں کی سرکشی اور نافرمانی کا اندیشہ ہو، ان کی اصلاح کے لئے تدریجی طریقہ اختیار کیا جائے۔ سب

سے پہلے نرمی کے ساتھ نصیحت اور سمجھانا، اگر اس سے اثر نہ ہو تو بستر میں علیحدگی اختیار کرنا تاکہ وہ اس رویے سے متأثر ہو کر اپنی اصلاح کرے۔ اگر یہ طریقہ بھی کارگر نہ ہو تو آخری درجہ کے طور پر ہلکی اور غیر تکلیف دہ تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے، جس میں نہ چہرے پر ضرب ہو، نہ جسم پر نشان پڑے، اور نہ کوئی نقصان پہنچے۔

علامتی تنبیہ

بعض مفسرین نے یہاں تک لکھا ہے کہ مسواک یا ہلکی سی چیز سے علامتی طور پر تنبیہ کی جائے، مگر نبی کریم ﷺ نے اس طریقے کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ شریف اور با اخلاق لوگ ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے۔

امام شافعیؒ بھی فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ جائز ہے، لیکن ترک کرنا افضل ہے۔ اگر ان تدابیر کے نتیجے میں عورت اصلاح اختیار کر لے اور اطاعت کی راہ پر آ جائے تو مرد کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ زیادتی، الزام تراشی اور سختی کا راستہ چھوڑ دے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا

یعنی جب وہ اطاعت کرنے لگیں تو ان پر ظلم و زیادتی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ بلند شان اور عظمت والا ہے۔ وہ ظالم مردوں سے مظلوم عورتوں کا بدلہ لینے پر پوری قدرت رکھتا ہے، لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اور انصاف کا معاملہ کرو، اور یاد رکھو کہ جس طرح تمہیں ان پر قدرت حاصل ہے، اس سے کہیں زیادہ اللہ کو تم پر قدرت حاصل ہے۔

عورتوں کو مارنے کی ممانعت

● حضرت عبداللہ بن زمعہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص اپنی بیوی کو غلام کی طرح نہ مارے، کیونکہ پھر وہی دن کے آخر میں اس سے تعلق قائم کرے گا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۲۰۴)

فائدہ: یہ پورا نظام اس لئے وضع کیا گیا کہ میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات گھر کی چار دیواری کے اندر ہی حکمت اور تدبر کے ساتھ حل ہو جائیں اور نوبت بگاڑ تک نہ پہنچے۔ لیکن اگر اختلاف شدت اختیار کر لے، خواہ عورت کی سرکشی کی وجہ سے ہو یا مرد کی زیادتی کی بنا پر، اور بدمزاجی بڑھتی جائے، تو ایسے حالات میں اس نزاع کو ختم کرنے کا ایک اور منصفانہ طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے، تاکہ خاندان کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہے۔

آیت نمبر (۳۵) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان اختلاف کا خوف ہو، تو ایک ثالث مقرر کرو مرد کے خاندان سے، اور ایک عورت کے خاندان سے۔ اگر وہ صلح کا ارادہ کریں گے، تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، خبردار ہے''۔

منصفانہ طریقہ

تفسیر اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والا اختلاف وہ خود آپس میں حل نہیں کر سکیں گے، تو ایسی صورت میں چاہئے کہ ایک صاحبِ فہم اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والا شخص مرد کے خاندان سے، اور اسی وصف کا حامل ایک شخص عورت کے خاندان سے مقرر کیا جائے۔

یہ دونوں افراد اس نزاع کو سلجھانے کے لئے ان کے پاس جائیں، حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ قصور کس کا ہے یا دونوں میں کس حد تک کوتاہی پائی جاتی ہے۔ پھر اخلاص اور خیرخواہی کے ساتھ انہیں سمجھائیں اور اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر وہ دونوں (میاں بیوی) سچے دل سے صلح و اصلاح کا ارادہ کرلیں، تو اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادیتا ہے۔

حکیمانہ دستور

ان آیات میں انسانی گھریلو زندگی کے لئے ایسا جامع اور حکیمانہ دستور پیش کیا گیا ہے کہ اگر اس پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے تو دنیا کے بیشتر گھریلو تنازعات ختم ہو سکتے ہیں، اور مرد و عورت باہمی سکون، اطمینان اور محبت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔

اسلام اور قرآنی تعلیمات کے نزول سے پہلے دنیا کے مختلف معاشروں میں میاں بیوی کے تعلقات میں شدید بے اعتدالی پائی جاتی تھی۔ کہیں عورت کو سرے سے کوئی حق حاصل نہ تھا، اور کہیں اس کی حیثیت نہایت پست تھی۔ اسلام نے آکر عورت کو عزت و وقار عطا کیا، اور اسے ماں، بیوی، بیٹی اور بہن ہر حیثیت میں اس کے جائز حقوق اور بلند درجات سے نوازا۔

نکاح کے بعد جدائی کی صورت

اسی طرح بعض معاشروں میں نکاح کے بعد جدائی کی کوئی جائز اور منصفانہ صورت موجود نہ تھی، جبکہ کہیں طلاق کو محض کھیل اور مذاق بنا دیا گیا تھا، کہ معمولی باتوں پر بیوی کو گھر سے نکال دیا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے ان تمام بے اعتدالیوں کی اصلاح کی، اور نکاح و طلاق کے اصولوں کو متوازن اور منصفانہ انداز میں مقرر کیا۔

میاں بیوی دونوں کے حقوق متعین کئے اور ایسی ہدایات عطا کیں کہ اگر اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو اس کا حل نکل سکے اور دونوں کی زندگی امن وسکون کے ساتھ قائم رہے۔

اس مقام تک سورت کے آغاز سے لے کر اب تک عام انسانی حقوق، یتیموں کے حقوق، وراثت کے مسائل، اور میاں بیوی کے باہمی حقوق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور عورتوں پر ہونے والے وہ تمام ظالمانہ اور غیر منصفانہ رسوم جن کا رواج زمانۂ جاہلیت میں تھا، ان کی اصلاح فرمادی گئی ہے۔

آیت نمبر (۳۶) وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۝۳۶

ترجمہ: ''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ حُسن سلوک کرو، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریبی اور اجنبی پڑوسیوں، ساتھ بیٹھنے والوں، مسافروں، اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی (حسن سلوک کرو)۔ بے شک اللہ تکبر کرنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

تفسیر یہاں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے باہمی حقوق سے پہلے اپنی عبادت، اطاعت اور عقیدۂ توحید کو بیان فرمایا، تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اسی لئے حکم دیا گیا کہ انسان اپنے رب کی عبادت وبندگی اختیار کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانا جائے، اس کی ذات، صفات، عبادت اور عظمت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، کیونکہ شرک ایسا سنگین جرم ہے جو اللہ کے ہاں ناقابلِ معافی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اس کی صراحت موجود ہے۔

والدین کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کو بیان فرمایا، اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک، ادب اور احسان کا حکم دیا۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کو لازم قرار دیا ہے، جس سے ان کے مقام ومرتبہ کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ والدین کے ساتھ احسان کے مختلف پہلو ہیں، جن میں یہ امور شامل ہیں:

۱۔ جسمانی خدمت: والدین کی ضروریات کے مطابق ان کی خدمت کرنا، خصوصاً بڑھاپے اور کمزوری کے زمانے

میں ان کا سہارا بننا۔

۲۔مالی معاونت: اگر والدین کو مالی ضرورت ہو تو خوش دلی کے ساتھ ان کی ضروریات کو پورا کرنا، اور اس میں کسی قسم کی تنگی یا بخل نہ دکھانا۔

۳۔نرم گفتاری اور ادب: والدین سے نہایت نرمی، محبت اور احترام کے ساتھ گفتگو کرنا، ایسا کوئی کلمہ نہ کہنا جس سے ان کی دل آزاری یا بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو۔

۴۔تعلقات کا احترام: والدین کے دوستوں، عزیزوں اور متعلقین کے ساتھ بھی حسنِ سلوک رکھنا، اور ایسا کوئی رویہ اختیار نہ کرنا جس سے والدین کو تکلیف پہنچے۔

۵۔اطاعتِ والدین: شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے والدین کے احکام کی تعمیل کرنا۔ یہاں تک کہ اگر والدین نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو، تب بھی اولاد کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کے ساتھ بدسلوکی کرے یا بے ادبی کا مظاہرہ کرے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

مزید یہ کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک محض ظاہری خدمت تک محدود نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے محبت، خیر خواہی اور دعا بھی ضروری ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا، ان کے نام پر صدقہ دینا، اور ان کے ناقص کاموں کو پورا کرنا اولاد کی سعادت مندی کی علامت ہے۔

● قرآنِ کریم نے تو یہاں تک تعلیم دی کہ اگر والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے ''اُف'' تک نہ کہا جائے، بلکہ نہایت عاجزی اور شفقت کے ساتھ ان سے پیش آیا جائے، اور ان کے لئے یہ دعا کی جائے: ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا'' (اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا)

حقوق کی ادائیگی

● حقیقت یہ ہے کہ والدین کے حقوق کی ادائیگی انسان کے اخلاق، ایمان اور شرافت کا آئینہ ہے، اور جو شخص اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رضا اور قربت حاصل کرتا ہے۔

● حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دس اہم وصیتیں ارشاد فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، خواہ اس کی پاداش میں انسان کو قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے۔ دوسری وصیت یہ فرمائی کہ والدین کی ہرگز نافرمانی نہ کرو اور نہ ہی ان کا دل دکھاؤ، چاہے وہ تمہیں یہ حکم

دیں کہ تم اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو بھی چھوڑ دو۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۴۲۵)

● اسی طرح ایک حدیثِ شریف میں وارد ہوا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے''۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۰۰)

والدین کی نافرمانی کا وبال

بیہقی کی ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دیگر گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، لیکن جو شخص اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرے اور ان کی دل آزاری کا سبب بنے، اسے آخرت سے پہلے ہی دنیا میں مختلف قسم کی آزمائشوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۷۲۶۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں جہاں والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی سخت تاکید آئی ہے، وہیں ان کے بے شمار فضائل اور بلند درجات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

رزق اور عمر میں برکت

● چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی اور عمر میں برکت ہو، اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے''، یعنی اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے اور ان کے ساتھ تعلقات کو جوڑے رکھے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۹۸۶، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۵۷)

مقبول حج کا ثواب

اسی طرح شعب الایمان میں بیہقیؒ نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو بیٹا اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور محبت واحترام کی نظر سے ان کی طرف دیکھے، تو اس کے ہر نظر ڈالنے پر اسے ایک مقبول حج کا ثواب عطا کیا جاتا ہے''۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۴۹۴۴)

اس آیت میں والدین کے بعد عام طور پر تمام رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے: وَبِذِی الْقُرْبٰی یعنی قرابت داروں کے حقوق ادا کرنا بھی ایمان اور اخلاق کا لازمی تقاضا ہے۔

قرآنِ کریم کی ایک نہایت جامع اور مشہور آیت، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر اپنے خطبات کے اختتام پر تلاوت فرمایا کرتے تھے، وہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤءِ ذِي الْقُرْبٰى (سورہ نحل: ۹۰)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے، حسنِ سلوک اختیار کیا جائے، اور خصوصاً رشتہ داروں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ اس میں یہ تمام پہلو شامل ہیں کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق اپنے

عزیزوں کی مالی اور جسمانی مدد کرے، ان سے تعلق قائم رکھے، ان کی خبر گیری کرے، ان سے قطع تعلقی نہ کرے، اور نہ ہی ان کے ساتھ تکبر، سختی یا بے رخی کا معاملہ کرے۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ غریب اور کمزور رشتہ داروں کو حقیر نہ سمجھا جائے، بلکہ عزت، شفقت اور محبت کے ساتھ ان کے ساتھ پیش آیا جائے۔ یہی وہ اخلاقی تعلیمات ہیں جو ایک مضبوط، ہمدرد اور متوازن معاشرے کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک

تیسرے درجے میں اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ارشاد فرمایا۔ اگرچہ سورت کے آغاز میں بھی یتیموں کے حقوق تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں، لیکن یہاں دوبارہ اس کی تاکید کی گئی ہے تاکہ ان کے حقوق کی اہمیت دلوں میں راسخ ہو جائے۔

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا مفہوم صرف مالی مدد تک محدود نہیں، بلکہ اس میں ان کی دلجوئی، تسلی و تشفی، خبر گیری، مناسب پرورش و تربیت، اور ان کے ساتھ نرمی، شفقت اور خوش اخلاقی کا برتاؤ سب شامل ہے۔ یتیم دراصل معاشرے کی ایک نازک ذمہ داری ہے، جن کی کفالت اور نگہداشت اللہ تعالیٰ کے یہاں عظیم اجر کا سبب ہے۔

اس کے بعد مساکین (غریب و نادار لوگوں) کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا۔ اس میں یہ شامل ہے کہ ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے، جہاں تک ممکن ہو ان کی مالی اور عملی مدد کی جائے، ان کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے، اور انہیں کسی بھی قسم کی مدد سے محروم نہ رکھا جائے۔ غریبوں کے ساتھ ہمدردی، نرمی اور عزت کے ساتھ پیش آنا ایک مہذب اور باایمان معاشرے کی علامت ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق

پھر فرمایا: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى یعنی قریبی پڑوسی اور ہمسایہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آس پاس رہنے والوں کی خبر گیری رکھو، اگر وہ بیمار ہوں تو عیادت کرو، اگر محتاج ہوں تو ان کی مدد کرو، اور وقتاً فوقتاً تحائف اور ہدیہ کے ذریعے محبت و تعلق کو مضبوط بناتے رہو۔ ہر وہ بات اور عمل جس سے پڑوسی کو تکلیف پہنچے، اس سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

اس امر پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریبی ہو یا دور کا، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بہرحال اس کا حق واجب ہے۔ اپنی وسعت کے مطابق اس کی مدد اور خیر خواہی کرنا ضروری ہے۔ البتہ جس پڑوسی کے ساتھ اضافی تعلقات ہوں، اس کا درجہ اور حق بھی زیادہ ہوگا۔

تین قسم کے پڑوسی

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پڑوسی تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) ایک وہ جس کا صرف ایک حق ہے: یعنی غیر مسلم پڑوسی جس سے کوئی قرابت نہ ہو۔

(۲) دوسرا وہ جس کے دو حق ہیں: یعنی مسلمان پڑوسی۔

(۳) تیسرا وہ جس کے تین حق ہیں: یعنی وہ پڑوسی جو مسلمان بھی ہو اور رشتہ دار بھی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جبرئیل امین مسلسل مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی وراثت میں شریک قرار دیا جائے گا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۱۴)**

ایک اور حدیث میں یہ سخت تنبیہ فرمائی گئی کہ کوئی شخص خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو یہ ایمان کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

دور کے پڑوسی اور عام معاشرتی تعلقات

اس کے بعد فرمایا: وَالْجَارِ الْجُنُبِ یعنی دور کے پڑوسیوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کیا جائے۔ اس میں اہلِ محلہ، گلی اور بستی کے لوگ سب شامل ہو جاتے ہیں۔ علماء کے درمیان پڑوسی کی حد کے تعین میں اختلاف ہے، بعض نے چالیس گھروں تک کو پڑوس قرار دیا، جبکہ بعض نے پورے محلے کو اس میں شامل کیا ہے۔

پھر فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ یعنی ساتھ بیٹھنے والے، ہم نشین اور رفیق کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو۔ یہ رفاقت خواہ سفر میں ہو، تجارت میں، تعلیم میں، یا کسی مجلس میں حتیٰ کہ ریل، بس یا جہاز میں چند لمحوں کے لئے ساتھ بیٹھنے والا بھی اس میں شامل ہے۔

اسلام نے جہاں مستقل پڑوسیوں کے حقوق بیان کئے، وہیں عارضی تعلقات رکھنے والوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی، تاکہ کسی کو بھی معمولی سی صحبت میں تکلیف نہ پہنچے۔

یہ تعلیمات اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ اگر ان پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے تو معاشرہ امن، محبت اور سکون کا گہوارہ بن جائے، اور نزاع و جھگڑے کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

مسافر اور محتاج کا حق

اس کے بعد فرمایا: وَابْنِ السَّبِيلِ یعنی مسافر، راہ گیر اور مہمان کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کیا جائے۔ اس میں

یہ شامل ہے کہ اس کی ضرورت کے مطابق مدد کی جائے، اس کی عزت کی جائے، اور اس کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ مسافر چونکہ اپنے وطن اور سہولیات سے دور ہوتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ تعاون اور مہمان نوازی خاص اہمیت رکھتی ہے۔

زیرِ کفالت افراد اور جانوروں کے حقوق

آخر میں فرمایا: وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ یعنی وہ سب جو تمہارے اختیار اور کفالت میں ہیں چاہے وہ غلام، خادم، ملازم، یا کوئی بھی خدمت گزار ہو، حتیٰ کہ جانور بھی، ان سب کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں یہ ہدایات شامل ہیں:

- ان کے کھانے پینے کا مناسب انتظام کیا جائے۔
- ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔
- گرمی و سردی میں ان کا خیال رکھا جائے۔
- ان کی اجرت اور حقوق بروقت ادا کئے جائیں۔
- اور ان کے ساتھ شفقت، عدل اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔

ان تمام ہدایات کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ اسلام صرف عبادات کا دین نہیں، بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو اللہ کے حقوق سے لے کر بندوں کے حقوق تک ہر پہلو میں متوازن، عادل اور رحم دل بناتا ہے۔

اگر یہ تعلیمات زندگی میں نافذ ہو جائیں تو نہ صرف فرد کی اصلاح ہوتی ہے بلکہ پورا معاشرہ امن، محبت، عدل اور خیر خواہی کا عملی نمونہ بن جاتا ہے۔

بڑائی جتلانے کی مذمت

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں فرماتے جو دل میں خود کو بڑا سمجھے اور زبان سے فخر و شیخی کا اظہار کرے۔

اس ارشاد میں نہایت لطیف انداز سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جن لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے، ان میں کوتاہی دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دل تکبر، غرور اور خود پسندی سے بھرے ہوتے ہیں۔

ایسے افراد نہ کسی کو اہمیت دیتے ہیں، نہ کسی کی حاجت کو محسوس کرتے ہیں، اور نہ ہی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

تکبر ایک نہایت خطرناک اور مہلک صفت ہے۔ اسی لئے حدیث میں اس کی شدید مذمت آئی ہے۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہو، اور جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۹۱)**

عاجزی کی تعلیم

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں، لیکن ان میں ایک بنیادی سبب تکبر ہے۔ جب انسان کے مزاج میں غرور آجاتا ہے تو وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے، اور اسی بنا پر وہ نہ اللہ کے حقوق کی صحیح قدر کرتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق کی۔

● حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رحم (رشتہ داری) رحمن سے نکلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: جو تجھے جوڑے گا، میں اسے جوڑوں گا، اور جو تجھے توڑے گا، میں اسے توڑ دوں گا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۹۸۸)**

● اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارا خادم تمہارے لئے کھانا لے کر آئے، اگر تم اسے اپنے ساتھ نہ بٹھا سکو تو کم از کم ایک دو لقمے اسے بھی دے دو''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۴۶۰)**

● اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۹۱)**

خلاصہ

ان تمام ارشادات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام انسان کو عاجزی، انکساری اور خدمتِ خلق کی تعلیم دیتا ہے، اور تکبر، غرور اور خود پسندی سے سختی کے ساتھ روکتا ہے۔ جو شخص اپنے اندر سے تکبر کو ختم کر لیتا ہے، وہی درحقیقت اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو صحیح طور پر ادا کرنے والا بن سکتا ہے۔

آیت نمبر (۳۷) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب

تیار کر رکھا ہے''۔

تکبر کرنے والوں کا انجام

تفسیر ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ جو لوگ حقوق ادا نہیں کرتے، ان کی بنیادی صفت تکبر ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ ایسے افراد عموماً بخل اور کنجوسی کے شکار ہوتے ہیں؛ دوسروں کو کچھ دینے میں ان کی جان پر بن آتی ہے۔ یا پھر وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع، حقوق کی ادائیگی پر ملنے والے اجر کے وعدوں اور کوتاہی پر ہونے والی وعیدوں پر ایمان نہیں رکھتے، جو حقیقت میں کفر کی ایک صورت ہے۔

بعض لوگوں کی عادت نام ونمود اور دکھاوے کی ہوتی ہے؛ چنانچہ جہاں شہرت کا موقع ہو وہاں خرچ کرتے ہیں، اور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں ہاتھ روک لیتے ہیں، خواہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سرے سے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے یا قیامت کے منکر ہوتے ہیں، اس لیے نہ انہیں اللہ کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور نہ آخرت کا ثواب، یہ بھی صریح کفر ہے۔ ایسے کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا ساتھی شیطان ہو جاتا ہے، وہ نہایت برا ساتھی ہے؛ وہ ہمیشہ ایسے مشورے دیتا ہے جن کا انجام خسارہ اور تباہی ہوتا ہے۔

یہود کا غرور

● حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ کے یہود کے بارے میں نازل ہوئی، جو سخت مغرور اور انتہائی کنجوس تھے۔ وہ نہ صرف اپنے مال میں بخل کرتے تھے بلکہ اس علم کو بھی چھپاتے تھے جو انہیں اپنی کتابوں سے حاصل تھا، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی بشارت اور آپ کی نشانیاں مذکور تھیں۔ حق کو پہچان لینے کے باوجود انہوں نے بخل اور عناد کا رویہ اختیار کیا؛ نہ خود اس پر عمل کیا اور نہ دوسروں کو اس کی خبر دی تاکہ وہ بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

بخل کی مذمت

ان ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں بھی بخل کرتے ہیں اور علم وایمان کے باب میں بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ یہ دراصل اللہ کی نعمتوں کے ناشکرے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے لیے آخرت میں ذلت آمیز عذاب تیار ہے۔

قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ میں بخل، یعنی مال کو روک کر رکھنے پر بار بار تنبیہ فرمائی گئی ہے اور اسے ہلاکت

خیز بیماری قرار دیا گیا ہے۔

تین خصلتوں سے پرہیز

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ، کیونکہ اسی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا''۔

● اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ سخی انسان اللہ کے قریب، جنت کے قریب اور لوگوں کے قریب ہوتا ہے، اور جہنم سے دور ہوتا ہے؛ جبکہ بخیل انسان اللہ سے دور، جنت سے دور اور لوگوں سے بھی دور ہو جاتا ہے، اور جہنم کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۶۱)

● حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دھوکے باز، بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا''۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۶۳)

یعنی یہ تینوں بری عادتیں فریب، کنجوسی اور احسان جتانا، ایسی مہلک صفات ہیں جو جنت کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اس لئے جو لوگ جنت کے طلبگار اور جہنم سے خوف رکھنے والے ہوں، انہیں چاہیے کہ ان خصلتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

متکبرین جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں، ان کی ایک نمایاں کمزوری یہ بھی بیان کی گئی کہ وہ واجب حقوق کی ادائیگی میں بھی بخل کرتے ہیں، اور مزید یہ کہ اپنی باتوں اور عمل کے ذریعے دوسروں کو بھی اسی بری خصلت کی طرف مائل اور آمادہ کرتے ہیں۔

آیت نمبر (۳۸) وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال دکھاوے کے لیے، اور نہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ آخرت پر۔ اور جس کا شیطان ساتھی بن جائے، وہ بہت برا ساتھی ہے''۔

نام ونمود کے لئے خرچ کرنے کی مذمت

تفسیر تکبر کرنے والوں کی ایک اور بری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خالص نیت سے خرچ نہیں کرتے، بلکہ لوگوں کو دکھانے، نام ونمود اور شہرت حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح واجب حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی اور بخل ایک بڑی برائی ہے، اسی طرح ریاکاری اور دکھاوے کے لئے خرچ کرنا بھی نہایت مذموم اور قابلِ نفرت عمل ہے۔

جولوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بجائے لوگوں کی نظر میں عزت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے نیکی کرتے ہیں، ان کے اعمال اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتے، کیونکہ عمل کی قبولیت کا دارومدار اخلاصِ نیت پر ہے۔

قبولیت کی بنیاد

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں شرک اور شرکت سے بالکل بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے، تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۸۵)**

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے بیزاری کا اظہار فرماتا ہے اور اس کا وہ عمل بالکل قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ اسی کے لئے ہوتا ہے جس کے لئے اس نے وہ عمل کیا ہو۔

قیامت کے دن

اسی مضمون کو مزید واضح کرتے ہوئے ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن، جب تمام انسانوں کو جمع کیا جائے گا، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں تو ایک منادی اعلان کرے گا: ''جس شخص نے اپنے کسی عمل میں، جو اس نے اللہ کے لئے کیا تھا، کسی اور کو شریک کیا ہو، وہ اس کا اجر اسی سے جا کر طلب کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۱۵۴)**

خلاصہ: ان آیات میں تکبر کے ساتھ جڑی ہوئی کئی مہلک صفات کی مذمت بیان کی گئی ہے، جیسے بخل، ریاکاری، اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لانا، اور آخرت پر یقین نہ رکھنا۔ اس کے بعد آگے ایمان بالآخرت اور اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور نیک اعمال سے غفلت برتتے ہیں، انہیں آخرت کے سخت اور دردناک انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

آیت نمبر (۳۹) وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

ترجمہ: ''اور انہیں کیا نقصان ہوتا اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آتے، اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے انہیں دیا ہے؟ اور اللہ ان کو خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر یعنی اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر صحیح اور کامل ایمان لے آتے، اور اللہ کے عذاب وثواب نیز قیامت کے حساب وکتاب کو سچے دل سے مان لیتے، اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور مال ودولت میں سے کچھ اس کی راہ

میں خرچ کرتے، تو آخران کا کیا نقصان ہوجاتا؟ جب ایمان میں کسی قسم کی کمی نہیں بلکہ سراسر اجروثواب کی امید ہے، تو پھر مال کی ناجائز محبت میں گرفتار ہوکر نافرمانی کا راستہ اختیار کرنا اور اپنی آخرت کو تباہی کے حوالے کر دینا کسی بھی صاحبِ عقل انسان کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اللہ پر ایمان لانا یا نہ لانا، قیامت وآخرت کو تسلیم کرنا یا اس کا انکار کرنا، اور سخاوت یا بخل اختیار کرنا، یہ سب تو انسان کے اپنے اعمال ہیں، اور شاید مرنے کے بعد یہ سب بے سود ثابت ہوں اور ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ اس وہم کے ازالے کے لئے ارشاد فرمایا گیا: وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيمًا

یعنی اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال، افعال، عقائد اور دلوں کے پوشیدہ احوال تک سے پوری طرح باخبر ہے۔ کوئی ادنیٰ چیز بھی اس کے علم سے اوجھل نہیں۔ وہ ہر نیکی اور ہر برائی کو خوب جانتا ہے، لہٰذا کسی کا کوئی عمل ہرگز ضائع نہیں جائے گا؛ بلکہ ہر شخص کو اس کے کردار کے مطابق مکمل جزا یا سزا دی جائے گی۔

آیت نمبر (۴۰) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی نیکی ہو تو اس کو دوگنا کر دیتا ہے، اور اپنی طرف سے بڑا اجر عطا کرتا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کسی بندے کے نیک عمل کے اجر میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں فرماتے، بلکہ اپنے فضلِ خاص سے اس میں اضافہ ہی فرماتے ہیں۔ وہ نہ صرف نیکی کا پورا بدلہ دیتے ہیں بلکہ اپنی رحمت اور کرم کے تقاضے کے مطابق اس اجر کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔

ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور اس کے بعد مختلف اسباب اور مواقع کے اعتبار سے اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال ایسے بھی ہیں جن کا اجر لاکھوں گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض روایات میں بیس لاکھ گنا تک اضافے کا ذکر ملتا ہے۔

اور پھر اللہ تعالیٰ تو سراسر کرم ورحمت والے ہیں؛ وہ اپنی بے پایاں مہربانی سے اتنا عطا فرماتے ہیں کہ وہ انسانی حساب وشمار سے ماورا ہوجاتا ہے۔ اس کے عطا کئے ہوئے اجروثواب کی نہ کوئی حد متعین کی جاسکتی ہے، نہ اس کی عظمت کا

صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ ربُّ العالمین کی طرف سے عطا ہوتا ہے، جس کی شانِ عطا بے مثال اور لامحدود ہے۔

آیت نمبر (۴۱) فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

ترجمہ: ''پھر کیا حال ہوگا اس دن جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے، اور آپ (اے رسولؐ) کو ان پر گواہ بنائیں گے؟''۔

تفسیر یعنی اُس ہولناک دن کا کیا عالم ہوگا جب ہر امت میں سے ایک ایک گواہ پیش کیا جائے گا، اور اے نبی ﷺ! آپ کو بھی اُن لوگوں کے خلاف گواہی دینے کے لیے حاضر کیا جائے گا جو آپ کی امت میں تھے۔ اس وقت دنیا میں اللہ کے احکام کو نہ ماننے والوں کے مقدمات پیش ہوں گے، اور بطورِ سرکاری گواہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی شہادتیں سنی جائیں گی۔ پھر ان گواہیوں کی بنیاد پر اختلافات کا فیصلہ ہوگا، جرم ثابت کیا جائے گا، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق سزا دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی روئیت

● حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانۂ مبارک میں بعض صحابہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھ سکیں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہاں، کیا تمہیں دوپہر کے وقت صاف آسمان میں سورج کو دیکھنے میں کوئی دشواری ہوتی ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''نہیں''۔ پھر فرمایا: ''اور کیا چودھویں رات کے چاند کو صاف آسمان میں دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟'' انہوں نے کہا: ''نہیں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسی طرح تم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھو گے، اور اس میں تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، جیسے سورج اور چاند کو دیکھنے میں نہیں ہوتی''۔ پھر آپ ﷺ نے اس عظیم دن کے مناظر بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن ایک منادی پکارے گا کہ ہر شخص اُس کے ساتھ ہو جائے جس کی وہ دنیا میں عبادت کرتا تھا''۔ چنانچہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی تھی بت، آستانے اور دیگر معبودانِ باطل، ان کے پجاری اپنے ان معبودوں کے ساتھ جہنم میں جا گریں گے، اور وہاں صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، خواہ ان میں نیک ہوں یا گناہگار مسلمان، نیز اہلِ کتاب کے کچھ افراد۔

پھر سب سے پہلے یہودیوں کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا: ''تم کس کی عبادت کرتے تھے؟'' وہ

کہیں گے: ''ہم حضرت عزیرؑ کی عبادت کرتے تھے، جو اللہ کے بیٹے ہیں''۔ تو ان سے کہا جائے گا: ''تم جھوٹ کہتے ہو، اللہ کی نہ کوئی بیوی ہے نہ بیٹا''۔ پھر ان سے کہا جائے گا: ''اب تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ عرض کریں گے: ''اے ہمارے رب! ہم شدید پیاسے ہیں، ہمیں پانی عطا کر''۔ تو انہیں ایک مقام کی طرف جانے کا اشارہ کیا جائے گا، مگر حقیقت میں وہ آگ ہوگی، جو سراب کی طرح دکھائی دے گی، اور اس کے شعلے ایک دوسرے کو روندتے ہوں گے، چنانچہ وہ اس میں جا گریں گے۔

اس کے بعد نصاریٰ کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا:

''تم کس کی عبادت کرتے تھے؟'' وہ کہیں گے: ''ہم حضرت عیسیٰؑ کی عبادت کرتے تھے، جو اللہ کے بیٹے ہیں''۔ تو ان سے کہا جائے گا: ''تم جھوٹ کہتے ہو، اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی بیوی ہے نہ بیٹا''۔ پھر ان سے بھی پوچھا جائے گا: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ بھی یہی کہیں گے، اور اسی طرح انہیں بھی دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ اس میں گر پڑیں گے۔

اس کے بعد میدان میں صرف وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، خواہ وہ نیک ہوں یا گناہگار، مگر سب موحد ہوں گے۔ اس وقت پروردگار ایک ایسی صورت میں جلوہ گر ہوگا جو پہلے دیکھی ہوئی صورت سے مشابہ ہوگی۔

ان سے پوچھا جائے گا: ''تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ ہر امت اپنے معبود کے ساتھ جا چکی ہے''۔ وہ عرض کریں گے: ''ہم دنیا میں بھی ان گمراہ لوگوں سے الگ رہے، ان کا ساتھ نہیں دیا، اور آج بھی ہم اپنے حقیقی معبود کے منتظر ہیں، جس کی ہم عبادت کرتے تھے''۔

اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں تمہارا رب ہوں''۔ تو وہ عرض کریں گے دو یا تین مرتبہ، ''ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے''۔ **(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ۸، حدیث ۴۵۸۱)**

قیامت کے دن انبیاء کی گواہی

مفسرین نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن کا اصل منظر اس طرح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بدکردار، سرکش اور نافرمان لوگوں کو جمع فرمائیں گے اور ان سے سوال ہوگا کہ تم نے سرکشی، انکارِ توحید اور اعمالِ صالحہ سے روگردانی کیوں اختیار کی؟ وہ لوگ جواب میں عرض کریں گے کہ ہم سے یہ کفر و شرک اور نافرمانیاں نادانی اور جہالت کی بنا پر ہوئیں؛ ہمیں آپ کا حقیقی حکم اور اصل قانون معلوم نہ تھا، اور ہمارے پاس حق و باطل میں فرق کرنے کا کوئی واضح معیار موجود نہ تھا۔

اس وقت ان منکرینِ حق کے دعوے کو رد کرنے کے لئے ہر امت کے پیغمبر کو بلایا جائے گا۔ انبیاء کرام علیہم

السلام صاف اور دوٹوک انداز میں گواہی دیں گے کہ ہم نے اللہ کا پیغام پوری وضاحت کے ساتھ پہنچا دیا تھا، مکمل قانونِ الٰہی کی تبلیغ کر دی تھی، لیکن ان لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا اور سرکشی اختیار کی۔ اب یہ لوگ جہالت کا عذر پیش کر رہے ہیں۔

اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باری آئے گی تو آپ کی امت کے کافر، مشرک، گنہگار اور بدکردار افراد کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ وہ بھی تبلیغِ احکام کا انکار کریں گے، تو اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہی کے لئے بلایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پوری طرح پہنچا دیے تھے، شریعت کا مکمل نظام ان کے سامنے واضح کر دیا تھا، انہیں نیکی اور حسنِ اخلاق کی دعوت دی تھی، مگر انہوں نے ضد اور انکار کے سوا کچھ قبول نہ کیا۔

اس طرح قرآنِ کریم کی اس آیت اور دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام کو بطورِ گواہ پیش کیا جائے گا، اور ہر نبی اپنی اپنی امت کے بارے میں شہادت دے گا، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنی امت کے اعمال پر گواہی دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن سننا

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا: ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ''۔ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں آپ کو سناؤں، حالانکہ قرآن آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، میرا دل چاہتا ہے کہ کسی اور سے سنوں''۔

چنانچہ انہوں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی، اور جب اس آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا... پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بس کرو''۔ حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کیونکہ اس آیت میں آخرت کا وہ ہولناک منظر اور اپنی امت کے کوتاہ عمل لوگوں کی حالت آپ کے سامنے آ گئی تھی۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۰۵۰)**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گواہی کی وضاحت

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری امت پر کیسے گواہی دیں گے، جبکہ گواہی تو عموماً مشاہدے پر مبنی ہوتی ہے اور پوری امت آپ کے زمانے میں موجود نہ تھی۔ اس کے جواب میں علماء نے مختلف توضیحات پیش کی ہیں:

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ روزانہ صبح و شام پوری امت کے اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، اور اسی علم کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن گواہی دیں گے۔

۲۔دوسرا یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری امت کے اعمال کا مکمل علم عطا فرما دیں گے، جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہادت دیں گے۔

۳۔تیسری توضیح یہ ہے کہ آیت میں مذکور ''هٰٓؤُلَآءِ'' سے مراد خاص لوگ ہیں، یعنی وہ کافر، مشرک، منافق اور گنہگار افراد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی کے بارے میں براہِ راست گواہی دیں گے۔

بہر حال، اس آیت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ پہلی امتوں کے انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے گواہ بن کر پیش ہوں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنی امت کے اعمال پر شہادت دیں گے۔

اس کے بعد آنے والی آیت میں میدانِ آخرت میں کافروں کی انتہائی بدحالی اور حسرت وندامت کا نہایت عبرت انگیز منظر بیان کیا گیا ہے، جس سے انسان کو انجامِ کار کا گہرا احساس ہوتا ہے۔

آیت نمبر (۴۲) يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

ترجمہ: ''اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے''۔

تفسیر یعنی قیامت کے دن جب انبیاء کرام علیہم السلام کی گواہیاں مکمل ہو جائیں گی، اعمال نامے کھول کر سامنے رکھ دئے جائیں گے، اور انسان کے اپنے ہاتھ پاؤں بھی اس کے خلاف گواہی دینے لگیں گے، تو گنہگار اور نافرمان لوگ سراسر جھوٹے ثابت ہو جائیں گے اور ان کا جرم پوری طرح ثابت ہو جائے گا۔

اس کے بعد عذاب سے نجات کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس ہولناک حالت میں وہ شدید حسرت و ندامت کے ساتھ تمنا کریں گے کہ کاش! وہ مٹی میں مل جاتے، یا زمین کا حصہ بن جاتے، تاکہ اس سخت باز پرس، حساب وکتاب اور عذاب سے بچ سکتے۔

اعضاء کی گواہی

اسی آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔ اگرچہ ابتدا میں کفار ومشرکین اپنے جرم کا انکار کریں گے، لیکن آخر کار حقیقت ان پر کھل جائے گی، کیونکہ ان کے اپنے اعضاء، ہاتھ، پاؤں اور دیگر

اعضاء ان کے گناہوں کے خلاف گواہی دیں گے، اور انہیں مجبوراً اپنے جرائم کا اقرار کرنا پڑے گا۔

● حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ قرآنِ کریم میں ایک مقام پر یہ فرمایا گیا ہے کہ کفار کچھ بھی نہ چھپا سکیں گے، جبکہ دوسرے مقام پر یہ ذکر ہے کہ وہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم نے شرک نہیں کیا۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس پر آپؓ نے وضاحت فرمائی کہ ابتدا میں جب کفار یہ دیکھیں گے کہ ایمان والوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہو رہا، تو وہ یہ تدبیر اختیار کریں گے کہ اپنے شرک اور برے اعمال کا انکار کر دیں، شاید اس طرح نجات حاصل ہو جائے۔ لیکن جب وہ انکار کریں گے تو ان کے اپنے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے، اور یوں ان کی یہ چال ناکام ہو جائے گی۔

لہٰذا فرمایا گیا کہ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات ہرگز نہیں چھپا سکیں گے، کیونکہ اس کے علم سے نہ کوئی ظاہر پوشیدہ ہے اور نہ کوئی باطن۔

آیت نمبر (۴۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو تم کہہ رہے ہو۔ اور نہ جنابت کی حالت میں، جب تک غسل نہ کر لو، مگر یہ کہ تم راستے سے گزر رہے ہو۔ اور اگر تم بیمار ہو، یا سفر پر ہو، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کر کے آئے، یا عورتوں سے ہمبستری کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ، تو پاک مٹی سے تیمم کر لو، اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ہے''۔

تفسیر آخر میں پھر اہلِ ایمان کو خطاب کر کے خاص طور پر نماز کی تاکید فرمائی گئی، جو تمام عبادات میں اعلیٰ ترین اور افضل عبادت ہے۔ شریعتِ مطہرہ نے اس کے اہتمام پر خاص زور دیا ہے، کیونکہ نماز انسان کو نیکی، احسان اور عدل کی طرف مائل کرتی ہے، ظلم اور حق تلفی سے روکتی ہے، اور توحید پر ثابت قدم رکھنے میں نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس آیت کے نزول کے متعلق محدثین نے بیان کیا ہے کہ سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن

نسائی اور المستدرک للحاکم میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ایک موقع پر ہمیں کھانے کی دعوت دی اور شراب بھی پیش کی۔ اس وقت شراب کی حرمت کا حکم مکمل طور پر نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ اس کے باعث ہمیں نشہ ہو گیا۔ اسی حالت میں نماز کا وقت آ گیا اور لوگوں نے مجھے امامت کے لیے آگے کر دیا۔ میں نے سورۂ کافرون کی تلاوت میں غلطی کر دی لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کی جگہ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ دیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ ''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ''۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر:۳۰۲۶)

جنابت کی صورت میں تیمم

● اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ وَلَا جُنُبًا والی آیت مسافر کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی اگر کسی کو جنابت لاحق ہو جائے اور پانی میسر نہ ہو تو وہ تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔

● طبرانی کی روایت کے مطابق ایک صحابی 'اسلع' بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور آپ کی اونٹنی کی تیاری کرتا تھا۔ ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلع! کجاوہ تیار کرو''۔ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں جنابت کی حالت میں ہوں''۔ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام تیمم کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلع! تیمم کر لو''، اور آپ ﷺ نے تیمم کا طریقہ سکھایا کہ ایک بار مٹی پر ہاتھ مار کر چہرے پر پھیرے جائیں اور دوسری بار ہاتھ مار کر کہنیوں تک ہاتھوں پر ملے جائیں۔ (سنن بیہقی، حدیث نمبر:۱۰)

● اسی طرح ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ بعض انصاری صحابہؓ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ اگر انہیں جنابت لاحق ہو جاتی اور پانی موجود نہ ہوتا، تو انہیں مسجد سے گزرے بغیر باہر جانے کا راستہ نہ ملتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ یعنی صرف بطورِ راستہ گزرنے کی اجازت ہے۔

بیماری کی صورت میں تیمم

● اسی طرح مجاہدؒ سے روایت ہے کہ ایک انصاری شخص سخت بیمار تھے، وہ وضو کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور نہ کوئی خدمت گزار موجود تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی مجبوری بیان کی، جس پر آیت وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى نازل ہوئی۔ حوالہ

● ابراہیم نخعیؒ سے بھی روایت ہے کہ بعض صحابہؓ زخمی ہو گئے تھے، ان کے بدن پر زخم تھے اور پھر انہیں جنابت لاحق ہو گئی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، تو اسی کے متعلق یہ حکم نازل ہوا کہ بیماری کی حالت میں تیمم کیا جا سکتا ہے۔

●اسی سیاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بعض علماء کے بارے میں نازل ہوئی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے الفاظ میں تحریف اور طعن و تشنیع کرتے تھے، جیسے ''اَرِعَنَا'' کہہ کر استہزاء کرتے تھے۔

نماز دلوں میں محبت، الفت اور اخوت پیدا کرتی ہے، خصوصاً جب جماعت کے ساتھ ادا کی جائے تو دلوں کی کدورتیں دور ہو جاتی ہیں، اور انسان اپنے بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور تعاون کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

دلوں کے اتحاد کا سبب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی صفوں کو سیدھا رکھا کرو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف اور دشمنی پیدا ہو جائے گی''۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۷۱۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا اور صفوں کی درستی نہ صرف ظاہری نظم ہے بلکہ دلوں کے اتحاد اور باہمی محبت کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح نماز کی پابندی انسان کے دل میں گناہوں سے نفرت پیدا کرتی ہے اور اسے تقویٰ کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

چونکہ نماز کے صحیح ہونے کے لئے بدن کی پاکی اور وضو بنیادی شرط ہیں، اس لئے ان آیات میں نماز کے ساتھ ساتھ طہارت اور وضو کے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس طرح ظاہری پاکیزگی بھی بالواسطہ طور پر اخلاقی پاکیزگی اور احسان کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے، اور انسان کو ایک پاکیزہ، منظم اور متوازن زندگی کی طرف رہنمائی دیتی ہے۔

نشے کی حالت میں نماز کی ممانعت

نشے کی حالت میں نماز ادا نہ کرنے کا حکم اُس وقت دیا گیا تھا جب تک شراب کی حرمت کا قطعی اور مکمل حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب شراب کو مکمل طور پر حرام قرار دے دیا گیا، تو نشہ نہ صرف نماز کے اوقات میں بلکہ ہر حال میں ناجائز ٹھہرا۔ اس طرح اس آیت کا ابتدائی حکم منسوخ ہو گیا، اور شراب سے مکمل اجتناب لازم قرار پایا۔

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں روایت کیا گیا ہے کہ ابتدا میں جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا، جس میں مہمانوں نے شراب بھی نوش کی۔ اسی دوران نمازِ مغرب کا وقت ہو گیا۔ حضرت علیؓ کو امامت کے لئے آگے کیا گیا، لیکن نشے کی حالت میں آپؓ نے سورہ قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ

کی تلاوت میں غلطی کر دی؛ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ کی جگہ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ دیا، جس سے معنیٰ بالکل بدل گئے اور بلا ارادہ خلافِ توحید کلمات ادا ہو گئے۔ بعد میں اس پر شدید ندامت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا گیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کر دیا گیا۔

تدریجی انداز میں شراب کی ممانعت

شراب نوشی عرب معاشرے کی قدیم عادت تھی، اور پوری قوم اس میں مبتلا تھی، سوائے چند ایسے افراد کے جن کی فطرت کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے پاکیزہ رکھا تھا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمانۂ نبوت سے پہلے بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی عادت کو ترک کرنا آسان نہیں ہوتا، خصوصاً نشہ آور چیزیں انسان کے مزاج پر اس طرح غالب آ جاتی ہیں کہ ان سے جدا ہونا گویا جان لیوا محسوس ہوتا ہے۔

حکمت

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شراب ابتدا ہی سے ناپسندیدہ اور ممنوع تھی، اور بعد میں مسلمانوں کو اس سے بچانا مقصود تھا۔ تاہم اگر اچانک اس کی حرمت کا حکم دے دیا جاتا تو اس پر عمل کرنا لوگوں کے لیے نہایت دشوار ہوتا۔ اس لیے حکمت کے ساتھ تدریجاً اس کی ممانعت کی گئی۔

ابتدا میں اس کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی گئی، پھر یہ حکم دیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ ایسی بری چیز ہے جو انسان کو اللہ کی عبادت سے روکتی ہے۔

چنانچہ بہت سے لوگوں نے اسی مرحلے سے اس کو ترک کرنا شروع کر دیا، اور باقی مسلمان بھی اس کی قباحت کو سمجھنے لگے۔ آخرکار سورۂ مائدہ میں واضح اور قطعی حکم نازل ہوا کہ شراب ناپاک اور حرام ہے، اور اس کے بعد ہر حال میں اس کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

دیگر حالتوں میں نماز کا حکم

جس طرح نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا، اسی طرح بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص پر شدید نیند کا غلبہ ہو یا بیماری کے باعث اس کی زبان پر قابو نہ رہے، تو ایسی حالت میں بھی نماز ادا کرنا مناسب نہیں۔ حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ اگر کسی کو نماز میں اونگھ آنے لگے تو اسے چاہیے کہ کچھ دیر آرام کر لے، تاکہ نیند کا اثر زائل ہو جائے، ورنہ وہ بے شعوری میں دعا کے بجائے اپنے ہی خلاف کلمات کہہ سکتا ہے۔

اسی طرح جنابت کی حالت میں، جب غسل فرض ہو، نماز ادا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، جب تک کہ غسل نہ

کرلیا جائے۔ البتہ اگر کوئی شرعی عذر موجود ہو جیسے پانی میسر نہ ہو یا استعمال ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے، جیسا کہ آیت کے اگلے حصے میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ یوں ان احکام کے ذریعے عبادت کی ظاہری و باطنی پاکیزگی، اور نماز کی ادائیگی میں کامل ہوشیاری، طہارت اور حضورِ قلب کو یقینی بنایا گیا ہے، تاکہ بندہ اپنے رب کے حضور صحیح معنوں میں حاضر ہو سکے۔

تیمم کی اجازت

یعنی اللہ تعالیٰ نے ضرورت اور مجبوری کے مواقع پر بندوں کے لئے آسانی فرماتے ہوئے تیمم کی اجازت عطا کی، اور پاک مٹی کو پانی کا قائم مقام قرار دے کر ایک سہل اور رحمت بھرا حکم نازل فرمایا۔

تین حالتوں میں تیمم کا حکم

اس آیت میں پانی کے استعمال نہ کرنے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ بیماری کی حالت: جب پانی کا استعمال صحت کے لئے نقصان دہ ہو۔

۲۔ سفر کی حالت: جب سفر میں پانی اس قدر کم ہو کہ اگر وضو یا غسل میں استعمال کیا جائے تو پیاس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو، اور آس پاس کہیں پانی دستیاب نہ ہو۔

۳۔ پانی کا نہ ہونا: جب سرے سے پانی موجود ہی نہ ہو۔

پانی نہ ملنے کی صورت میں طہارت کی دو حالتیں بیان فرمائی گئیں: ایک یہ کہ کوئی شخص قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو اور اسے وضو کی ضرورت ہو، یا میاں بیوی کے تعلق (ہمبستری) کے بعد غسل واجب ہو گیا ہو تو ان دونوں صورتوں میں پانی نہ ملنے پر تیمم کی اجازت دی گئی ہے۔

تیمم کے حکم کا واقعہ

اس آیت کے شانِ نزول کا واقعہ صحیح بخاری میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ روانگی سے پہلے میں نے اپنی بہن حضرت اسماءؓ سے ایک ہار عاریتاً لیا تھا، وہ راستے میں کہیں گر گیا۔ اس کی تلاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قافلے کو وہیں روک لیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس مقام پر نہ ہمارے پاس پانی تھا اور نہ ہی وہاں کہیں پانی موجود تھا۔ لوگوں نے میرے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شکایت کی کہ ہماری اس تاخیر کی وجہ سے سب کو دشواری پیش آ رہی ہے۔ چنانچہ وہ میرے پاس آئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما رہے تھے۔ انہوں نے مجھے سخت ملامت کی کہ تم نے

سب کو مشکل میں ڈال دیا، نہ پانی ہے اور نہ کہیں اس کا انتظام۔

اسی حالت میں رات گزر گئی، صبح ہوئی تو بھی پانی میسر نہ تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت نازل فرمائی، اور سب نے تیمم کر کے نماز ادا کی۔ بعد میں جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار تھی، تو وہی گم شدہ ہار اس کے نیچے سے مل گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خوش ہو کر فرمایا:

''تم بڑی بابرکت والی ہو، تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے کتنی بڑی آسانی عطا فرمائی''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۳۴)

جنابت میں تیمم کا طریقہ

حضرت عمارؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایک مہم پر بھیجا۔ دورانِ سفر انہیں جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہ ملا، تو وہ مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہو گئے جیسے کوئی جانور لوٹتا ہے۔ جب انہوں نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے لیے یہ کافی تھا''۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیمم کا درست طریقہ سکھایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ایک مرتبہ مٹی پر مارا، پھر ان پر پھونک ماری تاکہ زائد مٹی جھڑ جائے، اس کے بعد ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی پشت پر مسح کیا، اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرے کا مسح فرمایا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۳۸)**

● اسی مضمون کو سنن ابی داؤد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تیمم کے لئے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے لئے ایک ہی مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا کافی ہے۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۲۷)**

● اس طرح تیمم کا حکم اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اور آسانی کی ایک روشن مثال ہے، جس کے ذریعے بندوں کو عبادت سے محروم ہونے کے بجائے ہر حال میں طہارت اور عبادت کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

تیمم: امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی فضیلت

تیمم کی سہولت امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک خاص امتیاز اور اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے، جو اس سے پہلے کسی امت کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ یہ دینِ اسلام کی آسانی اور جامعیت کی روشن دلیل ہے۔

● صحیح مسلم کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمیں تمام لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئی ہیں: ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کے مشابہ بنائی گئیں، ہمارے لئے پوری زمین کو مسجد قرار دیا گیا، اور اس کی مٹی کو ہمارے لیے پاک اور پاک کرنے والی بنایا گیا، جب ہمیں پانی میسر نہ ہو۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۲۲)**

امت محمدیہ کی پانچ اہم خصوصیات

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی خصوصیات عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں:

۱۔ ایک مہینے کی مسافت تک دشمنوں کے دلوں میں میری ہیبت (رعب) ڈال کر میری مدد کی گئی۔

۲۔ پوری زمین کو میرے لئے مسجد اور ذریعۂ طہارت بنایا گیا، لہٰذا میری امت کا کوئی بھی فرد جہاں نماز کا وقت پائے، وہیں نماز ادا کرسکتا ہے، اور وہی زمین اس کے لئے وضو اور طہارت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۳۔ مالِ غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا، جو مجھ سے پہلے کسی کے لئے جائز نہ تھا۔

۴۔ مجھے شفاعت کا عظیم منصب عطا کیا گیا۔

۵۔ مجھ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے، جبکہ مجھے تمام انسانیت کے لئے مبعوث کیا گیا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۳۵)**

تیمم کے مسائل اور طریقہ

تیمم کرنے سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے، یعنی دل میں یہ ارادہ کیا جائے کہ میں طہارت حاصل کرنے یا نماز ادا کرنے کے لئے تیمم کررہا ہوں۔ نیت تیمم کی بنیادی شرط ہے۔

اس کے بعد دونوں ہاتھ پاک مٹی یا زمین پر مارے جائیں۔ اگر زیادہ گرد لگ جائے تو اسے جھاڑ دیا جائے، پھر ہاتھوں کو پورے چہرے پر اس طرح پھیرا جائے کہ کوئی حصہ باقی نہ رہے۔ اس کے بعد دوبارہ دونوں ہاتھ زمین پر مارے جائیں اور پھر کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں پر اچھی طرح مسح کیا جائے، اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کوئی حصہ یہاں تک کہ بال برابر بھی مسح سے رہ نہ جائے۔

● اگر انگلیوں میں انگوٹھی یا چھلہ ہو تو اسے اتار لینا چاہئے تاکہ مسح میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور تیمم صحیح طور پر ادا ہوسکے۔ یوں تیمم ایک آسان، جامع اور رحمت بھرا حکم ہے، جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلام نے عبادت کو ہر حال میں ممکن بنایا ہے، تاکہ بندہ کسی بھی حالت میں اپنے رب کی عبادت سے محروم نہ رہے۔

تیمم کن چیزوں سے جائز ہے

جو چیز زمین کی جنس سے تعلق رکھتی ہو، اُس سے تیمم کرنا جائز ہے، مثلاً: مٹی، ریت، پتھر، چونا، سرمہ، سنگِ مرمر، گندھک، گیرو، پکی ہوئی اینٹ، مٹی کے برتن، چاہے وہ خالی ہوں یا ان میں پانی بھرا ہو، نیز وہ نمک جو زمین

(کان) سے نکلتا ہے، وغیرہ۔غرض ہر وہ چیز جو اصل میں زمین سے ہو، تیمم کے لیے قابلِ استعمال ہے۔

کن چیزوں پر تیمم درست نہیں

راکھ پر تیمم کرنا درست نہیں، اسی طرح سونا، چاندی، فولاد، پیتل، تانبا، لکڑی، گھاس وغیرہ پر بھی تیمم جائز نہیں۔اسی طرح تکیہ، گدہ اور کپڑے پر بھی تیمم درست نہیں ہوتا۔البتہ اگر ان چیزوں پر اتنی گرد جمی ہو کہ ہاتھ مارنے سے گرد اُڑنے لگے، تو اس صورت میں اس گرد کے ذریعے تیمم کرنا جائز ہوگا۔

وضو اور غسل کے لئے تیمم

وضو اور غسل دونوں کے لئے تیمم کا طریقہ ایک ہی ہے، فرق صرف نیت کا ہوتا ہے۔وضو کے لئے تیمم کرتے وقت یہ نیت ہو کہ یہ وضو کے قائم مقام ہے، اور غسل کے لیے تیمم کرتے وقت یہ نیت کی جائے کہ یہ غسل کے قائم مقام ہے۔

اگر کوئی شخص ایک ہی تیمم کے ذریعے وضو اور غسل دونوں کا بدل حاصل کرنا چاہے تو یہ بھی درست ہے۔ایسی صورت میں اگر وضو ٹوٹ جائے تو تیمم وضو کے اعتبار سے ختم ہو جائے گا، لیکن غسل کے اعتبار سے باقی رہے گا، جب تک کہ کوئی ایسی چیز واقع نہ ہو جو غسل کو واجب کر دے۔

تیمم کے ٹوٹنے کا حکم

جس عذر کی وجہ سے تیمم کیا گیا ہو، اُس کے ختم ہو جانے سے تیمم بھی ختم ہو جاتا ہے۔مثلاً اگر کسی نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا تھا، اور بعد میں پانی میسر آ گیا، تو تیمم باقی نہیں رہے گا۔اسی طرح جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انہی چیزوں سے تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔مزید تفصیلی مسائل فقہ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہیں، جہاں سے ان کی مزید وضاحت حاصل کی جاسکتی ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۴۴ سے ۵۵ تک

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا وَاسۡمَعۡ غَيۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلۡسِنَتِهِمۡ وَطَعۡنًا فِى الدِّيۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰكِنۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۴۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدۡبَارِهَاۤ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَرٰۤى اِثۡمًا عَظِيۡمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَآءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يَّلۡعَنِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ نَصِيۡرًا ﴿۵۲﴾ اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ﴿۵۳﴾ اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا ﴿۵۵﴾

ترجمہ:

(۴۴) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہِ راست سے بھٹک جاؤ۔ (۴۵) اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، اور اللہ کافی ہے دوست ہونے کے لیے، اور اللہ کافی ہے مددگار ہونے کے لیے۔ (۴۶) کچھ یہودی ایسے بھی ہیں جو باتوں کو ان کی اصل جگہوں سے بدل دیتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: ''ہم نے سنا اور نافرمانی کی''، اور ''سنو، تم سننے کے لائق نہیں ہو''، اور ''راعنا'' (جس کا مطلب وہ طنزیہ انداز میں ''ہمارا چرواہا'' لیتے ہیں)، تاکہ دینِ حق کا مذاق اُڑائیں۔ حالانکہ اگر وہ کہتے: ''ہم نے سنا

اور مانا، اور سنیے اور ہماری طرف دیکھئے''، تو یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ درست ہوتا۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا، اس لیے وہ تھوڑے ہی لوگ ایمان لاتے ہیں۔ (۴۷) اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ اُس (قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا ہے، جو تصدیق کرتا ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو اور پھیر دیں انہیں ان کی پیٹھ کی طرف، یا ان پر لعنت کر دیں جیسے ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم تو پورا ہو کر رہتا ہے۔ (۴۸) اللہ کبھی نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اُس کے سوا جس گناہ کو چاہے، معاف فرما دے گا۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، اُس نے یقیناً بہت بڑا گناہ گڑھ لیا۔ (۴۹) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکی خود بیان کرتے ہیں؟ بلکہ اللہ ہی ہے جو جسے چاہے پاک کرتا ہے، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا دھاگے کے برابر بھی۔ (۵۰) دیکھو، وہ اللہ پر کیسا جھوٹ گڑھتے ہیں اور یہی کھلا گناہ کافی ہے۔ (۵۱) کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، وہ جادو اور شیطانی طاقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ (۵۲) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، اور جس پر اللہ لعنت کرے، اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ (۵۳) کیا ان کے پاس اللہ کی بادشاہت میں کوئی حصہ ہے؟ اگر ہوتا تو یہ دوسروں کو تل برابر بھی نہ دیتے۔ (۵۴) یا پھر وہ حسد کرتے ہیں ان لوگوں سے جنہیں اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے؟ تو یقیناً ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب، حکمت اور بڑی بادشاہی عطا کی تھی۔ (۵۵) چنانچہ ان میں کچھ لوگ ان پر ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا، اور جہنم کافی ہے جو بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۴۴ سے ۵۵ تک

آیت نمبر (۴۴) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہِ راست سے بھٹک جاؤ''۔

تفسیر تفسیر درِّ منثور (حصہ ۲، صفحہ ۱۶۸) میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ واقعہ منقول ہے کہ یہودیوں کے ایک سردار، رفاعہ بن زید، رسولِ اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ گفتگو کے دوران اپنی زبان کو پیچ دیتا، الفاظ کو بگاڑ کر ادا کرتا اور اس انداز سے کلام کرتا جس میں استہزاء اور طعنہ پوشیدہ ہوتا۔ اس نے نہ صرف اسلام پر

اعتراضات کیے بلکہ احکامِ شریعت میں بھی عیب جوئی کی کوشش کی۔ اس طرزِ عمل پر یہ آیتِ مبارکہ، ''اِلَّا قَلِیْلًا'' تک، نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو تورات کا علم عطا فرمایا تھا، مگر انہوں نے اپنی خواہشات کے تحت اس میں تحریف کر ڈالی۔ اس کے باوجود تورات میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت، نبوت اور رسالت کے واضح اشارات موجود تھے۔ لیکن ان کے علماء، حق کو پہچان لینے کے باوجود، نہ خود ایمان لائے اور نہ ہی اپنی قوم کو ایمان کی طرف آنے دیا۔ عوام بھی اپنے بڑوں کی تقلید میں گمراہی پر قائم رہے۔

تورات میں تحریف

اس طرح انہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کیا، نہ صرف خود کفر پر جمے رہے بلکہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر قائم رکھنے کی کوشش کی، اور یہاں تک کہ مسلمانوں کو بھی دینِ اسلام سے ہٹانے کی سازشیں کرتے رہے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو تسلی دی کہ وہ اپنے دشمنوں کے تمام خفیہ وظاہر حالات سے خوب واقف ہے، اور وہی ان کی مدد اور نصرت کے لئے کافی ہے۔

آیت نمبر (۴۵-۴۶) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ترجمہ: ''اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، اور اللہ کافی ہے دوست ہونے کے لیے، اور اللہ کافی ہے مددگار ہونے کے لیے۔ کچھ یہودی ایسے بھی ہیں جو باتوں کو ان کی اصل جگہوں سے بدل دیتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: ''ہم نے سنا اور نافرمانی کی''، اور ''سنو، تم سننے کے لائق نہیں ہو''، اور ''راعنا'' (جس کا مطلب وہ طنزیہ انداز میں ''ہمارا چرواہا'' لیتے ہیں)، تاکہ دینِ حق کا مذاق اُڑائیں۔ حالانکہ اگر وہ کہتے: ''ہم نے سنا اور مانا، اور سنیے اور ہماری طرف دیکھئے''، تو یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ درست ہوتا۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا، اس لیے وہ تھوڑے ہی لوگ ایمان لاتے ہیں''۔

تفسیر یہودی جب رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اپنی گفتگو میں زبان کو اس طرح موڑتے

کہ الفاظ کا ظاہر کچھ اور ہوتا اور باطن میں وہ بالکل مختلف معنیٰ مراد لیتے۔ انہی الفاظ میں ایک لفظ ''رَاعِنَا'' بھی تھا، جس کا عربی میں بظاہر معنیٰ ہوتا ہے: ''ہماری رعایت فرمایئے''، لیکن ان کی اپنی زبان میں یہی لفظ بددعا اور اہانت کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔

اس طرزِ عمل کی وضاحت قرآن مجید کی سورۂ بقرہ (رکوع ۱۳) کی اس آیت میں گزر چکی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ اس آیتِ مبارکہ میں بھی ان لوگوں کی اسی ناپسندیدہ عادت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ بات سنتے تو ساتھ ہی دل میں یا اشارۃً کہتے: ''عَصَيْنَا'' یعنی ''ہم نہیں مانیں گے'' حالانکہ ظاہر میں اس کا رخ کچھ اور ظاہر کرتے تھے، گویا وہ یہ جتانا چاہتے ہوں کہ ہم کسی مخالف کی بات نہیں مانیں گے۔ اسی طرح جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ''اِسْمَعْ'' (سن لیجئے) کہتے تو اس کے ساتھ ''غَيْرَ مُسْمَعٍ'' بھی ملا دیتے۔

بددعا کا پہلو

جیسا کہ صاحبِ روح المعانی (حصہ ۵، صفحہ ۴۷) میں بیان کرتے ہیں، اس ترکیب کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک برائی پر مبنی، یعنی ''تم سننے کے قابل نہ رہو'' جو دراصل بددعا کا پہلو رکھتا ہے، اور یہی ان کی اصل نیت تھی۔ دوسرا معنیٰ بظاہر اچھا بھی لیا جا سکتا ہے، یعنی ''آپ کو کوئی ناگوار بات سننی نہ پڑے''، مگر وہ اسے محض دھوکے اور استہزاء کے لئے استعمال کرتے تھے۔

یہودی، جو اپنی بداعمالیوں کے سبب اللہ کی لعنت کے مستحق قرار دیے گئے، ان الفاظ کو مذاق اور طعن کے طور پر ادا کرتے، تاکہ ظاہر میں کچھ اور سمجھا جائے اور دلوں میں اپنی فاسد نیت کے مطابق معنی مراد لیں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ خلوص کے ساتھ ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور اطاعت کی) کہتے، اور ''اِسْمَعْ'' کہہ کر اس کے ساتھ کوئی منفی اضافہ نہ کرتے، نیز ''انْظُرْنَا'' (ہماری طرف توجہ فرمایئے) کہتے اور ''رَاعِنَا'' جیسے مبہم اور قابلِ اعتراض الفاظ سے اجتناب کرتے، تو یہ ان کے لئے کہیں بہتر اور درست طرزِ عمل ہوتا۔

لیکن انہوں نے سنجیدگی اور ادب کے بجائے بیہودگی اور تمسخر کو اختیار کیا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب انہیں اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا۔ چنانچہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، سوائے چند کے، جو حق کو قبول کرنے کی توفیق پا لیں گے۔

آیت نمبر (۴۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ

قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

ترجمہ: ''اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ اُس (قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا ہے، جو تصدیق کرتا ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو اور پھیر دیں انہیں ان کی پیٹھ کی طرف، یا ان پر لعنت کر دیں جیسے ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم تو پورا ہو کر رہتا ہے''۔

تفسیر تفسیر درِّ منثور (حصہ ۲، صفحہ ۱۶۸) میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کے سرداروں سے گفتگو فرمائی، جن میں عبداللہ بن سوریہ اور کعب بن اسد بھی شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت شفقت اور حکمت کے ساتھ فرمایا:

''اے یہود! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو، اللہ کی قسم! تم خوب جانتے ہو کہ جو دین میں لے کر آیا ہوں وہ سراسر حق ہے''۔ مگر انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''اے محمد! ہم اسے نہیں پہچانتے''۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اہلِ کتاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل کی ہے، جو تمہاری اپنی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرتی ہے، اس سے پہلے کہ بطورِ سزا تمہارے چہروں کو مٹا دیا جائے یعنی انہیں ایسا مسخ کر دیا جائے کہ ناک، آنکھ اور منہ کچھ باقی نہ رہے یا تم پر لعنت مسلط کر دی جائے۔

ہفتہ کی بے حرمتی کرنے والوں پر لعنت

پھر انہیں اس واقعے کی یاد دہانی کرائی گئی کہ جس طرح ہفتہ (یومِ سبت) کی بے حرمتی کرنے والوں پر لعنت کی گئی تھی۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس دن شکار نہ کریں، مگر انہوں نے نافرمانی کی، جس کے نتیجے میں وہ بندروں میں مسخ کر دئے گئے، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ (رکوع ۸) میں اس کا ذکر آ چکا ہے۔

چونکہ یہ واقعہ انہی کی قوم میں پیش آیا تھا اور وہ اسے اپنے آباء و اجداد سے سنتے آئے تھے، اس لئے انہیں متنبہ کیا گیا کہ ایسا انجام تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

آخر میں ارشاد فرمایا: ''وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا''

یعنی اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ ہو جائے، وہ ہو کر رہتا ہے، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس آیت میں چہروں کے مسخ (طمسِ وجوہ) کا جو ذکر آیا ہے، اس پر مفسرین نے مفصل گفتگو کی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا یہ عذاب دنیا میں واقع ہو چکا ہے یا آئندہ پیش آئے گا۔ صاحبِ روح المعانی نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے متعدد اقوال نقل کیے

ہیں۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ واقعہ پیش نہیں آیا، کیونکہ اس کے بعد کچھ یہودی ایمان لے آئے تھے؛ جبکہ بعض کا قول ہے کہ یہ واقعہ قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا اور یہود میں مسخ واقع ہوگا۔

کچھ مفسرین نے یہ رائے بھی دی کہ آیت میں دو ممکنہ سزاؤں کا ذکر ہے: ''مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوهًا... أَوْ نَلْعَنَهُمْ.....'' یعنی یا تو چہروں کو مسخ کیا جائے گا یا لعنت نازل ہوگی۔ چونکہ لعنت کا نزول ہو چکا، اس لئے وعید پوری ہوگئی۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

تاہم قرآنِ کریم کے الفاظ میں ایسی صراحت موجود نہیں کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں لازماً مسخ ہی ہوگا، بلکہ یہ ایک ممکنہ سزا کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اگرچہ وہ اس کے مستحق تھے، مگر اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو معاف فرمادے۔

آیت نمبر (۴۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

ترجمہ: ''اللہ کبھی نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اُس کے سوا جس گناہ کو چاہے، معاف فرمادے گا۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، اُس نے یقیناً بہت بڑا گناہ گڑھ لیا''۔

تفسیر آیتِ مبارکہ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ'' کے ضمن میں مفسرین نے نہایت بصیرت افروز روایات نقل کی ہیں۔ چنانچہ ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرا بھتیجا برے اور حرام کاموں سے باز نہیں آتا۔ رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''اس کا دین کیا ہے؟'' اس نے عرض کیا: ''وہ توحید کا قائل ہے اور نماز کا پابند بھی ہے''۔

دین پر ثابت قدمی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس سے اس کا دین بطورِ ہدیہ طلب کرو، اور اگر وہ انکار کرے تو اسے خرید لو''۔ چنانچہ اس شخص نے اپنے بھتیجے سے یہ مطالبہ کیا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ جب اس نے واپس آ کر عرض کیا کہ وہ اپنے دین پر ثابت قدم ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ شرک کے علاوہ دیگر گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے معاف فرما سکتا ہے۔

اسی طرح آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہود اپنے بچوں کو آگے بڑھاتے، انہیں نماز اور قربانی کا ذریعہ بناتے، اور یہ گمان رکھتے کہ وہ ہر طرح کے

گناہوں سے بری ہیں۔ اس خودستائی اور فریبِ نفس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں ان کے باطل دعووں کو بے نقاب کیا گیا۔

شرک کی مذمت

اس مقام پر قرآن کریم نے ایک اصولی حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ شرک سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ ہے، اگر کوئی شخص بغیر توبہ کے اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کے لئے مغفرت کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ اس کے علاوہ دیگر گناہوں کے بارے میں فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے؛ وہ جسے چاہے معاف فرمادے اور جسے چاہے سزا دے۔

عقلی وفطری اعتبار سے بھی شرک نہایت سنگین بے انصافی ہے۔ انسان کو پیدا کرنے والا، اس کو زندگی عطا کرنے والا، رزق دینے والا اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، پھر عبادت، استعانت یا تعظیم میں کسی اور کو اس کا شریک ٹھہرانا عقلِ سلیم کے خلاف اور عدل کے منافی ہے۔

یعنی قرآن مجید، جگہ جگہ توحید کا درس دیتا ہے کہ اللہ ہی خالق، مالک اور رب ہے، اسی کی عبادت کی جائے اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، جبکہ شرک کی مختلف صورتوں کی سختی سے تردید بھی فرمائی گئی ہے۔

مشرکانہ اعمال سے اجتناب

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چاہے تمہیں کاٹ دیا جائے یا جلا دیا جائے''۔ **(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۰۳۴)**

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جھاڑ پھونک، تعویذ اور گنڈے شرک ہیں''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۸۸۳)**

● نیز حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جو شخص ایسا عمل کرے جس میں میرے ساتھ کسی کو شریک کرے، میں اسے اور اس کے عمل کو اسی کے سپرد کر دیتا ہوں''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۸۵)**

اللہ کی محتاجی

دنیا میں بھی اگر کسی چیز کا وقتی مالک اپنے حق میں کسی دوسرے کی شرکت کو برداشت نہیں کرتا، حالانکہ وہ حقیقی مالک نہیں، تو پھر اس کائنات کے حقیقی خالق و مالک کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا کس قدر بڑی جسارت ہے! جنہیں

مشرکین اللہ کا شریک بناتے ہیں، وہ سب مل کر ایک مکھی تک پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، بلکہ خود اپنی ہستی میں اللہ کے محتاج ہیں پیدا بھی وہی کئے گئے، فنا بھی انہی پر طاری ہوتی ہے، اور وہ کھانے پینے اور دیگر حاجات کے پابند ہیں۔

ایسے بے بس اور محتاج مخلوقات کو خدائی کا درجہ دینا نہایت جہالت اور صریح ناانصافی ہے، جو خالقِ کائنات کی ناراضگی کا موجب بنتی ہے۔ جو شخص شرک کی حالت میں مرے گا، وہ ہمیشہ کے لئے عذابِ جہنم میں مبتلا رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا تصور قائم کرنا بھی شرک کی ایک صریح صورت ہے، جیسے مشرکینِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھتے ہیں یہ سب گمراہ کن تصورات ہیں جو شرک کے زمرے میں آتے ہیں۔

ناقابل معافی جرم

کافروں کے بارے میں قرآنِ کریم، یعنی قرآن مجید، نہایت صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ جس طرح شرک ناقابلِ معافی جرم ہے، اسی طرح کفر کی دیگر صورتوں پر قائم رہنے والا شخص بھی، اگر بغیر ایمان کے دنیا سے رخصت ہو، تو ہمیشہ کے لئے عذابِ جہنم کا مستحق ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا، خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا'' یعنی بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہاں نہ انہیں کوئی دوست میسر آئے گا اور نہ کوئی مددگار۔ (سورۃ الاحزاب)

اسی مضمون کو مزید وضاحت کے ساتھ سورۂ نساء میں یوں بیان فرمایا گیا: ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا، اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا'' کہ جو لوگ کفر اور ظلم پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ نہ انہیں معاف فرمائے گا اور نہ ہی انہیں کوئی راستہ دکھائے گا، سوائے جہنم کے راستے کے، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔

ہمیشہ کی جہنم

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر، دینِ اسلام کے دشمن، اللہ اور اس کے احکام پر اعتراض کرنے والے، قرآن وسنت کا انکار کرنے والے یا ان کا تمسخر اڑانے والے، ختمِ نبوت کے منکر، اور وہ سب لوگ جو ثابت شدہ حقائق کا انکار کریں، یہ سب کفر کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور ایسے کافر، خواہ مشرک ہوں یا کسی اور نوع کے منکر، اگر ایمان کے بغیر مرجائیں تو ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب میں گرفتار رہیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حقیقت کو ایک نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم میں سب سے ہلکے عذاب والے شخص سے اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے: ''اگر تیرے پاس زمین بھر مال ہو، تو کیا تُو اسے دے کر اپنی نجات حاصل کرنا چاہے گا؟'' وہ عرض کرے گا: ''ہاں، یہی میری خواہش ہے''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے تجھ سے اس سے بھی کہیں آسان بات طلب کی تھی، جب تُو آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا، کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا؛ مگر تُو نے انکار کیا اور شرک ہی پر قائم رہا''۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۶۵۳۸)

یہ بیان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ توحید کا تقاضا نہایت آسان اور فطری تھا، مگر اس سے روگردانی ہی انسان کی دائمی محرومی کا سبب بنی۔

آیت نمبر (۴۹-۵۰) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۵۰﴾

ترجمہ: ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکی خود بیان کرتے ہیں؟ بلکہ اللہ ہی ہے جو جسے چاہے پاک کرتا ہے، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا دھاگے کے برابر بھی۔ دیکھو، وہ اللہ پر کیسا جھوٹ گڑھتے ہیں اور یہی کھلا گناہ کافی ہے''۔

تفسیر یہودیوں کی مذمت، جو اپنے آپ کو پاکیزہ اور برگزیدہ سمجھتے تھے، قرآنِ کریم کی نہایت بلیغ تنبیہات میں سے ہے۔ گزشتہ آیات میں ان کی بعض ناپسندیدہ حرکات کا ذکر ہوا، اور یہاں بھی ان کی بداعمالیوں اور خودفریبی کو آشکارہ کیا گیا ہے۔ صاحبِ روح المعانی نے، ابنِ جریرؒ کے حوالے سے حضرت حسنؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ انہوں نے دعویٰ کیا تھا: ''نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ'' یعنی ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، اور یہ بھی کہا کہ ''جنت میں صرف وہی داخل ہوگا جو یہودی یا نصرانی ہو''۔ اس طرح انہوں نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کیا، اپنے آپ کو نیک، صالح اور جنت کا مستحق قرار دیا، حالانکہ وہ کفر میں مبتلا تھے۔

بے عیب اور برتر سمجھنا

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے نفسوں کو پاکیزہ ٹھہراتے ہیں؟'' حقیقت یہ ہے کہ محض خودستائی سے نہ کوئی پاک ہوتا ہے اور نہ نجات کا حق دار بنتا ہے۔ اپنے آپ کو بے عیب اور برتر سمجھنا دراصل حماقت اور وبال ہے، نہ کہ فضیلت۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے عقائد،

اعمال اور انجام سے پوری طرح باخبر ہے؛ جسے وہ پاک قرار دے، حقیقی پاکیزگی اسی کی ہوتی ہے۔ جو لوگ کفر میں مبتلا ہو کر بھی اپنے آپ کو پاکباز ظاہر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بدکرداری کے مطابق انہیں سزا دے گا، اور یہ سزا نہایت عدل کے ساتھ ہوگی نہ اس میں ذرّہ برابر زیادتی ہوگی اور نہ کسی قسم کا ظلم۔

کھجور کے گٹھلی کی مثال

اہلِ عرب معمولی اور حقیر چیز کی مثال دینے کے لئے نقیر، فتیل اور قطمیر جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ کھجور کی گٹھلی میں موجود باریک گڑھے کو نقیر، اس میں پائے جانے والے باریک دھاگے کو فتیل اور گٹھلی کے اوپر کے باریک چھلکے کو قطمیر کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے یہاں فرمایا گیا کہ ان پر نقیر کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

پھر ارشاد ہوا کہ یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں! ان کا یہ دعویٰ کہ ہم اللہ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں، گویا یہ کہنا ہے کہ ''العیاذ باللہ'' اللہ کے نزدیک کفر بھی پسندیدہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر ایک کھلا بہتان اور سنگین الزام ہے۔

اسی لئے فرمایا: ''وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا'' یعنی یہ دعویٰ خود اپنے اندر ایک واضح گناہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

البتہ اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح کی گئی کہ حقیقی تزکیۂ نفس ایک نہایت مبارک اور ضروری عمل ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے نفس کو برائیوں، بداخلاقیوں اور گناہوں سے پاک کرے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائضِ نبوت میں یہ بھی بیان فرمایا: ''وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

جو شخص تعلیماتِ نبوی کے مطابق اپنے نفس کو پاک کرتا ہے، اس کے بارے میں فرمایا گیا: ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' یقیناً وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا۔ لیکن جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہو کر بھی اپنے آپ کو نیک ظاہر کرتے ہیں، وہ دوہرے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں: ایک بدعملی اور دوسرا جھوٹی خودستائی۔

یہاں تک کہ جو لوگ حقیقتاً نیک اور صالح ہوں، وہ بھی اپنی تعریف اور خودستائی سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ اس سے تکبر پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اخلاقی اصول

اسی لئے سورۂ نجم میں واضح ہدایت دی گئی: ''فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى'' اپنے نفسوں کی پاکیزگی بیان نہ کرو، اللہ خوب جانتا ہے کہ کون واقعی متقی اور پرہیزگار ہے۔

اپنی تعریف سے اجتناب ایک اہم اخلاقی اصول ہے، کیونکہ انسان خواہ کتنا ہی نیکی اور تقویٰ اختیار کر لے،

اس کی زندگی میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں اور خامیاں باقی رہ ہی جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ کسی کو اپنے انجام کا یقین نہیں کہ خاتمہ کس حالت پر ہوگا؛ اسی لئے خودستائی سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ایسے نام کو بھی پسند نہیں فرمایا جس میں اپنی پاکیزگی اور تعریف کا پہلو نمایاں ہو۔

چنانچہ حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ان کا نام پہلے ''برہ'' (یعنی نیک اور پاکیزہ عورت) رکھا گیا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے نفسوں کو پاکیزہ نہ بتاؤ، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم میں کون زیادہ نیک ہے''، اور ان کا نام بدل کر ''زینب'' رکھ دیا۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۴۲)**

البتہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اچھے اعمال، پاکیزہ اخلاق اور نیک صفات کی نعمت عطا فرمائے، اور وہ شخص محض شکرِ نعمت کے طور پر اپنی اچھی حالت کا ذکر کرے، تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے باطن کا جائزہ لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس دھوکہ دے رہا ہو اور اظہارِ نعمت کے پردے میں خودستائی اور تزکیۂ نفس کا پہلو داخل ہو جائے۔

تعریف میں احتیاط

حضرت ابوبکر صدیق سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر کسی کی تعریف کرنا ناگزیر ہو، تو یوں کہو کہ میں اس کے بارے میں ایسا گمان رکھتا ہوں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۶۱، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۰۰۰)**

اس اندازِ بیان میں احتیاط، تواضع اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جو انسان کو مبالغہ اور بے جا تعریف سے محفوظ رکھتا ہے۔

آیت نمبر (۵۱-۵۲) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَآءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يَّلۡعَنِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ نَصِيۡرًا ﴿۵۲﴾

ترجمہ: ''کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، وہ جادو اور شیطانی طاقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، اور جس پر اللہ لعنت کرے، اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا''۔

تفسیر یہودیوں کی گمراہی اور ضد کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ انہوں نے حقیقتِ توحید کو جانتے ہوئے بھی شرک کو

اس پر ترجیح دے دی۔

اس آیت ''اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ.....'' کے شانِ نزول میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ آیا تو قریش نے اس سے کہا:

''کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اپنی قوم میں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہم سے بہتر سمجھتا ہے، حالانکہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں اور پانی پلانے والے ہیں؟'' اس پر کعب نے جواب دیا: ''نہیں، تم ہی بہتر ہو''۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مذمت کے طور پر آیات نازل فرمائیں۔

● اسی طرح ایک اور روایت میں بیان ہوا ہے کہ قریش کے پاس مختلف قبائل، غطفان اور بنو قریظہ وغیرہ کے وفود آئے، جن میں یہودیوں کے نامور علماء اور سردار شامل تھے، جیسے حوئی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق اور دیگر۔ قریش نے آپس میں کہا کہ یہ اہلِ کتاب ہیں اور آسمانی کتابوں کا علم رکھتے ہیں، ان سے دریافت کرو کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین؟

چنانچہ جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے، حقیقت کو جانتے ہوئے بھی، یہ جواب دیا کہ ''تمہارا دین ان کے دین سے بہتر ہے، اور تم ان سے زیادہ ہدایت پر ہو۔

● اس پر اللہ تعالیٰ نے ''اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ.....'' سے لے کر ''مُلۡکًا عَظِیۡمًا'' تک آیات نازل فرمائیں۔

● مزید یہ کہ اہلِ کتاب نے حسد اور عناد میں یہ بھی کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے آپ کو بڑی بادشاہت کا حامل سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی متعدد ازواج ہیں اور ان کا مشغلہ نکاح ہی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ''اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ.....'' نازل فرما کر ان کے حسد اور باطل اعتراض کو ردّ کیا۔

لباب النقول میں بھی مذکور ہے کہ یہودی علماء، جو بنو نضیر سے تعلق رکھتے تھے، مکہ آئے۔ قریش نے ان سے اپنے دین اور دینِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فیصلہ چاہا۔ انہوں نے جانتے بوجھتے، اس حقیقت کے باوجود کہ قریش مشرک ہیں اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق پر ہیں، یہ کہہ دیا کہ تم لوگ زیادہ ہدایت پر ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر ان کے اس جھوٹ اور گمراہی کو بے نقاب کیا۔

یہود کا تکبر

حقیقت یہ ہے کہ یہودی اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں۔ وہ آپ کی آمد

کے منتظر بھی تھے اور آپ کی نشانیاں پہچان بھی چکے تھے، لیکن جب وہ حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے انکار کر دیا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یہ دراصل حسد، تکبر اور ضد کا نتیجہ تھا۔ جب خودی اور انا انسان کے دل میں گھر کر لیتی ہے تو وہ حق کو دیکھنے سے محروم ہو جاتا ہے؛ آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور دل کی بصیرت اندھی ہو جاتی ہے۔

حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جن کے پاس تورات کا علم موجود تھا، جو جانتے تھے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام توحید کی دعوت لے کر آئے اور شرک بدترین گمراہی ہے۔ اس سب کے باوجود انہوں نے محض ہٹ دھرمی اور عناد کی بنا پر مشرکینِ مکہ کو، داعیٔ توحید سیدنا محمد ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دے دیا۔

اس طرح انہوں نے اپنے علم کی کوئی قدر نہ کی اور حق کو چھوڑ کر باطل اور شیطانی نظریات کو اختیار کر لیا، یہی وہ گمراہی ہے جس پر قرآن نے انہیں سختی سے ملامت کی ہے۔

جبت اور طاغوت

لفظ ''جِبْت'' (جسے یہاں بعض نے 'جنت' لکھا ہے) اور ''طاغوت'' کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک جِبْت ایک مخصوص بت کا نام تھا، پھر یہ لفظ ہر باطل معبود کے لیے عام ہو گیا، جبکہ طاغوت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے اور باطل کی نمائندگی کرے۔ کچھ مفسرین نے یہ بھی کہا کہ جِبْت سے مراد جادوگر ہے اور طاغوت سے مراد شیطان۔ اس کے علاوہ بھی کئی تفسیری آراء موجود ہیں، اور انہی میں سے بعض کے مطابق آیتِ کریمہ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

● یہودیوں کی حالت قابلِ عبرت ہے کہ انہوں نے علم و ہدایت کو چھوڑ کر جہالت اور گمراہی کو اختیار کر لیا، اور یہاں تک کہ مشرکین کو اہلِ توحید سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دے دیا۔ اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بتوں اور شیطان جیسے باطل امور پر ایمان لانے کے مترادف ہو گئے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ'' یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی، انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

اس لعنت نے ان کی بصیرت چھین لی، یہاں تک کہ وہ بے خوف ہو کر کفر و شرک کی تائید کرنے لگے اور مشرکین کو اہلِ ایمان پر ترجیح دینے لگے۔ پھر ارشاد فرمایا:

''وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا'' جس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جائے، اس کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں کوئی اس کی حقیقی مدد کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں وہ کسی شفیع یا مددگار کو پائے گا جب اس پر عذاب نازل ہوگا۔

اگر چہ لعنت کا استحقاق کفار و مشرکین کے لئے ثابت ہے، لیکن احادیثِ مبارکہ میں بہت سے گناہگار اعمال پر بھی لعنت وارد ہوئی ہے۔ اس لئے ہر گناہ سے بچنا ضروری ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ ان گناہوں سے اجتناب کرنا چاہئے جن پر صراحت کے ساتھ لعنت بیان کی گئی ہے، تا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کے اس خطرناک انجام سے محفوظ رہ سکے۔

شراب کے بارے میں وعید

شراب کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ نے نہایت سخت وعید بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب سے متعلق دس قسم کے لوگوں پر لعنت فرمائی:

(۱) جو شراب تیار کرے (۲) جو اسے تیار کروائے (۳) جو اسے پیئے (۴) جو اسے اٹھائے (لے جائے) (۵) جس کی طرف اسے لے جایا جائے (۶) جو اسے پلائے (۷) جو اسے فروخت کرے (۸) جو اس کی قیمت کھائے (۹) جو اسے خریدے (۱۰) اور وہ شخص جس کے لئے اسے خریدا جائے۔

(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۲۷۷۶، جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۹۵، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۸۰)

اس ارشادِ مبارک سے واضح ہوتا ہے کہ شراب سے متعلق ہر قسم کی معاونت اور وابستگی ممنوع اور موجبِ لعنت ہے، خواہ وہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ۔

دھوکہ اور فریب کی ممانعت

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص ملعون ہے جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ اور فریب کا معاملہ کرے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۴۴)**

یہ تعلیمات اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام نہ صرف ظاہری گناہوں سے روکتا ہے بلکہ انسانوں کے باہمی معاملات میں بھی امانت، خیر خواہی اور سلامتی کو بنیادی اصول قرار دیتا ہے، اور ہر اس عمل کی سختی سے مذمت کرتا ہے جو دوسروں کے لئے نقصان، دھوکہ یا اذیت کا باعث بنے۔

تقدیر کے منکرین

تقدیر کے منکرین اور دیگر سنگین جرائم کے مرتکبین کے بارے میں احادیثِ نبویہ میں نہایت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جن لوگوں پر میں نے لعنت کی ہے اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) وہ شخص جو اللہ کی کتاب میں اضافہ یا تحریف کرے (۲) وہ جو تقدیر کا انکار کرے (۳) وہ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرائے (۴) وہ جو سنت کو ترک کردے (۵) وہ جو اولاد کی بے حرمتی کرے (۶) اور وہ جو زبردستی اقتدار حاصل کرے۔ **(مجمع الزوائد، طبرانی)**

اگرچہ روایت کے ابتدائی الفاظ میں چھ افراد کا ذکر ہے، مگر بعض نسخوں میں تعداد کے بیان میں کمی بیشی پائی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کسی کاتب سے سہواً کوئی جزرہ گیا ہو۔

مشکوٰۃ المصابیح میں بھی یہ روایت منقول ہے، جہاں چھٹے شخص کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ وہ جو زبردستی اقتدار حاصل کرے تاکہ عزت پائے، حالانکہ اللہ نے اسے ذلیل کیا ہو، اور وہ اس کے برخلاف جسے اللہ نے عزت دی ہو، اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرے۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے یہ حدیث امام بیہقی کے حوالے سے نقل کی ہے، اور اس میں سنت کو ترک کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کلی طور پر طریقۂ نبوی سے منہ موڑ لے یا کسی بھی سنت کا تمسخر اڑائے۔

قبروں کے آداب

اسی طرح قبروں کے آداب کے بارے میں بھی سخت تنبیہ آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو قبروں کی زیارت کے لئے جاتی ہیں، اور ان لوگوں پر بھی جو قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں یا ان پر چراغ روشن کرتے ہیں۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۲۳۶، جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۲۰)**

اس ارشادِ نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ قبروں کے ساتھ ایسی تعظیمی یا غیر مشروع رسوم اختیار کرنا، جو عبادت یا تقدیس کا رنگ اختیار کر جائیں، سخت ممنوع اور موجبِ لعنت ہیں۔

نوحہ کرنے والوں پر لعنت

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت پر لعنت فرمائی جو میت پر نوحہ و ماتم کرتی ہے، اور اس پر بھی جو اس نوحے کو سنتا اور برداشت کرتا ہے۔ اس ارشاد میں اس بات کی تنبیہ ہے کہ غم کے موقع پر صبر و رضا کا دامن تھامنا ہی مومن کی شان ہے، جبکہ نوحہ و فریاد شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۱۲۸)

شوہر کی نافرمانی کرنے والی پر وعید

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب شوہر اپنی بیوی کو اپنے پاس بلائے اور وہ بلا عذر انکار کر دے، یہاں تک کہ شوہر ناراض ہو کر رات گزارے، تو ایسی عورت پر صبح تک فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۳۷)

فائدہ: اس حدیث میں ازدواجی تعلقات کی اہمیت اور باہمی حقوق کی پاسداری پر زور دیا گیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کی گستاخی کرنے والوں پر لعنت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو برا کہتے ہیں، تو ان سے کہو کہ تمہاری اس بدزبانی پر اللہ کی لعنت ہو۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۶۶)

فائدہ: اس ارشاد میں صحابۂ کرامؓ کے مقام و مرتبہ کی عظمت اور ان کی حرمت کا واضح اعلان ہے۔

سود خوروں پر لعنت

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے، سود دینے والے، اس کے لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والوں سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔
(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۹۸)

ایک اور حدیث میں سود کے ساتھ ساتھ گودنے والی، گدوانے والی اور تصویر بنانے والوں پر بھی لعنت کا ذکر آیا ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۳۸)

فائدہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسے تمام اعمال سخت ناپسندیدہ اور موجبِ غضب ہیں جو فطرت اور شریعت کے خلاف ہوں۔

رشوت لینے اور دینے والوں پر لعنت

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔ (جامع ترمذی۔ حدیث نمبر: ۱۳۳۷)

حضرت ثوبانؓ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جو شخص ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا ہے، وہ بھی اسی وعید کا مستحق ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عدل و انصاف کو برقرار رکھنے کے لئے رشوت کو جڑ سے ختم کرنا ضروری ہے۔
(مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۷۰۶۸)

ذخیرہ اندوزی کرنے والوں پر لعنت

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص باہر سے غلہ لا کر لوگوں کو فراہم کرتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے رزق پاتا ہے، اور جو شخص ضرورت کے وقت غلہ روک کر مہنگائی کا انتظار کرتا ہے، وہ ملعون ہے۔

(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۱۵۳)

فائدہ: اس حدیث میں معاشرتی ہمدردی اور انصاف کی تعلیم دی گئی ہے، اور ذخیرہ اندوزی جیسے ظالمانہ عمل کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

فطری امتیاز کو بدلنے والوں پر لعنت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اُن عورتوں پر لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں، اور اُن مردوں پر بھی جو عورتوں کی صورت وہیئت اپنائیں۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۸۸۵)

● ایک دوسری روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن مردوں پر لعنت فرمائی جو خود کو مخنث (ہجڑا بننے والے) بناتے ہیں اور اُن عورتوں پر بھی جو مردانہ وضع اختیار کرتی ہیں، نیز یہ حکم دیا کہ ایسے لوگوں کو گھروں سے نکال دیا جائے۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۸۸۶)

فائدہ: ان ارشادات میں اس امر کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطری شناخت کو چھوڑ کر دوسری جنس کی مشابہت اختیار کرے۔ البتہ وہ افراد جو پیدائشی طور پر ایسے ہوں، چونکہ ان کا اس میں کوئی اختیار نہیں، اس لئے وہ اس وعید میں شامل نہیں۔ لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اپنی ساخت یا طرزِ زندگی کو بدلتے ہیں، وہ اس سخت تنبیہ کے مستحق ہیں۔ ایسے افراد کو گھروں میں آزادانہ جگہ دینا بھی گناہ قرار دیا گیا ہے۔

مخالف جنس کا لباس اختیار کرنے والوں پر لعنت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس مرد پر لعنت فرمائی جو عورتوں کا لباس پہنے اور اُس عورت پر بھی جو مردوں کا لباس اختیار کرے۔ یہ حدیث مرد وعورت کے درمیان فطری امتیاز اور ان کے مخصوص آداب واطوار کی حفاظت کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۰۹۸)**

غیر فطری طریقوں سے شہوت پوری کرنے والوں پر لعنت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ملعون ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ

غیر فطری طریقے سے (پچھلے راستے میں) اپنی خواہش پوری کرے۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۱۶۲)

● اسی طرح مسند احمد کی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قومِ لوط کے عمل جیسے افعال کرنے والوں پر تین مرتبہ لعنت فرمائی، اور ایسے شخص پر بھی لعنت کی جو کسی جانور کے ساتھ اپنی شہوت پوری کرے۔
(صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۴۱۷)

ان احادیث میں انسانی فطرت کے خلاف اعمال کی سخت مذمت اور ان سے مکمل اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

جسمانی تبدیلی کرنے والوں پر لعنت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن عورتوں پر لعنت فرمائی جو بالوں میں مصنوعی بال ملاتی ہیں، اور اُن پر بھی جو جسم کو گودتی یا گدواتی ہیں۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۹۳۷)

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی اُن عورتوں پر جو جسم گدواتی ہیں، چہرے کے بال نوچتی ہیں، اور حسن کے لیے دانتوں کو باریک کرواتی ہیں، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی کے مترادف ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۹۳۹)

فائدہ: ان ارشادات میں اس بات کی وضاحت ہے کہ محض حسن و زیبائش کی خاطر اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں غیر ضروری تبدیلی کرنا ناپسندیدہ اور موجبِ وعید ہے۔

یہ تمام تعلیمات اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ اسلام انسان کو اس کی فطری حالت پر قائم رہنے، پاکیزہ کردار اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود و اصولوں کی پاسداری کرنے کی تاکید کرتا ہے، تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں فساد اور بگاڑ سے محفوظ رہیں۔

عیب چھپا کر فروخت کرنے والوں پر لعنت

حضرت واثلہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کو اس کے عیب سمیت فروخت کرے اور خریدار کو اس سے آگاہ نہ کرے، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں مبتلا رہتا ہے، یا فرمایا کہ اس پر فرشتے برابر لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۲۴۷)

فائدہ: اس ارشادِ نبوی میں تجارت کے میدان میں دیانت و صداقت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور عیب چھپا کر خریدار کو دھوکا دینے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ لہٰذا مسلمان تاجر پر لازم ہے کہ وہ فروخت کی جانے والی چیز کا معلوم عیب خریدار کے سامنے واضح کر دے، تاکہ معاملہ باہمی رضامندی، امانت اور شفافیت کے ساتھ انجام پائے۔

غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والوں پر لعنت

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اُس پر جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے، اُس پر جو زمین کی حد بندی کی نشانی کو چُرائے، اُس پر جو اپنے والدین خصوصاً باپ پر لعنت کرے، اور اُس پر بھی جو ایسے شخص کو پناہ دے جو دین میں کوئی نئی (گمراہ کن) بات ایجاد کرے۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۸۵۵)**

اس حدیث میں متعدد سنگین گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خصوصاً زمین کی حد بندی میں خیانت جیسے کھیتوں کی میڑھ کو ہٹا دینا، یا دھوکے سے دوسرے کی زمین کو اپنی ملکیت میں شامل کر لینا یہ سب افعال نہایت سخت گناہ اور موجبِ لعنت ہیں۔ اسی طرح دین میں بدعات کو فروغ دینا یا بدعتی افراد کی پشت پناہی کرنا بھی سخت قابلِ مذمت ہے۔

غیر محرم پر نگاہ ڈالنے پر لعنت

حضرت حسن بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو دیکھنے والے پر اور اُس پر بھی جس کی طرف دیکھا جائے۔ **(سنن بیہقی، حدیث نمبر ۱۳۵۶۶)**

فائدہ: یہ حدیث ایک جامع اصول بیان کرتی ہے کہ ہر وہ نظر جو شریعت کی حدود سے تجاوز کرے، قابلِ گرفت اور موجبِ لعنت ہے۔ نہ صرف ناجائز نظر ڈالنے والا بلکہ وہ شخص بھی، جو اپنی مرضی سے خود کو ایسے انداز میں پیش کرے کہ اس پر ناجائز نظر ڈالی جائے، اس وعید میں شامل ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مرد یا عورت اپنے جسم کا وہ حصہ ظاہر کرے جس کا دیکھنا غیر محرم کے لیے جائز نہیں، تو وہ بھی اس گناہ میں شریک اور لعنت کا مستحق قرار پاتا ہے۔

نسب بدلنے والوں پر لعنت

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کو اپنا باپ ظاہر کرے، یا اپنے اصل مالک (مولا) کے سوا کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے، اُس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ اُس کا نہ کوئی فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۳۷۰)**

اس حدیث میں نسب کی حفاظت کی انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ جو لوگ اپنی اصل پہچان کو چھوڑ کر کسی معزز خاندان یا دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، وہ سخت وعید کے مستحق ہیں۔

اسی طرح غلامی کے زمانے میں جو تعلق 'ولا' (آزاد کرنے والے اور آزاد ہونے والے کے درمیان) قائم ہوتا تھا، اُس نسبت کو بدلنا بھی اسی وعید میں شامل ہے۔

حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُس شخص پر لعنت فرمائی جو حلالہ کرے (یعنی کسی عورت سے اس نیت سے نکاح کرے کہ اسے پہلے شوہر کے لیے حلال بنادے) اور اُس پر بھی جس کے لئے یہ عمل کیا جائے۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۲۰)**

شریعتِ اسلامیہ میں طلاق کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے، اور اگر ناگزیر ہو تو ایسے طریقے اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جن میں اصلاح اور رجوع کی گنجائش باقی رہے۔

لیکن جب کوئی شخص تین طلاقیں دے دے، تو عورت کے لئے اسی شوہر کے پاس واپس آنے کی ایک مخصوص اور فطری صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ کہ عدت کے بعد کسی دوسرے مرد سے حقیقی نکاح ہو، ازدواجی تعلق قائم ہو، پھر اگر وہ شوہر وفات پا جائے یا اپنی مرضی سے طلاق دے دے، اور اس کے بعد عدت پوری ہو، تب پہلی زوجیت کی طرف واپسی ممکن ہے۔

مگر بعض لوگ اس حکم کو ایک رسم یا حیلہ بنا لیتے ہیں، اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت کسی شخص سے صرف اس غرض سے نکاح کرواتے ہیں کہ وہ تعلق قائم کر کے فوراً طلاق دے دے۔ ایسا شخص ''مُحَلِّل'' کہلاتا ہے اور پہلا شوہر ''مُحَلَّلة''۔

نبی اکرم ﷺ نے دونوں پر لعنت فرمائی، کیونکہ نکاح ایک مقدس رشتہ ہے جس کا مقصد دائمی رفاقت ہے، نہ کہ وقتی اور منصوبہ بند جدائی۔ یہ عمل شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد کے سراسر خلاف ہے۔

مال و دولت کے غلام پر لعنت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دینار و درہم کے غلام پر لعنت کی گئی ہے۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۴۳۵)

اس حدیث میں اُس شخص کی تصویر کھینچی گئی ہے جو دنیاوی مال و دولت کا ایسا اسیر بن جائے کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف دولت کمانا رہ جائے۔ اسلام نے حلال روزی کمانے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے باعثِ اجر بھی قرار دیا ہے، مگر جب انسان مال کا بندہ بن جائے، حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھے، ہر تعلق کو مفاد کی نظر سے دیکھے، عبادات و فرائض سے غافل ہو جائے، اور اس کی ساری تگ و دو صرف دولت کے گرد گھومنے لگے تو ایسا شخص درحقیقت مال کا غلام ہے، اور اسی پر یہ وعید وارد ہوئی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہلاک ہو جائے دینار کا غلام، درہم کا غلام، اور چادر کا غلام! اگر اسے دیا جائے تو خوش ہو جائے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جائے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۴۳۵)**

ایسا شخص ہلاک ہو، اوندھے منہ گرے، اور اگر اسے کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ بھی نہ نکل سکے۔

ان ارشادات میں دنیا پرستی کی شدید مذمت اور اس کے انجام کی ہولناکی کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، تاکہ انسان اپنے دل کو مال کی غلامی سے آزاد رکھے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اپنا اصل مقصد بنائے۔

آیت نمبر (۵۳-۵۵) اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

ترجمہ: ''کیا ان کے پاس اللہ کی بادشاہت میں کوئی حصہ ہے؟ اگر ہوتا تو یہ دوسروں کو تل برابر بھی نہ دیتے۔ یا پھر وہ حسد کرتے ہیں ان لوگوں سے جنہیں اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے؟ تو یقیناً ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب، حکمت اور بڑی بادشاہی عطا کی تھی۔ چنانچہ ان میں کچھ لوگ ان پر ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا، اور جہنم کافی ہے جو بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔''

تفسیر لباب النقول میں مذکور ہے کہ اہلِ کتاب نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو کچھ عطا ہوا ہے وہ محض تواضع کے اظہار کے لئے ہے، اور چونکہ ان کی متعدد بیویاں ہیں، اس لیے ان کا مقصد گویا صرف نکاح کرنا ہے، اور اس سے بڑھ کر اور کون سا بادشاہ ہو سکتا ہے؟

ان باطل اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ (کیا یہ لوگ دوسروں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا؟)

یہودیوں کا بغض وحسد

حقیقت یہ ہے کہ یہود اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، بلکہ وہ ہمیشہ اعتراضات اور بے بنیاد بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔ جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کے واضح دلائل کا انکار ممکن نہ رہا، اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور کبھی اس کے خلاف نہیں چلتے، تو انہوں نے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض شروع کر دیا کہ ایسے شخص کو نبی کیوں بنایا گیا جس کی بیویوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ

اعتراض درحقیقت ان کی جہالت اور عناد کا مظہر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تنگ دلی اور بخیلی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ان کے پاس اقتدار یا ملک کا کوئی حصہ بھی ہوتا، تو وہ کسی کو ''نکیر'' کے برابر بھی کچھ نہ دیتے۔

یعنی کھجور کی گٹھلی کی باریک لکیر کے برابر بھی نہیں۔ خود تو کسی کو ایک معمولی چیز دینے کے لئے تیار نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کسی کو جو نعمت عطا فرمائی، اس پر جلتے ہیں۔ حسد کرنے والا دراصل اپنی ہی آگ میں جلتا ہے؛ وہ نہ دوسروں کی نعمت کو کم کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنے دل کی جلن کو بجھا سکتا ہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تقسیم پر راضی نہیں ہوتا، حالانکہ اللہ اپنے فضل سے جسے چاہے نوازتا ہے۔

آلِ ابراہیم کو عطا کی گئی نعمتیں

چونکہ یہود بنی اسرائیل کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں یاد دلایا کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب بھی عطا کی، حکمت بھی دی، اور عظیم سلطنت بھی نصیب فرمائی۔ حضرت داؤدؑ کو زبور عطا ہوئی، اور حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ دونوں کو عظیم حکومت و سلطنت سے نوازا گیا۔

اسی طرح ان کے پاس بھی متعدد بیویاں تھیں۔ پس جب یہ سب کچھ آلِ ابراہیم کے دیگر افراد کے لیے باعثِ اعتراض نہ تھا، تو حضرت محمد ﷺ جو خود بھی آلِ ابراہیم میں سے ہیں کے بارے میں اعتراض کیسا؟

اللہ تعالیٰ نے سورۂ رعد میں ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (اور ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے، اور ہم نے انہیں بیویاں اور اولاد عطا فرمائی)۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے نکاح اور اہل و عیال ہونا کوئی غیر معمولی یا قابلِ اعتراض بات نہیں، بلکہ یہ ایک فطری اور مشروع امر ہے۔

اللہ کے اختیارات اور شریعت کی حکمتیں

اللہ تعالیٰ کو کامل اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے جو نعمت عطا فرمائے، اور جس کے لیے جو چاہے حلال قرار دے۔ اس کی عطا پر اعتراض کرنا یا اس کے فیصلوں سے عدمِ رضا ظاہر کرنا درحقیقت کفر کی طرف لے جانے والا رویہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے لئے کثرتِ ازواج کو جائز فرمایا، اور نبی اکرم ﷺ کے لئے نو بیویوں تک کی اجازت دی، جبکہ امتِ محمدیہ کے لئے چار بیویوں کی حد مقرر کردی۔ اس پر اعتراض کرنا محض جہالت اور

گمراہی ہے۔ پھر فرمایا: فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ یعنی ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور کچھ نے انکار کیا۔

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ جس طرح آلِ ابراہیم کو عطا کردہ نعمتوں پر کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا، اسی طرح آپ کے زمانے میں بھی یہی حال ہے کچھ لوگ ایمان قبول کر رہے ہیں اور کچھ انکار پر قائم ہیں۔

تاریخ انسانی کی حقیقت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حق کے مقابلے میں ہمیشہ دو گروہ رہے ہیں: ایک وہ جو ایمان لاتے ہیں، اور دوسرے وہ جو ضد اور انکار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے منکرین کے لئے اللہ تعالیٰ نے دہکتی ہوئی آگ کا وعدہ فرمایا ہے، جو ان کی سرکشی اور شرارتوں کا پورا بدلہ ہوگی۔

یہ پورا بیان اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے آشکارہ کرتا ہے کہ حسد، عناد اور اعتراض کا رویہ انسان کو حق سے دور کر دیتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر رضا اور اس کے فضل کا اعتراف ہی ایمان کی اصل روح ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ لَہُمۡ فِیۡہَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ ۫ وَّنُدۡخِلُہُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾ فَکَیۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡکَ یَحۡلِفُوۡنَ ۟ بِاللّٰہِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِیۡقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُ اللّٰہُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ ۟ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَعِظۡہُمۡ وَقُلۡ لَّہُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ قَوۡلًۢا بَلِیۡغًا ﴿۶۳﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾

ترجمہ:

(۵۶) یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، ہم انہیں جلد ہی آگ میں جھونکیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم انہیں نئی کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں، بے شک اللہ زبردست، بڑی حکمت والا ہے۔ (۵۷) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور ہم انہیں گھنے سائے میں جگہ دیں گے۔ (۵۸) بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو، اور جب

لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ سنتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے۔(۵۹) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں صاحبِ اختیار ہیں۔ پھر اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی طریقہ بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔(۶۰) کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُس پر ایمان لائے جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، لیکن چاہتے ہیں کہ فیصلہ کروائیں طاغوت (شیطان) سے، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور گمراہی میں لے جائے۔(۶۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے: آؤ اُس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسولؐ کی طرف، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ منافق آپ سے کترا رہے ہیں بڑی شدت سے۔(۶۲) پھر جب انہیں ان کے اپنے کیے کی سزا میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ آپ کے پاس آ کر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ صرف بھلائی اور صلح صفائی کا تھا۔(۶۳) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کی حقیقت اللہ جانتا ہے، تو آپ ان سے اعراض کریں، انہیں نصیحت کریں، اور ان سے ایسی مؤثر بات کریں جو اُن کے دلوں تک پہنچ جائے۔(۶۴) اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔ اور اگر وہ لوگ، جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آ جاتے، پھر اللہ سے معافی مانگتے، اور رسولؐ بھی ان کے لیے معافی مانگتا، تو وہ ضرور اللہ کو بہت معاف کرنے والا، نہایت مہربان پاتے۔

تفسیر آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک

آیت نمبر (۵۶-۵۷) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۵۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝۵۷

ترجمہ: ”یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، ہم انہیں جلد ہی آگ میں جھونکیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم انہیں نئی کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں، بے شک اللہ زبردست، بڑی حکمت والا ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ہم انہیں

ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور ہم انہیں گھنے سائے میں جگہ دیں گے''۔

کافروں کو عذاب اور مومنوں کو ثواب

تفسیر اوپر کی آیات میں اہلِ ایمان اور منکرین کا تذکرہ گزر چکا، اب یہاں کافروں کے عذاب اور مومنوں کے اجر وانعام کا نہایت مؤثر اور عبرت انگیز بیان سامنے آتا ہے۔

پہلی آیت میں کفار کے لئے سخت اور ہولناک عذاب کا ذکر ہے، جبکہ دوسری آیت میں اہلِ ایمان کے لئے بے پایاں اجر وثواب اور نعمتوں کی بشارت دی گئی ہے۔ کافروں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم انہیں ایک ایسی آگ میں داخل کریں گے جو معمولی نہیں بلکہ نہایت عظیم اور شدید ہوگی۔ لفظ ''ناراً'' کی تنوین اسی عظمت اور شدت پر دلالت کرتی ہے، اور دوسرے مقام پر اس آگ کو ''النار الکبریٰ'' یعنی سب سے بڑی آگ فرمایا گیا ہے۔

● حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا صرف ستر واں حصہ ہے''۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! (عذاب کے لئے) یہی کافی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے باوجود جہنم کی آگ کو دنیا کی آگ پر انہتر درجے زیادہ بڑھا دیا گیا ہے، اور ہر درجے کی شدت دنیا کی آگ ہی جیسی ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۶۵)

عذاب کی کیفیت

دوزخ کے عذاب کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ جب ان کی کھالیں جل کر ختم ہو جائیں گی تو ہم ان کی جگہ نئی کھالیں پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ بار بار عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ دنیا میں تو جلنے کے بعد جسم ختم ہو جاتا ہے، مگر وہاں نہ فنا ہے اور نہ نجات؛ بلکہ ایک دائمی عذاب ہے۔ اسی لئے فرمایا:

''لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى'' نہ وہ ایسی زندگی پائیں گے جس میں راحت ہو، اور نہ موت آئے گی کہ عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔

● مزید فرمایا: ''لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ'' یعنی یہ سب اس لئے ہوگا کہ وہ عذاب کو پوری شدت کے ساتھ چکھتے رہیں۔ چونکہ جلنے اور درد کا احساس کھال کے ذریعے ہوتا ہے، اس لئے بار بار نئی کھالیں پیدا کی جائیں گی تاکہ عذاب کی شدت مسلسل باقی رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' بے شک اللہ زبردست ہے، ہر چیز پر غالب ہے، اس کے فیصلے کو کوئی ٹال

نہیں سکتا، اور وہ حکمت والا ہے، اس کا ہر فیصلہ کامل دانائی پر مبنی ہے۔

دلنشیں منظر

اس ہولناک انجام کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے لئے راحت ونعمت کا دلنشین منظر پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا:

''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا''

یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

ان کے لئے پاکیزہ اور طاہرہ بیویاں ہوں گی، جو ہر ظاہری اور باطنی آلائش سے پاک ہوں گی؛ نہ ان میں کوئی جسمانی ناپاکی ہوگی اور نہ اخلاقی کمزوری، بلکہ وہ ہر اس چیز سے منزہ ہوں گی جو نفرت یا ناگواری کا سبب بنے۔

دائمی سائے

آخر میں فرمایا: ''وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا'' ہم انہیں گھنے، گہرے اور دائمی سائے میں داخل کریں گے۔ یہ سایہ ایسا ہوگا جس میں نہ دھوپ کی آمیزش ہوگی اور نہ گرمی کی تپش، بلکہ کامل راحت اور سکون کا ماحول ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی نعمتوں کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: ''جنت میں ایک درخت ہے کہ اگر کوئی سوار اس کے سائے میں سو برس تک چلتا رہے تو بھی اس کا سایہ ختم نہ ہو''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۵۲)

فائدہ: یہ درخت ''طوبیٰ'' ہے، جو جنت کی بے پایاں نعمتوں اور دائمی آسائشوں کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

آیت نمبر (۵۸) اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۵۸

ترجمہ: ''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ سنتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے''۔

امانت کی ادائیگی اور فیصلوں میں انصاف

تفسیر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نہایت واضح اور قطعی حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اصل حقداروں تک پوری دیانت

کے ساتھ پہنچائی جائیں اور جب لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کیا جائے تو عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا جائے۔ اسی حکمِ الٰہی کی عملی تفسیر ہمیں اس واقعہ میں ملتی ہے جو فتح مکہ کے موقع پر پیش آیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد حضرت عثمان بن طلحہؓ کو طلب فرمایا اور ان سے خانۂ کعبہ کی کلید طلب کی۔ جب وہ چابی لے کر حاضر ہوئے اور پیش کرنے لگے تو حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کی خدمت کے ساتھ کلید کی ذمہ داری بھی مجھے عطا فرما دیجئے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

خانۂ کعبہ کی کلید (چابی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ فرمایا کہ ''اے عثمان! چابی لے آؤ''۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ اللہ کی امانت ہے، آپ اسے لے لیجئے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چابی لے کر بیت اللہ کا دروازہ کھولا، اندر تشریف لے گئے، عبادت ادا فرمائی، پھر باہر آ کر طواف کیا۔ اسی اثناء میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر حاضر ہوئے کہ یہ امانت اس کے اصل حق دار کو واپس کر دی جائے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر چابی واپس عطا فرمائی اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا...'' (بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ)۔

اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ابی طلحہ سے فرمایا:

''اس چابی کو اللہ کی امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھو، اسے تم سے کوئی نہیں چھینے گا مگر ظالم'' اور ایک روایت میں فرمایا: ''اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھو، یہ تمہاری نسلوں میں باقی رہے گی''۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک خانۂ کعبہ کی کلید اسی خاندان کے پاس ہے، جسے ''شیبی خاندان'' کہا جاتا ہے۔

یہ واقعہ اس حقیقت کو روشن کرتا ہے کہ اسلام میں امانت اور عدل محض نظری اصول نہیں بلکہ عملی زندگی کے بنیادی ستون ہیں۔ قرآن مجید نے بارہا امانت کی ادائیگی کا حکم دیا اور خیانت سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

- اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔
- بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا۔
- اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

● اللہ ہر خائن اور ناشکرے کو ناپسند کرتا ہے۔

● اور نیک بندوں کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنی امانتوں اور وعدوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔

فائدہ: الغرض، امانت کی پاسداری اور انصاف کا قیام ایک مومن کی بنیادی پہچان ہے۔ جو شخص ان اوصاف کو اختیار کرتا ہے، وہ نہ صرف اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرے میں اعتماد، سکون اور عدل کا ماحول بھی قائم کرتا ہے۔

امانتوں کی تفصیل

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت اور دیگر قرآنی آیات کے مجموعی مطالعہ سے یہ حقیقت نہایت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے ہر قسم کی امانت کی ادائیگی کو لازم قرار دیا ہے اور خیانت کی ہر شکل کو سختی کے ساتھ مذموم ٹھہرایا ہے۔ امانت کا دائرہ محض مال تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وہ حقوق جو بندوں پر عائد ہوتے ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ، کفارہ اور نذر وغیرہ یہ سب درحقیقت امانتیں ہیں۔ ان کی ادائیگی کا حال ہر انسان خود جانتا ہے کہ اس نے کس حد تک اطاعت کی اور کہاں کوتاہی برتی، کیونکہ اکثر یہ امور ایسے ہوتے ہیں جن کی خبر دوسروں کو نہیں ہوتی۔

اسی طرح بندوں کے باہمی حقوق، جنہیں ''حقوق العباد'' کہا جاتا ہے، وہ بھی امانت ہی کی ایک صورت ہیں اور ان کی ادائیگی ہر فرد پر لازم ہے۔

ذمہ داریاں

یہ ذمہ داری صرف عام افراد تک محدود نہیں بلکہ معاشرے کے ہر طبقے کو محیط ہے۔ حکام، مالکان، ذمہ داران اور اربابِ اختیار سب امانت کے امین ہیں۔ ان کے سپرد جو منصب اور اختیارات ہیں، وہ ایک بھاری ذمہ داری ہیں جنہیں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ادا کرنا لازم ہے۔ کسی بھی معاملے میں عوام کے ساتھ خیانت کرنا نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ دینی اعتبار سے بھی سخت گناہ ہے۔

اسی طرح انسانی تعلقات کا ہر رشتہ بھی امانت کے دائرے میں آتا ہے۔ سفر کے ساتھی، پڑوسی، میاں بیوی، والدین اور اولاد سب ایک دوسرے کے حقوق اور معاملات میں امین ہیں۔ جو شخص ان امانتوں میں خیانت کرتا ہے، وہ گناہگار ہوتا ہے اور آخرت کے دن اس سے باز پرس ہوگی۔

قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کے اندر یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جب ایک شخص دوسرے پر اعتماد کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اس اعتماد کی حفاظت کرے اور اپنے رب سے ڈرتا رہے۔

امانت داری اور ایمان کا بنیادی تقاضا

حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شاذ و نادر ہی کوئی خطبہ ایسا دیا ہوگا جس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: ''اس شخص کا ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں، اور اس کا دین نہیں جو عہد کو پورا نہ کرے''۔
(سنن بیہقی، حدیث نمبر: ۱۲۶۹۰)

یہ ارشاد اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ امانت داری محض ایک اخلاقی خوبی نہیں بلکہ ایمان کا لازمی جز ہے۔

منافق کی پہچان

رسول اللہ ﷺ نے منافق کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو، پھر بھی اس میں تین نشانیاں ہوں تو وہ نفاق کا حامل ہے:

- جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
- جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔
- جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۳)**

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو تو اس میں نفاق کی ایک علامت ہے، جب تک وہ اسے ترک نہ کر دے''۔

- امانت میں خیانت کرنا۔
- بات میں جھوٹ بولنا۔
- وعدہ کر کے دھوکہ دینا۔
- جھگڑے میں بدزبانی کرنا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۴)**

الغرض، امانت داری ایک ایسا وصف ہے جو ایمان کی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے، جبکہ خیانت انسان کو نفاق کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک مومن کی حقیقی شان یہی ہے کہ وہ ہر حال میں امانت کی حفاظت کرے اور اپنے قول و عمل میں دیانت کو اختیار کرے۔

اداروں کے مال کی حفاظت

جن افراد کے سپرد دوسروں کے اموال اور وسائل کی نگرانی ہوتی ہے، وہ محض منتظم نہیں بلکہ امانت کے حقیقی

محافظ ہوتے ہیں۔ان میں مالکان اور حکام بھی شامل ہیں، یتیموں کے سرپرست بھی، مساجد کے متولی، مدارس کے مہتمم، بیت المال کے نگراں اور وہ تمام افراد بھی جو کسی نہ کسی صورت دوسروں کے مال کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ یہ سب اس بات کے پابند ہیں کہ امانت کی حفاظت پوری دیانت کے ساتھ کریں اور اس میں ادنیٰ درجے کی خیانت سے بھی بچیں۔

امانت کی حفاظت اور اس کی صحیح ادائیگی نہایت عظیم ذمہ داری ہے۔ دنیا میں یہ عہدے اگرچہ بظاہر عزت اور سہولت کا ذریعہ نظر آتے ہیں، لیکن اگر ان کی ذمہ داریاں ادا نہ کی جائیں تو یہی مناصب قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا سبب بن جائیں گے۔

عہدہ کی ذمہ داری

حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا آپ مجھے کوئی ذمہ داری (عہدہ) عطا نہیں فرماتے؟'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے کندھے پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا: ''اے ابوذر! تم کمزور ہو، اور یہ عہدہ ایک امانت ہے، اور یقیناً یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث ہوگا، سوائے اس شخص کے جس نے اسے حق کے ساتھ لیا اور اس کی ذمہ داری کو پورا کیا''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۸۲۵)**

● ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! میں تمہیں کمزور دیکھتا ہوں اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، لہٰذا تم دو آدمیوں کے بھی امیر نہ بننا اور نہ ہی یتیم کے مال کے متولی بننا''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۲۶)**

فائدہ: یہ تعلیم اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ہر شخص ہر منصب کا اہل نہیں ہوتا، اور ذمہ داری قبول کرنے سے پہلے اپنی اہلیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

نااہل افراد کو عہدے

آج کے معاشرے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ اپنی ذاتی خواہشات، تعلقات یا اقتدار کے زور پر نااہل افراد کو اہم عہدوں پر فائز کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ افراد اس ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں۔

عہدہ درحقیقت ایک امانت ہے، جس کا حق ادا کرنا انتہائی ضروری ہے، مگر دنیاوی مفادات کے تحت فاسق، فاجر، ظالم اور بے پروا افراد کو ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔

اکثر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس شخص کو اختیار دیا جا رہا ہے، وہ اللہ سے ڈرنے والا ہے یا نہیں، دین پر قائم ہے یا نہیں، اور عوام کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہوگا۔

اس کے برعکس، عہدے دیتے وقت رشتہ داری، جماعتی وابستگی یا خاندانی تعلق کو معیار بنایا جاتا ہے، گویا اصل معیار ''یہ ہمارا آدمی ہے'' بن جاتا ہے۔ نتیجتاً عدل وانصاف پسِ پشت چلا جاتا ہے اور فیصلے غیر شرعی بنیادوں پر ہونے لگتے ہیں، جس کا خمیازہ عوام کو ظلم اور ناانصافی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

نااہل کے مقرر کرنے پر لعنت

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا، پھر اس نے ذاتی تعلقات یا مروت کی بنیاد پر کسی کو امیر مقرر کر دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے، اس کا کوئی فرض یا نفل قبول نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اسے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱)**

حکام کی خیانت

جب لوگ اقتدار حاصل کرتے ہیں تو اکثر اپنے وعدوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف وعدہ خلافی کرتے ہیں بلکہ عوام پر ظلم بھی ڈھاتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں کے لئے مختلف عذر تراشتے ہیں، حالانکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی سخت وعیدیں موجود ہیں۔

● حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مسلمانوں میں سے کسی جماعت کا نگہبان بنایا گیا، پھر وہ اس حال میں فوت ہوا کہ وہ ان کے ساتھ خیانت کرنے والا تھا، تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۵۱)**

عوام کے حقوق

ایک اور روایت میں فرمایا: ''جس بندے کو اللہ نے لوگوں کی ذمہ داری دی، پھر اس نے ان کی خیر خواہی نہ کی، وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۵۰)**

فائدہ: الغرض، امانت داری صرف ایک اخلاقی وصف نہیں بلکہ ایک عظیم دینی فریضہ ہے۔ جو شخص اس ذمہ داری کو اخلاص، دیانت اور خوفِ خدا کے ساتھ ادا کرتا ہے، وہی کامیاب ہے، اور جو اس میں خیانت کرتا ہے، وہ دنیا و آخرت دونوں میں خسارے کا مستحق بنتا ہے۔

کام کی ادائیگی اور معاشرتی ذمہ داریاں

جو افراد اپنی پوری تنخواہ وصول کرتے ہیں مگر اپنے کام کو مکمل دیانت کے ساتھ انجام نہیں دیتے یا اپنے مقررہ

اوقات کی پابندی نہیں کرتے، وہ درحقیقت امانت میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔اسی طرح وہ لوگ بھی جو رشوت لیتے ہیں اور حق وانصاف کے مطابق کام کرنے کے بجائے رشوت دینے والے کی خواہش کے مطابق فیصلے کر دیتے ہیں، وہ بھی خیانت کے دائرے میں آتے ہیں۔

رشوت اپنی ذات میں حرام ہے ہی، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسی ملازمت کی آمدنی بھی مکمل طور پر حلال نہیں رہتی، کیونکہ جس خدمت کے بدلے معاوضہ لیا جارہا ہے، اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جارہا۔

حقیقت یہ ہے کہ امانت داری ایک نہایت عظیم اور ہمہ گیر صفت ہے۔ یہ صرف مال و دولت تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے دائرے میں شامل کرتی ہے۔

مجالس بھی امانت ہیں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر معاملے میں امانت داری کو لازم قرار دیا اور فرمایا: ''**المجالس بالأمانة**''۔یعنی مجالس امانت کے حکم میں ہیں۔(**سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۸۶۹**)

فائدہ: اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مجلس میں ہونے والی گفتگو ایک امانت ہوتی ہے، جسے باہر جا کر بیان کرنا امانت کے خلاف اور اہلِ مجلس کے ساتھ خیانت ہے۔البتہ اگر کسی مجلس میں کسی سنگین گناہ جیسے ناحق قتل، زنا یا کسی کے مال پر ناجائز قبضہ کا منصوبہ بنایا جارہا ہو، تو اس کی اطلاع دینا جائز ہے تاکہ اس برائی کو روکا جاسکے۔

مزید یہ بھی بیان ہوا کہ اگر کوئی شخص بات کرتے وقت ادھر اُدھر دیکھے (گویا یہ ظاہر کرے کہ بات خفیہ ہے)، تو وہ بات بھی امانت شمار ہوتی ہے۔

مشورہ ایک امانت ہے

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے مشورہ طلب کیا جائے، وہ امانت دار ہوتا ہے''۔(**سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۱۲۸**)

فائدہ: اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی سے رائے یا مشورہ مانگا جائے تو وہ دیانت داری کے ساتھ وہی بات بتائے جو اس کے نزدیک بہتر اور صحیح ہو۔اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا مشورہ دے جو نقصان دہ ہو، تو وہ دراصل امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اسی ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے بھائی کو ایسا مشورہ دیا جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے خلاف ہے، تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی''۔(**سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۶۵۷**)

دیگر معاملات میں امانت داری

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض دیگر اعمال کو بھی خیانت کے زمرے میں شمار فرمایا، جن سے بچنا ضروری ہے جیسے:
جو شخص امامت کرے اور دعا میں صرف اپنے آپ کو مخصوص کر لے، اس نے جماعت کے حق میں خیانت کی۔ اسی طرح جو شخص بغیر اجازت کسی کے گھر میں جھانکے، اس نے اہلِ خانہ کے ساتھ خیانت کی۔

ان تمام تعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امانت داری کا تعلق صرف مالی معاملات تک محدود نہیں، بلکہ انسان کے ہر قول و فعل، ہر تعلق اور ہر ذمہ داری میں اس کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو با اعتماد، دیانت دار اور حقیقی معنوں میں مومن بناتی ہے۔

عدل وانصاف کا حکم

امانتوں کی ادائیگی کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت اہم اور بنیادی اصول کی طرف رہنمائی فرمائی، اور وہ ہے فیصلوں میں عدل وانصاف کا قیام۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:
''وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ''یعنی جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

شریعتِ اسلامیہ میں جن امور کو غیر معمولی اہمیت اور تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں عدل پر مبنی فیصلے کرنا بھی شامل ہے۔ انصاف کرنے والوں کے لیے بلند درجات اور عظیم اجر کی بشارت دی گئی ہے، جبکہ ظلم پر مبنی فیصلے کرنے والوں کے لئے سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

حقیقی انصاف اسی وقت قائم ہوتا ہے جب فیصلے اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے مطابق ہوں جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ ضابطوں کے مطابق ہر حق دار کو اس کا حق دینا اور ہر چیز کو اس کے مستحق تک پہنچانا ہی عدل کی حقیقی روح ہے۔

قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اکثر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن وحدیث کے برخلاف فیصلے کرنا حقیقت میں ظلم ہے، خواہ دنیا کے لوگ اسے انصاف کا نام ہی کیوں نہ دیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں: جیسے میراث و وصیت، دیت وقصاص، حدود وسزائیں، تجارت وزراعت، طلاق و نکاح، نظامِ حکومت اور دیگر معاملاتِ حیات کے لئے شریعتِ اسلامیہ نے واضح اصول وضوابط مقرر کئے ہیں۔

ان الٰہی قوانین کے خلاف فیصلہ دینا، دراصل انصاف سے انحراف اور ظلم کا ارتکاب ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ مائدہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' یعنی جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جہاں غیر مسلم حکومتیں ہیں وہاں تو شریعت کے خلاف فیصلے ہونا متوقع ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے ایسے ممالک جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے، وہاں بھی ذمہ داران اسلامی قوانین کو نافذ کرنے سے گریزاں ہیں۔ وہ زبانی طور پر اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، مگر جب شریعت کے نفاذ کی بات آتی ہے تو اس سے پہلوتہی اختیار کرتے ہیں۔

مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ عوام خود بھی، مغربی قوانین کے نتیجے میں ظلم سہنے کے باوجود، اسلامی نظام کے قیام کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ وہ اپنی شناخت تو مسلمان کی رکھتے ہیں، مگر عملی طور پر دشمنانِ دین کے وضع کردہ قوانین کو قبول کرتے ہیں۔

● اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ''

''کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ اور یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟''۔ الغرض، عدل وانصاف کا حقیقی معیار وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اسی میں فرد اور معاشرے کی فلاح، امن اور حقیقی کامیابی مضمر ہے۔

ظالمانہ فیصلوں کے نتائج

آج جو غیر اسلامی اور غیر منصفانہ فیصلے رائج ہیں، ان کے سبب معاشرے پر مصیبتوں کا ایک طوفان برپا ہے۔ یہ محض اتفاقی حالات نہیں بلکہ انسانی اعمال کا نتیجہ ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی اس کی نشاندہی فرمادی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں پانچ خرابیاں پیدا ہوجائیں اور میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تم میں ظاہر نہ ہوں''۔

پھر آپ ﷺ نے ان برائیوں اور ان کے نتائج کو اس طرح بیان فرمایا:

(۱) جب کسی قوم میں زنا علانیہ ہونے لگتا ہے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیلتی ہیں جو ان کے اسلاف

میں کبھی ظاہر نہ ہوئی تھیں۔

(۲) جب لوگ زکوٰۃ روک لیتے ہیں تو انہیں بارش سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور اگر چوپائے نہ ہوتے تو بارش بالکل نہ ہوتی۔

(۳) جب ناپ تول میں کمی کی جاتی ہے تو قحط، سخت محنت اور حکمرانوں کے ظلم کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

(۴) جب حکمران اللہ کے نازل کردہ قوانین کے خلاف فیصلے کرتے ہیں تو اللہ ان پر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے، جو ان کے وسائل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

(۵) اور جب لوگ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں تو ان کے درمیان باہمی لڑائیاں اور انتشار پیدا ہو جاتے ہیں۔ **(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۰۱۹)**

اسی حقیقت کو حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے بھی بیان فرمایا کہ جب کسی قوم میں خیانت عام ہو جاتی ہے تو اللہ ان کے دلوں میں خوف اور ہیبت ڈال دیتا ہے، ناپ تول میں کمی سے رزق میں برکت ختم ہو جاتی ہے، ظلم سے خونریزی بڑھتی ہے، اور عہد شکنی کے نتیجے میں دشمن مسلط ہو جاتے ہیں۔

تقویٰ اور انصاف کی بنیاد

حقیقی انصاف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب دل میں اللہ کا خوف، تقویٰ کی کیفیت اور حق کی پیروی کا جذبہ موجود ہو۔ جو شخص قرآن و حدیث کے احکام سے واقف نہ ہو اور عدالتی مسائل کی سمجھ نہ رکھتا ہو، وہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ کرتے وقت کسی قسم کی جانبداری نہ ہو نہ امیر اور غریب کا فرق، نہ اپنے اور پرائے کی تمیز، نہ زبان، قوم یا تعلق کا لحاظ۔ عدل کا معیار یہی ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا:

''لوگوں کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو''۔ یعنی جس طرح انسان اپنے لئے حق اور انصاف چاہتا ہے، اسی طرح دوسروں کے معاملات میں بھی اسی معیار کو اختیار کرے۔

آج کا المیہ اور انجام

آج کا المیہ یہ ہے کہ فیصلے اکثر حق کی بنیاد پر نہیں بلکہ تعلقات، قومیت، پیشہ، زبان یا ذاتی مفاد کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ حکمران اور ذمہ دار افراد ظالم کا ساتھ دیتے ہیں، اس کی رعایت کرتے ہیں اور حق دار کو اس کے حق سے محروم

کر دیتے ہیں۔

رشوت کا چلن عام ہو چکا ہے، جو زیادہ مال دے دیتا ہے، اس کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں یہ مال و دولت اور نوٹوں کے انبار بظاہر دلکش محسوس ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہی چیزیں آخرت میں سخت وبال اور عذاب کا سبب بنیں گی، جس سے اکثر لوگ غافل ہیں۔

الغرض، ظلم پر مبنی فیصلے نہ صرف دنیا میں تباہی کا باعث بنتے ہیں بلکہ آخرت میں بھی شدید گرفت اور انجامِ بد کا ذریعہ ہیں، جبکہ عدل وانصاف وہ نور ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو کامیابی اور فلاح کی راہ دکھاتا ہے۔

انصاف کے فیصلے اور ظالموں کی ہلاکت

جس طرح ظلم کرنے والوں کے لئے سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو کتابِ الٰہی (قرآن مجید) اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق فیصلے کرتے ہیں، ان کے لئے عظیم بشارتیں بھی دی گئی ہیں۔ عدل وانصاف کا قیام دراصل اللہ کی رضا اور کامیابیِ آخرت کا ذریعہ ہے۔

● حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قاضی تین قسم کے ہیں؛ ان میں سے ایک جنتی ہے اور دو جہنمی۔ وہ جنتی ہے جس نے حق کو پہچانا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور وہ شخص جس نے حق کو پہچانا مگر اس کے خلاف ظلم کا فیصلہ کیا، وہ جہنم میں جائے گا۔

اسی طرح وہ شخص بھی جہنم میں ہوگا جو جہالت کے ساتھ، بغیر حق کو سمجھے، لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے''۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۷۳)

فائدہ: یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ منصبِ قضا محض ایک عہدہ نہیں بلکہ ایک عظیم امتحان ہے، جس میں کامیابی صرف اسی کو ملتی ہے جو حق کو جان کر اس پر قائم رہے۔

اہل جنت کی قسمیں

اسی طرح ان سات خوش نصیب افراد میں، جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ نصیب ہوگا، جب اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، سب سے پہلے ''امامِ عادل'' کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ حکمران جو انصاف کو اپنا شعار بنائے۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت تین قسم کے ہوں گے:

(۱) وہ صاحبِ اقتدار جو عدل وانصاف کرنے والا ہو اور خیر کی توفیق سے نوازا گیا ہو۔

(۲) وہ شخص جو نرم دل اور رحم کرنے والا ہو۔

(۳) وہ شخص جو اہل وعیال رکھنے کے باوجود حرام سے بچنے والا اور پرہیز گاری اختیار کرنے والا ہو۔
(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۶۵)

فائدہ: ان ارشادات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اقتدار اور فیصلہ سازی کا منصب نہایت نازک اور بھاری ذمہ داری ہے، جس کا حساب آخرت میں نہایت سخت ہوگا۔

● حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے منصب پر فائز کیا گیا، گویا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۷۱)**

فائدہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عہدے کی ذمہ داری اور اس کا انجام نہایت سخت اور تکلیف دہ ہے۔ دنیا میں تو یہ منصب عزت اور اختیار کا مظہر دکھائی دیتا ہے، مگر اگر اس کے تقاضے پورے نہ کئے جائیں تو آخرت میں اس کا انجام نہایت دردناک ہوگا، ایسا جیسے کسی کو بغیر چھری کے ذبح کیا جائے، جس کی تکلیف حد درجہ شدید ہوتی ہے۔

حاکموں کے لئے سخت تنبیہ

یہ تعلیم ہر اس شخص کے لئے ایک سنجیدہ تنبیہ ہے جو کسی بھی درجے میں حاکم، قاضی یا مجسٹریٹ کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، قیامت کے دن اسے لایا جائے گا اور جہنم کے کنارے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اگر حکم ہوگا تو اسے دھکا دے دیا جائے گا، اور وہ ستر سال تک گہرائی میں گرتا چلا جائے گا''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۴۰۹۷)**

● اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن انصاف کرنے والا قاضی بھی ایک وقت ایسا محسوس کرے گا کہ حساب کی سختی کے باعث یہ تمنا کرے گا کہ کاش میں نے کسی ایک کھجور کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کیا ہوتا''۔ **(ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۰۵۵)**

فائدہ: الغرض، عدل وانصاف کا منصب جہاں عظیم اجر وثواب کا ذریعہ ہے، وہیں اس میں ذرا سی کوتاہی انسان کو ہلاکت اور شدید عذاب تک پہنچا سکتی ہے۔ پس ہر صاحبِ اختیار کے لئے لازم ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو اللہ کے خوف، تقویٰ اور کامل دیانت کے ساتھ ادا کرے، تاکہ دنیا میں بھی عزت پائے اور آخرت میں بھی سرخرو ہو۔

حاکم کے انتخاب کا معیار

یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب منصبِ قضا اور حکومت کے بارے میں اتنی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں تو پھر

لوگوں کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کون کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو شریعت کے اصولوں کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے اور وہ قرآن وسنت کی روشنی میں، عدل وانصاف کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلے کرے، خود بھی اسی کے مطابق زندگی گزارے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلائے، تو ایسا قاضی ان شاء اللہ کامیاب اور سرخ رو ہوگا۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ایسے قاضی کے انتخاب کا معیار کیا ہو؟ شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ شخص اس منصب کے لئے منتخب کیا جائے جو خود اس عہدے کا طلب گار نہ ہو، نہ اس کی خواہش رکھتا ہو، نہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرے، نہ سفارش ڈھونڈے اور نہ رشوت کا سہارا لے، بلکہ اس ذمہ داری سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتا ہو، ایسے ہی شخص کو قضا کا منصب سونپنا چاہئے۔

قضا کے منصب کا طالب

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص خود قضا کے منصب کا طلب گار ہو اور اس کے لئے سفارشوں کا سہارا لے، اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے (یعنی اللہ کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی)، اور جسے اس ذمہ داری پر مجبور کیا جائے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو اسے صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا رہتا ہے''۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۲۳)

فائدہ: اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص اس منصب کا خواہشمند ہو، اسے ہرگز یہ ذمہ داری نہیں دینی چاہئے، کیونکہ اس کی خواہش اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس عہدے سے دنیاوی فائدہ، عزت یا اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا شخص عموماً حق پر قائم نہیں رہتا، بلکہ اپنی خواہشات کے تابع ہو کر فیصلے کرتا ہے، جہالت سے کام لیتا ہے، رشوت کا مرتکب ہوتا ہے اور اپنے و پرائے کی بنیاد پر انصاف کو پامال کرتا ہے۔

اس کے برعکس، جس شخص کو اس منصب پر زبردستی مامور کیا جائے، وہ چونکہ پہلے ہی اس کی ذمہ داری سے خوفزدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنے نفس کو اس کے تقاضے پورے کرنے کا پابند بناتا ہے۔ یہی وہ اصول ہے کہ اگر اسے اختیار کر لیا جائے تو معاشرے میں ہونے والے بے شمار ظلم اور ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

موجودہ نظام کا المیہ

آج صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ لوگ ابتدا ہی سے اس نیت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ وہ جج یا مجسٹریٹ بنیں گے۔ پھر اس کے لئے درخواستیں دیتے ہیں، سفارشیں ڈھونڈتے ہیں، حتیٰ کہ رشوت تک کا سہارا لیتے ہیں۔ اور جن کے ہاتھ میں تقرری کا اختیار ہوتا ہے، وہ بھی انہی سفارشات، رشوتوں اور ظاہری ڈگریوں کی بنیاد پر لوگوں

کو اعلیٰ مناصب پر فائز کر دیتے ہیں۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ اس بات کی تحقیق نہیں کی جاتی کہ اس شخص کو قرآن وحدیث کا علم ہے یا نہیں، اس میں تقویٰ اور خدا ترسی کتنی ہے، اور کیا اس سے واقعی انصاف کی امید کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

اسی طرح ایک مظلوم شخص براہِ راست حاکم تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ اسے وکیل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ وکیل کی فیس ادا کرے، درخواست دے، پھر تاریخوں پر تاریخ ملتی رہتی ہے، اور اس طرح اس کے وقت اور مال دونوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے۔ یہ طریقہ انصاف کی روح کے خلاف ہے، مگر اسی کو رواج دے کر اپنایا جا رہا ہے، اور مظلوم کی حقیقی مدد کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔

اللہ کی نصیحت (سراپا خیر)

آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا'' یعنی بے شک اللہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات اور نصیحتیں دی ہیں، وہ سراسر خیر اور بھلائی پر مبنی ہیں۔ ان میں دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی پوشیدہ ہے، لہٰذا انہیں خوش دلی سے قبول کر کے ان پر عمل کرنا چاہیے۔

اور جو شخص اس نصیحت کو نظر انداز کرے گا، بھلائی کو قبول نہیں کرے گا، تو وہ اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا، کیونکہ وہ ہر بات کو سننے والا اور ہر عمل کو دیکھنے والا ہے۔ کوئی بھی عمل اس کے علم سے مخفی نہیں۔

درحقیقت یہ ایک زبردست تنبیہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو شریعت کے خلاف فیصلے کرنے، نااہل اور ظالم افراد کو مناصب پر فائز کرنے اور رشوت کے ذریعے عدل کو پامال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ سنجیدگی سے غور کریں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ ایک دن انہیں اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، جہاں ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔

آیت نمبر (۵۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسولؐ کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں صاحبِ اختیار ہیں۔ پھر اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی طریقہ بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے''۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

تفسیر اس آیت کے سببِ نزول کے ضمن میں علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک فوجی دستے کا امیر مقرر فرمایا۔ اس لشکر میں حضرت عمار بن یاسرؓ بھی شامل تھے۔ دورانِ سفر حضرت عمارؓ نے امیر سے اجازت لئے بغیر ایک شخص کو امان دے دی۔

حضرت خالدؓ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا: ''تم نے میرے بغیر اجازت کے امان کیوں دی؟'' اس سے دونوں کے درمیان کچھ تلخی پیدا ہوگئی۔

جب یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمارؓ کی دی ہوئی امان کو برقرار رکھا، تاہم انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ آئندہ امیر کی رائے کے بغیر ایسا نہ کیا کریں۔ یوں دونوں کے درمیان صلح اور باہمی رضامندی قائم ہوگئی۔ (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۵۶۷۵)

وسیع مفہوم

اگرچہ اس آیت کا ایک مخصوص سببِ نزول ہے، لیکن اس کا مفہوم نہایت وسیع اور عام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اطاعت وفرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جب کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے، اور جو فیصلہ وہاں سے ملے اسے دل وجان سے قبول کیا جائے۔

قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے، اسی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ان پر اپنی کتاب نازل کی اور ان کے ذریعے احکام جاری فرمائے۔ لہٰذا ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ ان احکام کی پیروی کرے، کیونکہ نافرمانی عذابِ الٰہی کا سبب بنتی ہے۔

امیر کی اطاعت (اتحاد کی بنیاد)

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ''اولوالامر'' یعنی ذمہ داران و حکام کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کو امیر یا قائد تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ امام ہو یا خلیفہ تو اس کی اطاعت ہی امت کے اتحاد کی ضامن بنتی ہے۔

اگر امیر کی اطاعت ترک کر دی جائے تو انتشار اور تفرقہ جنم لیتا ہے، ہر فرد اپنی راہ اختیار کر لیتا ہے، اور یوں امت کی شیرازہ بندی بکھر جاتی ہے۔ اس اختلاف وانتشار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن غالب آجاتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی بڑی قیادت کی طرف سے یا مسلمانوں کے کسی گروہ کی جانب سے کسی کو امیر مقرر کیا جائے، تو اس کی اطاعت بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کی نافرمانی بھی باہمی نزاع اور فساد کا سبب بنتی ہے۔

چونکہ امیر کی اطاعت کا حکم خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لئے اس کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ اس میں نہ صرف اجر وثواب ہے بلکہ مسلمانوں کے اتحاد، نظم اور استحکام کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

امیر کی نافرمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۳۷)

فائدہ: الغرض، اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ اختیار کی اطاعت وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر ایک صالح، متحد اور مستحکم معاشرہ قائم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری نہیں

حضرت حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم پر ایسا شخص امیر بنا دیا جائے جس کے ظاہری عیوب بھی ہوں، مگر وہ تمہیں اللہ کی کتاب کے مطابق چلائے، تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو''۔ اس ارشاد سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ امیر کی اطاعت اس کے ظاہری مرتبے یا شخصیت کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کے عدل وحق پر قائم ہونے کی بنیاد پر ہے۔ چنانچہ اہلِ اقتدار کی اطاعت واجب ہے، لیکن صرف ان امور میں جو شریعت کے مطابق ہوں، نہ کہ اس کے خلاف۔

● حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے، چاہے وہ اسے پسند ہو یا نہ ہو، جب تک اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ پس اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنی ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۴۴)

اطاعت کی ممانعت

اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گناہ کے کام میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت صرف نیکی کے کام میں ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۲۵۷)

فائدہ: یہ اصول نہایت واضح اور قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی بھی فرمانبرداری جائز نہیں۔

لیکن افسوس کہ آج کے دور میں جب بعض لوگ اقتدار کے منصب پر فائز ہوتے ہیں تو وہ خود کو ''اولوالامر'' سمجھ کر دوسروں سے اطاعت کا تقاضا کرتے ہیں، مگر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ان کے احکام اللہ کی اطاعت کے مطابق ہیں یا اس کی نافرمانی پر مبنی ہیں۔

خود بھی احکامِ الٰہی سے انحراف کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب اپنے فیصلوں کو نافذ کروانا ہو، خواہ وہ غیر شرعی قوانین پر مبنی ہوں تو اسی آیت کو دلیل بنا کر عوام کو اطاعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرمادیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں۔

امام المسلمین پر واجب امر

لہٰذا جو لوگ اقتدار کے منصب پر فائز ہوں، ان پر لازم ہے کہ وہ خود بھی اللہ کے احکام کے پابند رہیں اور دوسروں کو بھی شریعت کے مطابق چلائیں۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ کا ارشاد ہے: ''امام المسلمین پر واجب ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے کرے اور امانت ادا کرے، پھر جب وہ ایسا کرے تو عوام پر لازم ہے کہ اس کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں''۔ **(تفسیر طبری)**

اولوالامر کا مفہوم

''اولوالامر'' کے مفہوم میں اہلِ علم و تفسیر کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک اس سے مراد امراء ہیں، جبکہ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد فقہاء اور علماء ہیں، جو لوگوں کو دینی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسی رائے کو حضرت حسن بصریؒ اور حضرت مجاہدؒ نے بھی اختیار کیا، جبکہ حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ حضرت عطاؒ کے نزدیک اس سے مہاجرین، انصار اور تابعین مراد ہیں۔

اہل اقتدار کی اطاعت کا معیار

مفسر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر اس آیت کا مفہوم عام ہے، جس میں تمام اہلِ اقتدار، خواہ وہ حکمران ہوں یا علماء شامل ہیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ علماء کے ہاتھ میں دین کا نظام ہے اور امراء کے ہاتھ میں حکومت کا نظم ونسق۔ جب دونوں کی صحیح اطاعت کی جائے تو دین کے تمام تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور امت میں اتحاد و استحکام باقی رہتا ہے۔ الغرض، اطاعت کا اصل معیار اللہ کی رضا اور شریعت کی پیروی ہے؛ اسی میں کامیابی، اتحاد اور فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔

اختلاف کا حل

اللہ تعالیٰ نے باہمی نزاعات کے حل کے لئے ایک نہایت جامع اور سنہرا اصول عطا فرمایا:

''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ''

یعنی اگر تم کسی معاملے میں باہم اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ آیت دراصل مومن کی شان اور اس کے طرزِ عمل کو واضح کرتی ہے۔ جب کوئی شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اور آخرت کے حساب و کتاب کا یقین اپنے دل میں بسا لیتا ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کو معیار بنائے۔

کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی طرف رجوع

جب کبھی اختلاف پیدا ہو، تو ہر فریق کو چاہئے کہ وہ کتابِ الٰہی اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرے، اور جو فیصلہ وہاں سے سامنے آئے، اسے دل کی رضا کے ساتھ قبول کرے، اپنی رائے کو اس کے تابع کر دے اور اپنے نفس کو اس کے آگے جھکا دے۔

لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ، خواہ وہ معاشرے کے بااثر افراد ہوں، حکمران ہوں یا عام لوگ، اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں۔ بعض اوقات دنیاوی مفاد کے نقصان کے اندیشے سے وہ قرآن و حدیث کے فیصلے کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک سچے مومن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر راضی رہے۔

مسلم معاشرے کی موجودہ حقیقت

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سی مسلم حکومتیں نام کی حد تک اسلامی ہیں، مگر قوانین سازی کے وقت قرآن و سنت کو بنیاد نہیں بناتیں، بلکہ یورپی نظاموں کو سامنے رکھ کر انہی میں کچھ ردوبدل کر کے قوانین نافذ کر دیتی ہیں۔ جب حدود، زنا یا قصاص جیسے شرعی احکام کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے تو اس سے گریز کیا جاتا ہے۔

کچھ ممالک قومیت (نیشنلزم) کو اپنا شعار بناتے ہیں، کچھ اشتراکیت (کمیونزم) یا سوشلزم کو اختیار کرتے ہیں، اور بعض مغربی جمہوریت کے راستے پر چلتے ہیں، جبکہ اسلامی نظام کے نفاذ میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔

یہ طرزِ عمل اس دعوائے ایمان سے ہم آہنگ نہیں، کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ کتابِ اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عملی زندگی کا محور بنایا جائے اور عوام کو بھی اسی راہ پر چلایا جائے۔

اجتماعی رویّہ اور کمزوری

آج اکثر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر قرآن کا حکم ان کے دنیاوی مفادات یا رائج رسم ورواج کے خلاف ہو تو وہ اسے قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔ چاہے وہ حکمران ہوں یا عوام، سرمایہ دار ہوں یا مزدور اختلاف کے وقت ہر ایک اپنی رائے، اپنے فائدے اور اپنے گروہی یا قبائلی اصولوں کو ترجیح دیتا ہے، مگر قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے سے گریزاں رہتا ہے۔

بدعت اور سنت کا معیار

دینی معاملات میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں؛ ایک جماعت کسی عمل کو بدعت قرار دیتی ہے اور دوسری اسے دین کا حصہ سمجھتی ہے۔ ان اختلافات کا آسان اور واضح حل یہی ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔ جو بات قرآن وحدیث سے ثابت ہو، اسی کو اختیار کیا جائے۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی قائم کردہ بدعات یا آراء کو ترجیح دیتے ہیں اور نصوصِ شرعیہ کے مقابلے میں انہیں ہی برقرار رکھتے ہیں۔

حقیقی کامیابی کا راستہ

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا'' یعنی یہی طریقہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔ اس میں واضح تنبیہ ہے کہ اپنی اپنی آراء پر چلنے میں کوئی بھلائی نہیں۔ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اس کی ذاتی رائے یا اس کے گروہ کا نظریہ بہتر ہے؛ حقیقی بھلائی اسی میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ دنیا وآخرت کی کامیابی اسی اطاعت میں مضمر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو اختیار کیا جائے، کیونکہ خیر وفلاح کا سرچشمہ وہی ہے۔

آیت نمبر (۶۰-۶۵) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

ترجمہ: ''کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُس پر ایمان لائے جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، لیکن چاہتے ہیں کہ فیصلہ کروائیں طاغوت (شیطان) سے، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور گمراہی میں لے جائے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ''آؤ اُس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسولؐ کی طرف''، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ منافق آپ سے کترا رہے ہیں بڑی شدت سے۔ پھر جب انہیں ان کے اپنے کئے کی سزا میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ آپ کے پاس آ کر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ صرف بھلائی اور صلح صفائی کا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کی حقیقت اللہ جانتا ہے، تو آپ ان سے اعراض کریں، انہیں نصیحت کریں، اور ان سے ایسی مؤثر بات کریں جو اُن کے دلوں تک پہنچ جائے۔ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔ اور اگر وہ لوگ، جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آ جاتے، پھر اللہ سے معافی مانگتے، اور رسولؐ بھی ان کے لئے معافی مانگتا، تو وہ ضرور اللہ کو بہت معاف کرنے والا، نہایت مہربان پاتے۔ تو (اے محمدؐ!) آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے اختلافات میں حَکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ آپ کریں، اس پر دل میں بھی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ اسے خوش دلی سے قبول کر لیں''۔

ایک منافق کا واقعہ

تفسیر تفسیر معالم التنزیل میں سببِ نزول کے ضمن میں ایک نہایت عبرت آموز واقعہ نقل کیا گیا ہے جیسے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص 'بشر' نامی، جو ظاہر میں مسلمان مگر باطن میں منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ نزاع پیدا ہو گیا۔ دونوں کو فیصلہ کروانے کے لئے کسی منصف کے پاس جانا تھا۔ یہودی نے کہا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں چلیں تا کہ وہ ہمارے درمیان حق کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ لیکن بشر منافق نے اس پر رضامندی ظاہر نہ کی اور کہا کہ ہم کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں، جو

یہودیوں کا سردار تھا۔

یہودی نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ ہی کے پاس فیصلہ کے لئے جاؤں گا۔ جب بشر نے دیکھا کہ وہ کسی اور پر راضی نہیں ہوتا، تو وہ بادلِ ناخواستہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے عدل کے مطابق فیصلہ فرمایا، جو یہودی کے حق میں تھا۔ لیکن جب وہ دونوں باہر نکلے تو بشر نے کہا کہ آؤ، اب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یہودی نے سارا واقعہ بیان کیا اور عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان فیصلہ فرما چکے ہیں، مگر یہ شخص اب آپ سے فیصلہ کروانا چاہتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں''۔ پھر اندر تشریف لے گئے اور تلوار لے کر واپس آئے، اور اسی تلوار سے بشر منافق کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: ''جو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے پر راضی نہ ہو، ہمارے نزدیک اس کا یہی انجام ہے''۔

اس واقعے کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ عمرؓ نے حق اور باطل کے درمیان واضح فرق کر دیا، اسی وجہ سے انہیں ''فاروق'' کا لقب عطا ہوا۔ **(تفسیر قرطبی)**

غیر اسلامی قانون کی طرف رجوع کی مذمت

اس واقعے کے علاوہ بھی مفسرین نے متعدد اسبابِ نزول بیان کیے ہیں، لیکن اصل پیغام نہایت واضح اور عام ہے۔ ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن اور سابقہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، مگر جب عملی زندگی میں کوئی معاملہ پیش آتا ہے اور فیصلہ درکار ہوتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتے۔

بلکہ وہ اپنے معاملات ایسے لوگوں کے پاس لے جاتے ہیں، جن سے یہ امید ہو کہ وہ غیر اسلامی اصولوں یا حتیٰ کہ رشوت کے ذریعے ان کے حق میں فیصلہ کر دیں گے۔ یہی وہ تضاد ہے جس میں منافقت اپنی پوری قباحت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے: دعویٰ اسلام کا، مگر فیصلہ غیر اسلامی نظام سے!

طاغوت کی حقیقت اور گمراہی کا راستہ

قرآنِ مجید میں لفظ ''طاغوت'' عموماً شیطان کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کعب بن اشرف جیسے باطل پیشوا کے لئے آیا ہے، جو گمراہی کی طرف بلانے والا تھا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر ایسے باطل نظام اور

شیطانی قوت کا انکار کرے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا انکار کریں)۔

لیکن دنیا کی محبت اور وقتی مفاد کے اسیر لوگ، ایمان کے دعوے کے باوجود، ایسے ہی باطل مراکز کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نتیجتاً شیطان انہیں حق کے راستے سے بھٹکا دیتا ہے اور دور دراز گمراہی میں دھکیل دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا

منافقین کا طرزِ عمل

اسی واقعے کو مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا گیا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا یعنی جب انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آؤ، تو منافقین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منہ موڑتے اور پہلوتہی کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو دعووں میں تو پیش پیش ہوتے ہیں، مگر جب عملی امتحان کا وقت آتا ہے تو حق سے کتراتے ہیں، اور فیصلے کے لئے کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ یہ واقعہ صرف بشر تک محدود نہیں، بلکہ ہر زمانے کے ایسے تمام لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے، تاکہ وہ اپنے ایمان کو دعوے سے عمل کی سطح تک لے آئیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔

منافق کے قبیلے والوں کا انجام

روح المعانی میں بعض اہلِ علم سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جس منافق کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، اس کے ورثاء خون کا بدلہ لینے کے لئے حاضر ہوئے۔ جب ان کے سامنے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ تمہارا آدمی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کو رد کر کے دوبارہ فیصلہ کروانے کے لئے اپنے ساتھی یہودی کو حضرت عمرؓ کے پاس کیوں لے گیا؟ اور کیوں وہ اس فیصلے سے ناخوش ہوا جو سراسر حق اور عدل پر مبنی تھا؟ جو دراصل کفر کے مترادف عمل تھا تو انہوں نے اپنے مقتول کے فعل کی تاویلیں پیش کرنا شروع کر دیں اور مختلف بہانے تراشنے لگے۔

ان کے اسی طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ یعنی ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑے گی؟ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قسمیں کھائیں گے کہ 'بشر' کے معاملے میں ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی اچھے طریقے سے صلح ہو جائے اور باہمی رضامندی کے ذریعے اتفاق پیدا ہو جائے؛ ہم دل سے کسی غیر کے فیصلے پر راضی نہ تھے، جو کچھ تھا صرف ظاہری تھا۔

یہ دراصل ایک سخت وعید ہے، یہ بتانے کے لئے کہ وہ بہانے ضرور پیش کریں گے، لیکن ان کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ ان کا نفاق آشکار ہو چکا ہے، لہٰذا ان کی کوئی معذرت قابلِ قبول نہ ہوگی۔

● پھر ارشاد فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اور وہی ان کو ان کے اعمال کے مطابق سزا دے گا، چاہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کچھ کہیں یا نہ کہیں۔

البتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ انہیں نصیحت کرتے رہیں، ان کے اعمال کی حقیقت واضح کریں، اور ایسی مؤثر اور دل نشین باتیں ان سے کہیں جو انہیں راہِ حق کی طرف مائل کر سکیں۔

دو مفہوم

فرمایا: فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ مفسرین نے اس کے دو مفہوم بیان کئے ہیں:

اوّل یہ کہ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں اور ان کے باطل رویّے سے بے اعتنائی برتیں۔

دوم یہ کہ ان کے عذروں کو قبول کرنے سے گریز کریں اور ان کے اس دعوے کی طرف توجہ نہ دیں جو انہوں نے مقتول کے خون کے بدلے کے بارے میں کیا ہے، کیونکہ ایسے شخص کے خون کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔

● اور ارشاد فرمایا: وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

اس کا بھی دوہرا مفہوم بیان کیا گیا ہے: ایک یہ کہ ان کی ذاتی اصلاح کے لئے مسلسل نصیحت کرتے رہیں؛ اور دوسرا یہ کہ انہیں تنہائی میں سمجھائیں، کیونکہ خلوت میں کی گئی نصیحت دل پر زیادہ اثر ڈالتی ہے اور قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

فائدہ: یہ تمام مضامین تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، جو اس بات کی طرف واضح رہنمائی کرتے ہیں کہ نفاق کے پردے میں چھپے ہوئے اعمال بالآخر بے نقاب ہو کر رہتے ہیں، اور حق کے مقابلے میں کوئی عذر کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور اطاعت

جن لوگوں نے اپنے اعمال پر جھوٹے عذر تراش کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راضی کرنے کی کوشش کی، اُن کے لیے مزید تنبیہ فرمائی گئی اور انہیں خلوصِ دل کے ساتھ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی ہم نے ہر رسول کو اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کا منصب اللہ کے احکام کو بندوں تک پہنچانا ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے، جبکہ رسول کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مترادف ہے۔

جن لوگوں نے اپنے معاملات کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بجائے دوسروں کے پاس لے جانے کا ارادہ کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نافذ کئے ہوئے فیصلے پر راضی نہ ہوئے بلکہ دوبارہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس مقدمہ لے جانے کی ضد کی، انہوں نے دراصل اللہ اور اس کے رسول دونوں کی صریح نافرمانی کی۔

اگرچہ اس نافرمانی کے نتیجے میں 'بشر' نامی منافق اپنے انجام کو پہنچا، لیکن اس کے متعلقین نے بھی، اس کے بعد، اس کے عمل کی تاویلیں کر کے اور برائی کو اچھائی کا رنگ دینے کی کوشش کر کے نافرمانی ہی کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے استغفار کرتے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے۔ اس طرح ان کے لئے بخشش اور مغفرت کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

سچی توبہ

بے شک اللہ تعالیٰ سچی توبہ کو قبول فرماتا ہے، چاہے وہ خلوت میں کی جائے یا مجمع کے سامنے، لیکن ان لوگوں کے لئے خاص طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، اللہ سے استغفار کریں، اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے لئے استغفار کریں، تو وہ اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پائیں گے۔

بعض مفسرین نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی یہ شرط اس لئے رکھی گئی کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصبِ نبوت کو مجروح کیا، آپ کے فیصلے کو نظر انداز کیا، اور تاویلات کے ذریعے اس گستاخی کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت پہنچی۔

لہٰذا ان کے جرم کی تلافی کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ خود حاضر ہو کر اللہ کے حضور توبہ کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے لئے استغفار فرمائیں۔ یہ ایک اصولی حقیقت بھی ہے کہ پوشیدہ گناہ کی توبہ پوشیدہ طریقے سے، اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ طور پر کی جائے۔ چونکہ ان کی حرکت مشہور ہو چکی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے اذیت پہنچی تھی، اس لئے لازم ہوا کہ وہ برملا حاضر ہو کر توبہ کریں، تاکہ ان کی خطا کا ازالہ ہو اور وہ دوبارہ راہِ حق پر قائم ہو سکیں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۶۶ سے ۷۶ تک

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾

ترجمہ:

(۶۶) اور اگر ہم ان پر یہ حکم دیتے کہ ''اپنی جانوں کو قتل کرو'' یا ''اپنے گھروں سے نکل جاؤ''، تو ان میں سے تھوڑے ہی لوگ ایسا کرتے۔ لیکن اگر وہ وہی کرتے جو ان کو کہا گیا تھا، تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا سبب ہوتا۔ (۶۷) اور تب ہم ضرور انہیں اپنی طرف سے بڑا اجر دیتے۔ (۶۸) اور ہم ضرور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت دیتے۔ (۶۹) اور جو کوئی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے، وہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ لوگ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔ (۷۰) یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ خوب جاننے والا ہے۔ (۷۱) اے ایمان والو! اپنے بچاؤ (دفاع) کا سامان لے لو، پھر یا تو الگ الگ دستوں کی صورت میں نکلو یا سب مل کر اکٹھے نکلو۔ (۷۲) اور تم میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آ

جائے تو کہتے ہیں: اللہ نے تو مجھ پر بڑا انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ (۷۳) اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہو تو وہ ضرور کہتے ہیں گویا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دوستی ہی نہ تھی کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا! (۷۴) تو چاہیے کہ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ چکے ہیں۔ اور جو اللہ کے راستے میں لڑے، پھر چاہے وہ شہید ہو جائے یا غالب آ جائے، ہم ضرور اسے بڑا اجر عطا کریں گے۔ (۷۵) اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے، جو دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں، اور ہمیں اپنی طرف سے کوئی حمایتی دے، اور اپنی طرف سے کوئی مددگار عطا فرما۔ (۷۶) جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم لڑو شیطان کے ساتھیوں سے، بے شک شیطان کی چال کمزور ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۶۶ سے ۷۶ تک

آیت نمبر (۶۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

ترجمہ: ''تو (اے محمدؐ!) آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ آپ کریں، اس پر دل میں بھی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ اسے خوش دلی سے قبول کر لیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کو دل سے ماننا

تفسیر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا ایمان کی بنیادی علامت ہے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زبیر بن عوامؓ اور ایک انصاری کے درمیان کھیت کی آبپاشی کے معاملے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ دونوں اپنا مقدمہ لے کر بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ چونکہ پانی کا بہاؤ اس ترتیب سے تھا کہ پہلے حضرت زبیرؓ کی زمین آتی تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت عدل وحکمت کے ساتھ فرمایا:

''اے زبیر! تم اپنی کھیتی کو سیراب کر لو، پھر پانی اپنے پڑوسی کی طرف چھوڑ دو''۔ یہ فیصلہ سراسر انصاف پر مبنی تھا، مگر اس انصاری نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ اس لئے دیا ہے کہ وہ آپ

کے پھوپھی زاد ہیں''۔

یہ گستاخانہ جملہ سن کر رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا، اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے زبیر! اپنی زمین کو اچھی طرح سیراب کرو، یہاں تک کہ پانی کیاریوں کے کناروں تک بھر جائے، پھر اپنے پڑوسی کی طرف چھوڑ دو''۔

''اس طرح آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو ان کا مکمل اور واضح حق عطا فرمایا۔ پہلے آپ ﷺ نے نرمی اور وسعت کے ساتھ ایسا حکم دیا تھا جس میں دونوں کے لئے گنجائش تھی، لیکن جب اعتراض اور بدگمانی ظاہر کی گئی تو آپ ﷺ نے پورا حق واضح کر دیا''۔

اس واقعے کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ...یعنی: ''اے نبی! آپ کے رب کی قسم، یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مانیں، پھر آپ کے فیصلے پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اسے پوری طرح تسلیم نہ کر لیں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۵۹)**

فائدہ: اس واقعے سے یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ اگر کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی تنگی یا اعتراض پیدا ہو جائے تو یہ ایمان کی روح کے منافی ہے۔

یہ آیت محض ایک واقعے تک محدود نہیں بلکہ ایک دائمی اصول بیان کرتی ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی معاملے میں قرآن وسنت کے واضح فیصلے کے باوجود اپنی خواہشات یا غیر اسلامی قوانین کی طرف رجوع کرتا ہے، اسے اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہئے۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد

رسول اللہ ﷺ کی ظاہری حیات میں آپ ﷺ خود موجود تھے، اور آپ کے وصال کے بعد قرآنِ مجید اور آپ ﷺ کی سنت واحادیث ہمارے لئے رہنمائی کا کامل ذریعہ ہیں۔ اب مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں انہی کو معیار بنائیں، اور جو قاضی وحکام ہیں وہ بھی اپنے فیصلے قرآن وحدیث کے مطابق کریں۔ ورنہ قرآنِ مجید کی صریح تنبیہ کے مطابق ایسے لوگ ''لَا يُؤْمِنُونَ'' کے دائرے میں آ سکتے ہیں یعنی وہ کامل ایمان والوں میں شمار نہیں ہوں گے۔

پس ایمان کا حقیقی تقاضا یہی ہے کہ انسان رسول اللہ ﷺ کے ہر فیصلے کو دل و جان سے قبول کرے، اس میں کوئی تردد یا تنگی محسوس نہ کرے، اور کامل تسلیم و رضا کے ساتھ اسے اپنا لے۔

انسانی ذہن کی گمراہی

آج انسانوں کے اذہان مغربی ساختہ قوانین سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ وہ انہی کے مطابق ظلم سہنے اور ظلم کرنے دونوں پر آمادہ ہو جاتے ہیں، مگر اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ قوانین کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ معاشرے میں زنا کاری کے عام ہو جانے پر بھی بے حسی چھائی ہوئی ہے، چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں، اور لوگ انہیں برداشت کئے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے عطا کردہ قوانین کو نافذ کرنے کی رغبت دلوں میں پیدا نہیں ہوتی۔

ظالمانہ قوانین کہنا

افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ ان الٰہی قوانین کو نہ صرف دل سے ناپسند کرتے ہیں بلکہ انہیں صریح الفاظ میں ''ظالمانہ'' کہہ کر انکار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

حالانکہ اگر اسلامی حدود و قوانین کو نافذ کیا جائے، چور کے ہاتھ کاٹے جائیں، زانی کو شرعی سزائیں دی جائیں، شراب نوشی پر حد جاری کی جائے، اور ڈاکوؤں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں آیا ہے کہ انہیں (جرم کے مطابق) قتل کیا جائے، سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں یا قید کیا جائے اور اسی طرح قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور دیت کے احکام نافذ کیے جائیں، تو معاشرے سے جھگڑے، فسادات، چوریاں، ڈکیتیاں اور بے حیائی بڑی حد تک ختم ہو سکتی ہیں۔

لیکن حال یہ ہے کہ لوگ نام کے مسلمان ہیں، مگر قرآن کے احکام پر راضی نہیں۔ وہ اپنے فیصلے کفار کے قوانین کے مطابق کرتے اور کرواتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے کہ ان کا دین اور ایمان کس بنیاد پر قائم ہے۔

قرآنِ مجید کی مذکورہ آیت میں واضح طور پر یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کی تکمیل صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ انسان اپنے جھگڑوں کے فیصلے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جائے، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ آپ ﷺ کے فیصلے کو دل کی گہرائیوں سے، بغیر کسی تنگی اور کراہت کے، کامل رضا اور تسلیم کے ساتھ قبول کرے۔ یہی حقیقی ایمان کی پہچان ہے۔

آیت نمبر (۶۶-۶۸) وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ

دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

ترجمہ: ''اور اگر ہم ان پر یہ حکم دیتے کہ ''اپنی جانوں کو قتل کرو'' یا ''اپنے گھروں سے نکل جاؤ''، تو ان میں سے تھوڑے ہی لوگ ایسا کرتے۔ لیکن اگر وہ وہی کرتے جو ان کو کہا گیا تھا، تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا سبب ہوتا۔ اور تب ہم ضرور انہیں اپنی طرف سے بڑا اجر دیتے۔ اور ہم ضرور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت دیتے''۔

تفسیر اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت، آپ کے احکام کو قبول کرنا اور آپ کے فیصلوں پر دل سے راضی ہونا کوئی ایسا دشوار امر نہیں جس پر عمل کرنا ناممکن ہو۔ یہ تو درحقیقت ایک آسان اور قابلِ عمل حکم ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو لوگوں پر اس سے کہیں زیادہ سخت احکام بھی فرض کر سکتا تھا، جیسے بنی اسرائیل پر بچھڑے کی عبادت کے بعد بطورِ توبہ اپنی جانوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، یا انہیں اپنے گھروں سے نکل جانے کا حکم ملا، لیکن ایسے کٹھن احکام پر بہت ہی کم لوگ عمل کر پاتے۔

جانوں کے قتل کا حکم

مفسرین کے بیان کے مطابق جب یہ آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ اگر ہم لوگوں پر اپنی جانیں قربان کرنے کا حکم لازم کر دیتے، تو اس موقع پر ایک مکالمہ پیش آیا۔ ایک یہودی نے فخر سے کہا کہ ہم پر تو ایسا حکم آیا اور ہم نے اس پر عمل بھی کیا، جبکہ حضرت ثابت بن قیسؓ نے جواب دیا کہ اگر ہمیں بھی ایسا حکم دیا جاتا تو ہم ضرور اس کی تعمیل کرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر اہلِ ایمان کے اخلاص کو سراہا۔

محبت کا اظہار

اسی طرح ایک شخص نے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اپنی جان، اولاد اور ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر یہ سوچ کر دل بے چین ہو جاتا ہے کہ آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے بلند درجات میں ہوں گے اور شاید میں آپ کا دیدار نہ کر سکوں۔

اس پر کچھ دیر بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ قیامت میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ اس بشارت سے صحابۂ کرامؓ کے دلوں کو بڑی تسلی نصیب ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ اگر ہمیں اپنی جان قربان کرنے کا حکم دیا جائے تو ہم ضرور اس پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس اخلاص کی تصدیق فرمائی۔ دیگر صحابۂ کرامؓ جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر حضرات نے بھی اسی جذبۂ اطاعت کا اظہار کیا، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ایمان اس قدر مضبوطی سے جما ہوا ہے کہ وہ جمے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ پختہ ہے۔

● حضرت حسن بصریؒ روایت کرتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے یہ عزم ظاہر کیا کہ اگر ایسا سخت حکم بھی دیا جاتا تو وہ اس پر عمل کرتے، اور جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ایمان کی پختگی کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ ان کے دل ایمان سے اس طرح لبریز ہیں جیسے کوئی مضبوط چیز اپنی جگہ جم جائے۔

خلاصہ: اس آیت کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ پر آسانی فرمائی ہے اور انہیں ایسے سخت احکام کا مکلف نہیں بنایا، لیکن اس کے باوجود صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ اطاعت اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر بلند تھا کہ وہ ہر حکم پر جاں نثار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہی کامل ایمان اور حقیقی اطاعت کی علامت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر اعتراض

بعض روایات میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت زبیرؓ اپنے کھیت کی سیرابی کے مقدمے کا فیصلہ کرا کے واپس لوٹ رہے تھے تو راستے میں حضرت مقدادؓ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوا؟ اس پر ایک انصاری نے ناگواری کے ساتھ منہ پھیرتے ہوئے کہا کہ فیصلہ تو اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں کر دیا گیا۔

اس موقع پر وہاں موجود ایک یہودی نے اس طرزِ گفتگو کو سمجھ لیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا: اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے! یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، پھر بھی ان کے فیصلے پر اعتراض کرتے ہیں اور جانبداری کا گمان کرتے ہیں۔

اس نے مزید کہا کہ ہمیں یاد ہے، حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جب ہم سے ایک عظیم گناہ سرزد ہوا تو ہمیں توبہ کے طور پر اپنی جانیں قربان کرنے کا حکم دیا گیا، اور ہم نے اللہ کے حکم کی اطاعت میں اس قدر جان نثاری کی کہ ستر ہزار افراد قتل ہو گئے، تب جا کر ہمارا رب ہم سے راضی ہوا۔

ایمانی جرأت

اگرچہ یہ واقعہ دراصل ایک ہی انصاری سے متعلق تھا، لیکن اس یہودی نے تمام انصار و مہاجرین کو اس طعن کا

نشانہ بنایا۔اس پر حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایمان ویقین کے ساتھ جواب دیا کہ اگر ہمیں بھی اپنی جانوں کو قربان کرنے کا حکم دیا جائے تو ہم ہرگز پس وپیش نہ کریں گے۔

اگرچہ اس روایت کی سند صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی، لیکن اگر اسے درست مان لیا جائے تو اس سے آیاتِ سابقہ کے ساتھ اس کا ربط نہایت واضح ہوجاتا ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا کہ جس شخص کی طرف یہ اعتراض منسوب ہے، وہ درحقیقت منافق تھا، مگر انصار کے کسی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اسے انصاری کہا گیا۔اس کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

''وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ''یعنی اگر یہ لوگ ان نصیحتوں پر عمل کرتے جو انہیں کی جارہی ہیں، تو یہ ان کے لئے دنیا وآخرت دونوں میں بہتر ہوتا، اور ان کے دلوں کو حق پر مضبوطی سے جما دیتا۔اور جب وہ اطاعت وعمل کا راستہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے انہیں عظیم اجر عطا فرماتا اور انہیں سیدھی راہ پر گامزن کردیتا۔

آیت نمبر(۶۹-۷۰) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

ترجمہ: ''اور جو کوئی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے، وہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ لوگ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر پھر آیات (۶۹-۷۰) میں اطاعتِ الٰہی ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عظیم صلہ بیان کیا گیا ہے: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں، وہ انہی مقدس ہستیوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا خاص انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔اور یہ کیسا بہترین ساتھ ہے! یہ سب اللہ کا فضل ہے، اور اللہ ہی سب کچھ جاننے والا کافی ہے۔

یہ آیات دراصل ایمان والوں کے لئے ایک عظیم بشارت ہیں کہ سچی اطاعت انسان کو ان بلند ترین مراتب تک پہنچا دیتی ہے جہاں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام رحمت اللہ علیہم کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔یہی اللہ کا فضلِ عظیم ہے، اور اسی میں کامیابی کا حقیقی راز پوشیدہ ہے۔

اطاعتِ الٰہی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں جہاں اپنی اور اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے، وہیں اس اطاعت کا عظیم صلہ بھی نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانبردار ہوں گے، انہیں آخرت میں ان بلند ہستیوں کی رفاقت نصیب ہوگی جن پر اللہ کا خاص انعام ہوا یعنی انبیاء کرامؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ یہ وہ اعلیٰ مقام ہے جس تک پہنچنا ہر مومن کی آرزو ہوتی ہے۔

تفسیر معالم التنزیل میں ایک نہایت اثر انگیز واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ثوبانؓ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ آپ کے دیدار کے بغیر انہیں قرار نہ آتا تھا۔ ایک دن وہ بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو ان کے چہرے پر غم و اندوہ کے آثار نمایاں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تمہاری یہ کیفیت کیوں ہے؟ عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! نہ کوئی بیماری ہے نہ کوئی تکلیف، بس آپ کی جدائی کا خیال بے چین کیے دیتا ہے۔

پھر آخرت کا تصور دل میں آیا تو خوف لاحق ہوا کہ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے اعلیٰ درجات میں ہوں گے اور اگر میں جنت میں داخل بھی ہوا تو نچلے درجے میں رہوں گا، یوں آپ کے دیدار سے محروم رہ جاؤں گا۔

اس شدید محبت اور اضطراب کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بشارت دی کہ اہلِ جنت، اگرچہ درجات میں مختلف ہوں گے، مگر باہم ملاقات اور رفاقت سے محروم نہ ہوں گے۔

● اسی حقیقت کو مزید واضح کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایک آدمی کسی قوم سے محبت رکھتا ہے مگر عمل و مرتبے میں ان تک نہیں پہنچ پاتا، اس کا کیا حال ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ'' یعنی انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت

● حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے قیامت کے بارے میں سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس دن کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے عرض کیا: میں نے زیادہ عمل تو نہیں کیا، مگر اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسی کے ساتھ ہو جس سے تم نے محبت کی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کی نعمت کے بعد مسلمانوں کو کسی بات سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس بشارت سے ہوئی کہ محبت انسان کو اپنے محبوب کے ساتھ ملا دیتی ہے۔

انبیاء وصالحین کی رفاقت

● اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، لیکن جب میں آخرت کا تصور کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ آپ اعلیٰ درجات میں ہوں گے اور میں آپ کے دیدار سے محروم رہ جاؤں گا۔ اس پر کچھ دیر بعد جبرئیل امینؑ یہ آیت لے کر نازل ہوئے، جس میں اطاعت کرنے والوں کے لئے انبیاء وصالحین کی رفاقت کی خوشخبری دی گئی۔ (طبرانی)

نیک لوگوں سے محبت

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ'' کا مفہوم نہایت جامع ہے۔ اگر کوئی شخص نیک لوگوں سے محبت رکھتا ہے تو وہ ان کے ساتھ ہوگا، اور اگر کسی کی محبت برے لوگوں سے ہے تو وہ انہی کے ساتھ شمار ہوگا۔ یہ اصول دنیا اور آخرت دونوں پر یکساں نافذ ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے، اور یہی حال آخرت میں بھی ہوگا۔

● اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ فرمائی: ''اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ''، یعنی انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، لہٰذا ہر شخص کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اطاعتِ الٰہی، محبتِ رسول ﷺ اور صالحین سے قلبی تعلق انسان کو نہ صرف دنیا میں نیکی کی راہ پر قائم رکھتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اسے اعلیٰ ترین رفاقتوں کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہی کامیابی کا حقیقی معیار اور ایمان کی اصل روح ہے۔

نماز کی پابندی نہ کرنے والے کا انجام

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے نماز کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے نماز کی پابندی اختیار کی، قیامت کے دن یہی نماز اس کے لئے نور بنے گی، اس کے ایمان کی روشن دلیل ہوگی اور اس کی نجات کا ذریعہ بنے گی۔ اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی، اس کے لئے نہ کوئی نور ہوگا، نہ کوئی دلیل، اور نہ ہی نجات کا سامان؛ بلکہ وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابیّ بن خلف جیسے لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۶۵۷۶)

فائدہ: محدثینِ کرام نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے نہایت حکمت کے ساتھ یہ وضاحت فرمائی ہے کہ نماز میں کوتاہی کرنے والے مختلف طبقات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ مال و دولت کی محبت میں نماز سے غفلت برتتے ہیں، ایسے لوگ قارون کے ساتھ ہوں گے۔

بعض لوگ اقتدار یا منصب کی مصروفیات میں نماز ترک کر دیتے ہیں، وہ فرعون کے ساتھ ہوں گے۔ کچھ افراد اپنی ملازمت یا دفتری مشغولیات کو بہانہ بنا کر نماز میں سستی کرتے ہیں، وہ ہامان کے ساتھ اٹھائے جائیں گے، جو فرعون کا وزیر تھا۔

جو لوگ تجارت اور کاروبار میں اس قدر مشغول ہو جاتے ہیں کہ نماز کی پابندی نہ کر سکیں، وہ اُبی بن خلف کے ساتھ ہوں گے، جو ایک بدترین مشرک تھا اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے قتل فرمایا تھا۔

یہ حدیث اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ جیسے نیک لوگ نیکوں کے ساتھ ہوں گے، اسی طرح برے اعمال کرنے والے برے لوگوں کی معیت میں رکھے جائیں گے۔ انسان کا انجام اس کے اعمال اور اس کی ترجیحات کا آئینہ دار ہوگا۔

روح المعانی کی وضاحت

تفسیر روح المعانی میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم میں انبیاء کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ کی رفاقت کا جو ذکر آیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کے درجات یکساں ہوں گے، اور نہ ہی یہ مراد ہے کہ صرف جنت میں داخل ہونا ہی ساتھ ہونا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ درجات میں فرق کے باوجود اہلِ جنت ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، ملاقات کر سکیں گے، اور ممکن ہے کہ کم درجے والوں کو اعلیٰ درجے والوں کی زیارت کے لئے اوپر جانے کی اجازت بھی دی جائے، تاکہ وہ اپنے محبوبوں سے مل سکیں۔ بہرحال، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرنے والوں کو ان مقدس ہستیوں کی رفاقت ضرور نصیب ہوگی، اور جن سے سچی محبت ہوگی، وہ انہی کے ساتھ ہوں گے۔

اللہ کے لئے محبت

● اسی مفہوم کو مزید واضح کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اگر دو بندے محض اللہ کی رضا کے لئے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں، خواہ ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں، تو بھی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں جمع فرما دے گا اور ارشاد ہوگا: یہ وہی شخص ہے جس سے تم نے میری خاطر محبت کی تھی۔ **(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۵۰۲۴)**

یہ تعلیم ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ نماز کی پابندی، اخلاصِ عمل اور اللہ کے لیے محبت، انسان کو نہ صرف دنیا میں سنوارتی ہے بلکہ آخرت میں بھی اسے بہترین رفاقت اور کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

رفاقتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا

حضرت ربیعہ بن کعبؓ روایت کرتے ہیں کہ انہیں یہ سعادت حاصل تھی کہ کبھی کبھی رات کے وقت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے، اور جب آپ بیدار ہوتے تو وضو کا پانی اور دیگر ضروری اشیاء پیش کرتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شفقت بھرے انداز میں فرمایا: ''مانگو، کیا چاہتے ہو؟''

انہوں نے عرض کیا: ''میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے علاوہ اور کچھ؟'' عرض کیا: ''میرا مقصود تو یہی ہے''۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر یہی چاہتے ہو تو اپنے نفس کے خلاف میری مدد کرو، کثرت سے سجدے کیا کرو''۔ یعنی نوافل کی کثرت اختیار کرو اور عبادت میں اضافہ کرو۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۸۹)

فائدہ: اس ارشاد سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ بلند درجات اور مقربین کی رفاقت محض خواہش سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے مسلسل نیک اعمال میں مشغول رہنا ضروری ہے۔ نماز، ایمان کے بعد سب سے عظیم عمل ہے، اور جتنی زیادہ نمازیں ہوں گی، اتنے ہی زیادہ سجدے ہوں گے، اور یہی سجدے انسان کو اللہ کے قرب سے ہمکنار کرتے ہیں۔ پس وضو کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ اخلاص لازم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں کہ ''اپنے نفس کے خلاف میری مدد کرو''، ایک گہرا اشارہ پوشیدہ ہے۔ نفسِ انسانی اکثر نیکی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، سستی اور خواہشات کی طرف مائل کرتا ہے۔

لہٰذا جو شخص نفس کے مقابلے میں کھڑا ہو کر عبادت اور اطاعت کو اختیار کرتا ہے، وہی دراصل اس بلند مقام کا مستحق بنتا ہے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کے بارے میں خصوصی بشارت دی گئی ہے کہ ان کے کرنے والے انبیاء، صدیقین اور شہداء کی رفاقت پائیں گے۔

اسی ضمن میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سچا اور امانتدار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۰۹)

جنت کے بلند درجات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جنت میں سو درجات ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار فرمایا ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ پس جب تم اللہ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور افضل مقام ہے، اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۹۰)

جنت کا منظر

ایک اور روایت میں حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت کے عام رہنے والے، بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم دنیا میں آسمان کے کناروں پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہو، اور یہ فرق ان کے درجات کے تفاوت کی وجہ سے ہوگا''۔

صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ مقامات صرف انبیاء کرامؑ کے لئے مخصوص ہوں گے، جہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! یہ مقامات اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے لئے ہیں، مگر ان کے علاوہ وہ لوگ بھی وہاں پہنچیں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسول کی سچی تصدیق کی''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۵۶)**

فائدہ: یہ تمام روایات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ جنت کے درجات بے شمار اور مختلف ہیں، مگر ان تک رسائی کا راستہ واضح ہے، ایمان، اخلاص، اطاعت، اور کثرتِ عبادت۔ جو شخص اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے، وہی ان بلند مقامات کا مستحق بنتا ہے اور بالآخر اپنے محبوبوں، انبیاء، صدیقین اور صالحین کی رفاقت سے سرفراز ہوتا ہے۔

اللہ کے انعام یافتہ بندے (چار عظیم جماعتیں)

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جن بندوں پر اپنا خاص انعام فرمایا ہے، انہیں چار بلند مرتبہ جماعتوں میں ذکر کیا ہے، اور یہی وہ پاکیزہ ہستیاں ہیں جن کی راہ اختیار کرنا مومن کی اصل کامیابی ہے:

۱۔ حضرات انبیاء علیہم السلام

یہ وہ مقدس ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی، ہدایت اور پیغام رسانی کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ انسانیت کے رہنما، حق کے علمبردار اور کامل نمونۂ حیات ہیں۔

۲۔ حضرات صدیقین

یہ وہ عظیم لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کرامؑ کی دعوت کو بغیر کسی تردد کے فوراً قبول کیا، اور پھر پوری زندگی اخلاص، وفاداری اور جان و مال کی قربانی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اسی لئے ''صدیق'' کہا جاتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت سنتے ہی بلا توقف اس کی تصدیق کی اور ہر مرحلے پر آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔

● حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے گزرے تو وہ اپنے بعض غلاموں پر لعنت کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متوجہ ہو کر فرمایا: ''کیا لعنت کرنے والے بھی صدیق ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، ربِّ کعبہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا''۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو سخت احساس ہوا، انہوں نے اسی دن اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا اور بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔
(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۴۸۶۸)

۳۔ شہداء

یہ وہ خوش نصیب حضرات ہیں جنہوں نے اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں شہادت کا مقام پایا۔ اللہ کے نزدیک ان کا درجہ نہایت بلند اور قربِ خاص کا حامل ہے۔

۴۔ صالحین

یہ وہ نیک بندے ہیں جن کے دل برائیوں سے پاک اور نیکیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی اخلاص اور اعمالِ صالحہ سے مزین ہوتی ہے۔ نیکی ان کی طبیعت اور مزاج کا حصہ بن چکی ہوتی ہے، اور یہی حقیقت میں اللہ کا عظیم انعام ہے۔

نیکی کی یہ صفت اس قدر اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کو بھی اس وصف کے ساتھ یاد فرمایا۔ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں فرمایا: ''نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِيْنَ'' حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں فرمایا: ''وَمِنَ الصَّالِحِيْنَ'' اور حضرت یوسفؑ نے دعا کی: ''تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِيْنَ'' (اے اللہ! مجھے حالتِ اسلام میں وفات دے اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے) چونکہ انبیاء کرامؑ کا ذکر الگ ہو چکا، اس لئے یہاں صالحین سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہیں۔

راہِ ہدایت کی دعا

ان آیات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے انہی چار جماعتوں پر مشتمل ہیں: (۱) انبیاء، (۲) صدیقین، (۳) شہداء، (۴) صالحین

اسی لئے ہمیں بار بار یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم انہی کی راہ اختیار کرنے کی دعا کریں۔ چنانچہ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے اندر ہم یہ دعا دہراتے ہیں: ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' یعنی: اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے اپنا انعام فرمایا۔

یہ دعا دراصل ایک مکمل زندگی کا منشور ہے کہ انسان اپنی سوچ، عمل اور کردار کو انہی مقدس ہستیوں کے نقشِ قدم پر ڈال دے، تاکہ دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہو اور آخرت میں بھی ان کی رفاقت نصیب ہو۔

حقیقی انعام اور بہترین رفاقت

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار اور لامحدود ہیں، جن سے نہ صرف اہلِ ایمان بلکہ کافر اور فاسق بھی دنیا میں مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اصل اور دائمی انعام وہی ہے جو اُن منتخب بندوں کو عطا ہوا جن کا ذکر پہلے کیا گیا، کیونکہ ہدایت، اللہ سے مضبوط تعلق، باطنی اصلاح اور حقیقی کامیابی ہی وہ نعمتیں ہیں جو انسان کو بلند کرتی ہیں۔ یہی وہ انعام ہے جو آخرت میں اعلیٰ درجات کا سبب بنتا ہے، جبکہ دنیاوی نعمتیں اور اُن کے فوائد اسی فانی دنیا تک محدود رہ جاتے ہیں۔

پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا'' یعنی یہ لوگ کس قدر بہترین رفیق ہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ان مقدس ہستیوں کی رفاقت نصیب ہونا سب سے بڑی سعادت ہے، اور ان کا ساتھ ہر لحاظ سے نہایت خوشگوار اور باعثِ فخر ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: ''ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللهِ''

یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کی توفیق عطا فرمائی، اور انہیں اسی راہ پر ثابت قدم رکھا، یہاں تک کہ وہ آخرت میں اپنے مقرب بندوں کی رفاقت کے مستحق بن گئے۔

آخر میں ارشاد ہوا: ''وَكَفٰى بِاللهِ عَلِيمًا''

یعنی اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے جو ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ وہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے، اُن کی نیتوں، کوششوں اور اخلاص کو جانتا ہے، اور وہی ان کے اعمال کے مطابق انہیں جزا یا سزا عطا فرمائے گا۔

یہ تمام مضمون اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ کامیابی کا اصل معیار دنیاوی نعمتیں نہیں بلکہ ہدایت، اطاعت اور اللہ کی رضا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو بہترین رفاقت اور دائمی کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

آیت نمبر (۷۱-۷۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ

وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے بچاؤ (دفاع) کا سامان لے لو، پھر یا تو الگ الگ دستوں کی صورت میں نکلو یا سب مل کر اکٹھے نکلو۔ اور تم میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو کہتے ہیں: اللہ نے تو مجھ پر بڑا انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہو تو وہ ضرور کہتے ہیں گویا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دوستی ہی نہ تھی کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا! تو چاہئے کہ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ چکے ہیں۔ اور جو اللہ کے راستے میں لڑے، پھر چاہے وہ شہید ہو جائے یا غالب آ جائے، ہم ضرور اسے بڑا اجر عطا کریں گے''۔

اہل ایمان کو ہدایت

تفسیر ان آیاتِ کریمہ میں سب سے پہلے اہلِ ایمان کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ہمیشہ بیدار اور چوکس رہیں۔ اپنے اسبابِ دفاع کو تیار رکھیں، اور حالات وضرورت کے مطابق منظم انداز میں پیش قدمی کریں۔ جہاں چھوٹی جماعتیں کافی ہوں، وہاں مختصر دستے روانہ کئے جائیں، اور جہاں بڑے لشکر کی ضرورت ہو، وہاں پوری قوت کے ساتھ نکل کھڑے ہوں۔ یہ نظم وحکمت ہی کامیابی کی بنیاد ہے۔

جہاد کی اہمیت

● اسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کی عظمت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خوب جان لو! جنت تلواروں کے سائے تلے ہے''۔ یعنی اللہ کی راہ میں قربانی اور جدوجہد ہی جنت کے حصول کا راستہ ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۸۱۸)

اللہ کی راہ میں ایک صبح شام

● حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام گزارنا دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے''۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے دین کے لئے اٹھایا گیا ایک قدم بھی

دنیا کی ہر آسائش سے زیادہ قیمتی ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۹۲)

ایمان کے کمزوری کی علامت

● حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مرے کہ نہ اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو اور نہ کبھی اس کا ارادہ ہی دل میں آیا ہو، تو اس کی موت نفاق کی ایک شاخ پر ہوگی''۔ یعنی دل میں بھی دین کی سربلندی کا جذبہ نہ ہونا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۹۱۰)

شہادت کی تمنا

● حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! میری تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، یہاں تک کہ بار بار اسی راہ میں شہادت نصیب ہو''۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۹۷)

یہ ارشادات اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد، قربانی اور استقامت نہ صرف ایمان کی علامت ہیں بلکہ جنت کے اعلیٰ درجات کے حصول کا ذریعہ بھی ہیں۔ ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف ظاہری تیاری رکھے بلکہ دل میں بھی دین کی سربلندی کا جذبہ زندہ رکھے، کیونکہ یہی جذبہ اسے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔

منافقوں کا طرزِ عمل

ان آیات میں منافقین کے رویّے کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ ظاہری طور پر مسلمانوں کے ساتھ رہتے تھے، اس لیے ان کی اندرونی کیفیت کو بھی کھول کر سامنے لایا گیا۔ فرمایا گیا کہ تمہارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب جہاد کے لئے نکلنے کا موقع آتا ہے تو ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے یہ فریضہ ان پر نہایت بھاری محسوس ہوتا ہے۔ وہ دل سے اس میں شریک ہونا نہیں چاہتے، اس لئے بددلی اور سستی کے ساتھ نکلتے ہیں۔

لفظ ''لَيُبَطِّئَنَّ'' بابِ تفعیل سے ہے، جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ خود کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاد میں شریک ہونے سے پیچھے رہ جاتے ہیں یا تاخیر کرتے ہیں؛ اور دوسرا یہ کہ وہ دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے اور بددل کرتے ہیں، جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر منافقین نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔

یہ لوگ دراصل دنیا پرست ہیں، ظاہراً مسلمانوں کے ساتھ مگر حقیقت میں ان کے دشمن۔ اسی لئے ان کی

زبانوں سے وہی باتیں نکلتی ہیں جو ان کے دل کے نفاق اور بیماری کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ جب مسلمانوں کو کوئی نقصان یا تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں:

''اچھا ہوا کہ اللہ نے ہمیں گھر بیٹھنے کی توفیق دی، ہم ان کے ساتھ شامل نہ ہوئے جہاں انہیں مصیبت کا سامنا کرنا پڑا''۔

اور جب اللہ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوتی ہے یا مالِ غنیمت ملتا ہے تو یہی لوگ حسرت سے کہتے ہیں:

''کاش! ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے، تو ہمیں بھی بڑی کامیابی نصیب ہوتی اور ہم بھی اس مال سے حصہ پاتے''۔

چونکہ ان کے دل ایمان سے خالی ہیں، اس لئے اللہ کے فضل اور مسلمانوں کی کامیابی پر انہیں حقیقی خوشی نہیں ہوتی، بلکہ افسوس ہوتا ہے کہ وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ ان کے نزدیک اصل کامیابی مال و دولت ہے، جبکہ اہلِ ایمان کے نزدیک دین کی سربلندی اور کفر کی شکست ہی حقیقی فتح ہے۔ اس کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ''

یعنی وہ لوگ جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں، انہیں بھی چاہئے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں، اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے گھروں سے نکلیں، کفر کو مغلوب کریں اور حق کو غالب کریں۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح

مفسرین نے اس جملے کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ''يَشْرُونَ'' کو ''يَشْتَرُونَ'' کے معنیٰ میں لیا جائے تو مراد وہ لوگ ہوں گے جو دنیا کو آخرت پر اختیار کرتے ہیں۔ اور اگر اسے ''بیچنے'' کے معنیٰ میں لیا جائے تو پھر مراد اہلِ ایمان ہوں گے، یعنی وہ لوگ جو اپنی دنیا کو آخرت کے بدلے فروخت کر دیتے ہیں۔

اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر منافقین انہیں روکیں بھی، تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد جاری رکھیں اور ان کی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کریں۔

یہ تعلیم اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ ایک سچا مومن کبھی دنیا کی محبت میں حق کے راستے سے پیچھے نہیں ہٹتا، بلکہ ہر حال میں اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے عظیم اجر کی خوشخبری سناتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا

یعنی جو شخص اللہ کی راہ میں قتال کرے، خواہ وہ شہید ہو جائے یا غالب آ جائے، ہر حال میں ہم اسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۔

اس آیت میں نہایت جامع انداز میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی راہ میں اٹھایا گیا ہر قدم ضائع نہیں جاتا۔ اگر کوئی مجاہد میدانِ جنگ میں شہادت کا مرتبہ پالے تو وہ کامیاب، اور اگر فتح حاصل کرے تو بھی وہ سرخ رو، کیونکہ دونوں صورتوں میں اس کے لئے اجرِ عظیم مقدر ہے۔ اصل کامیابی تو آخرت کا اجر ہے، جبکہ دنیا میں مالِ غنیمت کا مل جانا محض اللہ کا اضافی فضل ہے، نہ کہ مومن کا اصل مقصد۔

یہ ارشاد درحقیقت منافقین کے لئے تنبیہ بھی ہے، جو مالِ غنیمت کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی شریک ہوتے تو ہمیں بھی دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل کامیابی مال و دولت نہیں بلکہ آخرت کا اجر اور اللہ کی رضا ہے۔ سچا مومن خلوص دل سے ایمان قبول کرتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کے دشمنوں کے مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی مومن کو جہاد کے دوران مالِ غنیمت بھی حاصل ہو جائے تو اس کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی نیت مال حاصل کرنا نہیں بلکہ اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ دنیاوی فائدہ تو محض ایک عطیۂ الٰہی ہے، جبکہ اصل سرمایہ آخرت کی کامیابی ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: وہ کہتے ہیں کہ ان آیات میں مسلمانوں کو ہر وقت ہتھیار تیار رکھنے اور جنگ کے لیے نکلنے کی تاکید کی گئی ہے، جس سے یہ تأثر ملتا ہے کہ اسلام ایک جنگجو (militant) مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو مسلسل لڑائی پر ابھارتا ہے۔ مزید یہ کہ ''اللہ کی راہ میں قتال'' اور شہادت یا غلبہ پر ''بڑا اجر'' دینے کا ذکر اس بات کی دلیل سمجھا جاتا ہے کہ اسلام جنگ کو مذہبی فریضہ بنا کر اس کی ترغیب دیتا ہے، اور دنیاوی زندگی کے مقابلے میں جنگ و جہاد کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ ان آیات میں ان لوگوں کو برا کہا گیا ہے جو جنگ میں شریک نہیں ہوتے، اور انہیں منافقانہ طرزِ عمل کا حامل بتایا گیا ہے۔ اس سے ان کے نزدیک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر جنگ میں شرکت کے لیے نفسیاتی دباؤ ڈالتا ہے اور عدم شرکت کو مذموم قرار دیتا ہے، جو بظاہر فرد کی آزادی کے خلاف ہے۔

جواب: سورۂ نساء کی آیات (71-74) کو اگر سیاق وسباق (context) سے ہٹا کر دیکھا جائے تو بظاہر ایسا محسوس ہوسکتا ہے کہ اسلام جنگ کی ترغیب دیتا ہے، لیکن جب ان آیات کو تاریخی پس منظر، مجموعی قرآنی تعلیمات اور اسلامی اصولِ قتال کے ساتھ سمجھا جائے تو حقیقت بالکل برعکس سامنے آتی ہے۔

یہ اعتراض دراصل آیات کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ سورۂ نساء کی یہ آیات عام حالات میں ہر وقت جنگ چھیڑنے کا حکم نہیں دیتیں، بلکہ اس دور کے پس منظر میں نازل ہوئیں جب مسلمان مدینہ میں ایک منظم جماعت بن چکے تھے اور مکہ کے مشرکین، منافقین اور دشمن قوتوں کی طرف سے مسلسل حملوں، سازشوں اور جنگی خطرات کا سامنا تھا۔ اس لیے قرآن نے فرمایا:

''خُذُوْا حِذْرَكُمْ'' یعنی ''اپنی حفاظت کا سامان کرو''۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ یہاں مقصد جارحانہ جنگ نہیں بلکہ دفاعی تیاری، نظم واحتیاط ہے۔ معتبر تفاسیر میں بھی اس مقام کو اہلِ ایمان کے لیے احتیاط اور منظم دفاع کی ہدایت قرار دیا گیا ہے۔

یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب مدینہ کی اسلامی ریاست کو بیرونی اور اندرونی خطرات کا سامنا تھا: مکہ کے کفار مسلسل حملوں کی تیاری میں تھے غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور دیگر جنگیں مسلمانوں پر مسلط کی گئیں مدینہ کے اندر منافقین (Hypocrites) کمزوری اور انتشار پیدا کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں یہ آیات دفاعی نظم (defensive mobilization) کے لیے نازل ہوئیں، نہ کہ جارحانہ جنگ کے لیے۔

ایسے حالات میں اگر مسلمانوں کو یہ نہ کہا جاتا کہ: ''چوکس رہو'' ''اپنی حفاظت کا سامان رکھو'' تو یہ غفلت اور خودکشی کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا یہ حکم: جنگ شروع کرنے کا نہیں بلکہ اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کا ہے۔

تین اہم نکات

ان آیات میں تین اہم نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ دفاعی تیاری کا حکم: ''خُذُوْا حِذْرَكُمْ'' یعنی: اپنی حفاظت کا سامان کرو۔ یعنی یہ جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں، بلکہ ممکنہ حملے سے بچاؤ کی تیاری ہے۔

۲۔ منافقین کی ذہنیت کا بیان: قرآن ان لوگوں کو بے نقاب کرتا ہے جو: مصیبت میں خوش ہوتے ہیں کہ ہم بچ گئے کامیابی پر افسوس کرتے ہیں کہ ہم شریک نہ ہوئے۔ یعنی یہ آیات دراصل اخلاقی کمزوری اور منافقت کی مذمت کر رہی ہیں، نہ کہ جنگ کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

۳۔اللہ کی راہ میں قتال: ''فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...'' یہاں ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کی قید بہت اہم ہے: ذاتی مفاد کے لیے نہیں، ظلم یا جارحیت کے لیے نہیں، بلکہ عدل، دفاع اور مظلوموں کی حفاظت کے لیے۔

اسلام کا اصولِ قتال

قرآن مجید میں قتال کے اصول واضح طور پر محدود اور مشروط ہیں:

(1) صرف دفاع کے لیے اجازت: ''تم ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، زیادتی نہ کرو'' (البقرہ: 190)۔ یہ واضح کرتا ہے کہ اسلام جارحانہ جنگ (aggression) کو منع کرتا ہے۔

(2) ظلم کے خاتمے کے لیے: ''اور تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے...'' (النساء: 75)۔ یعنی قتال کا مقصد مظلوموں کی مدد ہے۔

(3) صلح کو ترجیح: ''اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ'' (الانفال: 61)۔ اسلام جنگ نہیں بلکہ امن کو ترجیح دیتا ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عملی ثبوت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اسلام جنگ پسند نہیں: مکہ میں 13 سال تک ظلم برداشت کیا، مگر جنگ کی اجازت نہیں دی گئی مدینہ میں بھی جنگ ہمیشہ دفاعی رہی صلح حدیبیہ ایک عظیم مثال ہے جہاں جنگ کے بجائے صلح کو ترجیح دی گئی، اگر اسلام جنگ پسند ہوتا تو صلح حدیبیہ جیسا معاہدہ نہ ہوتا۔

اجر کا ذکر

یہ کہا جاتا ہے کہ: ''شہادت یا غلبہ'' کہہ کر جنگ کی ترغیب دی گئی ہے، یہاں ایک غلط فہمی اس لئے ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک کی حکومت اپنے دفاع کے لیے قربانی دینے والوں کو سراہتی ہے اسلام نے بھی یہی کیا، مگر اخلاقی حدود کے ساتھ۔ یہ ''لالچ'' نہیں بلکہ: حوصلہ افزائی (motivation) ہے کیونکہ: جنگ ایک مشکل اور خطرناک عمل ہے اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے اجر کا ذکر: لوگوں کو ظلم کے خلاف کھڑا ہونے کی ہمت دیتا ہے۔

حقیقت کی نشاندہی

آیات میں جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں، ان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ عام لوگ نہیں بلکہ: وہ لوگ تھے جو: مشکل وقت میں ساتھ نہیں دیتے کامیابی پر حصہ چاہتے ہیں۔ یہ اخلاقی کمزوری (hypocrisy) کی نشاندہی ہے نہ کہ

ہر غیر شریک ہونے والے کی مذمت۔ اسلام نے: مجبور، بیمار، کمزور لوگوں کو معاف کر رکھا ہے۔

ہر ریاست اپنے شہریوں سے دفاع کی ذمہ داری چاہتی ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں مثال کے طور پر آج بھی ہر ملک میں فوج ہوتی ہے اور جنگ کے وقت لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ اسلام نے بھی: اجتماعی دفاع (collective security) کو ضروری قرار دیا۔

● سورۂ نساء (71-74) کی آیات: جنگ پر اکسانے کے لیے نہیں بلکہ دفاع، نظم، اور منافقین کی نشاندہی کے لیے ہیں اسلام کا قتال ایک محدود، مشروط اور اخلاقی دفاعی نظام ہے یعنی امن قائم کرنا ظلم کا خاتمہ مظلوموں کی حفاظت لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام جنگ پسند مذہب ہے، سیاق وسباق سے ہٹ کر ایک غلط فہمی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک امن پسند لیکن باوقار دفاعی نظام رکھنے والا دین ہے۔

منافقین کی مذمت

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ آیات میں جن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے وہ عام کمزور، بیمار، مجبور یا معذور لوگ نہیں ہیں، بلکہ وہ منافقین ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ رہ کر بھی دل سے دشمنوں کے ساتھ تھے۔ اگر مسلمانوں پر مصیبت آتی تو خوش ہوتے کہ ہم بچ گئے، اور اگر مسلمانوں کو کامیابی ملتی تو افسوس کرتے کہ کاش ہم بھی ساتھ ہوتے تاکہ مالِ غنیمت یا دنیاوی فائدہ حاصل کر لیتے۔ اس لیے قرآن ان کی مذمت جنگ نہ کرنے پر نہیں، بلکہ مفاد پرستی، بزدلی، بے وفائی اور دورخے پن پر کرتا ہے۔

فی سبیل اللہ کا مطلب

اسی طرح ''فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'' کا مطلب محض لڑائی نہیں، بلکہ اللہ کی راہ میں حق، عدل، مظلوموں کے دفاع اور ظلم کے خاتمے کے لیے جدوجہد ہے۔

اگلی آیت، یعنی سورۂ نساء آیت 75، اسی مضمون کو مزید واضح کرتی ہے کہ لڑائی کا مقصد مظلوم مردوں، عورتوں اور بچوں کو ظلم سے نجات دلانا تھا، نہ کہ دنیا پر قبضہ کرنا یا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا۔

اسلام نے جنگ کو اصل مقصد نہیں بنایا بلکہ مجبوری کی حالت میں ایک محدود اور اخلاقی عمل بنایا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں صاف حکم ہے:

''جو تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرو''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قتال کی اجازت ظلم، حملہ اور فتنہ کے مقابلے میں ہے، نہ کہ بے گناہوں پر حملہ کرنے یا مذہب پھیلانے کے لیے۔

مظلوموں کی حفاظت

لہٰذا سورۂ نساء 71-74 کا مفہوم یہ ہے کہ جب ایک دینی و اخلاقی جماعت پر دشمن حملہ آور ہو، اندر سے منافقین کمزوری پیدا کر رہے ہوں، اور مظلوموں کی حفاظت کا مسئلہ ہو، تو اہلِ ایمان کو غفلت، بزدلی اور مفاد پرستی چھوڑ کر منظم، محتاط اور قربانی کے جذبے کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ تعلیم جنگ پسندی نہیں بلکہ عدل، اجتماعی ذمہ داری اور مظلوموں کی حفاظت کی تعلیم ہے۔

ان آیات سے اسلام کا جنگ پسند ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ظلم کے سامنے خاموش رہنے، منافقت کرنے اور اجتماعی ذمہ داری سے بھاگنے کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام امن کا دین ہے، لیکن ایسا امن نہیں جو ظالم کو کھلی چھوٹ دے اور مظلوم کو بے سہارا چھوڑ دے۔

خلاصہ: یہ کہنا کہ ان آیات میں اسلام جنگ کی ترغیب دیتا ہے، حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ آیات کسی جارحانہ حملے کا حکم نہیں دیتیں بلکہ ایک ایسے وقت میں نازل ہوئیں جب مسلمان خود مسلسل خطرے اور حملوں کا شکار تھے، اس لیے انہیں دفاعی تیاری، نظم اور چوکس رہنے کی تعلیم دی گئی۔

''اللہ کی راہ میں قتال'' کا مطلب زبردستی مذہب پھیلانا نہیں بلکہ ظلم اور جارحیت کے خلاف کھڑا ہونا ہے، جیسا کہ قرآن خود کہتا ہے کہ ''زیادتی نہ کرو''۔

مزید یہ کہ شہادت یا غلبہ پر اجر کا ذکر کسی لالچ کے لیے نہیں بلکہ ایک مشکل اور جان لیوا فریضہ انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ لہٰذا یہ آیات جنگ کو بڑھاوا نہیں دیتیں بلکہ منصفانہ دفاع، اخلاقی جرات اور اجتماعی ذمہ داری کا درس دیتی ہیں۔

آیت نمبر (۷۵-۷۶) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾

ترجمہ: ''اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے، جو دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم

ہیں، اور ہمیں اپنی طرف سے کوئی حمایتی دے، اور اپنی طرف سے کوئی مددگار عطا فرما۔ جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم لڑو شیطان کے ساتھیوں سے، بے شک شیطان کی چال کمزور ہے''۔

مظلوم مسلمانوں کی نصرت اور جہاد کی تاکید

تفسیر ان آیاتِ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نہایت بلیغ انداز میں ابھارا گیا ہے اور گویا انہیں جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے؟ خصوصاً اس حال میں کہ تمہارے اپنے بھائی مرد، عورتیں اور معصوم بچے، کمزوری اور بے بسی کے باعث ہجرت بھی نہیں کر سکتے، مکہ کی سرزمین میں گھرے ہوئے ہیں اور مشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔

یہ مظلوم و بے کس لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کر رہے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نجات دے جس کے باشندے ظالم ہیں، جو شرک کے ذریعے عظیم ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اہلِ ایمان کو اذیتیں پہنچا رہے ہیں۔ اور اے ہمارے رب! ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار اور کارساز پیدا فرما، جو ہماری حمایت کرے اور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے۔

مظلوموں کی دعائیں

تفسیر روح المعانی میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مظلوموں کی دعا کو قبول فرمایا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں مکہ فتح ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کمزور مسلمانوں کی عملی مدد فرمائی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی مقرر فرمایا، جنہوں نے ان مظلوموں کی بھرپور حمایت کی، یہاں تک کہ وہی لوگ جو کبھی کمزور اور مغلوب تھے، عزت ووقار کے مقام پر فائز ہو گئے۔

● صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ خود اور ان کی والدہ بھی انہی کمزور لوگوں میں شامل تھے جن کا ذکر قرآن میں ''وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ'' کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

ان مظلوم مسلمانوں میں ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ جیسے حضرات شامل تھے، جو مکہ میں کفار کے ظلم کا شکار تھے اور ہجرت کرنے سے قاصر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لئے نماز میں رکوع کے بعد، خصوصاً آخری رکعت میں، دعا فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد دعا کرتے: ''اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عباس بن ربیعہ اور دیگر کمزور مسلمانوں کو، جو مکہ میں کفار کی قید میں ہیں، نجات عطا فرما۔ اور اے اللہ! اہلِ مضر (کفار) پر سخت گرفت فرما اور ان پر ایسا قحط نازل کر جیسا حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آیا تھا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۶)

بالآخر یہ مظلوم مسلمان کفار کی قید و بند سے آزاد ہو کر مدینہ منورہ پہنچے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبولیت کا شرف بخشا۔ یہ آیات اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ جہاد صرف زمین یا مال کے لئے نہیں، بلکہ مظلوموں کی نصرت، دین کی سربلندی اور ظلم کے خاتمے کے لئے ہوتا ہے۔ اور جب بندے اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو وہ ضرور ان کی فریاد سنتا اور انہیں عزت و نجات عطا فرماتا ہے۔

مومن اور کافر کی جنگ کا بنیادی فرق

ان آیات میں مومن اور کافر کی جنگ کے اصل مقصد کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان جب میدانِ جہاد میں اترتے ہیں تو ان کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اس کے دین کو سربلند کرنا ہوتا ہے۔ ان کی جنگ کسی ذاتی مفاد، دنیاوی لالچ یا اقتدار کی خواہش کے لئے نہیں، بلکہ خالصتاً اللہ کی خوشنودی اور حق کے غلبے کے لئے ہوتی ہے۔

اس کے برعکس کافر جب جنگ کرتے ہیں تو وہ طاغوت، یعنی شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کفر کو فروغ دیا جائے، باطل کو تقویت ملے اور اللہ کے دین کو دبایا جائے۔ گویا دونوں کے درمیان جنگ صرف میدان کی نہیں بلکہ نظریہ، مقصد اور نیت کی جنگ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا:

''فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ'' یعنی شیطان کے پیروکاروں اور اس کے مددگاروں کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرو۔

یہاں یہ حقیقت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ اگرچہ شیطان اپنے ساتھیوں کی مدد کرتا ہے، مگر اس کی مدد اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

جب مومن خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے میدان میں آتے ہیں اور انہیں اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہو جاتی ہے، تو شیطان اور اس کے پیروکار پسپا ہو جاتے ہیں۔

وہ بھاگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اہلِ ایمان کی تھوڑی سی جماعت کے سامنے بھی بے بس اور عاجز دکھائی دیتے ہیں۔

اس طرح شیطان کی تمام چالیں اور تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں، بشرطیکہ اہلِ ایمان کے اندر ایمان کی قوت، یقین کی پختگی اور اخلاصِ عمل موجود ہو۔ جب یہ اوصاف جمع ہو جائیں تو پھر کامیابی یقینی ہو جاتی ہے، کیونکہ اللہ کی مدد ہی اصل قوت ہے اور اسی کے سامنے ہر باطل طاقت مٹنے کے لئے ہوتی ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: اگر قرآن ایک کتابِ ہدایت اور امن کی تعلیم دینے والی کتاب ہے، تو پھر سورۂ النساء کی ان آیات (75-76) میں مسلمانوں کو قتال (جنگ) کے لیے کیوں ابھارا جا رہا ہے؟ کیا یہ آیات اس بات کی دلیل نہیں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو جنگ، قتل و قتال اور دوسروں کے خلاف لڑائی کی ترغیب دیتا ہے، اور کیا یہ تعلیمات عالمی امن کے خلاف نہیں ہیں؟

جواب: یہ اعتراض دراصل سیاق و سباق (context) کو نظر انداز کر کے کیا جاتا ہے، جبکہ Qur'an کی کسی بھی آیت کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر، مقصد اور مجموعی تعلیمات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

سورۂ النساء (75-76) کا تعلق اس زمانے سے ہے جب: مکہ میں مسلمان شدید ظلم و ستم کا شکار تھے مرد، عورتیں اور بچے قید، تشدد اور جبر کا سامنا کر رہے تھے وہ فریاد کر رہے تھے: ''اے ہمارے رب! ہمیں اس ظالم بستی سے نکال'' اس صورتِ حال میں یہ حکم دیا گیا: تم کیوں نہیں لڑتے ان مظلوموں کی نجات کے لیے؟ یعنی: یہ جنگ جارحیت (aggression) کے لیے نہیں بلکہ ظلم کے خاتمے کے لیے ہے۔

ظلم کے خلاف مزاحمت

قرآن کا اصول ہے کہ: بلاوجہ جنگ نہ کی جائے گی بلکہ صرف ان حالات میں جنگ کی اجازت ہوگی کہ جب ظلم ہو، جب جان و ایمان خطرے میں ہو، جب کمزوروں کی مدد ضروری ہو۔ اسی اصول کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا: ''وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا'' ''تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو''۔ (سورہ بقرہ:۱۹۰)

مظلوموں کی مدد ایک اخلاقی فرض

ان آیات کا مرکزی پیغام نہایت واضح اور انسانیت نواز ہے کہ جب مظلوم مرد، عورتیں اور معصوم بچے ظلم و جبر کا شکار ہوں اور مدد کے لیے پکار رہے ہوں، تو صاحبِ طاقت افراد کا ان کی مدد کے لیے کھڑا ہونا محض ایک اختیار نہیں بلکہ

اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اگر طاقت رکھنے کے باوجود کوئی شخص یا قوم مظلوموں کی فریاد کو نظر انداز کر دے تو یہ درحقیقت ظلم کے نظام کو مضبوط کرنے کے مترادف ہے، جو ایک سنگین اخلاقی کوتاہی بلکہ جرم ہے۔ اسلام ایسے موقع پر خاموش رہنے کے بجائے مظلوم کی نصرت کو فرضِ انسانی قرار دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں بھی یہی اصول تسلیم شدہ ہے۔ جب کسی خطے میں ظلم، نسل کشی یا انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے اور کوئی طاقت اس ظلم کو روکنے کے لیے مداخلت کرتی ہے، تو اسے ''انسانی حقوق کا دفاع'' کہا جاتا ہے۔ اسلام نے یہی اصول صدیوں پہلے واضح کر دیا تھا کہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا امن کے خلاف نہیں بلکہ حقیقی امن کی بنیاد ہے، کیونکہ امن صرف جنگ کے نہ ہونے کا نام نہیں بلکہ انصاف، تحفظ اور انسانی وقار کے قیام کا نام ہے۔

''سبیل اللہ'' اور ''سبیل الطاغوت'' کا فرق

قرآنِ مجید کی اس آیت میں دراصل دو متضاد راستوں کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک طرف اہلِ ایمان ہیں جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، یعنی ان کی جنگ کسی ذاتی مفاد، لالچ یا توسیعِ اقتدار کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد انصاف قائم کرنا، ظلم کا خاتمہ کرنا اور مظلوموں کی مدد کرنا ہوتا ہے۔

ان کا قتال اصول، اخلاق اور حدود کا پابند ہوتا ہے، جس میں زیادتی، ناانصافی اور بے گناہوں کو نقصان پہنچانا ممنوع ہے۔ گویا ان کی جدوجہد ایک اخلاقی اور اصلاحی جدوجہد ہوتی ہے جس کا ہدف ایک پرامن اور عادلانہ معاشرہ قائم کرنا ہے۔

اس کے برعکس وہ لوگ ہیں جو طاغوت (باطل نظام) کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان کی لڑائی کا مقصد حق اور انصاف نہیں بلکہ ظلم، جبر، طاقت کا غلط استعمال اور دوسروں کو دبانا ہوتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات، مفادات اور اقتدار کے لیے جنگ کرتے ہیں، جس میں اخلاقی حدود کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔

اس طرح قرآن یہ واضح کرتا ہے کہ اصل فرق خود ''جنگ'' میں نہیں بلکہ اس کے مقصد، نیت اور طریقۂ کار میں ہے ایک جنگ حق انصاف اور انسانیت کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے، جبکہ دوسری ظلم، فساد اور ناانصافی کو بڑھانے کے لیے۔ چنانچہ یہاں اصل فرق جنگ میں نہیں بلکہ مقصد (purpose) میں ہے۔

خلاصہ

اس آیت پر اعتراض کرنا درحقیقت اس کے پس منظر (background)، سیاق و سباق (context) اور مقصد کو سمجھے بغیر ایک سطحی رائے قائم کرنا ہے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیات کسی عمومی جنگ یا جارحیت کی ترغیب نہیں دیتیں بلکہ ایک

خاص تاریخی اور اخلاقی پس منظر میں نازل ہوئیں، جہاں مظلوم انسان مرد، عورتیں اور بچے، ظلم وستم کا شکار تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے۔

اس حقیقت کو نظر انداز کر کے آیت کو تنہا پیش کرنا نہ صرف علمی دیانت کے خلاف ہے بلکہ معنیٰ کے بگاڑ (distortion) کا سبب بھی بنتا ہے۔

درحقیقت جب ان آیات کو مکمل تناظر میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام جنگ نہیں بلکہ عدل، امن اور مظلوم کی حفاظت ہے۔ اس لیے صحیح فہم یہی ہے کہ کسی بھی قرآنی حکم کو اس کے سیاق وسباق کے ساتھ سمجھا جائے، کیونکہ جزوی مطالعہ اکثر غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے، جبکہ مکمل تناظر حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۷۷ سے ۸۴ تک

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَخۡشَوۡنَ النَّاسَ كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً ۚ وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ۝۷۷ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكۡكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا ۝۷۸ مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ وَاَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ۝۷۹ مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنۡ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ؕ ۝۸۰ وَيَقُوۡلُوۡنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ غَيۡرَ الَّذِىۡ تَقُوۡلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكۡتُبُ مَا يُبَيِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ۝۸۱ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ۝۸۲ وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰۤى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝۸۳ فَقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّكُفَّ بَاۡسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّاَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ۝۸۴

ترجمہ:

(۷۷) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور کہنے لگے: ''اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کی؟ کیوں نہ تھوڑی مدت تک

ہمیں مہلت دی؟'' کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اور تم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۷۸) جہاں کہیں بھی تم ہو، موت تمہیں آلے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ (اے محمدؐ!) یہ تمہاری وجہ سے ہے۔ کہہ دیجیے: سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں؟ (۷۹) تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔ اور ہم نے آپؐ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا، اور اللہ کافی ہے گواہ کے طور پر۔ (۸۰) جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے روگردانی کی، تو ہم نے آپؐ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا۔ (۸۱) اور وہ کہتے ہیں: ہم اطاعت کرتے ہیں لیکن جب وہ آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو آپؐ کہتے ہیں، اور اللہ لکھ لیتا ہے جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں۔ پس آپ ان سے اعراض کریں اور اللہ پر بھروسا رکھیں، اور اللہ کافی ہے کارساز۔ (۸۲) کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ (۸۳) اور جب ان کے پاس کوئی خبر آتی ہے امن یا خوف کی، تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسولؐ اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف لوٹا دیتے، تو ان میں سے تحقیق کرنے والے اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ جاتے، مگر کچھ ہی لوگ۔ (۸۴) پس آپؐ اللہ کے راستے میں لڑیں، آپ اپنی ذات کے سوا کسی کے ذمہ دار نہیں، اور مؤمنوں کو ابھاریں (ترغیب دیں)، امید ہے کہ اللہ کافروں کی جنگ کو روک دے، اور اللہ سخت طاقت والا اور سخت سزا دینے والا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۷۷ سے ۸۴ تک

آیت نمبر (۷۷) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ‌ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَخۡشَوۡنَ النَّاسَ كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً‌ ۚ وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ‌ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ‌ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ‌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى‌ ۫ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۷۷﴾

ترجمہ: ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے اس طرح

ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور کہنے لگے: ''اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کی؟ کیوں نہ تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت دی؟'' کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اور تم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

تفسیر نزول کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے حالات اور احکامِ الٰہی بتدریج نازل ہوئے، اور ہر مرحلے میں اُن کی تربیت ایک خاص حکمت کے تحت کی گئی۔

درگذر کرنے کا حکم

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہجرت سے قبل کا زمانہ تھا جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور اُن کے چند ساتھی رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! جب ہم مشرک تھے تو عزت ووقار کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، لیکن جب ہم ایمان لے آئے ہیں تو گویا ہمیں ذلت اور کمزوری کا سامنا ہے''۔

اُن کی خواہش تھی کہ انہیں دشمنانِ دین کے مقابلے میں جنگ کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو صبر، عفو ودرگزر کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ابھی درگزر کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے تم جنگ نہ کرو''۔ **(مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۲۳۷۷)**

یہ دراصل ایک تربیتی مرحلہ تھا، جس میں مسلمانوں کو صبر، ضبط اور روحانی استقامت سکھائی جارہی تھی۔ اس کے بعد جب ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ قائم ہوا اور مسلمانوں کو اجتماعی قوت حاصل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم نازل فرمایا۔

دلوں پر خوف کا غلبہ

لیکن عجیب معاملہ یہ پیش آیا کہ جن لوگوں نے پہلے جوش وجذبے کے ساتھ جہاد کی اجازت مانگی تھی، جب وہی حکم عملی صورت میں آیا تو اُن میں سے بعض کے دلوں پر خوف غالب آ گیا۔ وہ لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگے جیسے اللہ سے ڈرنا چاہئے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اور انہوں نے کہنا شروع کیا: ''اے ہمارے رب! ہم پر اتنی جلدی جہاد کیوں فرض کر دیا گیا؟ اگر کچھ اور مہلت مل جاتی تو بہتر ہوتا''۔

بظاہر یہ الفاظ اعتراض کے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ صحابۂ کرامؓ کی شان اس سے کہیں بلند ہے۔ اس اشکال کے جواب میں مفسرین نے مختلف توضیحات پیش کی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ کلمات منافقین کے تھے، نہ کہ سچے اہلِ

ایمان کے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ الفاظ بعض ایسے مسلمانوں کی زبان سے نکل گئے جو ابھی علم ویقین میں پختہ نہ تھے اور وقتی خوف کی وجہ سے ایسا کہہ بیٹھے،مگر دل سے اُن کا ایمان برقرار تھا اور بعد میں انہوں نے توبہ بھی کر لی۔

ایک اور توجیہ یہ کی گئی ہے کہ بعض لوگ ابتدا میں ایمان لائے،لیکن جب جہاد فرض ہوا اور حالات کی سختی سامنے آئی تو وہ کمزوری کا شکار ہو کر نفاق میں مبتلا ہو گئے اور میدانِ جہاد سے پیچھے ہٹ گئے۔اس واقعہ سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنا آسان ہے،لیکن اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رہنا اصل کسوٹی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت تدریج کے ساتھ فرماتا ہے،اور ہر مرحلے میں اُن کے صبر،اخلاص اور ہمت کا امتحان لیتا ہے۔

بزدلی کی حقیقت اور اس کا سبب

بہرصورت،معاملہ کوئی بھی ہو،بزدلی دراصل دنیا کی محبت کے باعث انسان پر غالب آتی ہے۔جب دل دنیا کی عارضی لذتوں میں الجھ جائے تو ہمت کمزور پڑ جاتی ہے۔لیکن اگر دل میں آخرت کی سچی محبت جاگزیں ہو،وہ آخرت جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے،اور دنیا کی حقیر خواہشات کی کوئی وقعت نہ رہ جائے،تو اللہ کی راہ میں لڑنا،مرنا اور اپنی جان قربان کرنا سب کچھ سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:''قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ''

یعنی آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا فائدہ نہایت تھوڑا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا بذاتِ خود بھی قلیل ہے،اور پھر اس قلیل میں سے بھی ہر شخص کو بس ایک معمولی سا حصہ ہی نصیب ہوتا ہے۔ایسی عارضی اور محدود چیز کے خاطر آخرت جیسے عظیم اور دائمی انعام سے منہ موڑ لینا سراسر نادانی ہے۔

● پھر فرمایا:''وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى''یعنی آخرت اُس شخص کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ تقویٰ صرف ایک محدود مفہوم نہیں رکھتا،بلکہ اس میں کفر وشرک سے اجتناب،نیز چھوٹے اور بڑے ہر گناہ سے بچنا شامل ہے۔

جو شخص تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے،اس کے لئے آخرت کی نعمتیں یقیناً دنیا کی ہر نعمت سے بدرجہا بہتر ہیں۔ دنیا خواہ کتنی ہی وسیع اور پرکشش کیوں نہ ہو،آخرت کی ایک ادنیٰ نعمت کے مقابلے میں بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مزید یہ کہ دنیا فانی ہے،اسے لازماً ختم ہونا ہے،بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کے ختم ہونے سے پہلے ہی دنیا والے ختم ہو جاتے ہیں۔اس کے برعکس آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے،اور ظاہر ہے کہ باقی رہنے والی چیز فانی پر ہمیشہ فوقیت رکھتی ہے۔

● آخر میں ارشاد فرمایا: ''وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا''

یعنی تم پر رتی برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس پر اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ یہاں ''فتیل'' سے مراد کھجور کی گٹھلی کے اندر موجود وہ باریک دھاگہ ہے جسے عربی محاورے میں انتہائی معمولی اور حقیر چیز کے لئے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کے ہاں انصاف اس قدر کامل ہے کہ ذرّہ برابر بھی کسی کے حق میں کمی نہیں کی جائے گی۔

آیت نمبر (۷۸-۷۹) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ''جہاں کہیں بھی تم ہو، موت تمہیں آ لے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں کہ (اے محمدؐ!) یہ تمہاری وجہ سے ہے۔ کہہ دیجیے: سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں؟ تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔ اور ہم نے آپؐ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا، اور اللہ کافی ہے گواہ کے طور پر''۔

تفسیر جو لوگ بزدلی اختیار کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد سے گریز کرتے ہیں، دراصل وہ موت کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ موت کا ایک مقررہ وقت ہے؛ جب وہ وقت آ پہنچتا ہے تو انسان کو بہر حال اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔ نہ کوئی مقام اس سے بچا سکتا ہے اور نہ کوئی تدبیر اسے ٹال سکتی ہے۔

موت سے فرار ناممکن ہے

اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تمہیں آ پکڑے گی، خواہ تم مضبوط اور بلند قلعوں ہی کے اندر کیوں نہ پناہ گزیں ہو جاؤ۔ گویا موت سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

تفسیر معالم التنزیل میں مذکور ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب غزوۂ اُحد میں بعض

مسلمان شہید ہوئے تو منافقین نے طعنہ دیتے ہوئے کہا: ''اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل گمان کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے؛ تم خواہ کہیں بھی ہو، وہ تمہیں پہنچ کر رہے گی۔ حتیٰ کہ اگر تم مضبوط قلعوں میں بھی بند ہو جاؤ، تب بھی موت سے نجات ممکن نہیں۔ یہ بیان دراصل اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہے کہ دنیاوی احتیاطیں انسان کو تقدیرِ الٰہی سے بچا سکتی ہیں، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

منافقین اور یہودیوں کی روش

جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو بعض منافقین اور یہودیوں نے عجیب وغریب باتیں کہنا شروع کر دیں۔ وہ یہ کہنے لگے کہ جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں آئے ہیں، ہمارے پھلوں میں کمی ہوگئی ہے اور کھیتوں کی پیداوار بھی گھٹنے لگی ہے۔

اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی، پیداوار میں کمی واقع ہوتی یا مہنگائی بڑھ جاتی تو اس سب کا سبب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ٹھہراتے۔ گویا ان کے نزدیک یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی آمد کی نحوست کا نتیجہ تھا۔

لیکن جب حالات بہتر ہوتے، خوشحالی آتی اور نعمتیں میسر ہوتیں تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے، اور جب کوئی کمی یا پریشانی آتی تو اس کا الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈال دیتے۔ اس باطل طرزِ فکر کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خوشحالی ہو یا تنگی، دونوں اللہ ہی کے حکم اور ارادے سے ہیں۔

اعمال کا اثر

اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ نعمتیں اللہ کے فضل سے عطا ہوتی ہیں، اور مصیبتوں کے آنے میں انسان کے اپنے اعمال کا بھی اثر ہوتا ہے، مگر بالآخر ہر چیز اللہ ہی کی مشیت کے تحت واقع ہوتی ہے۔

● پھر ارشاد فرمایا:

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا

یعنی ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس بات کو سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے۔ گویا ان کی جہالت اس قدر غالب ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے ہیں۔

● اس کے بعد ایک عظیم اصول بیان فرمایا گیا:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ یعنی تمہیں جو بھی بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو بھی برائی پہنچے وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔

یہ خطاب ہر انسان کے لئے ہے اور اس میں زندگی کا ایک بنیادی قانون بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں؛ جو بھی نعمت انسان کو ملتی ہے وہ محض اللہ کا فضل ہے۔ حتیٰ کہ نیک اعمال کے بدلے جو انعامات اور برکتیں ملتی ہیں، وہ بھی اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ ہیں، نہ کہ کسی واجب حق کا تقاضا۔ اس کے برعکس جو مصیبتیں، پریشانیاں یا تنگیاں انسان کو پیش آتی ہیں، وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

● اسی حقیقت کو سورۂ شوریٰ میں یوں بیان فرمایا گیا:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ

یعنی تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سی خطاؤں کو معاف بھی فرما دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبتیں اگرچہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں، لیکن اہلِ ایمان کے لئے ان میں یہ خیر بھی پوشیدہ ہوتی ہے کہ ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

پوری انسانیت کے رسول

● آخر میں فرمایا: وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا

یعنی ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ گواہی کے لئے کافی ہے۔

لفظ ''لِلنَّاس'' اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت پوری انسانیت کے لئے ہے۔ اور اگر کوئی آپ کی رسالت کا انکار کرے تو اس سے آپ کے مقامِ رسالت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی؛ آپ کے لئے اللہ کی گواہی ہی کافی ہے۔

بعض مفسرین نے اس جملے کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام اعمال، اچھے ہوں یا برے سے پوری طرح باخبر ہے، اور وہی سب کو ان کے اعمال کا مکمل بدلہ دینے والا ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: اگر ان کو بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر دکھ پہنچے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے (اے نبی) کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ برائی کا پیدا کرنے والا خدا ہے؟

جواب: یہ اعتراض دراصل قرآن کی آیت (سورۃ النساء:78) کو جزوی طور پر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔قرآن نے اس مسئلے کو ایک ہی جگہ نہیں بلکہ مکمل نظامِ فکر کے ساتھ واضح کیا ہے، اس لیے ایک آیت کو دوسری آیت سے الگ کر کے سمجھنا درست نہیں۔

اصل میں اعتراض کرنے والے صرف ایک جملہ لیتے ہیں ''سب اللہ کی طرف سے ہے'' اور باقی وضاحت کو نظرانداز کر دیتے ہیں جبکہ قرآن خود اسی مقام پر وضاحت کر دیتا ہے کہ برائی تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔اس لیے یہ اعتراض دراصلنا مکمل مطالعہیا غلط فہم (misinterpretation) کا نتیجہ ہے۔

اللہ کا نظام

آیت میں فرمایا گیا: ''قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ'' (کہہ دو: سب اللہ کی طرف سے ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ: کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے نظام اور مشیت کے تحت ہوتا ہے۔یعنی اصل خالقِ اسباب (cause-creator) اللہ ہے۔

لیکن فوراً اگلی آیت میں وضاحت کر دی گئی: ''وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ''

یعنی اور جو برائی تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ تخلیق (creation) اللہ کی طرف سے ہے مگر کسب و ذمہ داری (acquisition & responsibility) انسان کی طرف سے ہے۔اس کو ان دو مثالوں کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے جیسے:

اللہ نے انسان کو عقل دیا، ختیار (free will) دیا، صحیح و غلط کا شعور دیا۔اب اگر انسان صحیح راستہ اختیار کرے تو نتیجہ خیر (good) کا ہوگا اور اگر غلط راستہ اختیار کرے تو نتیجہ شر (evil) کا ہوگا۔

لہٰذا برائی اللہ کی طرف ''بطور خالقِ نظام'' ہے مگر ''بطور فعل'' انسان کی اپنی کمائی ہے جیسے: آگ کا جلانا اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے۔لیکن اگر کوئی خود آگ میں ہاتھ ڈالے تو جلنے کی ذمہ داری اسی کی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ برائی کا کوئی تعلق انسان سے نہیں تو پھر جزا و سزا (Reward & punishment) بے معنٰی ہو جائے گی اور انصاف کا نظام ختم ہو جائے گا لیکن قرآن کہتا ہے: انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔اس سے ثابت ہوا: اللہ خالق ہے، مگر ظالم نہیں، انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔

قرآن کا متوازن نظریہ

قرآن کا مؤقف نہ جبر (determinism) ہے اور نہ مکمل آزادی (absolute freedom)، بلکہ ایک متوازن

نظر یہ ہے کہ اللہ خالقِ کائنات اور نظامِ اسباب کا بنانے والا ہے جبکہ انسان اختیار رکھنے والا اور اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔

قرآن ہرگز یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ برائی کا ذمہ دار ہے، بلکہ وہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اللہ نے ایک کامل اور منظم نظام بنایا ہے، جس میں انسان کو اختیار اور ارادہ دیا گیا ہے کہ وہ خیر یا شر میں سے جو چاہے انتخاب کرے۔ لہٰذا جو شخص اس آیت پر یہ اعتراض کرتا ہے، دراصل وہ اس کے صحیح مفہوم، سیاق و سباق اور قرآن کے مجموعی نظریۂ عدل و اختیار کو سمجھ نہیں پاتا، بلکہ ادھوری سمجھ کی بنیاد پر غلط نتیجہ نکالتا ہے۔

آیت نمبر (۸۰) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾

ترجمہ: ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے روگردانی کی، تو ہم نے آپؐ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا''۔

اطاعتِ رسول اور اطاعتِ الٰہی

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ معالم التنزیل میں اس کا سببِ نزول بیان کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۳۷)

تو بعض منافقین نے طعنہ دیا کہ یہ شخص تو چاہتا ہے کہ ہم اسے رب بنالیں، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنالیا تھا۔

● اس باطل خیال کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں واضح کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری دراصل اللہ ہی کی فرمانبرداری ہے، کیونکہ آپ ﷺ جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

پیغام پہنچانے والے کے ذریعے جو حکم انسان تک پہنچتا ہے، اس پر عمل کرنا درحقیقت پیغام بھیجنے والے ہی کی اطاعت ہوتا ہے۔

اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ پیغام لانے والا رب کے درجے پر فائز ہوجائے۔ نصاریٰ نے تو جہالت کی انتہا کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کو نبوت و رسالت کے مقام سے آگے بڑھا کر الوہیت کا درجہ دے دیا، جبکہ یہاں محض

اطاعتِ رسول کی بات ہے، جو سراسر اللہ کی اطاعت ہی کا تقاضا ہے۔

انکارِ حدیث کی گمراہی

آج کے دور میں جو لوگ انکارِ حدیث کا فتنہ اٹھائے ہوئے ہیں، اس آیت میں اُن کے لئے بھی واضح جواب موجود ہے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال حجت نہیں ہیں۔ حالانکہ قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر اطاعتِ رسول اور اتباعِ رسول کا حکم دیا ہے، اور فرمایا:

''یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے'' اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔

قرآن مجید اصولی اور اجمالی انداز میں احکام بیان کرتا ہے، جبکہ اُن کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قول و عمل سے واضح فرماتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور سنت کو شرعی دلیل نہ مانے، وہ درحقیقت قرآن ہی کا انکار کرتا ہے۔

منکرینِ حدیث اگرچہ اپنے آپ کو ''اہلِ قرآن'' کہتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ قرآن و حدیث دونوں سے انکار کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر وہ واقعی قرآن کو ماننے والے ہوتے تو اس کی اس تعلیم کو بھی تسلیم کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع فرض ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو اللہ کی محبت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

رسول کا منصب

اس کے بعد فرمایا گیا: ''اور جو شخص روگردانی کرے، تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا'' یعنی اگر کوئی شخص حق کو قبول نہ کرے اور ہدایت سے منہ موڑ لے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا منصب صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے، لوگوں کو زبردستی اس پر عمل کروانا آپ کے ذمہ نہیں۔

● اسی مضمون کو ایک اور مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا:

''نصیحت کیجئے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں، آپ ان پر مسلط نہیں ہیں''۔

بعض مفسرین نے یہ رائے پیش کی ہے کہ یہ حکم ابتدائی دورِ اسلام سے متعلق ہے، جب جہاد فرض نہیں ہوا تھا، بعد میں قتال کا حکم نازل ہوا تو وہ آیات اس حکم کے لئے ناسخ بن گئیں۔ تاہم اگر اس آیت کا مقصد محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینا ہو کہ آپ ہدایت نہ ماننے والوں کے بارے میں فکرمند نہ ہوں، کیونکہ آپ کے ذمہ صرف پیغام پہنچانا ہے، تو پھر اسے منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اطاعت کی اہمیت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی؛ اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے اس کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۳۷)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے تمام لوگ جنت میں داخل ہوں گے، سوائے اُس کے جو انکار کرے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون ایسا ہے جو جنت میں جانے سے انکار کرے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے جنت میں جانے سے انکار کر دیا''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۲۸۰)**

فائدہ : ان ارشادات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، ایمان کا لازمی تقاضا اور فلاحِ آخرت کا بنیادی ذریعہ ہے۔

آیت نمبر (۸۱-۸۲) وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

ترجمہ: ''اور وہ کہتے ہیں: ہم اطاعت کرتے ہیں لیکن جب وہ آپؐ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو آپؐ کہتے ہیں، اور اللہ لکھ لیتا ہے جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں۔ پس آپ ان سے اعراض کریں اور اللہ پر بھروسا رکھیں، اور اللہ کافی ہے کارساز۔ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے''۔

منافقین کی خصلت

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں منافقین کی ایک نہایت مذموم عادت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جب وہ رسولِ اکرم ﷺ کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوتے ہیں تو بڑی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہ ہم آپ کے حکم سے کیسے سرتابی کر سکتے ہیں، ہمارا شیوہ تو سراسر اطاعت و انقیاد ہے۔لیکن جب وہ اس نورانی مجلس سے باہر نکلتے ہیں تو اُن ہی میں سے ایک گروہ، خصوصاً اُن کے سردار، شب کی تاریکی میں وہ منصوبے ترتیب دیتے ہیں جو ان کے ظاہر کردہ اقوال کے یکسر برعکس ہوتے ہیں۔اس طرح وہ آپ ﷺ کے ارشادات کی خلاف ورزی کرتے اور نافرمانی کی تدبیریں بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ

یعنی اللہ اُن تمام خفیہ مشوروں اور سازشوں کو محفوظ کر رہا ہے۔وہی دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔لہٰذا آپ ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ ان سے اعراض فرمائیں، ان سے بدلہ لینے کی فکر میں نہ پڑیں، بلکہ اللہ پر کامل بھروسہ رکھیں۔ یقیناً اللہ ہی بہترین کارساز ہے، وہی آپ کے تمام امور کو سنوارنے والا اور آپ کو ان کے شر و فساد سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

قرآن میں تدبر کی دعوت

اس کے بعد قرآنِ مجید میں غور و فکر کی اہمیت کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کیا گیا ہے: ''اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ'' کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟

اگر یہ لوگ اخلاص کے ساتھ قرآن میں غور کریں تو ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ یہ کلام سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے، اور یہ بھی کہ رسول اللہ ﷺ واقعی اللہ کے برحق رسول ہیں، جن کی رسالت کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ثبت فرمائی ہے۔

● مزید فرمایا: ''وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا'' اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بے شمار تضادات پائے جاتے۔

یعنی اس کی خبروں میں تضاد ہوتا، کہیں بات درست ہوتی اور کہیں غلط، کہیں معنی میں خلل ہوتا اور کہیں درستگی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے الفاظ، معانی اور مضامین ہر اعتبار سے کامل اور بے عیب ہیں۔

اس میں نہ کسی نقص کی گنجائش ہے اور نہ کسی اعتراض کی جگہ۔قرآنِ مجید نے اپنے مقابلے میں ایک آیت لانے کا چیلنج دیا، جو آج تک پوری انسانیت کے لئے قائم ہے، مگر کوئی بھی اس کا ہم پلہ کلام پیش نہ کر سکا۔اگر کسی نے اپنی کم فہمی کی بنا پر کوئی اعتراض کیا بھی، تو اس کا شافی جواب خود قرآن میں موجود ہے یا اہلِ علم و دانش نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔یہی قرآن کی صداقت، اعجاز اور الوہیت کی روشن ترین دلیل ہے۔

غور وفکر کے اہل

قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت میں تدبر وتفکر کی دعوت اُن لوگوں کے لئے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمِ نافع سے نوازا ہے۔ ایسے اہلِ علم پر لازم ہے کہ وہ قرآن میں گہرائی کے ساتھ غور کریں۔ البتہ ہر انسان اپنی فہم، استعداد اور علمی صلاحیت کے مطابق اس میں تدبر کرسکتا ہے، اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا اشکال پیدا ہو، وہاں اہلِ علم سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

سمجھنے والوں کے درجات مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح تدبر کی صورتیں بھی متنوع ہیں۔ کوئی معانی میں غور کرتا ہے، کوئی حقائق و اسرار کی جستجو کرتا ہے، کوئی احکام و مسائل کی تحقیق میں مصروف ہوتا ہے، اور کوئی اس کی فصاحت و بلاغت، اسلوبِ بیان اور اعجازِ کلام کی گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سب تدبر ہی کی مختلف جہات ہیں۔

● ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ نے قرآنِ مجید میں عمیق غور وفکر کرکے اس سے مسائل اخذ کئے اور اس کے حقائق کو منکشف کیا۔ ان کے بعد آنے والے علماء نے بھی اسی روایت کو جاری رکھا اور قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے احکام و مسائل کی توضیح وتشریح کا سلسلہ قائم رکھا۔

● تاہم تدبر کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ معمولی سی عربی یا اردو جاننے والے افراد، جنہیں نہ صرف نحو کا علم ہو، نہ صیغوں کی پہچان، نہ وجوہِ اعراب کا ادراک، نہ مشتق ومشتق منہ کی معرفت، اور نہ ہی حروفِ اصلیہ وزائدہ کی تمیز، وہ بھی قرآن میں ازخود غور کرنے لگیں اور اپنے آپ کو علمائے راسخین کے ہم پلہ سمجھ کر اپنی رائے سے اس کے معانی بیان کرنے لگیں۔ ایسا طرزِ عمل درحقیقت علم نہیں بلکہ صریح جہالت ہے۔

تفسیر کا فتنہ

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم پر علماء ہی کی اجارہ داری کیوں ہو؟ ہم بھی اہلِ علم ہیں، ہم بھی اس کے معانی بیان کرسکتے ہیں۔ بلکہ ان میں سے کچھ نادان تو اس حد تک جا پہنچتے ہیں کہ (معاذ اللہ) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی درمیان سے نکال دیتے ہیں اور یہ کہنے لگتے ہیں کہ قرآن اللہ نے ہمیں براہِ راست عطا کیا ہے، لہٰذا ہم خود ہی اسے سمجھ لیں گے، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریح وتوضیح کی ضرورت نہیں۔

تفسیر بالرائے

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص قرآن کو اس کے لانے والے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نہ سمجھے، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعد آنے والے اہلِ علم کے سلسلۂ فہم کو بھی نظرانداز کردے، وہ لازماً اپنی

رائے سے تفسیر کرنے لگے گا۔

تفسیر بالرائے (اپنی رائے سے تفسیر) گمراہی کا راستہ ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ علم کے بغیر قرآن کی تفسیر میں مشغول ہوئے، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہی میں مبتلا کر گئے۔

● حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۹۵۰)**

● اسی طرح حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا، اگر چہ اس کی بات درست ہی کیوں نہ ہو، تب بھی اس نے غلطی کی''۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۹۵۲)

فائدہ: ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی بات بظاہر درست بھی کہہ دی جائے، تب بھی یہ طریقہ غلط ہے، اس لیے کہ یہ منصب اُس کا نہیں تھا، مگر اس نے ازخود اسے اختیار کرلیا۔

رہا یہ سوال کہ قرآن پر علماء کی ہی ''ٹھیکیداری'' کیوں ہے، تو یہ دراصل جہالت پر مبنی سوال ہے۔ جب علاج و معالجہ کا میدان ڈاکٹروں کے سپرد ہے، قانون سازی اور اس کی تشریح و تطبیق قانون دانوں کے حوالے ہے، اور انجینئرنگ کے امور ماہرینِ انجینئر کے اختیار میں ہیں، تو پھر قرآن کے معانی و مفاہیم کو سمجھانے کا حق اُنہی لوگوں کو کیوں نہ ہو جو اس علم کے ماہر اور اہل ہیں؟

کیا قرآن آسان ہے؟

کبھی یہ اشکال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں تو اللہ تعالیٰ نے اسے آسان قرار دیا ہے، پھر اس کا فہم سب کے لئے یکساں طور پر آسان کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن آسان ہے، مگر اپنے اصول وضوابط کے ساتھ۔ دنیا میں کوئی بھی آسان چیز اپنے اصولوں کے بغیر آسان نہیں رہتی۔

مثلاً حلوہ کھانا ایک نہایت آسان کام سمجھا جاتا ہے، مگر اس کے لئے پہلے چینی، سوجی اور گھی کا انتظام، پھر اسے بنانے کا طریقہ سیکھنا، اور قواعد کے مطابق اسے تیار کرنا ضروری ہوتا ہے، تب جا کر وہ لقمہ آسانی سے منہ تک پہنچتا ہے۔

● اسی طرح قرآن بھی بلاشبہ آسان ہے، لیکن چونکہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے اسے سمجھنے کے لئے متعلقہ علوم سے واقفیت ناگزیر ہے۔

ان علوم کے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص نہ حلوہ بنانے کے اجزاء سے واقف ہو، نہ

اسے تیار کرے، نہ منہ تک لائے، مگر اس کے باوجود اسے نگلنے کی کوشش کرے یہ محض نادانی ہے۔

بنیادی احکام

البتہ قرآن کے بنیادی احکام، حلال وحرام کی ابتدائی پہچان اس قدر واضح ہے کہ اگر کسی شخص کے سامنے بیان کردی جائے تو وہ بھی اسے سمجھ سکتا ہے، چاہے اس نے خود قرآن نہ پڑھا ہو۔ لیکن پورے قرآن کی جامع تفسیر، اس کے معارف ودقائق کا استخراج، متشابہات کی معرفت، اور مختلف احتمالی معانی میں سے سیاق وسباق کے مطابق درست مفہوم کا تعین، یہ سب ایسے امور ہیں جن کے لئے عربی زبان اور اس کے علوم پر کامل دسترس ضروری ہے۔

افسوس کہ موجودہ دور کے جاہل لوگ اپنی طرف سے قرآن کے معانی بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے، جبکہ وہ اہلِ علم جنہوں نے اپنی عمریں قرآن فہمی میں صرف کردیں، وہ بھی اس باب میں زبان کھولتے ہوئے نہایت احتیاط اور خوف محسوس کرتے ہیں۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کا احتیاط وتقویٰ

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بڑھ کر، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآنِ کریم کا فہم وادراک رکھنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس کے باوجود جب اُن سے سورۂ عبس کی آیت ''وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا'' کے معنٰی دریافت کئے گئے تو اُنہوں نے نہایت عجز واحتیاط کے ساتھ فرمایا: ''کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے اپنے اوپر اٹھائے گی، اگر میں اللہ کی کتاب کے بارے میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں!'' یہ طرزِ عمل اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ قرآنِ مجید کے فہم وبیان میں کس قدر احتیاط، خشیت اور ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔

اصولِ تفسیر اور مفسر کی ذمہ داریاں

مفسرِ قرآن کے لئے سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآنِ مجید ہی میں تلاش کرے، کیونکہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ ایک مقام کی وضاحت دوسرے مقام پر فرمادی جاتی ہے۔ اس طرح قرآن خود اپنی بہترین تفسیر پیش کرتا ہے۔

اگر کسی آیت کی تشریح قرآن میں نہ ملے تو پھر اسے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تلاش کیا جائے، اس لئے کہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنِ کریم کی مستند ترین تفسیر اور کامل ترین شرح ہے۔ ظاہر ہے کہ جس مقدس ہستی پر قرآن نازل ہوا، اسی نے اس کے معانی ومطالب کو سب سے بہتر طور پر واضح فرمایا ہے۔

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر سراسر حق ہے، اور اس کے خلاف ہر تشریح ناقابلِ قبول ہوگی۔ چنانچہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ یعنی ہم نے آپ پر کتابِ حق نازل کی تاکہ آپ اللہ کے دکھائے ہوئے طریقے کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔

اگر کسی آیت کی وضاحت حدیثِ مبارکہ میں بھی نہ ملے تو اس کے بعد حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کیا جائے، کیونکہ یہ مقدس جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآن کے سب سے بڑے عالم اور فہم رکھنے والے تھے۔

صحابۂ کرام کا امتیاز

صحابۂ کرامؓ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ نزولِ قرآن کے زمانے میں موجود تھے، ان حالات و واقعات سے واقف تھے جن میں آیات نازل ہوئیں، اور انہیں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی۔ اسی صحبتِ نبوی کی برکت سے وہ کامل فہم، صحیح علم اور نیک عمل کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح انہیں قرآن کے الفاظ سکھاتے تھے، اسی طرح اس کے معانی و مطالب بھی واضح فرماتے تھے۔

● حضرت ابوعبدالرحمن سلمیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے جب تک ان آیات کے علم و عمل کو پوری طرح نہ سمجھ لیتے، اس طرح ہم نے قرآن، اس کا علم اور اس پر عمل، سب کچھ ایک ساتھ حاصل کیا۔

مفسر کے لئے لازم علوم

مفسر کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ عربی زبان اور اس کے علوم، صرف، نحو، بلاغت، لغت اور اصولِ فقہ پر کامل دسترس رکھتا ہو، تاکہ وہ الفاظ کے دقیق معانی اور سیاق و سباق کے تقاضوں کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اسی طرح اسے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، اور مطلق و مقید جیسے اصولوں کا علم ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ آیات کے درمیان تطبیق دے سکے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔

مزید یہ کہ مفسر کے اندر تقویٰ، اخلاص اور خوفِ خدا کا ہونا نہایت ضروری ہے، کیونکہ قرآن کی تفسیر محض علمی کام نہیں بلکہ ایک عظیم امانت ہے۔ اگر اس میں ذاتی رائے، خواہشِ نفس یا تعصب کو دخل دیا جائے تو یہ گمراہی کا سبب بن سکتا ہے۔

سابقہ مفسرین سے استفادہ

اسی طرح مفسر کو چاہئے کہ وہ سابقہ مفسرین کے اقوال سے استفادہ کرے، ان کے علمی سرمائے کو نظر انداز نہ کرے، اور امت کے متوارث علمی ذخیرے کے ساتھ جڑا رہے۔ الغرض، تفسیرِ قرآن ایک نہایت حساس اور ذمہ دارانہ منصب ہے، جس کے لئے علم، تقویٰ، احتیاط اور سلفِ صالحین کے منہج کی پیروی لازمی ہے، تاکہ قرآن کے حقیقی پیغام کو صحیح طور پر سمجھا اور دوسروں تک پہنچایا جاسکے۔

تفسیر کے بیان میں احتیاط و ذمہ داری

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص کسی فن خواہ وہ حساب (Maths) ہو یا طب (Medicine) کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس کے معانی، مطالب اور دقائق کو سمجھنے، محفوظ کرنے اور اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ تو کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، جو قرآنِ کریم کو اپنی نجات اور دونوں جہانوں کی کامیابی کا سرچشمہ سمجھتے تھے، انہوں نے اس مقدس کتاب کے معانی و مطالب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت نہ کیا ہو؟ ہرگز نہیں؛ بلکہ انہوں نے قرآن کے الفاظ ہی نہیں، اس کے معانی، مقاصد اور عملی تقاضوں کو بھی براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا اور پوری زندگی ان پر عمل پیرا رہے۔

لہٰذا جو شخص قرآن، حدیث اور تفاسیرِ صحابہؓ میں مہارت نہیں رکھتا اور محض عربی داں کے سہارے قرآن کے معانی سمجھنے کی جسارت کرتا ہے، وہ نہ صرف خود گمراہی کا شکار ہوگا بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

فہم قرآن کے لئے عمل

قرآن کے صحیح مفاہیم تک رسائی کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ انسان کا عقیدہ درست ہو اور اس کا عمل شریعت کے مطابق ہو۔ یعنی وہ اُنہی عقائد و اعمال کا پابند ہو جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کی تربیت فرمائی، اور فسق و فجور، الحاد اور باطل نظریات سے پاک ہو۔ اس کے دل میں قرآن پر عمل کرنے کا سچا جذبہ ہو، نہ کہ یہ خواہش کہ وہ قرآن کی آیات کو اپنے ذاتی نظریات اور خیالات کے تابع کردے۔

خلاصہ: تفسیرِ قرآن میں احتیاط، اخلاص اور صحیح منہج کی پیروی ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعے انسان قرآن کے حقیقی پیغام کو سمجھ سکتا ہے اور دوسروں تک درست طور پر پہنچا سکتا ہے۔

آیت نمبر (۸۳) وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى

الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

ترجمہ: ''اور جب ان کے پاس کوئی خبر آتی ہے امن یا خوف کی، تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسولؐ اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف لوٹا دیتے، تو ان میں سے تحقیق کرنے والے اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ جاتے، مگر کچھ ہی لوگ''۔

اہلِ علم تک خبر پہنچانے کی اہمیت

تفسیر صحیح مسلم میں ایک نہایت سبق آموز واقعہ مذکور ہے۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات سے طلاق دئے بغیر وقتی طور پر علیحدگی اختیار فرمائی۔ جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو انہوں نے تحقیق کے بغیر اسے طلاق سمجھ لیا اور آگے پھیلانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ یہ بات عام ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضری کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر حاضر ہو کر عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں!''۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ میں مسجد میں گیا تو دیکھا لوگ جمع ہیں اور یہی بات کر رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو بتا دو''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۷۹)**

چنانچہ حضرت عمرؓ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اسی موقع پر وہ آیت نازل ہوئی (جس کا پہلے ذکر گزر چکا ہے)۔ اس طرح حضرت عمرؓ اُن لوگوں میں شامل ہوئے جنہوں نے کسی خبر کو پھیلانے سے پہلے اس کی تحقیق کی اور اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کرتا رہے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵)**

فائدہ: یہ واقعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ بغیر تحقیق کے بات پھیلانا کس قدر خطرناک ہے، اور یہ کہ اہلِ علم تک رجوع کر کے حقیقت معلوم کرنا دین و دنیا دونوں کے لئے نہایت ضروری ہے۔

منافقین کی روش اور خبر پھیلانے کا فتنہ

علامہ بغویؒ نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف علاقوں کی طرف فوجی دستے روانہ فرمایا کرتے تھے۔ جب یہ لشکر واپس آتے تو منافقین فوراً ان کے پاس پہنچ جاتے اور بے صبری سے دریافت کرتے کہ کیا نتیجہ نکلا؟ تم غالب رہے یا مغلوب؟ جب انہیں حالات سے آگاہ کیا جاتا تو وہ اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے سے پہلے ہی عام کر دیتے۔ اگر خبر شکست یا نقصان کی ہوتی تو اس کے نتیجے میں مومنین کے دلوں میں کمزوری اور اضطراب پیدا ہو جاتا۔

اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جب ان کے پاس امن کی کوئی خبر (مثلاً فتح یا غنیمت) یا خوف کی کوئی خبر (مثلاً قتل یا شکست) آتی ہے تو یہ فوراً اسے مشہور کر دیتے ہیں۔

حالانکہ مناسب طریقہ یہ تھا کہ اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے جاتے اور اُن اصحاب کے سامنے پیش کرتے جو اہلِ رائے اور صاحبِ بصیرت تھے۔ ایسے اہلِ علم جو معاملات کی باریکیوں کو سمجھتے، حالات کی اونچ نیچ کا ادراک رکھتے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے تھے، وہ اس خبر کا صحیح تجزیہ کرتے اور اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرتے کہ کون سی بات ظاہر کی جائے اور کون سی مخفی رکھی جائے۔ جو خبر پھیلانے کے قابل نہ ہوتی، اسے آگے نہ بڑھاتے، اور جو بیان کرنے کے لائق ہوتی، اسے مناسب انداز سے عام کرتے۔

مگر منافقین کا طرزِ عمل اس کے برعکس تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ علم صحابہؓ تک خبر پہنچنے سے پہلے ہی اسے اڑا دیتے، جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ چونکہ ان کا مقصد مسلمانوں کی خیر خواہی نہ تھا، اس لیے وہ کسی احتیاط کے قائل نہ تھے، ادھر بات سنی اور اُدھر پھیلا دی، بغیر اس کے کہ اس کے نتائج یا مقصد پر کوئی غور کرتے۔

استنباط کا مطلب

قرآنِ مجید میں لفظ ''یَسْتَنبِطُونَهُ'' استعمال ہوا ہے، جو استنباط سے مشتق ہے۔ لغت میں استنباط کا مطلب زمین کی تہہ سے پانی نکالنا ہے، لیکن یہاں اس سے مراد کسی بات کی تحقیق کرنا، اس کی گہرائی میں اترنا، اور اس کے پوشیدہ پہلوؤں کو سمجھنا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا

یعنی اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے اکثر لوگ شیطان کے پیرو ہو جاتے، سوائے چند افراد کے۔

اللہ تعالیٰ کا دین اسلام بھیجنا اس کا عظیم فضل ہے، اور قرآنِ کریم کا نازل فرمانا اس کی بے پایاں رحمت۔ اگر یہ فضل و رحمت شاملِ حال نہ ہوتے تو انسانیت کا بڑا حصہ شیطان کے پیچھے چل پڑتا، اور حق سے دور ہو جاتا۔ البتہ چند وہ لوگ تھے جو بعثتِ نبوی اور نزولِ قرآن سے پہلے بھی فطرتِ سلیمہ پر قائم تھے اور اپنی عقلِ سلیم کی رہنمائی میں توحید کو اختیار کئے ہوئے تھے، اور یہ بھی دراصل اللہ ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ تھا۔

لیکن چونکہ رسول کا مبعوث ہونا اور کتاب کا نازل ہونا ایک خاص اور عظیم رحمت ہے، اس لئے واضح فرمایا گیا کہ اگر یہ الٰہی فضل و رحمت نہ ہوتی تو سب کے سب شیطان کے پیرو کار بن جاتے، سوائے چند خوش نصیب افراد کے۔

خبر کی تحقیق

آیتِ مبارکہ کے ترجمہ اور سببِ نزول سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی خبر سننے میں آئے تو فوراً اسے آگے بڑھانے کے بجائے اس کی تحقیق ضروری ہے، کیونکہ ہر سنی ہوئی بات درست نہیں ہوتی اور اس میں غلطی کا قوی امکان رہتا ہے۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو آگے بیان کرتا رہے''۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵)**

موجودہ دور میں یہ خرابی اور بھی شدت اختیار کر گئی ہے۔ نہ صرف لوگ سنی سنائی باتوں کو آگے بڑھانے میں سبقت لے جاتے ہیں بلکہ باقاعدہ جھوٹی خبریں گڑھی جاتی ہیں، انہیں پھیلایا جاتا ہے، اور اس کے ذریعے مالی فائدہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جماعتیں اور حکومتیں بھی ایسے افراد کو تیار کرتی ہیں جنہیں معاوضہ دے کر جھوٹی خبروں کی ترویج پر مامور کیا جاتا ہے۔

احتیاط کا اصول

اصولی طور پر قرآنِ مجید سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی خبر سچی بھی ہو، تب بھی اس کے پھیلانے میں احتیاط ضروری ہے، کیونکہ بعض اوقات سچی خبر بھی نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

منافقین کا یہی طرزِ عمل تھا کہ وہ جنگ سے واپس آنے والوں سے فتح یا شکست کی خبریں معلوم کر کے فوراً عام کر دیتے تھے، جس سے مسلمانوں کے حوصلے متاثر ہوتے تھے۔

اس پر انہیں تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ ایسی خبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ رائے صحابہؓ تک پہنچا دیتے تو وہ اس کی حقیقت، اہمیت اور نتائج کو سمجھ لیتے۔ پھر اگر اسے پھیلانا مناسب ہوتا تو پھیلا دیتے، اور اگر اس میں کوئی باریک پہلو یا پوشیدہ حکمت ہوتی تو اس کی تہہ تک پہنچ کر درست فیصلہ کرتے۔ لہٰذا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ کسی خبر کو سننے، اس کی تحقیق کرنے، اور پھر اسے آگے منتقل کرنے میں ان تینوں مراحل میں نہایت احتیاط اور ذمہ داری کی ضرورت ہے۔

استنباط اور قیاس کا اصول

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قیاس کے جواز کی بھی دلیل پائی جاتی ہے۔ علم کی ایک قسم وہ ہے جو تلاوت اور روایت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، یعنی وہ نصوص جو براہِ راست قرآن وحدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ جبکہ علم کی ایک دوسری قسم وہ ہے جو غور وفکر اور استنباط کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے، اور یہی استنباط دراصل قیاس کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جو معانی اور اصول موجود ہیں، ان پر قیاس کرتے ہوئے نئے مسائل کے احکام اخذ کئے جائیں۔

البتہ جہاں نصوصِ شرعیہ (قرآن وحدیث کے واضح احکام) موجود ہوں، وہاں قیاس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ نص کے مقابلے میں قیاس معتبر نہیں۔ لیکن جن مسائل کے بارے میں نصوص میں صراحت موجود نہ ہو اور امت کو ان کا حکم معلوم کرنا ضروری ہو، وہاں اہلِ علم اجتہاد، استنباط اور قیاس کے ذریعے ان کا حل نکالتے رہے ہیں۔ یوں شریعت کا نظام نہ صرف محفوظ رہتا ہے بلکہ ہر دور کے نئے مسائل کا حل بھی اسی کے دائرے میں رہتے ہوئے ممکن ہوتا ہے۔

ائمۂ مجتہدین کا منہج اور اجتہاد کی حقیقت

حضرات ائمۂ مجتہدین رحمہم اللہ قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل کا استنباط فرمایا کرتے تھے۔ وہ مقیس علیہ (اصل مسئلہ) میں پائی جانے والی جامع علتوں کو پیشِ نظر رکھ کر قیاس کرتے اور اسی بنیاد پر نئے مسائل کے احکام اخذ کرتے تھے۔

جن اہلِ علم کو قرآن وحدیث پر گہری دسترس حاصل ہو اور جو اجتہاد کے لئے درکار علوم سے پوری طرح آراستہ ہوں، وہ آج بھی نئے پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد کر سکتے ہیں۔ تاہم ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ ائمۂ مجتہدین اور سلفِ صالحین نے اس نوعیت کے مسائل میں کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا۔

اگر ائمۂ سلف کی رہنمائی کو نظر انداز کیا جائے تو انسان کے گمراہی میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے کئی گروہ گزرے ہیں جو اجتہاد کے دعویدار بنے، مگر راہِ حق سے ہٹ گئے۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ نہ ان میں تقویٰ تھا، نہ پورے قرآنِ مجید پر مہارت، نہ علمِ صرف ونحو اور علمِ اشتقاق سے واقفیت، اور نہ ہی احادیثِ نبویہ کا وسیع ذخیرہ ان کے پیشِ نظر تھا، اس کے باوجود وہ اجتہاد کے مدعی بنے رہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے اجتہاد سے دور رہنا ہی

سلامتی کا راستہ ہے۔

آیت نمبر ۸۴ کی توضیح

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا

ترجمہ: ''پس آپ اللہ کی راہ میں جنگ کریں، آپ کو صرف اپنی ذات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اور آپ مومنین کو بھی ترغیب دیں۔ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی جنگی طاقت کو روک دے، اور اللہ سب سے زیادہ سخت ہے جنگ میں اور سب سے زیادہ سخت سزا دینے والا ہے''۔

اللہ کی راہ میں جہاد کا مفہوم

علامہ بغویؒ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان (جو اس وقت مشرکینِ مکہ کا سردار تھا) سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ذیقعدہ کے مہینے میں بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلہ ہوگا۔ جب وعدے کے مطابق جنگ کے لیے پیش قدمی کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو اس مہم کے لیے بلایا، مگر بعض لوگوں کو اس میں تردد اور گرانی محسوس ہوئی۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کریں، چاہے کوئی ساتھ دے یا نہ دے، آپ اس ذمہ داری میں صرف اپنی ذات کے مکلف ہیں۔ لہٰذا آپ اپنی جان کے ساتھ میدان میں حاضر ہوں، اللہ تعالیٰ کی نصرت آپ کے ساتھ ہے۔ ساتھ ہی مومنین کو بھی جہاد کی ترغیب دیتے رہیں اور اس کے اجر وثواب کو بیان کریں، تاکہ جو بھی اس راہ میں شریک ہو، وہ اجرِ عظیم کا مستحق بنے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ ستر سواروں کے ساتھ روانہ ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد شاملِ حال فرمائی، یہاں تک کہ قتال کی نوبت بھی نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ جلد ہی کافروں کی قوت و شوکت کو روک دے گا۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ طاقتور ہے؛ جب وہ کسی مومن کی مدد فرماتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی۔ اور وہی دنیا وآخرت میں کافروں کو سخت ترین سزا دینے والا ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ حق کی راہ میں ثابت قدمی، اللہ پر کامل توکل، اور اخلاص کے ساتھ جدوجہد ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔

❁❁❁

آیت نمبر ۸۵ سے ۹۳ تک

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ:

(۸۵) جو کوئی اچھی سفارش کرے، اسے اس کا حصہ ملے گا، اور جو بُری سفارش کرے، اسے اس کا حصہ ملے گا،

اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔(۸۶) اور جب تمہیں کوئی دعا دے، تو تم بہتر دعا دو یا ویسی ہی لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔(۸۷) اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ضرور تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے؟(۸۸) پھر تمہیں کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ بن گئے ہو؟ حالانکہ اللہ نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے گمراہی میں پھینک دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو، تم اسے ہدایت دے دو؟ اور جسے اللہ گمراہ کرے، تو آپ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔(۸۹) وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہو گئے ہیں تا کہ تم اور وہ برابر ہو جاؤ۔ پس تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اور اگر وہ اعراض کریں (اس سے) تو جہاں کہیں بھی ان کو پاؤ، پکڑو اور قتل کرو، اور نہ انہیں دوست بناؤ اور نہ مددگار۔(۹۰) سوائے ان کے جو ایسے لوگوں سے جا ملے ہوں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس بات سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کریں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر غالب کر دیتا، پھر وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے الگ رہیں، جنگ نہ کریں، اور صلح کی پیش کش کریں، تو اللہ نے تمہیں ان پر حملہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں دیا۔(۹۱) تم کچھ اور لوگوں کو بھی پاؤ گے، جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ جب بھی وہ فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ پس اگر وہ تم سے الگ نہ ہوں، صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو انہیں جہاں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو۔ یہی لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔(۹۲) کسی مؤمن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مؤمن کو قتل کرے، مگر غلطی سے۔ اور جس نے غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کیا تو اسے ایک مؤمن غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا ہوگا، مگر یہ کہ وہ صدقہ کر دیں۔ اگر مقتول ایسی قوم کا ہو جو تمہاری دشمن ہو اور وہ مؤمن ہو، تو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہے، تو خون بہا بھی دینا ہوگا اور غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو، وہ دو مہینے لگاتار روزے رکھے۔ یہ اللہ سے توبہ کا کفارہ ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔(۹۳) اور جس نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کیا، تو اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہے گا، اللہ کا غضب اور لعنت اس پر ہوگی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۸۵ سے ۹۳ تک

آیت نمبر (۸۵) مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ

شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

ترجمہ: ''جوکوئی اچھی سفارش کرے، اسے اس کا حصہ ملے گا، اور جو بُری سفارش کرے، اسے اس کا حصہ ملے گا، اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

اچھی اور بری سفارش

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں سفارش کے باب میں نہایت حکیمانہ رہنمائی عطا کی گئی ہے؛ جہاں نیک اور صالح مقصد کے لئے سفارش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، وہیں باطل اور ناحق بات کے لئے سفارش کرنے پر سخت وعید بھی سنائی گئی ہے۔ اگر کسی کی نیت پاکیزہ ہو اور مقصد خیر پر مبنی ہو تو اس کی سفارش کرنا یقیناً باعثِ اجر وثواب ہے۔ اس طرح ایک ضرورت مند کی حاجت پوری ہوجاتی ہے اور سفارش کرنے والا بھی عنداللہ اجر کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنی جائز بات کو صحیح انداز میں پیش کرنے یا اپنے مدعا کو مؤثر طریقے سے بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو علم وفہم اور قوتِ بیان رکھتے ہوئے بھی اُن لوگوں تک رسائی نہیں پاسکتے جن کے ذریعے اُن کا کام ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی صاحبِ حیثیت شخص ان کی طرف سے سفارش کردے تو یہ عمل نہایت بابرکت اور باعثِ ثواب بن جاتا ہے۔

سفارش کرنے والے کی نیت پر اجر

یہ ضروری نہیں کہ ہر سفارش لازماً قبول ہی ہوجائے یا اس کا نتیجہ فوراً برآمد ہو، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ سفارش کرنے والے کو اس کی نیت اور کوشش کا اجر ضرور ملتا ہے، چاہے مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم سفارش کیا کرو، تمہیں اجر دیا جائے گا، اور اللہ اپنے رسول کی زبان سے جو چاہے فیصلہ فرمائے گا۔ یعنی تم اپنا فریضہ ادا کرکے ثواب حاصل کرلو''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۲۷)**

جبکہ کام کا ہونا یا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی تعلیم فرمائی کہ جو لوگ اپنی ضرورت پیش کرنے سے قاصر ہوں، اُن کی حاجات اہلِ اقتدار تک پہنچانا ایک عظیم نیکی ہے۔

● آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اُن لوگوں کی حاجت پہنچایا کرو جو خود اپنی حاجت بیان نہیں کرسکتے، کیونکہ جو شخص کسی صاحبِ اختیار تک کسی بے بس انسان کی ضرورت پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قدموں کو ثابت قدمی عطا فرمائے گا''۔

خدمت خلق کا ذریعہ

سفارش کا دروازہ درحقیقت میں خدمتِ خلق، ہمدردی اور خیر خواہی کا ایک روشن باب ہے، بشرطیکہ وہ حق، انصاف اور نیکی کے دائرے میں ہو۔

● حضرت ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ جب کبھی کوئی سائل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ صحابۂ کرامؓ کو تلقین فرماتے: ''تم اس کی سفارش کرو، تمہیں اس پر اجر ملے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے فیصلہ نافذ فرما دیتا ہے''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۲۷)

یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نیک مقصد کے لئے کی گئی سفارش باعثِ ثواب ہے، چاہے مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو۔

ناحق سفارش پر گرفت

لیکن جس طرح اچھی سفارش پر اجر وثواب ہے، اسی طرح بری اور ناحق سفارش پر سخت گرفت بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے کام میں ملوث ہونا چاہتا ہو یا ایسی ملازمت کا خواہش مند ہو جو شریعت کی رو سے حرام ہو، تو اس کے لئے سفارش کرنا بھی گناہ اور ناجائز ہے۔ افسوس کہ بہت سے لوگ محض قرابت داری یا دوستی کے تقاضے میں سفارش کر دیتے ہیں، بغیر اس پر غور کئے کہ جس کام کے لئے سفارش کی جارہی ہے وہ حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز۔

اس طرح وہ خود بھی گناہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ بلکہ جس شخص کے لیے سفارش کی گئی ہے، وہ جب تک اس گناہ میں مبتلا رہے گا اور اس کے اثر سے دیگر لوگ بھی گناہ کرتے رہیں گے، سفارش کرنے والا بھی ان سب کے گناہوں میں حصہ دار ٹھہرے گا۔

● حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے کسی حد کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے سفارش کرے، وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر آتا ہے۔ اور جو شخص جانتے بوجھتے کسی باطل بات کے لئے جھگڑا کرے، وہ اللہ کی ناراضی میں رہتا ہے جب تک اس سے باز نہ آجائے۔ اور جو کسی مومن کے بارے میں ایسی بات کہے جو اس میں نہیں، اللہ تعالیٰ اسے جہنمیوں کے خون اور پیپ میں ڈال دے گا، یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لے''۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۹۷)

اللہ تعالیٰ کے حدود کو روکنے کے لئے سفارش

● اسی طرح ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزاؤں (حدود) کو روکنے کے لئے سفارش کرنا

سراسر حرام ہے۔ چنانچہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی، تو قریش نے چاہا کہ اسے سزا سے بچایا جائے اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لئے آمادہ کیا۔ جب انہوں نے سفارش کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تم اللہ کی مقرر کردہ حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' پھر آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور واضح کیا کہ پچھلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ وہ بااثر لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں اور کمزوروں پر سزا نافذ کرتی تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: ''اگر فاطمہؓ بنتِ محمد بھی چوری کرتیں تو میں ان کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۸۸)

گناہ کے کاموں میں سفارش

مزید یہ کہ جس طرح گناہ کے کاموں میں سفارش ناجائز ہے، اسی طرح نااہل افراد کے لئے سفارش کرنا بھی خیانت اور فریب ہے۔ اگر کسی ایسے شخص کو منصب، ملازمت یا ذمہ داری دلوادی جائے جو اس کا اہل نہ ہو، تو یہ نہ صرف اس شخص بلکہ پوری قوم کے ساتھ خیانت ہے۔ لہٰذا سفارش کرتے وقت صرف اپنے اور پرائے کا لحاظ نہ رکھا جائے، بلکہ حلال وحرام، اور اہلیت و نااہلیت کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔

خلاصہ: سفارش کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی صاحبِ اختیار سے محض درخواست کی جائے کہ فلاں شخص کا کام کردے یا وہ ایک نیک اور ضرورت مند آدمی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس سے سفارش کی جائے وہ لازماً اس کام کو انجام دے۔ سفارش کرنے والا اپنا اجر حاصل کرلیتا ہے۔

اور اگر وہ شخص کام نہ کرے تو اس پر ناراض ہونا درست نہیں۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ دباؤ ڈال کر یا زور زبردستی سے سفارش کروانا یا کروانا، سفارش کے اصل اصول کے خلاف ہے۔ جس پر کوئی کام واجب نہیں، اس کے لئے یہ محض اختیار کی بات ہے کہ کرے یا نہ کرے اور یہی انصاف اور اعتدال کا تقاضا ہے۔

مسئلہ: یہ بات نہایت واضح اور قطعی ہے کہ کسی بھی قسم کی سفارش کے بدلے میں کوئی رقم یا ہدیہ (تحفہ) وصول کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص اس عنوان سے کچھ لے لے تو وہ درحقیقت رشوت کے حکم میں داخل ہوکر حرام کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ سفارش ایک دینی واخلاقی خدمت ہے، نہ کہ کمائی کا ذریعہ۔

آخر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا ہے۔ وہی ذاتِ باری نیکی پر اجر عطا کرتی ہے اور برائی پر سزا دیتی ہے، اور اس کے فیصلے کے سامنے کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہیں ہوسکتی۔

لفظ مقیتا کا مفہوم

لفظ مُّقِيْتًا کے مفہوم پر اہلِ علم نے نہایت دقیق گفتگو کی ہے۔ امام راغبؒ نے اپنی کتاب مفردات میں اس کے تین معانی بیان کئے ہیں: (۱) قدرت رکھنے والا، (۲) حفاظت فرمانے والا، (۳) ہر چیز کا علم رکھنے والا (گواہ)۔

اگرچہ مفردات القرآن میں یہی معانی مذکور ہیں، تاہم معالم التنزیل میں اس کا ایک اور بلیغ مفہوم بھی ذکر کیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ: اللہ تعالیٰ ہر جاندار تک اس کی خوراک پہنچانے والا ہے۔

اگر اس معنیٰ کو سامنے رکھا جائے تو اس آیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رزق کی تقسیم سراسر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی سفارش قبول نہ ہو تو اس سے اس شخص کے رزق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے جو رزق مقدر فرما دیا ہے، وہ اسے بہر حال پہنچ کر رہتا ہے۔

آیت نمبر (۸۶) وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶

ترجمہ: ''اور جب تمہیں کوئی دعا دے، تو تم بہتر دعا دو یا ویسی ہی لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے''۔

سلام کے احکام و مسائل

تفسیر لفظ حُيِّيْتُمْ بابِ تفعیل سے ہے، بروزن سُمِّيْتُمْ، اور یہ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، جبکہ فَحَيُّوْا اسی مادہ سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کا تعلق لفظ تحیۃ سے ہے، جس کے اصل لغوی معنیٰ ہیں: حَيَاتَ اللهِ کہنا، یعنی کسی کے لئے یہ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا فرمائے اور تمہیں سلامت رکھے۔ یہی اس کا بنیادی مفہوم ہے۔

اس کے بعد یہی لفظ ملاقات کے وقت سلام کرنے کے معنیٰ میں مستعمل ہو گیا، کیونکہ سلام میں نہ صرف زندگی بلکہ سلامتی، امن اور خیر کی دعا بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً یعنی جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو، یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ایک بابرکت اور پاکیزہ دعا ہے۔

سلام کی اہمیت

اسی بنا پر بعض مفسرین نے إِذَا حُيِّيْتُمْ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے۔

● احادیثِ مبارکہ میں بھی سلام کی اہمیت اور اس کے آداب نہایت واضح انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے اختیار کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے؟ آپس میں سلام کو عام کرو''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۴)

سلام پر نیکیاں

● حضرت عمرانؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: السلام علیکم، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دس (نیکیاں)۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: بیس۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تیس۔ (جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۸۹)

سلام کے اصول

● حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چھوٹا بڑے کو سلام کرے، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اور کم تعداد والے زیادہ لوگوں کو سلام کریں''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۳۱)

انجان شخص کو بھی سلام

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا اسلام بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر ایک کو سلام کرو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۲)

فائدہ: ان تمام تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ سلام محض ایک رسمی کلمہ نہیں، بلکہ محبت، اخوت، خیر خواہی اور اسلامی تہذیب کا ایک عظیم مظہر ہے، جو دلوں کو جوڑتا اور معاشرے میں الفت و یگانگت کو فروغ دیتا ہے۔

سلام کی ابتدا

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونکی، تو انہیں چھینک آئی۔ انہوں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا، جس پر ان کے رب نے فرمایا: یَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔

پھر ارشاد ہوا: اے آدم! ان فرشتوں کے پاس جاؤ جو وہاں بیٹھے ہیں، اور انہیں جا کر اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ

کہو۔ چنانچہ حضرت آدمؑ نے جا کر فرشتوں کو سلام کیا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ ،تو فرشتوں نے جواب دیا: وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ۔

پھر جب وہ واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا تحیہ (سلام کا طریقہ) ہے۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۳۶۸)

فائدہ: اس مبارک حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ انسانوں میں سلام کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے خود حضرت آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم دی کہ وہ فرشتوں کو سلام کریں، اور یوں یہ بابرکت کلمہ پہلی بار ادا ہوا۔ فرشتوں نے اس کا جواب دیا، اور اللہ تعالیٰ نے اسے بنی آدم کے لئے دائمی دستور قرار دیا کہ وہ باہمی ملاقات کے وقت اسی طرح ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیں۔

سلامتی کی دعا

یہی وہ دینِ حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نام سے عطا فرمایا، ایک ایسا دین جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی سلامتی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کے لئے خیر و عافیت کی دعا کریں۔ ملاقات کرنے والا ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہہ کر سلامتی کی دعا دے، اور جسے سلام کیا جائے وہ ''وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ'' کہہ کر اس دعا کا جواب دے۔

اس طرح دونوں جانب سے لفظِ ''سلام'' کے ذریعے ہمیشہ کے لئے امن، عافیت اور حفاظت کی دعا دی جاتی ہے۔ یہ دعا کسی خاص وقت یا حالت کے ساتھ محدود نہیں، بلکہ ہر موقع اور ہر حال میں ایک مومن کے لئے باعثِ خیر اور موجبِ برکت ہے۔

ملاقات کے وقت دیگر اقوام کے طریقے

بعض اقوام میں ملاقات کے وقت ''گڈ مارننگ'' اور ''گڈ ایوننگ'' جیسے الفاظ رائج ہیں۔ ان تعبیرات میں اول تو ایسا کوئی جامع مفہوم موجود نہیں جو مکمل طور پر سلامتی اور خیر کی دعا کو ظاہر کرے، بلکہ ان میں درحقیقت انسان کے لئے براہِ راست دعا بھی نہیں ہوتی۔

زیادہ سے زیادہ وقت کو اچھا قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے ذریعے بالواسطہ انسان کی بہتری کا اشارہ دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ان الفاظ میں دعا کسی خاص وقت کے ساتھ مقید ہوتی ہے، جب کہ حقیقی اور کامل دعا وہ ہے جو ہر وقت اور ہر حال کے لئے ہو۔ اس کے برعکس اسلام نے جو تحیۂ ملاقات عطا کیا ہے، وہ ہر اعتبار سے جامع، کامل اور ہمہ گیر ہے۔

دور جاہلیت کا سلام

● حضرت عمران بن حصینؓ بیان کرتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے ہم ملاقات کے وقت کہا کرتے تھے: ''اَنْعَمَ اللّٰہ بِکَ عَیْناً'' (اللہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی رکھے) اور ''اَنْعَمْ صَبَاحاً'' (تمہاری صبح خوشگوار ہو)، لیکن جب اسلام آیا تو ہمیں ان الفاظ کے استعمال سے منع کر دیا گیا۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۲۷)

فائدہ: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے سکھائے ہوئے طریقے کے علاوہ ملاقات کے وقت دیگر اقوام کے انداز اختیار کرنا اور ان کے رواج کے مطابق کلمات ادا کرنا ممنوع ہے۔

لہٰذا جو لوگ انگریزی انداز میں ''گڈ مارننگ'' یا ''گڈ ایوننگ'' کہتے ہیں، یا عربی رسم کے مطابق ''صَبَاحَ الْخَیْر'' اور ''مَسَاءَ الْخَیْرِ'' استعمال کرتے ہیں، ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔

دنیا کی مختلف قوموں میں ملاقات کے لئے جداگانہ الفاظ رائج ہیں، مگر اسلام نے جو کلمہ سکھایا ہے، اس جیسا جامع اور بامعنیٰ اظہار کہیں اور نہیں ملتا، ایسا کلمہ جس میں محبت کا اظہار بھی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ایک مکمل دعا بھی کہ وہ آپ کو ہر قسم کی مصیبت، آفت اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔

لفظ اسلام

لفظ ''اسلام'' خود اپنے اندر ایک گہرا مفہوم رکھتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے بھی ہے۔ محدثین ومفسرین نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کا ایک معنیٰ یہ ہے: میں تمہیں اس ذات کے سپرد کرتا ہوں جو سلامتی عطا کرنے والی ہے، اور دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے اور ہر حال میں سلامت رکھے۔

سلام کی کثرت اور اس کا جواب

اسلامی تعلیمات میں سلام کو عام کرنا نہایت محبوب اور پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوسکو گے جب تک مومن نہ بن جاؤ، اور تم اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہارے درمیان محبت پیدا ہوجائے؟'' پھر فرمایا: ''آپس میں سلام کو عام کرو''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۴)

فائدہ: یہ واضح ہدایت اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ سلام کا رواج ایمان کی بنیاد پر ہونا چاہئے، نہ کہ محض جان پہچان یا تعلقات کی بنیاد پر۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر جو حقوق ہیں، ان میں سے ایک اہم حق یہ بھی ہے کہ

جب وہ اس سے ملے تو اسے سلام کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی حقوق بیان کرتے ہوئے اس کا خصوصی ذکر فرمایا۔

سلام کا جواب

جس طرح سلام کرنا ایک مسلمان کا حق ہے، اسی طرح اس کا جواب دینا بھی لازم اور حقوقِ مسلم میں شامل ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: (۱) سلام کا جواب دینا، (۲) مریض کی عیادت کرنا، (۳) جنازے کے ساتھ جانا، (۴) دعوت قبول کرنا، اور (۵) چھینکنے والے کا جواب دینا، جب وہ الحمدللہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا جائے''۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۶۲)

افضل اعمال

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کون سا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر ایک کو سلام کرو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۲)**

مزید یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے ملے تو اسے سلام کرے، پھر اگر درمیان میں کوئی درخت، دیوار یا پتھر حائل ہو جائے اور دوبارہ ملاقات ہو تو پھر سلام کرے''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۰۰)**

فائدہ: ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام محض ایک رسمی کلمہ نہیں، بلکہ یہ ایمان کی علامت، محبت کا ذریعہ اور اسلامی معاشرت کا ایک روشن اور پُراثر شعار ہے، جس کے ذریعے دلوں میں الفت اور اخوت پروان چڑھتی ہے۔

راستے کے حقوق اور سلام

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ راستوں پر بیٹھنے سے اجتناب کرو، اور اگر کسی مجبوری کے تحت وہاں بیٹھنا ہی پڑے تو راستے کے حقوق ادا کرو۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! راستے کا حق کیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

نگاہوں کو نیچی رکھنا (تاکہ نظر کسی ناجائز مقام پر نہ پڑے)، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۲۱)**

مجلس یا گھر میں داخل ہوتے وقت سلام

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی مجلس میں پہنچو تو سلام کرو، اور اگر مناسب سمجھو تو بیٹھ جاؤ۔ پھر جب وہاں سے اٹھنے لگو تو دوبارہ سلام کرو، کیونکہ جس طرح پہلی مرتبہ سلام کرنا اہم تھا، اسی طرح رخصت کے وقت سلام کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر:۲۷۰۶)**

اسی طرح حضرت قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اہلِ خانہ کو سلام کرو، اور جب وہاں سے روانہ ہونے لگو تو سلام کے ساتھ رخصت ہو۔ **(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر:۴۶۵۱)**

اپنے گھر والوں کو سلام

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے بیٹے! جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کیا کرو، یہ عمل تمہارے لئے اور تمہارے اہلِ خانہ کے لئے باعثِ برکت ہوگا۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر:۲۶۹۸)

سلام میں پہل کرنے کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص سلام میں پہل کرتا ہے وہ تکبر سے پاک ہوتا ہے''۔

(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر:۴۶۶۶)

● حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۱۹۷)**

فائدہ: ان تمام روایات سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اسلام میں سلام کی کثرت نہایت محبوب اور پسندیدہ ہے۔ سلام کرنا اور اس کا جواب دینا مسلمانوں کے باہمی حقوق میں شامل ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت اور وہاں سے رخصت ہوتے وقت سلام کرنا چاہئے، مجلس میں آنے اور جانے کے وقت سلام کرنا چاہئے، اور اپنے گھر میں داخل ہو کر اہلِ خانہ کو سلام کرنا باعثِ خیر و برکت ہے۔

سلام کا بہتر جواب

اوپر یہ ہدایت بیان کی گئی کہ جب کوئی شخص تمہیں سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب یا تو اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم انہی الفاظ کے برابر جواب دے دو۔ چنانچہ اگر کسی نے السلام علیکم کہا ہے تو اس کے جواب میں کم از کم وعلیکم السلام کہنا ضروری ہے، تاکہ واجب ادا ہو جائے، اور افضل یہ ہے کہ جواب میں مزید الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو السلام علیکم کہا تو فرشتوں نے جواب میں ورحمۃ اللہ کا اضافہ فرمایا۔ اسی اصول پر اگر سلام کرنے والا ورحمۃ اللہ بھی کہہ دے تو جواب دینے والے کے لیے بہتر ہے کہ وبرکاتہ کا اضافہ کردے۔

● حضرت عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: السلام علیکم۔ آپ ﷺ نے جواب دیا، پھر فرمایا: اس کے لئے دس نیکیاں ہیں۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۱۹۵)**

پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا: اس کے لئے بیس نیکیاں ہیں۔ پھر تیسرا شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا: اس کے لئے تیس نیکیاں ہیں۔ یہ حدیث سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی میں بھی وارد ہوئی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اسے حدیثِ حسن قرار دیا ہے۔

مفسر ابن کثیرؒ نے (بحوالہ ابن جریر) ایک روایت نقل کی ہے کہ جب ایک شخص نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: علیک، اور ساتھ ہی فرمایا: تم نے ہمارے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑا، اس لئے ہم نے بھی اتنا ہی لوٹا دیا جتنا تم نے کہا تھا۔

سلام کی انتہا

● اس پر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وبرکاتہ تک ہی سلام کی انتہا ہے اور اس سے آگے اضافہ نہیں۔ مفسر قرطبیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ اگر کوئی سلام علیک ورحمۃ اللہ کہے تو جواب میں وبرکاتہ کا اضافہ کیا جائے، اور یہی حدِ انتہا ہے، اس کے بعد مزید اضافہ نہیں۔

● اسی طرح درِّ مختار میں مذکور ہے کہ جواب دینے والا وبرکاتہ سے زیادہ اضافہ نہ کرے۔ اگرچہ سنن ابی داؤد میں سلام کرنے والے کی طرف سے مغفرت کا اضافہ منقول ہے، جس سے بظاہر آگے اضافہ جائز معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، اسی لئے فقہاء نے اسے اختیار نہیں کیا۔

● حضرت ابن عباسؓ کے عمل سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ یمن کے ایک شخص نے انہیں سلام کیا اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بعد مزید الفاظ بڑھا دیے، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: سلام برکت تک مکمل ہو چکا ہے۔ امام محمدؒ نے بھی اسی روایت کو نقل کر کے فرمایا: جب وبرکاتہ تک کہا جائے تو وہیں رک جانا چاہئے، کیونکہ سنت کی پیروی ہی افضل ہے۔

البتہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ایسی متعدد روایات جمع کی ہیں جن سے وبرکاتہ سے آگے اضافہ کا ثبوت ملتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تصریح فرمائی کہ وہ تمام روایات سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، اگرچہ مجموعی طور پر ان میں ایک نوع کی تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔ ان تمام تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سلام کا بہترین اور مسنون طریقہ یہی ہے کہ اسے وبرکاتہ تک محدود رکھا جائے، اور اسی میں سنت کی پیروی اور اعتدال کا حسن پوشیدہ ہے۔

سلام سے متعلق مسائل

مسئلہ: سلام کرنا سنت ہے، جب کہ سلام کا جواب دینا واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہ اُن معدودے چند اعمال میں سے ہے جن میں سنت پر عمل کرنے کا اجر، بعض پہلوؤں سے واجب سے بھی بڑھ جاتا ہے، کیونکہ اس میں پہل، تواضع اور اخلاص کا نمایاں پہلو ہوتا ہے۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے کا طریقہ

مسئلہ: جب کسی کے گھر جانے کا ارادہ ہو تو پہلے سلام کیا جائے، پھر اندر آنے کی اجازت طلب کی جائے۔ حدیثِ مبارکہ میں اس کا طریقہ اس طرح بیان ہوا ہے: ''السلام علیکم، أأدخل؟'' یعنی تم پر سلام ہو، کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ اس طرح تین مرتبہ سلام اور اجازت طلب کی جائے، اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ آنا چاہئے۔ بلا اجازت نہ کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز ہے اور نہ اندر جھانکنا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: ''اس شخص کو اجازت نہ دو جو سلام سے ابتدا نہ کرے'' یعنی جو سلام کئے بغیر داخلے کی اجازت مانگے۔ **(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۴۶۷۶)**

دوسرے کے ذریعہ سلام

مسئلہ: جب کوئی شخص کسی دوسرے کے ذریعے سلام بھیجے تو جواب دیتے وقت سلام لانے والے کو بھی شامل کیا جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے: ''علیک وعلیہ السلام'' (تم پر بھی اور اس پر بھی سلام ہو)۔ چنانچہ ایک صحابیؓ نے اپنے بیٹے کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام بھیجا، تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''علیک وعلیہ السلام'' تم پر بھی اور تمہارے والد پر بھی سلام ہو۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۱۲)**

تین دن کے اندر سلام

مسئلہ: اگر دو مسلمانوں کے درمیان رنجش پیدا ہوجائے اور تعلق منقطع ہوجائے تو دونوں پر لازم ہے کہ جلد از جلد اس اختلاف کو ختم کریں۔ تین دن سے زیادہ تک سلام کلام بند رکھنا شرعاً جائز نہیں۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین

دن سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔ جب وہ آپس میں ملیں تو ایک منہ پھیر لے اور دوسرا دوسری طرف رخ کر لے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۷۷)

● اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مومن کے لئے حلال نہیں کہ وہ دوسرے مومن سے تین دن سے زیادہ تعلق توڑے رکھے۔ جب تین دن گزر جائیں تو اس سے ملے اور اسے سلام کرے۔ اگر وہ سلام کا جواب دے دے تو دونوں اجر میں شریک ہو جاتے ہیں، اور اگر جواب نہ دے تو وہ گناہگار ہوتا ہے، جبکہ سلام کرنے والا قطع تعلق کے گناہ سے بری ہو جاتا ہے''۔ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۱۲)

فائدہ: یہ تین دن کی مہلت دراصل آخری حد ہے، اس سے پہلے ہی تعلقات کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اپنے نفس کو آمادہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ نفس میں تکبر پایا جاتا ہے اور وہ جھکنے سے گریز کرتا ہے، اسی لئے جو شخص سلام میں پہل کرتا ہے وہ زیادہ فضیلت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ارشاد ہے: ''ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۷۷)

یہ تمام احکام اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ سلام محض ایک لفظ نہیں، بلکہ باہمی تعلقات کی اصلاح، دلوں کی صفائی اور اسلامی اخوت کے فروغ کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔

سلام سے متعلق چند اصول و آداب

(۱) جو شخص سواری پر ہو، وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے؛ پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے؛ کم تعداد والے زیادہ افراد کو سلام کریں؛ اور چھوٹا بڑے کو سلام میں پہل کرے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۳۱)

(۲) اگر کسی بیٹھے ہوئے مجمع کو ایک شخص سلام کر دے تو یہ سب کی طرف سے کافی ہے، اور اسی طرح اگر گزرنے والوں میں سے ایک شخص سلام کرے تو وہ بھی سب کی جانب سے کافی سمجھا جائے گا۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۱۰)

(۳) نماز کی حالت میں اگر کوئی شخص زبان سے سلام کرے یا سلام کا جواب دے، خواہ بھول ہی کیوں نہ ہو، تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر ہاتھ کے اشارے سے سلام کرے یا جواب دے تو یہ مکروہ ہے۔

(۴) نماز ادا کرنے والا، تلاوتِ قرآن میں مشغول شخص، ذکرِ الٰہی میں مصروف فرد، حدیث بیان کرنے والا، خطبہ دینے والا یا سننے والا، علمِ دین پڑھنے یا پڑھانے والا، تلبیہ پڑھنے والا، قاضی جو فیصلہ سنانے میں مشغول ہو، ان سب کو اس حالت میں سلام کرنا مکروہ ہے۔

اسی طرح اذان دینے والے اور اقامت کہنے والے کو سلام کرنا بھی مکروہ ہے، اور اگر کوئی انہیں سلام کرے تو

ان پر جواب دینا واجب نہیں۔

(۵) جو شخص شطرنج کھیل رہا ہو یا کسی گناہ میں مبتلا ہو، اسے سلام نہ کیا جائے۔ اسی طرح جو شخص قضائے حاجت (پیشاب یا پاخانہ) میں مصروف ہو، اسے بھی سلام کرنا درست نہیں۔

(۶) کافر کو سلام کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

(۷) نوجوان اجنبی عورتوں (جو محرم نہ ہوں) کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

(۸) سونے والے اور نشہ کی حالت میں موجود شخص کو بھی سلام نہ کیا جائے۔

(۹) گانے بجانے میں مشغول افراد یا کبوتر اڑانے جیسے لہو ولعب میں مبتلا لوگوں کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

(۱۰) ایسے فاسق معلمین جو علانیہ گناہوں میں مبتلا ہوں، ان کو بھی سلام کرنا ممنوع ہے۔ (یہ مسائل درِّ مختار میں مذکور ہیں)

● اس کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

لہٰذا ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، جن میں سلام کا جواب دینا بھی شامل ہے۔

حضرت آدمؑ کا سلام

● نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس حال میں پیدا فرمایا کہ ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا۔ جب انہیں پیدا کیا گیا تو حکم دیا گیا کہ اس فرشتوں کے گروہ کے پاس جا کر سلام کریں اور ان کا جواب سنیں، کیونکہ یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا طریقۂ سلام ہوگا۔

چنانچہ حضرت آدمؑ نے فرشتوں سے کہا: السلام علیکم، تو انہوں نے جواب میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا، یعنی انہوں نے ورحمۃ اللہ کا اضافہ کیا۔

جنت میں انسانوں کا قدوقامت

نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا کہ جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ حضرت آدم علیہ السلام کی ہیئت وقامت پر ہوگا، یعنی ساٹھ ہاتھ لمبا۔ اور حضرت آدمؑ کے بعد سے انسانوں کے قدوقامت میں بتدریج کمی آتی گئی، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۲۷)**

فائدہ: یہ تمام احکام اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ سلام نہ صرف ایک دینی شعار ہے بلکہ ایک مکمل نظامِ اخلاق ومعاشرت ہے، جو انسان کو ادب، تواضع اور حقوق کی ادائیگی کا درس دیتا ہے۔

آیت نمبر (۸۷) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

ترجمہ: ''اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ضرور تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے؟''۔

تفسیر اس آیتِ مبارکہ میں نہایت جامع انداز میں عقیدۂ توحید، عقیدۂ آخرت اور قیامت کی حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے۔ اس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ قیامت کا دن یقینی طور پر آنے والا ہے، جس میں کسی ادنیٰ درجے کا بھی شک وشبہ نہیں۔ وہ دن جزا وسزا کا ہوگا، جہاں ہر نیکی اور ہر بدی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے خود اس حقیقت کی خبر دی ہے، اور اس کی خبر سے بڑھ کر کوئی بات سچی اور معتبر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اس پر کامل یقین رکھنا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔

آیت نمبر (۸۸) فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

ترجمہ: ''پھر تمہیں کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ بن گئے ہو؟ حالانکہ اللہ نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے گمراہی میں پھینک دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو، تم اسے ہدایت دے دو؟ اور جسے اللہ گمراہ کرے، تو آپ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں پاسکتے''۔

منافقوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملہ

تفسیر روح المعانی میں حضرت مجاہدؒ سے یہ روایت منقول ہے کہ اس مقام پر اُن لوگوں کا ذکر ہے جو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے اور اپنے آپ کو مہاجر ظاہر کیا، لیکن اس کے بعد مرتد ہوگئے۔ پھر انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ وہ مکہ جاکر اپنا تجارتی سامان لے آئیں تاکہ کاروبار جاری رکھ سکیں۔ اس صورتِ حال پر مسلمانوں کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔

ایک جماعت نے انہیں منافق قرار دیا، جبکہ دوسری جماعت انہیں مومن سمجھتی رہی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کے نفاق کو واضح کردیا اور ان کے بارے میں سخت حکم صادر فرمایا۔

● حضرت ضحاکؒ سے منقول ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ ہی میں مقیم رہے۔ انہوں نے زبان سے ایمان کا اقرار تو کیا، لیکن ہجرت نہ کی۔ اس بنا پر صحابۂ کرامؓ کے درمیان ان کے متعلق اختلاف ہو گیا؛ کچھ حضرات نے اُن سے تعلقات برقرار رکھے، جبکہ بعض نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور کہا کہ چونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے اور ہجرت سے گریزاں رہے، اس لئے ہم ان سے ناراض ہیں۔ (تفسیر الدر المنثور)

● حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ اُحد کے لئے روانہ ہوئے تو کچھ لوگ راستے ہی سے واپس مدینہ لوٹ گئے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر صحابہؓ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے؛ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ان سے قتال کیا جائے، جبکہ دوسرا گروہ اس کے خلاف تھا۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۰۵۰)

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں واضح فرما دیا کہ یہ لوگ منافق ہیں، اور مسلمانوں کو ہدایت دی کہ جب تک وہ ہجرت کر کے شاملِ جماعت نہ ہوں، ان سے دوستی اور قلبی تعلق نہ رکھا جائے۔

مزید یہ کہ صاحبِ روح المعانیؒ نے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور احمد کی روایات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے تو بعض افراد درمیان ہی سے پلٹ گئے۔ ان کے بارے میں بھی صحابہؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا؛ کچھ ان کے قتل کے قائل تھے اور کچھ اس کے مخالف۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تا کہ حق واضح ہو جائے۔

● صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو؟ اللہ نے انہیں ان کے اعمالِ بد کے سبب الٹا پھیر دیا اور گمراہی میں ڈال دیا۔ کیا تم اس شخص کو ہدایت دینا چاہتے ہو جسے اللہ نے گمراہ کر دیا؟ حالانکہ جسے اللہ گمراہ کر دے، اس کے لئے تم ہرگز کوئی راستہ نہیں پا سکتے''۔ (صحیح بخاری: ۴۵۸۹، ۱۸۸۴، ۴۰۵۰)

یہ بیان اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ہدایت وضلالت کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور بندے کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر کامل یقین رکھے اور اسی کے مطابق اپنا طرزِ عمل اختیار کرے۔

آیت نمبر (۸۹) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

ترجمہ: ''وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہو گئے ہیں تا کہ تم اور وہ برابر ہو جاؤ۔ پس تم

ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اور اگر وہ اعراض کریں (اس سے) تو جہاں کہیں بھی ان کو پاؤ، پکڑو اور قتل کرو، اور نہ انہیں دوست بناؤ اور نہ مددگار"۔

منافقین کے ارادوں کا بیان

تفسیر منافقین کی ناپاک خواہشات کا ذکر کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً یعنی یہ لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کفر اختیار کرلو جیسے انہوں نے کیا، تاکہ تم اور وہ ایک ہی درجے میں برابر ہو جاؤ۔ ایسے بدباطن اور گمراہ لوگوں کو ہرگز اپنا دوست نہ بناؤ۔

البتہ اگر وہ فی سبیل اللہ (اللہ کی رضا کے لئے) ہجرت کرلیں، جس سے ان کے ایمان کی صداقت ظاہر ہو جائے تو اس صورت میں ان سے تعلقِ دوستی قائم کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ہجرت کے ساتھ "فی سبیل اللہ" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اگر ہجرت خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو بلکہ کسی دنیاوی مفاد کے تحت ہو، تو وہ معتبر اور قابلِ قبول نہیں ہوتی۔

آیات کے مجموعی سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام مختلف اقسام کے منافقین کے بارے میں نازل ہوئے، لیکن یہ حکم ہر منافق پر یکساں نافذ نہیں ہوتا، کیونکہ مدینہ منورہ کے منافقین کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں کیا گیا کہ انہیں قتل کردیا جائے۔

پھر فرمایا:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا

یعنی اگر یہ لوگ ہجرت فی سبیل اللہ سے منہ موڑ لیں اور اپنے رویّے پر قائم رہیں، تو جب بھی تمہیں ان پر قابو حاصل ہو، انہیں جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، خواہ وہ حرمت والی جگہ ہی کیوں نہ ہو اور ان میں سے کسی کو بھی نہ دوست بناؤ اور نہ مددگار۔ ان سے مکمل اور ہمہ جہت طور پر کنارہ کشی اختیار کرو۔

وضاحت

صاحبِ روح المعانیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ان سے ایسا کامل اجتناب کرو کہ ہر پہلو سے دوری اختیار کی جائے، اور کبھی بھی ان کی دوستی یا مدد قبول نہ کی جائے۔

نوٹ: "کافروں کو جہاں پاؤ قتل کرو" جیسے احکام کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے سورۂ آلِ عمران (آیت ۲۸) اور سورۂ بقرہ (آیات ۱۹۰ تا ۱۹۳) کو پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے، تاکہ پورا پس منظر اور حدود و قیود واضح ہو جائیں۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب

اعتراض: اس میں کہا گیا ہے کہ کافروں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ بڑی بے رحمی کا حکم ہے؟ کیا اللہ دیالو (رحیم) نہیں ہے؟ تو کیا یہ آیت اس بات کی دلیل نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے قتل کا حکم دیتا ہے؟ کیا یہ تعلیمات بے رحمی اور تشدد کو فروغ نہیں دیتیں؟ اور کیا یہ ایک رحمت والے خدا کے تصور کے خلاف نہیں؟

جواب: یہ آیت ــ '' فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ '' اگر اپنے پس منظر، سیاق وسباق اور متعلقہ آیات سے الگ کر کے دیکھی جائے تو یقیناً غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، لیکن جب اسے مکمل تناظر میں سمجھا جائے تو اس کا حقیقی مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

یہ حکم عام غیر مسلموں کے بارے میں نہیں بلکہ ان مخصوص لوگوں کے متعلق ہے جو بظاہر مسلمان (منافقین) تھے، پھر ایمان چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹے، اور نہ صرف خود منحرف ہوئے بلکہ چاہتے تھے کہ دوسرے مسلمان بھی ان کے راستے پر چل پڑیں۔

مزید یہ کہ وہ دشمنوں سے جا ملے اور عملی طور پر مسلمانوں کے خلاف محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس اعتبار سے یہ لوگ محض مذہبی اختلاف رکھنے والے نہیں بلکہ باغی، غدار اور فعال جنگی دشمن تھے۔

لہٰذا اس آیت میں دیا گیا حکم دراصل ان عناصر کے بارے میں ہے جنہوں نے ایمان والوں مردوں، عورتوں اور کمزور افراد کو ایذا رسانی، ظلم اور فساد کا نشانہ بنایا اور بار بار سمجھانے کے باوجود بغاوت اور دشمنی پر قائم رہے۔

ایسے حالات میں یہ حکم کسی عام اخلاقی ہدایت نہیں بلکہ ریاستی دفاع اور ملکی سیاست (law of war and state security) کا حصہ ہے، جس کا مقصد معاشرے کو انتشار، فتنہ اور اندرونی خطرات سے محفوظ رکھنا ہے۔

غلط فہمی

اس حکم کو عمومی قتل وقتال کی اجازت سمجھنا علمی طور پر غلط ہے، بلکہ یہ ایک مخصوص اور محدود قانونی اقدام ہے جو صرف انہی حالات میں نافذ ہوتا ہے جہاں بغاوت اور جنگی دشمنی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہو۔

اسی مقام پر قرآن نے اس حکم کی حدود و قیود بھی واضح کر دی ہیں: اگر وہ لوگ تم سے لڑائی چھوڑ دیں، صلح کی طرف آ جائیں یا کنارہ کش ہو جائیں تو: ''فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا'' یعنی پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا۔

فعال دشمنوں کے خلاف حکم

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف فعال دشمنوں (active enemies) کے لیے ہے، نہ کہ ہر غیر مسلم کے لیے۔ لہٰذا ''جہاں پاؤ قتل کرو'' کا حکم عام کافروں کے بارے میں نہیں بلکہ مخصوص باغیوں اور جنگی دشمنوں کے لیے ہے۔ قرآن نے خود اس کی حدود مقرر کر دی ہیں کہ اگر وہ صلح کر لیں تو جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر اسلام کا اصل اصول امن، عدل اور مظلوم کی حفاظت ہے۔

چنانچہ صحیح بات یہ ہے کہ: ''یہ آیت عام انسانوں کے قتل کا حکم نہیں دیتی، بلکہ ان مخصوص باغیوں کے خلاف کارروائی کی ہدایت ہے جو ظلم، بغاوت اور جنگ میں شریک تھے اور یہی کسی بھی منظم معاشرے کا اصول ہے''۔

الزامی جواب:

الزامی طور پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ ریاستی نظم، قانونِ جنگ اور مجرموں کی سزا سے متعلق سخت احکام صرف قرآن میں نہیں، بلکہ دیگر مذہبی و قانونی متون میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہندو دھرم کی قدیم قانونی کتاب Manusmriti (منواسمرتی) میں ریاست کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جرائم پیشہ اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے خلاف سخت اقدامات کرے، حتّٰی کہ بعض صورتوں میں قتل تک کی سزا کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح Satyarth Prakash (ستیارتھ پرکاش) میں بھی معاشرتی نظم قائم رکھنے کے لیے مجرموں کو سخت سزا دینے کی تائید ملتی ہے۔ یہ تمام احکام اس اصول پر مبنی ہیں کہ اگر کوئی فرد یا گروہ معاشرے میں فساد، ظلم اور بغاوت کو فروغ دے تو ریاست اس کے خلاف طاقت استعمال کر سکتی ہے۔

منواسمرتی کی گواہی

दण्ड एव हि लोकानां राजा भवति रक्षणे ।
दण्डः सुप्तेषु जागर्ति दण्डं धर्मं विदुर्बुधाः ॥

ترجمہ: ''درحقیقت سزا (دَند) ہی لوگوں کی حفاظت کے لیے حاکم (نگہبان) کا کام کرتی ہے، اور جب سب سو رہے ہوتے ہیں تو سزا (قانون) جاگتی رہتی ہے، دانا لوگ سزا کو ہی (نظامِ) دین/قانون سمجھتے ہیں''۔ (ادھیائے (Chapter) 8، شلوک (Verse) 351)

تشریح: اس شلوک میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ: معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے سزا

(punishment) ضروری ہے یہی سزا مجرموں کو روکتی اور کمزوروں کی حفاظت کا ذریعہ بنتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ: ریاستی قانون اور سخت سزائیں معاشرتی امن کے قیام کے لیے ایک بنیادی اصول سمجھی جاتی ہیں۔

جدید دنیاوی قوانین

اسی طرح جدید دنیا کے قانونی نظام (legal systems) کا تقابلی مطالعہ (comparative analysis) یہ واضح کرتا ہے کہ ہر منظم state (ریاست) اپنے وجود، استحکام اور public order (امنِ عامہ) کے تحفظ کے لیے بعض سنگین جرائم پر سخت سزائیں مقرر کرتی ہے۔

تقریباً تمام ممالک کے فوجداری قوانین میں murder (قتل)، terrorism (دہشت گردی)، rebellion (بغاوت) اور treason (غداری) جیسے جرائم کو ''heinous offences'' (سنگین جرائم) قرار دے کر ان پر death penalty (سزائے موت)، life imprisonment (عمر قید) یا طویل قید جیسی سزائیں رکھی گئی ہیں۔ قانونی فلسفہ (philosophy of law) کے مطابق ان سزاؤں کا مقصد محض انتقام نہیں بلکہ روک تھام، protection of society (معاشرے کا تحفظ)، maintenance of justice (نظامِ انصاف کا قیام) اور elimination of disorder (فساد کا خاتمہ) ہوتا ہے، تاکہ اجتماعی زندگی میں توازن اور استحکام برقرار رہے۔

نتیجہ: اس تناظر میں یہ نتیجہ اُخذ کرنا بالکل معقول ہے کہ: باغیوں، غداروں اور خطرناک مجرموں کے خلاف سخت سزا دینا کسی ایک مذہب یا مخصوص نظام کا امتیاز نہیں، بلکہ ہر مہذب اور منظم معاشرے کا ایک مسلمہ legal principle (قانونی اصول) ہے۔ یہی اصول ریاست کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی سالمیت (sovereignty) اور شہریوں کی life and property (جان و مال) کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرے۔

جائزہ: جب ایسے احکام مذہبی متون میں بیان ہوتے ہیں تو انہیں اسی statecraft (سیاسی و قانونی نظم) اور collective security (اجتماعی سلامتی) کے فریم ورک میں سمجھنا چاہیے، نہ کہ محض ظاہری سختی کے زاویے سے۔

لہٰذا جب انہی نوعیت کے احکام قرآن میں آتے ہیں تو انہیں ''سختی'' یا ''بے رحمی'' کہنا درست نہیں، بلکہ یہ ہر مہذب معاشرے کے بنیادی اصول کا حصہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن نے ان احکام کے ساتھ واضح حدود و قیود بھی مقرر کر دی ہیں، جیسے صلح کی صورت میں جنگ روک دینا، زیادتی سے منع کرنا، اور صرف انہی لوگوں کے خلاف کارروائی کرنا جو عملاً جنگ اور بغاوت میں شریک ہوں۔

اس لیے جو لوگ ان احکام کو سمجھنے کے بجائے انہیں محض سختی قرار دیتے ہیں، وہ درحقیقت سیاستِ ملکی (statecraft) اور قانونِ نظمِ معاشرہ کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔

آیت نمبر (۹۰) اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝۹۰

ترجمہ: ''سوائے ان کے جو ایسے لوگوں سے جا ملے ہوں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس بات سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کریں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر غالب کر دیتا، پھر وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے الگ رہیں، جنگ نہ کریں، اور صلح کی پیش کش کریں، تو اللہ نے تمہیں ان پر حملہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں دیا''۔

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں اُن لوگوں کو قتال سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ مسلمانوں کا باقاعدہ معاہدۂ صلح ہو، نیز اُن افراد کو بھی اس حکم سے الگ رکھا گیا ہے جو اس حالت میں مسلمانوں کے پاس آئیں کہ ان کے دل جنگ سے تنگ ہوں؛ نہ وہ مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی ہی قوم کے خلاف تلوار اٹھانا گوارا کرتے ہوں، بلکہ دونوں فریقوں کے ساتھ امن وصلح کے خواہاں ہوں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں واضح ہدایت ہے کہ نہ انہیں گرفتار کیا جائے اور نہ ہی ان کے قتل کی اجازت ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بھی بیان فرمائی کہ اگر وہ چاہتا تو ان لوگوں کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے برسرِ پیکار ہو جاتے، لیکن جب انہوں نے خود کو تم سے الگ کر لیا، جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی اور صلح کی پیشکش کر دی، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف نہ کوئی گرفت کا جواز رکھا اور نہ ہی قتال کی اجازت دی۔

یہاں تک دو جماعتوں کا ذکر ہوا ہے: ایک وہ جو اسلام قبول کرنے کے بعد ہجرت کر کے پھر دارالحرب کی طرف لوٹ جائیں، اور دوسری وہ جو مسلمانوں سے عدمِ جنگ کا معاہدہ کر لیں یا ایسی معاہدہ کرنے والی قوم سے جا ملیں۔ اب تیسری جماعت کا آگے ذکر آ رہا ہے۔

آیت نمبر (۹۱) سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۹۱

ترجمہ: ''تم کچھ اور لوگوں کو بھی پاؤ گے، جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ جب بھی وہ فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ پس اگر وہ تم سے الگ نہ ہوں، صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو انہیں جہاں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو۔ یہی لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے''۔

تفسیر اس میں تیسری جماعت کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو بظاہر وقتی طور پر صلح کا رویہ اختیار کرتی ہے، مگر اس کے پسِ پردہ یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی جانب سے بھی بے خوف رہے اور اپنی قوم کی طرف سے بھی محفوظ رہے۔ لیکن جب کبھی انہیں شرارت اور فتنہ انگیزی کی طرف بلایا جائے تو فوراً اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہونے میں تامل نہیں کرتے اور اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔

اس گروہ کا بیان ''سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ'' کے الفاظ میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں، نہ صلح وسکون کے ساتھ رہیں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں، تو انہیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے خلاف واضح حجت اور اجازت عطا فرما دی ہے۔

ہجرت کا ابتدائی حکم

ابتدا میں مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ دارالسلام، یعنی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کریں، اور اس ہجرت کو ایمان کی ایک شرط کی حیثیت دی گئی تھی۔ جو لوگ ہجرت کر کے نہ آتے، ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کرنے سے منع کیا گیا تھا، جیسا کہ سابقہ آیات سے واضح ہوتا ہے۔ لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی وہ فرضیت باقی نہ رہی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، وَإِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا''

یعنی فتح مکہ کے بعد اس نوع کی ہجرت فرض نہیں رہی جو وطن چھوڑنے پر مبنی تھی، بلکہ اب اصل چیز جہاد اور نیت ہے؛ جب بھی جہاد یا ہجرت کی ضرورت پیش آئے اور تمہیں بلایا جائے تو اس کے لئے نکل کھڑے ہونا لازم ہوگا۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۸۳)

آیت نمبر (۹۲) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

ترجمہ: ''کسی مؤمن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مؤمن کو قتل کرے، مگر غلطی سے۔ اور جس نے غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کیا تو اسے ایک مؤمن غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا ہوگا، مگر یہ کہ وہ صدقہ کر دیں۔ اگر مقتول ایسی قوم کا ہو جو تمہاری دشمن ہو اور وہ مؤمن ہو، تو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہے، تو خون بہا بھی دینا ہوگا اور غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو، وہ دو مہینے لگا تار روزے رکھے۔ یہ اللہ سے توبہ کا کفارہ ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے''۔

غلطی سے قتل کا حکم

تفسیر امام ابنِ جریرؒ نے حضرت عکرمہؒ سے روایت نقل کی ہے کہ حارث بن یزید، بنی عامر بن لوئی میں سے تھے۔ یہ ابوجہل کے ساتھ مل کر حضرت عیاش بن ربیعہؓ کو سخت اذیتیں دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حارث بن یزید نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

ایک موقع پر مقامِ حرا میں حضرت عیاشؓ کی اُن سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے انہیں کافر سمجھ کر تلوار کے وار سے قتل کر دیا۔ بعد میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی مومن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، سوائے اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔

پھر فرمانِ باری تعالیٰ ''وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا'' کے تحت ابنِ جریرؒ نے ابنِ جریجؒ کے واسطے سے حضرت عکرمہؒ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک انصاری شخص نے مقیم بن سبابہ کے بھائی کو قتل کر دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بدلے دیت ادا کروادی، مگر بعد میں مقیم نے اپنے بھائی کے قاتل کے بجائے کسی اور کو قتل کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس شخص کو حِل وحرم میں کہیں بھی امن نہیں دوں گا۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن اسے قتل کر دیا گیا۔

ابنِ جریجؒ فرماتے ہیں کہ یہی وہ واقعہ ہے جس کے بارے میں آیتِ کریمہ ''وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا'' نازل ہوئی (تفسیر ابن عباس)۔

قتل کا بدلہ اور احکام

سابقہ آیات میں قتال کا ذکر تھا، جبکہ یہاں قتل کے دنیوی واخروی احکام کو بیان فرمایا گیا ہے۔ قتلِ عمد، یعنی جان بوجھ کر قتل کرنا، ایک سنگین جرم ہے جس کا بیان سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۱ میں گزر چکا ہے۔ جبکہ قتلِ خطا، یعنی غلطی سے قتل ہوجانے کی صورت میں، دیت ادا کرنا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا لازم ہے۔ اگر غلام میسر نہ ہو تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

ابتدا میں یہ اصول واضح کیا گیا کہ کسی مومن کے لئے ہرگز یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کی جان لے۔ درحقیقت ہر اس جان کا قتل گناہِ کبیرہ ہے جس کی حفاظت شریعت نے لازم قرار دی ہو، اور اس میں معاہد شخص (جس سے باقاعدہ معاہدہ ہو) بھی شامل ہے۔ جب معاہد کا قتل بھی حرام ہے تو مومن کا قتل تو بدرجۂ اولیٰ سخت ترین حرمت رکھتا ہے۔

اسی مضمون کو سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح بیان فرمایا گیا:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے، مگر حق کے ساتھ (یعنی شرعی اجازت کے تحت)۔ البتہ کافرِ حربی، جو دارالحرب میں ہو اور کسی معاہدے یا امان میں شامل نہ ہو، اس کے خلاف قتال جائز ہے۔

قتل کی سزا

اور جو شخص حالتِ احصان میں، یعنی نکاح کے بندھن میں ہوتے ہوئے، زنا کا ارتکاب کرے، اس کے لئے بھی قتل کی سزا مقرر ہے، یعنی اسے سنگسار کیا جائے گا۔ اسی طرح جو شخص کسی ایسے فرد کو جان بوجھ کر قتل کردے جس کا قتل شریعت میں حلال نہیں، اس پر قصاص لازم ہوگا، یعنی جان کے بدلے جان لی جائے گی۔

مومن کو قتل کرنا نہایت عظیم گناہ ہے، اور اس پر قرآن وحدیث میں سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ اسی لئے یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مومن اپنے ہی مومن بھائی کو عمداً قتل کرے؛ البتہ اگر کسی سے غلطی سے ایسا واقعہ پیش آجائے تو وہ ایک جدا معاملہ ہے، جسے شریعت کی اصطلاح میں ''قتلِ خطا'' کہا جاتا ہے۔

قتل خطا کی دو صورتیں

قتلِ خطا کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں: ایک خطا بالقصد اور دوسری خطا بالفعل۔ خطا بالقصد یہ ہے کہ کسی نے کسی شئے کو دیکھ کر اسے شکار سمجھا اور تیر چلا دیا، حالانکہ وہ شکار نہ تھا بلکہ ایک انسان تھا؛ یا یہ گمان کیا کہ سامنے کوئی کافرِ

حربی ہے اور اسے قتل کر دیا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان تھا۔

اور خطا بالفعل یہ ہے کہ کسی مخصوص ہدف پر تیر چلایا جائے، مگر وہ جا کر کسی انسان کو لگ جائے، ان دونوں صورتوں میں کفارہ بھی واجب ہوتا ہے اور دیت بھی لازم آتی ہے۔

دیت کی تعریف

دیت دراصل خون بہا کو کہا جاتا ہے، یعنی کسی جان کے بدلے جو مال ادا کیا جائے وہ دیت کہلاتا ہے۔ اس لفظ کی اصل ''وَدْیٌ'' ہے، جس میں قاعدے کے مطابق ''واؤ'' حذف کر کے اس کے بدلے آخر میں ''تا'' لگا دی گئی، جیسے ''وَزن'' سے ''زِنَۃٌ'' اور ''وعد'' سے ''عِدَۃٌ'' بنا ہے۔

''وَدَیٰ یَدِی'' لفیف مفروق ہے، جس کے معنٰی بہنے کے ہیں، اور چونکہ اس میں بہائے گئے خون کا بدلہ دیا جاتا ہے، اس لئے اسے ''دیت'' کہا جاتا ہے۔

شریعتِ اسلامی میں دیت اور قصاص کے احکام دراصل انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے مقرر کئے گئے ہیں۔ اور جن ممالک میں دیت کے نظام کو قائم رکھا گیا ہے، وہاں بڑی حد تک جانوں کا تحفظ ممکن ہوا ہے۔

'دیت' اور 'کفارہ' کی ادائیگی کا حکم

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ

یعنی جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے، اس پر لازم ہے کہ وہ ایک مومن غلام یا باندی کو آزاد کرے، اور ساتھ ہی دیت بھی ادا کرے جو مقتول کے وارثوں کے حوالے کی جائے۔

پھر فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا یعنی اگر مقتول کے وارث اس قاتل پر دیت معاف کر دیں اور اسے صدقہ کر دیں، تو یہ دیت ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر تمام وارث معاف نہ کریں، تو جو وارث معاف کر دے گا، اس کے حصے کے مطابق دیت معاف ہو جائے گی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا:

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

یعنی اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں، یعنی وہ حربی کفار کے درمیان رہتا ہو، مگر خود ایمان والا ہو، تو اس صورت میں صرف ایک مومن غلام یا باندی کو آزاد کرنا بطورِ کفارہ لازم ہوگا۔

فائدہ: جہاں تک دیت کا تعلق ہے، وہ اس لئے واجب نہ ہوگی کہ مقتول کے قریبی رشتہ دار کافر ہیں، اور دیت میراث کے اصول کے تحت تقسیم کی جاتی ہے۔ چونکہ کافر اور مومن کے درمیان میراث کا تعلق قائم نہیں ہوتا، اس

لئے اس صورت میں نہ دیت واجب ہوگی اور نہ ہی کسی کو ادا کی جائے گی۔

غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے روزے

''وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ''

یعنی اگر مقتول مومن ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہو، خواہ وہ قوم کافر ہی کیوں نہ ہو تو چونکہ مقتول مومن ہے، اس کے قاتل پر دیت لازم ہوگی، جو اس کے وارثوں کو ادا کی جائے گی، بشرطیکہ اس کے اہلِ خانہ میں کوئی مسلمان موجود ہو۔ اگر اس کے ورثاء میں کوئی مسلمان نہ ہو تو دیت واجب نہ ہوگی، البتہ ایک مومن غلام یا باندی کو آزاد کرنا بہر حال لازم رہے گا۔

فائدہ: یہ حکم صرف اسی صورت کے ساتھ خاص نہیں کہ مقتول کسی معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہو، بلکہ اگر دارالسلام میں مسلمانوں کے درمیان بھی کوئی مومن کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے، تو اس صورت میں بھی دیت اور غلام آزاد کرنا دونوں واجب ہوں گے۔ (روح المعانی، حصہ ۵، صفحہ ۱۱)

اس کے بعد فرمایا: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ

یعنی جو شخص غلام یا باندی آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، چاہے اس لئے کہ غلام دستیاب ہی نہ ہوں جیسا کہ اس زمانے میں ہے، یا اس لئے کہ خریدنے کی قدرت نہ ہو، تو وہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔ یہ روزے پے در پے ہوں، ان کے درمیان کوئی ناغہ نہ ہو، اور ان میں رمضان المبارک شامل نہ ہو، بلکہ رمضان کے علاوہ مکمل دو مہینوں کے روزے رکھے جائیں۔ یہ روزے غلام آزاد کرنے کے بدل میں کفارہ ہیں، البتہ دیت بہر حال ادا کرنا لازم رہے گا۔ پھر فرمایا:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے؛ وہ قاتل کو بھی جانتا ہے اور مقتول کو بھی۔ اگر کسی نے قتل کیا اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکا، یا معاملہ قاضی تک نہ پہنچا، تو اسے یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دنیا و آخرت میں بچ جائے گا۔ جس کا یہ قانون ہے وہ دیکھنے والا اور باخبر ہے، اور وہ آخرت میں اپنے احکام کی خلاف ورزی پر سزا دے گا۔ وہ حکیم بھی ہے، اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں؛ دیت، غلام کی آزادی اور دیگر تمام احکام میں بے شمار مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

ذمی اور معاہد

آیت ''وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ'' میں چونکہ ''وَهُوَ مُؤْمِنٌ'' کے الفاظ موجود نہیں، اس لئے بعض فقہاء نے اسے ذمی اور معاہد کے قتل پر محمول کیا ہے۔

علامہ قرطبیؒ اپنی کتاب احکام القرآن (جلد ۳، صفحہ ۳۲۵) میں لکھتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباسؓ، شعبیؒ، نخعیؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے، اور امام طبریؒ نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

مزید یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ حکم عرب کے ان مشرکین کے بارے میں تھا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں گے یا ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ یہ معاہدہ ایک محدود مدت کے لئے تھا، اور اس دوران اگر ان میں سے کوئی شخص قتل ہو جاتا تو اس کے بدلے دیت اور کفارہ دونوں لازم ہوتے تھے۔

لیکن جب آیتِ کریمہ ''بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ'' نازل ہوئی تو یہ معاہدہ منسوخ ہو گیا، اور اس کے ساتھ اس معاہدہ کی بنیاد پر جو احکام قائم کئے گئے تھے وہ بھی ختم ہو گئے، لہٰذا اب وہ حکم باقی نہیں رہا۔

دیت سے متعلق مسائل

قتلِ خطا میں ایک جان کی دیت سو اونٹ مقرر ہے، جن کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں بیس ''بنت مخاض''، بیس ''بنت لبون''، بیس ''ابن مخاض''، بیس ''حقہ'' اور بیس ''جزعہ'' شامل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی نوعیت کی روایت منقول ہے۔ یہ تمام نام اونٹوں کی مختلف عمروں کے اعتبار سے رکھے گئے ہیں، جیسا کہ اہلِ عرب میں رائج تھا۔

● **مسئلہ:** اگر دیت اونٹوں کے علاوہ کسی اور مال سے ادا کی جائے تو ایک ہزار دینار سونے کے یا دس ہزار درہم چاندی کے ادا کئے جائیں گے۔

● **مسئلہ:** امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیت کی ادائیگی صرف تین چیزوں سے ہوگی: اونٹ، دینار یا درہم۔ جبکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک گائے، بکریاں اور کپڑے بھی اس میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ اگر گائیوں سے ادا کی جائے تو سو گائیں، بکریوں سے ادا کی جائے تو ایک ہزار بکریاں، اور کپڑوں سے ادا کی جائے تو دو سو جوڑے دینے ہوں گے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔

● **مسئلہ:** عورت کی دیت، مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہوتی ہے۔

● **مسئلہ:** مسلم اور ذمی کی دیت برابر ہے۔ ذمی وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کی ماتحتی میں رہتے ہیں۔

● **مسئلہ:** دیت کو مقتول کے شرعی ورثاء میں میراث کے اصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ اگر تمام ورثاء معاف کر دیں تو دیت مکمل طور پر ساقط ہو جائے گی، اور اگر بعض ورثاء معاف کریں تو ان کے حصے کے بقدر معافی ہو جائے گی۔

عاقلہ کے دیت کا مسئلہ

● **مسئلہ:** قتلِ خطا کی دیت ''عاقلہ'' پر واجب ہوتی ہے، جبکہ کفارہ، یعنی غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا، قاتل کے ذمہ لازم ہوتا ہے۔ عاقلہ سے مراد وہ اہلِ نصرت ہیں جن کے درمیان قاتل رہتا ہے اور جو باہمی تعاون اور مدد رکھتے ہیں۔ اگر ایسے افراد موجود نہ ہوں تو قاتل کا قبیلہ ہی اس کی عاقلہ شمار ہوگا۔

● امام شافعیؒ کے نزدیک دیت کی ذمہ داری صرف قاتل کے خاندان اور قبیلے پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قتل ایک شخص نے کیا ہے تو اس کی دیت اس کے اہلِ قرابت یا اہلِ نصرت پر کیوں ڈالی جاتی ہے؟ اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ احادیث اور آثار میں یہی حکم ثابت ہے۔

دیت کی حکمت

مزید یہ کہ اس کی حکمت یہ ہے کہ قاتل اپنی جماعت، قبیلے اور مددگاروں پر اعتماد رکھتے ہوئے کبھی بے احتیاطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ جب انہی افراد کو دیت کی ادائیگی میں شریک کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے افراد کو سختی سے احتیاط کی تلقین کریں گے، تاکہ کسی سے ایسی لغزش سرزد نہ ہو جس کا بوجھ سب کو اٹھانا پڑے۔

اس طرح اجتماعی ذمہ داری کے احساس سے قتلِ خطا کے واقعات میں نمایاں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

● **مسئلہ:** عاقلہ سے دیت تین سال کے عرصے میں قسطوں کی صورت میں وصول کی جائے گی۔ اگر قاتل کا اپنا قبیلہ اس قابل نہ ہو کہ دیت ادا کر سکے تو نسب کے اعتبار سے قریب ترین قبیلہ بھی اس میں شریک کیا جائے گا۔ خود قاتل بھی عاقلہ کے ایک فرد کے طور پر شامل ہوگا، اور اس سے بھی اس کے حصے کے مطابق رقم وصول کی جائے گی۔

قتلِ عمد (جان بوجھ کر) اور قتلِ شبہ عمد

قتلِ خطا کے علاوہ قتل کی ایک دوسری قسم قتلِ عمد ہے، یعنی جان بوجھ کر قتل کرنا، اور ایک تیسری صورت قتلِ شبہ عمد کہلاتی ہے۔ قتلِ عمد کا مفصل بیان آئندہ آیات میں آئے گا، جبکہ قتلِ شبہ عمد وہ ہے جس میں مارنے کا ارادہ تو ہو، لیکن ایسا ہتھیار استعمال نہ کیا گیا ہو جو عام طور پر جان لینے یا اعضاء جدا کرنے کا سبب بنتا ہے؛ مثلاً کسی کو کوڑوں یا لاٹھی سے مارا جائے اور اسی کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو جائے۔

قتلِ شبہ عمد میں بھی دیت اور کفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں، اور اس کی دیت عاقلہ کے ذمہ ہوتی ہے۔ اگر دیت دینار یا درہم کی صورت میں ادا کی جائے تو وہی مقدار ہوگی جو قتلِ خطا میں مقرر ہے، البتہ اگر اونٹوں کے ذریعے

ادا کی جائے تو اس میں کچھ فرق ہوگا۔

اس صورت میں بھی اونٹوں کی تعداد سو ہی ہوگی، لیکن پانچ اقسام کے بجائے چار اقسام رکھی جائیں گی، یعنی پچیس ''بنت مخاض''، پچیس ''حقہ'' اور پچیس ''جزعہ'' ادا کئے جائیں گے۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، جو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے۔

● **مسئلہ:** کفارۂ قتل میں غلام آزاد کرنے کے لئے لفظ ''رقبہ'' استعمال ہوا ہے، جو غلام اور باندی دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو بھی آزاد کر دینے سے کفارہ ادا ہو جائے گا، بشرطیکہ وہ مومن ہو اور اس کے اعضاء صحیح وسالم ہوں۔

● **مسئلہ:** اگر غلام یا باندی دستیاب نہ ہو تو قاتل پر لازم ہے کہ وہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔ اگر کسی عذر، مثلاً بیماری کی وجہ سے روزوں کا تسلسل ٹوٹ جائے تو دوبارہ نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے۔ البتہ عورت کے لئے اگر درمیان میں حیض آ جائے تو اس سے تسلسل منقطع نہیں ہوگا، اور رمضان المبارک کے روزے کفارہ کے روزوں میں شمار نہیں کیے جائیں گے۔

قتل کی دیگر صورتیں

فقہاء نے قتلِ خطا کے ساتھ دو مزید صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے: ایک ''ما أُجری مجریٰ الخطا'' اور دوسری ''القتل بسبب''۔ پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص نیند کی حالت میں کسی پر پلٹ پڑے اور اس کے نتیجے میں وہ شخص جاں بحق ہو جائے۔ اس حالت میں دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوتے ہیں۔

● دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی زمین میں کنواں کھود دے یا راستے میں ایسا پتھر رکھ دے جو کسی کی موت کا سبب بن جائے۔ اس صورت میں دیت تو عاقلہ پر لازم ہوگی، مگر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

● **مسئلہ:** اگر کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائی جائے اور اس کے نتیجے میں مردہ بچہ ساقط ہو جائے تو اس پر ایک غلام یا پانچ سو درہم ادا کرنا لازم ہوگا، جسے فقہی اصطلاح میں ''غُرّہ'' کہا جاتا ہے۔

اور اگر بچہ زندہ پیدا ہو کر بعد میں مر جائے تو اس کی مکمل دیت واجب ہوگی۔ اگر مردہ بچہ گرنے کے بعد ماں بھی وفات پا جائے تو ماں کی پوری دیت ادا کی جائے گی اور بچے کی غُرّہ بھی دینا ہوگا۔ اور اگر چوٹ کے سبب ماں پہلے فوت ہو جائے، پھر بچہ زندہ پیدا ہو کر مر جائے، تو ماں اور بچے دونوں کی الگ الگ دیتیں لازم ہوں گی۔ نیز حمل کے ساقط ہونے کی وجہ سے جو کچھ واجب ہوگا، وہ بچے کے وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

● **مسئلہ:** جو شخص کسی جانور پر سوار ہو، اس پر لازم ہے کہ احتیاط کے ساتھ چلے۔ اگر اس کی سواری کسی کو روند دے، ٹکر مار دے یا کاٹ لے، تو ان تمام صورتوں میں تاوان (ضمان) لازم آئے گا۔

● **مسئلہ:** اگر دو گھڑ سوار آپس میں ٹکرا جائیں اور دونوں ہلاک ہو جائیں، تو ہر ایک کی عاقلہ پر دوسرے کی دیت واجب ہوگی۔

فائدہ: قصاص اور دیت کا نظام درحقیقت انسانی جانوں کے تحفظ کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کو نافذ نہ کرنے کے باعث دنیا بھر میں قتل وخونریزی عام ہوگئی ہے۔ جو لوگ شریعت کے احکام کو نافذ نہیں کرتے، وہ ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں، جیسا کہ سورۂ مائدہ (آیت ۴۵) میں فرمایا گیا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

یعنی جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

جو لوگ قانونِ الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں یا اسے نافذ نہیں کرتے اور اس کے بجائے دیگر قوانین کو اختیار کر کے انہیں زمانے کے لئے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں (العیاذ باللہ)، ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کامل علم اور حکمت کے ساتھ احکام نازل فرماتا ہے۔ اس کے قوانین کے خلاف کوئی بات کہنا یا لکھنا درحقیقت اس کے علم اور حکمت پر اعتراض کے مترادف ہے۔

آیت نمبر (۹۳) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ''اور جس نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کیا، تو اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہے گا، اللہ کا غضب اور لعنت اس پر ہوگی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار ہے''۔

کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے کا گناہ

تفسیر قتلِ خطا کے احکام بیان کرنے کے بعد اس آیت میں عمداً قتل کرنے والے کی اخروی سزا کو نہایت شدت کے ساتھ واضح فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کردے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا، اس پر اس کی لعنت ہوگی، اور اس کے لئے سخت ترین عذاب تیار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مومن کا قتل نہایت سنگین اور ہولناک گناہ ہے۔

ایک مومن کی اہمیت

● حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: پوری دنیا کا فنا ہوجانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مومن کے قتل کے مقابلے میں بہت معمولی چیز ہے۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۹۵)**

اسی طرح حضرت ابوسعید خدری ؓ اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر آسمانوں اور زمین والوں میں سے سب کے سب کسی ایک مومن کے قتل میں شریک ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۹۸)**

● حضرت ابودرداء ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادے، مگر جو شخص شرک کی حالت میں مرے، یا جس نے کسی مومن کو قتل کیا ہو، اس کی مغفرت نہیں ہوگی۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۲۷۰)

فائدہ: ان سخت وعیدوں کے باوجود افسوس کا مقام ہے کہ دنیا میں قتل وخونریزی عام ہوچکی ہے۔ اسلام کا نام لینے والے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے ہی لسانی، قومی، قبائلی، وطنی اور صوبائی تعصّبات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔

حالانکہ قوم، برادری، ملک اور وطن سب یہیں رہ جائیں گے، اور انسان اپنے ساتھ صرف اپنے اعمال لے کر قبر میں جائے گا۔ جو لوگ قتلِ مومن جیسے عظیم گناہ کے بوجھ کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، انہیں اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہئے۔

لوگوں نے گویا جہنم میں داخل ہونا اور اس کی آگ میں جلنا ایک معمولی بات سمجھ لیا ہے۔ جاہلیت کی پرانی روشیں دوبارہ سر اٹھا رہی ہیں، دشمنوں کے بہکاوے اور اکسانے پر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، اپنی قوت کو کمزور کر رہے ہیں اور دشمنوں کو مضبوط بنا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد انصار کے دونوں بڑے قبائل، اوس اور خزرج، جو صدیوں سے باہم برسرِ پیکار تھے، اسلام کی برکت سے ایک ہوگئے تھے، اور ان کی پرانی دشمنیاں ختم ہو گئی تھیں۔

لیکن ایک موقع پر بعض یہودیوں کے بھڑکانے سے دوبارہ نزاع کی فضا پیدا ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ نے فوراً اس فتنے کو ختم فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آیتِ کریمہ نازل فرما کر مسلمانوں کو اتحاد واتفاق کی تلقین کی۔

اتحادِ امت اور قتلِ مومن کی سنگینی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا، وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا، وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

اس آیت کی تفسیر اور اس کے پس منظر کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دشمنانِ اسلام ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور باہمی نزاع پیدا ہو، کیونکہ ان کا اتحاد انہیں کبھی گوارا نہیں ہوتا۔ افسوس کہ مسلمان خود ہی آپس میں قتل وقتال کر کے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہے ہیں، اور محض اس بنیاد پر ایک دوسرے کے خون کے درپے ہو جاتے ہیں کہ وہ ہماری جماعت یا گروہ سے تعلق نہیں رکھتا۔

تاریخی خطبہ

● رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر، دسویں ذی الحجہ کے تاریخی خطبہ میں نہایت مؤثر انداز میں تنبیہ فرمائی: ''میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۲۱)

● ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے، وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۰۷۰)

ہتھیار سے اشارہ کی ممانعت

یہاں تک کہ اسلام نے صرف قتل ہی نہیں، بلکہ اس کے ابتدائی اسباب کو بھی سختی سے روکا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے، کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے اسے چلا دے اور وہ دوزخ کے گڑھے میں جا گرے''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۰۷۲)

فتنوں کی کثرت

● حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، قیامت سے پہلے ایسا زمانہ آئے گا کہ قاتل کو معلوم نہ ہوگا کہ اس نے کیوں قتل کیا، اور مقتول کو بھی علم نہ ہوگا کہ وہ کیوں قتل ہوا''۔ عرض کیا گیا: ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا: ''فتنوں کی کثرت کی وجہ سے اور اس میں قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے''۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۰۸)

● حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں تو دونوں جہنمی ہیں''۔ عرض کیا گیا کہ قاتل کا جہنمی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر مقتول کیوں؟ فرمایا: ''اس لئے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۰۸۳)

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان اپنے دین کے معاملے میں اس وقت تک کشادگی اور اطمینان کی حالت میں رہتا ہے، جب تک کہ وہ ناحق خون نہ بہائے''۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

مومن کے قاتل کی مغفرت

اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ مومن قاتل کی مغفرت آخر کار ہو سکتی ہے، جیسے دیگر کبیرہ گناہوں کے بارے میں امید رکھی جاتی ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کی مغفرت نہیں ہوگی، اگرچہ ان سے اس کے خلاف قول بھی منقول ہے۔

● حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں اہلِ کوفہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، تو میں اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے حضرت ابنِ عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آیت: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (اور جس نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کیا، تو اس کی سزا جہنم ہے)۔

یہ آیت آخری آیات میں سے ہے جو نازل ہوئی، اور اسے کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۷۶۳)

امام بیضاویؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ البتہ اس قول کی علت سختی اور زجر و توبیخ کو بیان کرنا ہے، کیونکہ خود ان سے اس کے برخلاف بھی روایت منقول ہے۔

جمہور علماء کا موقف

● جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ یہ حکم اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو توبہ نہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ'' اور اسی طرح کی دیگر آیات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔

یا پھر یہاں ''خلود'' سے مراد ہمیشہ رہنا نہیں بلکہ طویل مدت تک عذاب میں مبتلا رہنا ہے، کیونکہ متعدد دلائل

سے ثابت ہے کہ اہلِ ایمان میں سے گناہگار ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ یا یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو قتل کو حلال سمجھ لے۔

● **مسئلہ:** جو شخص جان بوجھ کر قتل کا ارتکاب کرے، وہ نہایت عظیم گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورہ آیت سے واضح ہے، اور اس پر قصاص بھی لازم آتا ہے، جس کی کچھ تفصیل سورۃ البقرہ کے رکوع ۲۲ میں گزر چکی ہے اور مزید وضاحت سورۃ المائدہ کے رکوع ۷ کی تفسیر میں آئے گی۔

قصاص دراصل مقتول کے وارثوں کا حق ہے؛ وہ چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو قصاص کے طور پر قاتل کو قتل کروا دیں۔ اس معاملے میں کسی بادشاہ، صدر، وزیر یا کسی بھی درجے کے حاکم کو معافی دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

● **مسئلہ:** جو شخص اپنے کسی مورث (جس سے وہ میراث پانے والا ہو) کو قتل کر دے، اسے میراث سے محروم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے جلدی میراث حاصل کرنے کی نیت سے یہ جرم کیا، لہٰذا شریعت نے بطورِ سزا اسے اس حق سے مکمل طور پر محروم کر دیا۔

❁❁❁

آیت نمبر ۹۴ سے ۱۰۲ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۹۴ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۹۵ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۹۶ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۹۷ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۹۸ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۹۹ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۰۰ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۱۰۱ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۡ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَاۗىِٕكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَاۗىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۱۰۲

ترجمہ:

(۹۴) اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کرلیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے، اس سے یہ نہ کہو کہ تو

مومن نہیں ہے، تم دنیاوی سامان چاہتے ہو؟ حالانکہ اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔ تم خود بھی پہلے ایسے ہی تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، پس خوب تحقیق کیا کرو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے خوب باخبر ہے۔ (۹۵) وہ مؤمن جو بغیر کسی عذر کے بیٹھے رہتے ہیں، اور وہ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں۔ اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو درجے میں ان پر فضیلت دی ہے جو بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اللہ نے سب سے بھلائی (جنت) کا وعدہ کیا ہے، مگر مجاہدین کو اجر عظیم کے ساتھ فضیلت دی ہے۔ (۹۶) ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے، مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (۹۷) بے شک وہ لوگ جن کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں، فرشتے ان سے پوچھتے ہیں: ''تم کس حال میں تھے؟'' وہ کہیں گے: ''ہم زمین میں کمزور تھے''۔ فرشتے کہیں گے: ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر لیتے؟'' یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (۹۸) مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو کمزور اور بے بس ہوں، نہ کوئی تدبیر کر سکیں، نہ کوئی راستہ پائیں۔ (۹۹) سو امید ہے کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔ (۱۰۰) اور جو کوئی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے، وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور کشادگی پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے موت آ لے، تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو چکا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ (۱۰۱) جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو قصر کر لو، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ (۱۰۲) اور (اے نبی!) جب آپ مسلمانوں کے ساتھ ہوں اور ان کے لیے نماز قائم کریں، تو ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار ساتھ رکھے، پھر جب وہ سجدہ کر لیں تو وہ پیچھے ہٹ جائیں اور دوسرا گروہ، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، آ جائے اور وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھے، اور وہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار ساتھ رکھیں۔ کافر تو یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تا کہ وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں۔ اگر بارش کی وجہ سے تمہیں تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو ہتھیار رکھ دینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں، البتہ چوکنا ضرور رہو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۹۴ سے ۱۰۲ تک

آیت نمبر (۹۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا

لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے، اس سے یہ نہ کہو کہ ''تو مومن نہیں ہے''، تم دنیاوی سامان چاہتے ہو؟ حالانکہ اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔ تم خود بھی پہلے ایسے ہی تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، پس خوب تحقیق کیا کرو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے خوب باخبر ہے''۔

اسلام کا اظہار کرنے والے کے لئے حکم

تفسیر تفسیر الدر المنثور میں صحیح البخاری اور سنن النسائی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ چند مسلمان کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اپنا مال ساتھ لیے ہوئے تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر ''السلام علیکم'' کہا، مگر انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال لے لیا۔ اس واقعے پر قرآن کی ایک آیت نازل ہوئی۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۹۱)**

● اسی طرح جامع الترمذی کے حوالے سے منقول ہے کہ بنو سلیم کا ایک شخص اپنی بکریاں چرا رہا تھا۔ وہ چند صحابہؓ کے پاس سے گزرا اور اس نے سلام کیا۔ بعض نے آپس میں کہا کہ اس نے جان بچانے کے لئے سلام کیا ہے، حقیقتاً مسلمان نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی بکریاں لے لیں۔ پھر وہ بکریاں لے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اس پر بھی وہی آیت نازل ہوئی۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۳۰)**

سلام یا کلمہ پڑھنے والے کے لئے حکم

اس آیتِ مبارکہ میں نہایت بلیغ انداز میں تنبیہ فرمائی گئی کہ جو شخص اسلام کی اطاعت و وابستگی کا اظہار کرے خواہ سلام کے ذریعے، یا کلمۂ اسلام پڑھ کر، یا کسی اور طریقے سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اس کے بارے میں یہ کہنا ہرگز جائز نہیں کہ وہ مومن نہیں۔

چونکہ اس واقعے میں مال بھی لے لیا گیا تھا، اس لئے یہ بھی فرمایا گیا کہ تم اللہ کے پاس موجود غنیمتوں کی طرف رغبت رکھو، وہ تمہیں فراوانی عطا فرمائے گا؛ کسی شخص کو بلا تحقیق کافر قرار دے کر اس کا مال ہتھیانا ہرگز روا نہیں۔

● مزید ارشاد ہوا کہ آج تم ایک سلام کرنے والے کو مومن نہیں مانتے، تو اپنے ماضی پر بھی نظر ڈالو: تم بھی کبھی

ایسے ہی تھے کہ تمہارے ظاہر اسلام ہی کو تمہاری جانوں کے تحفظ کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل فرمایا، تمہیں استقامت عطا کی، تمہاری جماعت بنی، اور تمہاری پہچان اہلِ اسلام کے طور پر مستحکم ہوئی۔ یہاں تک کہ تم اپنی اسی ظاہری دینداری کی بنیاد پر دوسروں کے ایمان پر حکم لگانے لگے۔

● اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص سلام کرے، کلمہ پڑھے یا خود کو مسلمان ظاہر کرے، تو اس کے ظاہر پر اعتماد کرنا لازم ہے۔ اس کے ایمان کے بارے میں شک کرنا یا اس کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کرنا درست نہیں۔ کیونکہ حقیقی ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے، اور دلوں کے حال کو جاننا انسان کے بس میں نہیں؛ بندوں کو ظاہر کے مطابق ہی حکم دیا گیا ہے اور وہ اسی کے مکلف ہیں۔

ظاہر کا اعتبار

مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پھر جب وہ یہ سب کر لیں تو ان کی جانیں اور مال میری طرف سے محفوظ ہو جاتے ہیں، سوائے اس کے کہ اسلام کے کسی حق کے تحت (جیسے قصاص میں) سزا دی جائے، اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے''۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۵)

فائدہ: یہ تعلیمات اس حقیقت کو نہایت واضح کر دیتی ہیں کہ اسلام میں ظاہر کا اعتبار ہے، اور کسی کے دل کے حال کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے۔

جو شخص اپنے اسلام کا اظہار کرے، ہم اسے مسلمان ہی شمار کریں گے۔ اگر وہ دل سے مسلمان نہ بھی ہو، تو اللہ تعالیٰ، جو دلوں کے پوشیدہ احوال سے بھی خوب واقف ہے، اس کے ساتھ اس کے باطنی عقیدے کے مطابق معاملہ فرمائے گا۔ اگر وہ منافق ہوا تو کافروں میں شمار ہو کر سخت ترین عذاب کا مستحق ہوگا، اور اگر دل سے مومن ہوا تو اپنے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا بھرپور اجر پائے گا۔

(۱) اس آیتِ مبارکہ میں فَتَبَيَّنُوْا (تحقیق کرو) کا حکم دو مرتبہ وارد ہوا ہے۔

پہلی جگہ فرمایا: اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

اور دوسری جگہ ارشاد ہوا: كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ○ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔

دوسری آیت میں سفر کا ذکر نہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تحقیق کا یہ حکم عام ہے، چاہے انسان سفر میں ہو یا حضر میں۔ مسلمانوں کو یہ جامع ہدایت دی گئی ہے کہ محض گمان پر عمل نہ کریں، بلکہ ہر معاملے میں تحقیق کو پیشِ نظر رکھیں، خصوصاً جہاں جان و مال کا تعلق ہو، وہاں انتہائی احتیاط اور ذمہ داری لازم ہے۔

سلامتی اور عدل کا دین

اسلام سلامتی اور عدل کا دین ہے، ظلم اور زیادتی کا نہیں۔ کسی کے بارے میں محض بدگمانی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا، یا اس کی ذات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا ہرگز جائز نہیں۔ بدگمانی ہی وہ دروازہ ہے جس سے تہمت، غیبت اور ظلم کے راستے کھلتے ہیں، اور معاشرہ اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

(۲) احتیاط کے نام پر بے احتیاطی بھی درست نہیں۔ اگر کوئی شخص زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے مگر ساتھ ہی کھلے طور پر کفریہ عقائد کا اظہار بھی کرے، مثلاً ختمِ نبوت کا انکار، اسلامی حدود و قصاص کو ظلم قرار دینا، احادیثِ مبارکہ کا انکار، یا قرآنِ کریم میں تحریف کے قائل ہونا تو ایسے شخص کے کفر کو چھپانا یا اس کے بارے میں فیصلہ کرنے میں غیر ضروری تساہل برتنا درحقیقت مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنا ہے۔ جس کا کفر واضح ہو جائے، اس کے کفر کو ظاہر کرنا ضروری ہے۔

کلمہ گو کو کافر کہنا

عوام میں جو یہ بات مشہور ہے کہ ''کسی کلمہ گو کو کافر نہ کہو''، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دعویٰ ایمان کے ساتھ کوئی کفریہ علامت ظاہر نہ ہو۔ بعض لوگ فقہاء کے قول ''لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ'' کا مفہوم سمجھے بغیر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہر کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہے یا تمام اہلِ قبلہ بلا امتیاز مسلمان ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی اور جہالت ہے۔ اس ضمن میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

''اہلِ سنت کے نزدیک اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس میں کفر کی کوئی علامت یا دلیل ظاہر نہ ہو، اور نہ ہی اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر ہو جو کفر کو لازم کرتا ہو، اس وقت تک اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا''۔

(۳) محض کسی گناہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، جب تک کہ وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھے۔ اگر کوئی شخص کسی حرام کو حلال جان کر کرے، یا کسی فرض کے فرض ہونے کا انکار کرے، تو وہ کفر کے دائرے میں آ جائے گا؛ ورنہ صرف گناہ کا ارتکاب کسی مسلمان کو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

ایمان کے تقاضے

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تین باتیں ایمان کے تقاضوں میں سے ہیں:

اوّل- یہ کہ جو شخص کلمۂ اسلام پڑھ لے، اس کی جان و مال کے خلاف ہاتھ اور زبان کو روک لیا جائے۔

دوم- یہ کہ کسی گناہ کی بنا پر اسے کافر نہ کہا جائے، یعنی محض کسی عمل کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج نہ کیا جائے۔

سوم- یہ کہ جہاد کا سلسلہ جاری رہے گا، جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ دجال سے مقابلہ کریں گے اور کسی ظالم کا ظلم یا کسی عادل کا عدل اس حکم کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ تقدیر پر ایمان رکھنا بھی ایمان کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۳۲)

یہ تمام تعلیمات اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہیں کہ اسلام میں ظاہر کا اعتبار ہے، احتیاط و تحقیق لازم ہے، اور تکفیر جیسے حساس معاملے میں نہ افراط درست ہے نہ تفریط۔

آیت نمبر (۹۵) لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

ترجمہ: ”وہ مؤمن جو بغیر کسی عذر کے بیٹھے رہتے ہیں، اور وہ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں۔ اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو درجے میں ان پر فضیلت دی ہے جو بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اللہ نے سب سے بھلائی (جنت) کا وعدہ کیا ہے، مگر مجاہدین کو اجرِ عظیم کے ساتھ فضیلت دی ہے“۔

تفسیر جیسا کہ سابقہ حدیث میں بیان ہوا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ دجال سے قتال کریں گے۔ یہ جہاد جان و مال دونوں کے ساتھ کیا جائے گا، مگر اس کی اصل غرض و غایت صرف اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہوگا۔

مجاہدین اور قاعدین برابر نہیں

اس آیتِ مبارکہ میں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ وہ لوگ جو بلا عذر گھروں میں بیٹھے رہتے

ہیں، ان کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے جو اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ خواہ جہاد کی نوعیت کوئی بھی ہو، بہر حال مجاہد، بیٹھ رہنے والے سے بدرجہا افضل ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جان و مال قربان کرنے والوں کو قاعدین (بیٹھ رہنے والوں) پر عظیم درجات کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔

روح المعانی میں صاحبِ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ ایسے بلند مراتب ہیں جن کی نہ پوری قدر کی جا سکتی ہے اور نہ ان کی حقیقت کو مکمل طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

آغازِ آیت میں صرف عدمِ مساوات کا ذکر تھا، مگر بعد میں مجاہدین کی برتری کو واضح الفاظ میں بیان کر کے یہ حقیقت آشکار کر دی گئی کہ قاعدین محض معمولی محرومی کا شکار نہیں، بلکہ وہ عظیم درجات سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سبب نزول

● حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (کاتبِ وحی) حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا تا کہ آیتِ کریمہ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تحریر کریں۔ وہ قلم و دوات لے کر حاضر ہوئے، اور آپ ﷺ نے لکھوانا شروع فرمایا۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ، جو نابینا تھے، عرض گزار ہوئے کہ میں تو بصارت سے محروم ہوں، اس فضیلت میں میرا کیا حصہ ہوگا؟ اس پر آیت میں غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ کا اضافہ نازل ہوا، اور اس طرح آیت مکمل ہوئی:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ معذور افراد اس حکم کے عموم میں شامل نہیں۔

● حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ یعنی جو لوگ اس عظیم معرکے میں شریک ہوئے اور جو پیچھے رہ گئے، وہ برابر نہیں ہو سکتے۔

(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۹۵)

غزوہ بدر میں نکلنے کا حکم

حقیقت یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں عمومی طور پر سب کو نکلنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اسی لئے بہت سے صحابہؓ شریک نہ ہو سکے۔ اس عدمِ شرکت پر وہ گناہ گار نہ تھے، لیکن جو فضیلت مجاہدین کو حاصل ہوئی، وہ انہی کے حصے میں آئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ بیان اس خاص موقع کے تناظر میں ہے، ورنہ آیت کا مفہوم ہمیشہ کے لئے عام اور دائمی ہے۔

پھر ارشاد فرمایا:

دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور قاعدین دونوں سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہاں ''حُسنٰی'' سے مراد جنت ہے، جیسا کہ روح المعانی میں قتادہؓ سے منقول ہے۔ چونکہ ایمان اور بنیادی فرائض کی ادائیگی میں سب شریک ہیں، اس لئے سب کے لئے جنت کا وعدہ کیا گیا، البتہ اگر جہاد فرضِ عین ہو اور کوئی بلا عذر ترک کرے تو وہ گناہ گار ہوگا۔

اس کے بعد دوبارہ مجاہدین کی فضیلت کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قاعدین پر اجرِ عظیم کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی ہے۔ ان کے لئے بلند درجات، مغفرت اور رحمت کے انعامات ہیں، یہ سب اللہ کی طرف سے خاص عطیات ہیں جو اس کے راستے میں جان و مال قربان کرنے والوں کے لئے مقدر کئے گئے ہیں۔

آیت نمبر (۹۶) دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

ترجمہ: ''ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے، مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں فرمایا کہ اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس لوٹے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً مدینہ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، مگر ہم جس کسی وادی اور گھاٹی سے گزرے، وہ ہمارے ساتھ ہی رہے''۔ یعنی اجر و ثواب میں وہ بھی ہمارے شریک تھے، کیونکہ انہیں کسی عذر نے روک رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف فرمانے والا اور نہایت مہربان ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۸۳۹)

آیت نمبر (۹۷) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ جن کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں، فرشتے ان سے پوچھتے ہیں: ''تم کس حال میں تھے؟'' وہ کہیں گے: ''ہم زمین میں کمزور تھے''۔ فرشتے کہیں گے: ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر لیتے؟'' یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

تفسیر صحیح البخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا، مگر ہجرت نہ کی اور بدستور مشرکین کے ساتھ ہی رہتے رہے۔ وہ ان کی جماعت میں شامل ہو کر ان کی مدد کرتے، یہاں تک کہ جب مشرکین کسی جنگ کے لئے نکلتے تو یہ بھی ان کے ساتھ جاتے، جس سے دشمن کی قوت میں اضافہ ہوتا۔ نتیجتاً کبھی ایسا ہوتا کہ مسلمانوں کے تیر انہی کو لگ جاتے اور وہ مارے جاتے، یا تلواروں کا نشانہ بن کر ہلاک ہو جاتے۔ اسی واقعے کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ہجرت کی وسعت

آیتِ مبارکہ میں اس طرزِ عمل پر سخت ناراضی کا اظہار کیا گیا ہے کہ کوئی شخص، ہجرت کے مواقع میسر ہونے کے باوجود، اپنے دین وایمان کی حفاظت کی فکر نہ کرے اور کفار کے درمیان رہنا اختیار کر لے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرنے والے ہیں۔

جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں: تم کس حال میں تھے؟ دین کے تقاضوں کو کیوں ادا نہ کر سکے؟ وہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم ایسی سرزمین میں تھے جہاں ہم مغلوب اور مجبور تھے، اس لئے دینی فرائض ادا نہ کر سکے۔ اس پر فرشتے جواب دیتے ہیں: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم وہاں سے ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ چلے جاتے جہاں اپنے دین پر عمل کر سکتے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مزید فرماتے ہیں کہ مکہ میں کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو جنگ کے مواقع پر مشرکین کا ساتھ دیتے اور ان کی تعداد میں اضافہ کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی مسلمانوں کے حملوں میں وہ خود بھی زد میں آ جاتے، زخمی ہوتے یا مارے جاتے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۷۰۸۵)**

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت

ابتدائی دور میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرض تھی۔ جو لوگ محض نفاق کی بنا پر اسلام لائے تھے، وہ اپنے اسی نفاق کے سبب عذاب کے مستحق قرار پائے۔ اور جنہوں نے سچے دل سے اسلام تو قبول کیا، مگر استطاعت کے باوجود ہجرت نہ کی، وہ فرض ترک کرنے اور بالواسطہ دشمنانِ دین کی تقویت کا سبب بننے کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہوئے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہجرت کوئی معمولی سفر یا تجارت کی طرح کا آسان معاملہ نہیں تھا کہ انسان سامان کے ساتھ نکلے اور سہولت سے واپس آ جائے۔

بلکہ یہ ایک نہایت کٹھن مرحلہ تھا، جس میں دین وایمان کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنا گھر، زمین، جائیداد

اور وطن سب کچھ چھوڑنا پڑتا تھا، وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ مزید یہ کہ دشمن اکثر راستہ روک لیتے اور نکلنے نہ دیتے۔ اگر موقع مل جاتا تو اہل وعیال کو ساتھ لے جایا جاتا، ورنہ انہیں بھی پیچھے چھوڑنا پڑتا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ابتدائی ہجرتوں کے واقعات انتہائی دردناک اور ایثار سے بھرپور ہیں۔ کچھ حضرات پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے، پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا، اور جو حضرات حبشہ میں تھے وہ بھی بعد میں مدینہ منورہ آ گئے۔ یہ سب قربانیاں اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ دین کی حفاظت کے لئے انہوں نے ہر طرح کی مشقت اور آزمائش کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔

کافروں کی طرف سے مصیبتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اپنے اہل وعیال کو مکہ مکرمہ میں ہی چھوڑ آئے۔ بعد میں وہ سب بھی مدینہ آ گئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب بنت محمدؓ کو اپنے شوہر کے ساتھ مکہ ہی میں قیام کرنا پڑا۔ جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور روانہ ہونے لگیں، تو ایک کافر نے ظلم کرتے ہوئے ان کے پیٹ پر لات ماری، جس کے نتیجے میں ان کا حمل ساقط ہو گیا۔

حضرت ام سلمہ کا واقعہ

● اسی طرح حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ان کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ جب ہجرت کے لئے نکلے تو انہوں نے مجھے اور اپنے بیٹے سلمہ کو اونٹ پر سوار کر لیا۔ ابھی ہم روانہ ہی ہوئے تھے کہ مکہ کے لوگ آ پہنچے۔ میرے گھر والوں نے مجھے روک لیا، پھر ابوسلمہؓ کے خاندان والے آئے اور ہمارے بیٹے کو لے گئے۔ اس طرح ہم تینوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

● حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں صبح سے شام تک روتی رہتی تھی اور اسی حالت میں ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک شخص نے میرے قبیلے والوں سے کہا کہ تم نے اس بے چاری کو اس کے شوہر اور بچے سے جدا کر دیا ہے، اسے جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟

اس پر انہوں نے مجھے مدینہ جانے کی اجازت دے دی، اور ابوسلمہؓ کے خاندان والوں نے بھی میرا بچہ واپس کر دیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں تنہا اس حال میں روانہ ہوئی کہ میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔ جب میں تنعیم کے مقام پر پہنچی تو وہاں عثمان بن طلحہ مل گئے۔

انہوں نے پوچھا: کہاں جا رہی ہو؟ میں نے کہا: مدینہ منورہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں۔ انہوں نے

دریافت کیا: تمہارے ساتھ کوئی ہے؟ میں نے جواب دیا: اللہ اور یہ بچہ ہی میرے ساتھ ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اونٹ کی مہار تھام لی اور مجھے بحفاظت مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ (بحوالہ: اصابہ)

● اسی طرح ہجرت کے موقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بے شمار آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی واقعات میں حضرت صہیب رومیؓ کا واقعہ بھی ہے، جو اس آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

ابتدائی دور میں مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرض تھی، مگر فتح مکہ کے بعد اس کی فرضیت ختم ہوگئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا: ''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ''۔ تاہم دین وایمان کی حفاظت کے لئے ہجرت کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔

ہجرت ترک کرنا گناہ کا سبب

ہر دور میں، مختلف علاقوں اور حالات میں ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جہاں مسلمانوں پر ہجرت لازم ہو جاتی ہے۔ بالخصوص انقلابی یا اضطرابی حالات میں بعض مسلمان کفار کے علاقوں میں پھنس جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ انہیں نکلنے کا موقع میسر ہوتا ہے، وہ گھر، مال وجائداد یا رشتہ داریوں کی محبت میں اپنے وطن سے وابستہ رہتے ہیں، حالانکہ وہاں وہ اپنے دین کے بنیادی شعائر، حتیٰ کہ اذان بھی ادا نہیں کر سکتے۔

ایسے لوگ ہجرت ترک کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوتے ہیں اور اس قرآنی خطاب کے مصداق بن جاتے ہیں: اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا

آج بھی یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بعض خطوں میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جہاں سے مسلمانوں کے لئے ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جو شخص خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے ہجرت کا ارادہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ضرور کوئی راستہ نکال دیتا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں وعدہ فرمایا گیا: يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً بشرطیکہ ہجرت کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو۔

مگر افسوس کہ آج کے دور میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ لوگ دینی ماحول کو چھوڑ کر محض دنیا کمانے کی خاطر یورپ، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا جیسے ممالک کا رخ کرتے ہیں، اور بعض اوقات ایسے مقامات پر سکونت اختیار کر لیتے ہیں جہاں ان کے اپنے دین وایمان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی دینی اعتبار سے کمزور پڑ جاتے ہیں اور ان کی اولادیں دین سے اور بھی زیادہ

دور ہوجاتی ہیں۔ البتہ اگر کسی جگہ دین کی حفاظت ممکن ہو، تو وہاں رہنے کی گنجائش موجود ہے۔

آیت نمبر (۹۸) اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

ترجمہ: ''مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو کمزور اور بے بس ہوں، نہ کوئی تدبیر کرسکیں، نہ کوئی راستہ پائیں''۔

تفسیر یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ مرد، عورتیں اور بچے جو کفار کے درمیان محصور ہوجائیں، وہاں مغلوب ومجبور ہوں، ہجرت کی طاقت نہ رکھتے ہوں، نہ کوئی تدبیر میسر ہو اور نہ ہی یہ معلوم ہو کہ کہاں جائیں اور کیا کریں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ سے مستثنیٰ ہیں۔

● حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ بھی انہی لوگوں میں شامل تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۹۷)

ان کے علاوہ بھی متعدد صحابۂ کرامؓ ایسے تھے جو مکہ مکرمہ میں محصور رہ گئے تھے اور نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی، جس کے باعث وہ سخت آزمائش اور تکلیف میں مبتلا تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لئے قنوتِ نازلہ میں خصوصی دعا فرمایا کرتے تھے۔ روایات میں خصوصیت کے ساتھ سلمہ بن حشام اور ولید بن ولید کے نام مذکور ہیں۔
(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۶)

آیت نمبر (۹۹) فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

ترجمہ: ''سو امید ہے کہ اللہ انہیں معاف کردے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے''۔

تفسیر آخر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ○ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔

روح المعانیمیں اس مقام کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اس آیت سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہجرت کو ترک کرنا نہایت نازک اور خطرناک معاملہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخص بھی جو واقعی مجبوری کی حالت میں ہو اور جس پر ہجرت فرض نہ ہو، اس کا ہجرت سے محروم رہ جانا بھی ایسے درجہ میں ہے کہ اس کے لئے معافی کی امید رکھی گئی

ہے، اور معافی اسی کے لئے ہوتی ہے جس سے کسی درجے میں کوتاہی واقع ہوئی ہو۔

لہٰذا ایسے معذور و مجبور شخص کو بھی چاہئے کہ وہ ہجرت کے مواقع کی تلاش میں رہے، اس کا دل ہمیشہ ہجرت کے خیال سے وابستہ ہو، اور جیسے ہی کوئی مناسب موقع میسر آئے، فوراً اللہ کی راہ میں روانہ ہو جائے۔

آیت نمبر (۱۰۰) وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: ''اور جو کوئی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے، وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور کشادگی پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے موت آ لے، تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو چکا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں ہجرت کرنے والوں کے لئے کشادگی اور عظیم اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے نزول کے سلسلے میں متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔

ہجرت کا شوق

چنانچہ سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے روانہ ہوئے اور اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ مجھے سوار کر دو تاکہ میں مشرکین کی سرزمین چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

مگر افسوس کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس پر وحی کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص اپنے گھر سے صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہجرت کی نیت سے نکلے.....

● اسی طرح سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب وہ مکہ مکرمہ میں تھے تو یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کا ذکر ہے جو نہ ہجرت کی طاقت رکھتے تھے، نہ کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ راستہ جانتے تھے۔ اس موقع پر ابوزمرہ نے کہا کہ میں نہ تو بے بس ہوں اور نہ ہی تدبیر سے محروم؛ چنانچہ انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روانہ ہوئے، لیکن مقام تنعیم پر ہی ان کا وصال ہو گیا۔ ان کے بارے میں بھی یہی آیت نازل ہوئی: وَمَنْ يَّخْرُجْ..... اسی مضمون کو ابن کثیرؒ نے عکرمہ، قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ سے بھی نقل کیا ہے۔

حضرت خالد بن حرامؓ کا واقعہ

● ایک اور واقعہ خالد بن حرام رضی اللہ عنہ کا ہے، جو حبشہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے، مگر راستے میں سانپ کے ڈسنے سے وفات پا گئے۔ ان کے بارے میں بھی یہی آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت کے نزول کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، اور اس میں کوئی تعارض نہیں۔

دین کی حفاظت کے لئے ہجرت

● یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ نزول کے اسباب مخصوص واقعات ہیں، لیکن آیت کا مفہوم عام اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں یہ واضح اعلان ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا کے لئے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی نیت سے ہجرت کے لئے نکلے، تو اس کا محض خلوصِ نیت کے ساتھ نکل کھڑا ہونا ہی اجر و ثواب کے لئے کافی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے اور راستے ہی میں اس کا انتقال ہو جائے، تب بھی وہ اپنے حقیقی مقصد کو پا لیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر مکمل طور پر لکھ دیا جاتا ہے اور اس کی ہجرت قبول کر لی جاتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہایت بخشنے والے اور مہربان ہیں، جو نیک نیت پر بھی پورا ثواب عطا فرماتے ہیں، خواہ عمل ابھی مکمل نہ ہوا ہو۔

عذر کی وجہ

اسی حقیقت کو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت مزید واضح کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا: ''مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ جب تم کوئی وادی طے کرتے ہو تو وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں''۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، انہیں کسی عذر نے روک لیا ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۸۳۹)**

یہ تمام واقعات اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیت کی صداقت کو بڑی قدر حاصل ہے، اور جو شخص اخلاص کے ساتھ اس کے راستے میں قدم اٹھاتا ہے، وہ کسی حال میں محروم نہیں رہتا۔

ہجرت کا مفہوم اور اس کی عظمت

ہجرت کے لفظی معنیٰ عربی زبان میں ''چھوڑ دینا'' کے ہیں، جبکہ شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کی خاطر اپنے وطن کو ترک کر کے کسی دوسرے مقام کو اختیار کرے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مومن کفر کے ماحول سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود اپنے وطن کو چھوڑ دیتا ہے، اور کبھی اہلِ کفر اسے اس

کے وطن سے نکال دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ہجرت ایک دینی تقاضا بن جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جاں نثار صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور دیگر علاقوں سے بھی صحابۂ کرامؓ ہجرت کر کے مدینہ پہنچتے رہے۔

یہ سلسلہ صرف اسی زمانے تک محدود نہ رہا بلکہ مختلف ادوار میں ہجرت کے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ ہجرت بظاہر ایک نہایت کٹھن عمل ہے، کیونکہ اس میں انسان کو اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑتا ہے، عزیز واقارب سے جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے، اور بے شمار مشقتوں سے گزرنا ہوتا ہے؛ اسی لئے اس عظیم قربانی کا اجر بھی نہایت عظیم رکھا گیا ہے۔

ہجرت کا اجر وثواب

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ہجرت کرنے والوں کے لئے عظیم بشارتیں بیان کی گئی ہیں۔ قرآن میں سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ہجرت کرتے ہیں، اپنے گھروں سے نکالے جاتے ہیں، اللہ کی راہ میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں، قتال کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو مٹا دیتا ہے اور انہیں ایسی جنتوں میں داخل فرماتا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ سب اللہ کی طرف سے انعام ہے، اور اللہ ہی کے پاس بہترین بدلہ ہے۔

● اسی طرح سورہ بقرہ (آیت ۲۱۸) میں فرمایا گیا کہ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔

● مزید سورہ توبہ (آیت ۲۰) میں ارشاد ہے کہ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اپنے مال وجان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک بلند درجات کے حامل ہیں اور یہی لوگ حقیقی کامیاب ہیں۔

● اسی طرح سورہ نحل (آیت ۴۱) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے لئے ہجرت کی، ہم انہیں دنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ عطا کریں گے اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، کاش لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیتے۔

فائدہ: ان تمام آیات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہجرت اور جہاد دونوں کو شریعتِ اسلامیہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے فیوض وبرکات نہ صرف آخرت میں ظاہر ہوتے ہیں بلکہ دنیا میں بھی ان کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ جو شخص خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ کے لئے ہجرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے کسی نہ کسی جگہ بہتر ٹھکانہ عطا فرماتا ہے اور اس کے لئے رزق کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ چند ہی برسوں کے اندر مکہ فتح ہوا، خیبر فتح ہوا، اور متعدد علاقے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے۔ اس کے نتیجے میں بڑی بڑی جائیدادیں حاصل ہوئیں اور مسلمانوں کو وسعت واستحکام نصیب ہوا۔

تاریخ اس بات کی روشن گواہ ہے کہ ہجرت اور جہاد انسان کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف آخرت کے بے مثال اجر وثواب کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ دنیاوی اعتبار سے بھی عزت، غلبہ، خوشحالی اور قوت کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح ایک مومن، اللہ کے راستے میں دی گئی قربانی کے بدلے، دونوں جہانوں کی کامیابی سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

اصل ہجرت (گناہوں سے کنارہ کشی)

ہجرت کا حقیقی مقصد محض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا نہیں، بلکہ اس کے پسِ پردہ وہ عظیم غایت کارفرما ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کی آزادی میسر آئے۔ جب کفار یا باطل قوتیں دین پر چلنے میں رکاوٹیں پیدا کریں تو ان رکاوٹوں سے نکل کر ایسے ماحول میں پہنچنا جہاں ایمان کے ساتھ سکون واطمینان سے عبادت اور دینی فرائض انجام دئے جاسکیں، یہی ہجرت کی روح ہے۔

تاہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ صرف وطن چھوڑ دینا ہی ہجرت نہیں، بلکہ ہجرت کے دائرے میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان گناہوں کو ترک کردے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنی زندگی کا شعار بنالے۔

حقیقی مہاجر

● چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ محمد ﷺ نے فرمایا:

''**المهاجر من هجر ما نهى الله عنه**'' یعنی حقیقی مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ (**صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۰**)

اسی طرح ایک اور حدیث میں وارد ہے: ''**المهاجر من هجر الخطايا والذنوب**'' یعنی اصل مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو ترک کردے۔ (**سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۹۳۴**)

افضل ہجرت

مزید یہ کہ حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: ''کون سی ہجرت افضل ہے؟'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**أن تهجر ما كره ربك**'' یعنی تو ان امور کو چھوڑ دے جو تیرے رب کو ناپسند ہیں۔ (**مسند احمد، حدیث نمبر: ۶۸۱۳**)

ہجرت کا مقصد

ان احادیثِ مبارکہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہجرت صرف ظاہری نقل مکانی کا نام نہیں، بلکہ اس کے مقصد کو اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ اصل ہجرت وہ ہے جو انسان کے باطن میں تبدیلی پیدا کرے اور اسے معصیت سے اطاعت کی طرف لے آئے۔

بدقسمتی سے آج کے دور میں یہ منظر عام ہے کہ لوگ وطن تو چھوڑ دیتے ہیں، مگر جس جگہ جا کر آباد ہوتے ہیں وہاں گناہوں میں اور زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نمازوں سے غفلت برتتے ہیں، شرعی پردہ ان پر گراں گزرتا ہے، اللہ کے عطا کردہ مال میں اس کے حقوق ادا نہیں کرتے، زکوٰۃ کا صحیح حساب نہیں دیتے۔

بعض اوقات طلاقِ مغلظہ (تین طلاقیں) دے کر بھی جاہلی قوانین کا سہارا لیتے ہوئے عورتوں کو معلق حالت میں رکھتے ہیں، اور اس طرح گھرانوں میں فساد اور نزاع کو جنم دیتے ہیں۔

اگر کوئی انہیں دین کی طرف متوجہ کرے تو اس سے الجھ پڑتے ہیں، بلکہ بعض اوقات کفر کے کلمات تک زبان پر لے آتے ہیں۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود اپنے آپ کو ''مہاجر'' کہنا ایک سنگین غلط فہمی ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہجرت کے ظاہری پہلو کے ساتھ اس کے حقیقی مقصد، یعنی گناہوں سے اجتناب اور اطاعتِ الٰہی کو بھی اپنایا جائے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ جو شخص واقعی اللہ کے لئے ہجرت کر کے آئے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کی مدد کریں، اس کا سہارا بنیں اور اسے دین پر قائم رہنے میں تعاون فراہم کریں۔

انصارِ مدینہ کی بے مثال صفت

جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کے مسلمانوں نے اُن کا ایسا پرتپاک استقبال کیا جو تاریخِ انسانیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے نہ صرف مہاجرین کو خوش دلی سے قبول کیا بلکہ ہر طرح کی مدد، ہمدردی اور ایثار کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اسی عظیم کردار کی بنا پر انہیں ''انصار'' یعنی مددگار کا لقب عطا کیا گیا۔

● قرآن میں سورہ حشر کے اندر انصار کی اسی بے مثال صفت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پہلے ہی مدینہ کو اپنا مسکن بنایا اور ایمان میں پختگی اختیار کی، وہ ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ مہاجرین کو دیا جاتا ہے اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے، بلکہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود انہیں سخت حاجت ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے محفوظ رہا، وہی درحقیقت کامیاب ہے۔

انصارِ مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جس اخلاص، ایثار اور خدمت کا برتاؤ کیا، اس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دئے، اپنی دولت بانٹ دی، اور اپنے آرام و آسائش کو قربان کر کے مہاجرین کو سہارا دیا۔ مگر آج کے دور میں یہ روح کمزور پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ نہ مہاجرین میں وہ اخلاص باقی رہا اور نہ انصار جیسا ایثار۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دینی تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ کمزور ہو چکا ہے۔ اب بعض اوقات میزبان لوگ مہاجرین کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان کے حقوق میں شریک ہو رہے ہیں، حالانکہ اصل اسلامی تعلیم اس کے بالکل برعکس ہے۔

دنیا سے بے رغبتی

چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا، اور لوگوں کے مال و اسباب سے بے نیاز رہو تو لوگ تم سے محبت کریں گے''۔ **(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۱۰۲)**

اسی حقیقت کو امام شافعی رحمہ اللہ نے نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا کہ اگر تم دنیا سے کنارہ کش رہو گے تو دنیا والوں کے ساتھ تمہارا امن قائم رہے گا، اور اگر تم دنیا کو اپنی طرف کھینچو گے تو اس کے پیچھے لگنے والے تمہارے ساتھ نزاع اور کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اعمال کی بنیاد

صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرتا ہے۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہو، اس کی ہجرت بھی اللہ اور اس کے رسول کے لئے شمار ہوگی؛ اور جس کی ہجرت کسی دنیاوی غرض یا کسی عورت سے نکاح کے لئے ہو، تو اس کی ہجرت بھی اسی مقصد کے لئے سمجھی جائے گی۔

اُم قیس کا واقعہ

اسی سلسلے میں ایک مشہور واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت، جسے ''امِّ قیس'' کہا جاتا تھا، کو نکاح کا پیغام دیا۔ اس عورت نے نکاح کے لئے ہجرت کی شرط رکھی، چنانچہ وہ شخص ہجرت کر کے آیا۔ صحابۂ کرامؓ اسے ''مہاجرِ امِّ قیس'' کہا کرتے تھے۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱)**

خلاصہ: ان تمام واقعات سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ہجرت کی اصل روح اخلاص، ایثار اور

خالص نیت میں پوشیدہ ہے۔ جب تک یہ اوصاف باقی رہیں، ہجرت بھی باعثِ برکت ہے اور معاشرہ بھی امن ومحبت کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

آیت نمبر(۱۰۱) وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝۱۰۱

ترجمہ: ''جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو قصر کرلو، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں''۔

تفسیر اس آیت کی تفسیر میں حضرت علی بن ابی طالبؓ سے منقول ہے، جیسا کہ محمد بن جریر طبریؒ نے روایت کیا، کہ بنو نجار کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم جب زمین میں سفر کرتے ہیں تو نماز کس طرح ادا کریں؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ جب تم سفر میں ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم (قصر) کرلو۔ **(تفسیر ابن عباس)**

سفر میں نماز قصر

چونکہ جہاد اور ہجرت دونوں میں سفر پیش آتا ہے، اس لئے ہجرت کے احکام کے ساتھ ہی سفر میں نمازِ قصر کا حکم بھی بیان فرمادیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا معمول رہا ہے کہ وہ سفر میں قصر نماز ادا کرتے ہیں۔ قصر صرف چار رکعت والی نمازوں میں ہوتا ہے، یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعتیں کم کر کے دو رکعت ادا کی جاتی ہیں، جبکہ مغرب اور فجر کی نماز میں قصر نہیں ہے؛ یہ دونوں نمازیں سفر میں بھی پوری ادا کی جاتی ہیں۔

امام اور مقتدی کی نماز

اگر کوئی مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے بھی امام کی اقتدا میں پوری چار رکعت ادا کرنا لازم ہوگا۔ اور اگر کوئی مقیم، مسافر امام کے پیچھے نماز پڑھے، تو جب امام دو رکعت کے بعد سلام پھیر دے، تو مقیم مقتدی کھڑے ہو کر اپنی باقی رکعتیں مکمل کرے گا۔

ہر سفر میں قصر جائز نہیں، بلکہ اس کے لئے مخصوص مسافت مقرر ہے۔ اگر سفر تین منزل (تقریباً ۴۸ میل) یا اس سے زیادہ ہو، یعنی تقریباً ۸۴ کلومیٹر (حدودِ بستی سے نکلنے کے بعد) تو قصر شروع کیا جائے گا۔ اور جب تک کسی مقام پر پندرہ دن قیام کی نیت نہ ہو، مسافر قصر ہی پڑھتا رہے گا۔ لیکن اگر پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کا ارادہ کر

لے، تو وہاں پوری نماز ادا کرے گا، قصر نہیں کرے گا۔

جدید پیمائش (۴۸ میل اور کلومیٹر کی تحقیق)

جواہر الفقہ (مفتی محمد شفیع عثمانیؒ): رسالہ ''اوزانِ شرعیہ'' اور ''مسافتِ سفر'' میں مفتی شفیع صاحب نے تحقیق کے بعد 48 میل (تقریباً 77.25 کلومیٹر) کو معتمد قرار دیا ہے۔

فتاویٰ عثمانی (جلد 1، ص 535، مفتی تقی عثمانی): ''مسافتِ سفر ہمارے نزدیک 48 میل ہے، جو کلومیٹر کے حساب سے تقریباً سوا ستتر (تقریباً 77.25) کلومیٹر بنتی ہے''۔

احسن الفتاویٰ (مفتی رشید احمد لدھیانویؒ، جلد 4): انہوں نے فرسخ شرعی کے اوزان کی بنیاد پر مسافت کو تقریباً 84 کلومیٹر بیان کیا ہے۔

سفر میں سنتوں کا حکم

سنت نمازوں میں قصر نہیں ہے، تاہم اگر جلدی ہو یا سواری چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو سنتیں ترک کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر اطمینان ہو اور جلدی نہ ہو تو سنتیں پڑھنا بہتر ہے۔ البتہ وتر کو ترک نہ کیا جائے، اور فجر کی سنتوں کا بھی خاص اہتمام کیا جائے۔

● حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں ظہر کی دو رکعت نماز ادا کی، اور اس کے بعد دو رکعتیں (نفل) بھی پڑھیں۔ اسی طرح عصر کی دو رکعتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پڑھیں اور اس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی۔ مغرب کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر اور حضر دونوں میں تین رکعت ہی ادا فرمائی، اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی، اور یہ دن کے وتر ہیں، جن کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۵۵۲)**

● اسی طرح حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں اٹھارہ دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں رہا، اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورج ڈھلنے کے بعد دو رکعتیں ترک کی ہوں۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۵۵۰)**

سنت نماز کا حکم

سفر میں سنت نماز ادا کرنا بھی مشروع ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اہلِ علم کا اس مسئلے میں اختلاف ہوا۔ بعض صحابہؓ اور ائمہؒ جیسے امام احمدؒ اور اسحاقؒ اس بات کے قائل ہیں کہ سفر میں نفل پڑھنا درست ہے۔

جبکہ بعض اہلِ علم نے کہا کہ نہ پہلے نفل پڑھے جائیں نہ بعد میں۔ ان کے نزدیک نفل چھوڑ دینا رخصت کو قبول کرنا ہے، اور جو نفل ادا کرے اسے زیادہ اجر ملے گا۔ جمہور اہلِ علم اسی بات کو پسند کرتے ہیں کہ سفر میں نوافل پڑھنا افضل ہے۔

خوف کی حالت میں قصر

قرآنِ کریم کے ظاہر بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کفار کی طرف سے کسی فتنے یا نقصان کا اندیشہ ہو تو قصر کی اجازت ہے۔ اسی بنا پر حضرت یعلی بن امیہؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قصر صرف خوف کی حالت میں ہے، تو پھر امن کی حالت میں کیا حکم ہے؟ (اس سوال کا جواب آگے کی روایات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔

● حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ مجھے بھی اسی بات پر تعجب ہوا تھا جس پر تمہیں تعجب ہو رہا ہے، یعنی اب جبکہ امن وامان ہے تو کیا پوری نماز نہ پڑھنی چاہئے؟ چنانچہ میں نے یہی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ایک صدقہ ہے، لہٰذا اللہ کے اس صدقے کو قبول کرو''۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۸۶)

دو اہم باتیں

اوپر کی حدیث سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) اول یہ کہ ابتداء قصر کی اجازت کفار کے فتنے اور خوف کی شرط کے ساتھ تھی، مگر بعد میں یہ شرط باقی نہ رہی، اور نمازِ قصر ایک مستقل حکم بن گئی۔ چنانچہ اب جب کوئی شخص مسافتِ قصر کے برابر سفر کرے، تو خواہ امن وامان ہو اور کسی قسم کا خوف نہ ہو، تب بھی چار رکعت والی نماز کو قصر ہی ادا کیا جائے گا۔

● حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کا سفر فرمایا، اس حال میں کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۸۷)**

اسی طرح حضرت حارثہ بن وہبؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کی، حالانکہ اس وقت لوگ کامل امن وامان میں تھے۔ **(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۹۶)**

سفر میں قصر ہی لازم ہے

(۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فَاقْبَلُوا صَدَقَتَهٗ — اللہ کے اس عطیہ کو قبول کرو۔ اسی بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ مسافر کے لئے قصر کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی مسافر پوری چار رکعت نماز ادا کرے تو وہ درست طریقہ اختیار نہیں کرتا، کیونکہ اس پر دو رکعت

ہی فرض ہیں، اور اسی پر اس کا قعدۂ اخیرہ ہوگا۔ اگر وہ دوسری رکعت پر بیٹھے بغیر کھڑا ہو جائے اور چار رکعتیں مکمل کر لے تو اسے نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی، کیونکہ اس سے فرض ترک ہو گیا، اور فرض کے ترک کی تلافی سجدۂ سہو سے بھی نہیں ہو سکتی۔

● حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں رہا، اور آپ ﷺ نے کبھی دو رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ پھر میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ رہا، انہوں نے بھی دو رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۸۹)

چار رکعت پر تعجب

● اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔ مزید یہ کہ مسند احمد میں منقول ہے کہ عبدالرحمن بن ابی زباب نے بیان کیا کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی تو لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۴۴۳)**

● جب حضرت عثمانؓ نے لوگوں کی ناگواری دیکھی تو فرمایا کہ میں نے مکہ کو اپنا وطن بنا لیا ہے، اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو کسی جگہ کو اپنا وطن بنا لے، وہ وہاں مقیم کی طرح پوری نماز ادا کرے۔

حضرت عثمانؓ کی یہ تاویل اور وطن بنانے کی نیت سے پوری نماز پڑھنا، اور حاضرین کا اس پر تعجب کرنا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسافر کے لئے قصر ہی اصل حکم ہے۔

اگر سفر میں پوری نماز پڑھنا جائز یا افضل ہوتا تو صحابہؓ و تابعینؒ کو حضرت عثمانؓ کے اس عمل پر تعجب نہ ہوتا، اور نہ ہی حضرت عثمانؓ کو اس کی تاویل پیش کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

آیت نمبر (۱۰۲) وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: ''اور (اے نبی!) جب آپ مسلمانوں کے ساتھ ہوں اور ان کے لیے نماز قائم کریں، تو

ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار ساتھ رکھے، پھر جب وہ سجدہ کرلیں تو وہ پیچھے ہٹ جائیں اور دوسرا گروہ، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، آجائے اور وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھے، اور وہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار ساتھ رکھیں۔ کافر تو یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ تم پر اچانک حملہ کردیں۔ اگر بارش کی وجہ سے تمہیں تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو ہتھیار رکھ دینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں، البتہ چوکنا ضرور رہو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

تفسیر امام احمد بن حنبلؒ اور امام حاکم نیشاپوریؒ نے صحیح سند کے ساتھ، اور امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب دلائل میں حضرت ابوعیاش زرقیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عسفان کے مقام پر تھے۔ سامنے سے مشرکین آگئے، جن کی قیادت خالد بن ولید کر رہے تھے (اس وقت وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے)، اور وہ ہمارے اور قبلہ کے درمیان حائل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی۔

مشرکین نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ یہ ایسا موقع تھا کہ اگر ہم حملہ کردیتے تو سب کو ختم کرسکتے تھے۔ پھر انہوں نے آپس میں کہا کہ ابھی ان کی ایک اور نماز آنے والی ہے، جو انہیں اپنی جانوں اور اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے، لہٰذا جب یہ اس نماز میں مشغول ہوں گے تو ہم ان پر حملہ کریں گے۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیات لے کر نازل ہوئے: وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ... (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۲۳۶)

● اسی مضمون کی روایات امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے، اور محمد بن جریر طبریؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی ہیں۔ نیز صحیح البخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آیت اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے بارے میں نازل ہوئی، جب وہ زخمی تھے۔ (تفسیر ابن عباس)

صلوٰۃُ الخوف (نمازِ خوف)

اس آیتِ کریمہ میں صلوٰۃ الخوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ لباب النقول میں بھی حضرت ابوعیاش زرقیؓ سے یہی واقعہ منقول ہے کہ دشمن مسلمانوں اور قبلہ کے درمیان تھا، اور وہ مسلمانوں کی نماز کے وقت حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ الخوف کا حکم نازل فرمایا۔

نمازِ خوف کا طریقہ

● نمازِ خوف کے متعدد طریقے احادیث میں منقول ہیں، جنہیں امام ابوداؤدؒ نے ذکر کیا ہے۔ آیتِ مذکورہ

میں جو طریقہ بیان ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازیوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک جماعت دشمن کے مقابل کھڑی ہو کر نگرانی کرے، جبکہ دوسری جماعت امام کے پیچھے نماز کے لئے کھڑی ہو جائے۔

پہلی جماعت امام کے ساتھ ایک رکعت (دو سجدوں سمیت) ادا کر لے، پھر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر دشمن کی طرف چلی جائے، اور دوسری جماعت، جس نے ابھی نماز شروع نہیں کی، آ کر امام کے پیچھے کھڑی ہو جائے۔ امام ان کے آنے تک انتظار کرے، پھر وہ ان کے ساتھ ایک رکعت ادا کرے، اور اس کے بعد سلام پھیر دے۔ اس طرح امام کی دو رکعتیں مکمل ہو جائیں گی، جبکہ دونوں جماعتوں کی ایک ایک رکعت ادا ہو چکی ہوگی۔

اگر امام مقیم ہو

یہ طریقہ اس صورت میں ہے جب امام اور مقتدی دونوں مسافر ہوں۔ اگر امام مقیم ہو تو ہر جماعت کو دو دو رکعتیں پڑھائے، اور باقی رکعتیں وہ خود مکمل کریں۔ اور اگر نماز مغرب میں ایسا موقع پیش آئے تو پہلی جماعت کو دو رکعتیں اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائی جائے۔ نماز کے دوران آنا جانا چونکہ حالتِ اضطرار اور شرعی اجازت کے تحت ہوتا ہے، اس لئے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

صلوٰۃ الخوف کے اس حکم سے نہ صرف نماز کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ نماز باجماعت کی عظمت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ جب دشمن سر پر موجود ہو، اس نازک ترین حالت میں بھی نہ نماز ترک کرنے کی اجازت دی گئی، اور نہ ہی جماعت کے بغیر نماز ادا کرنے کی۔

حملے کی صورت میں احکام

اگر دشمن کا حملہ اس شدت سے ہو جائے کہ اس سے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے، تو ایسی حالت میں ہر شخص الگ الگ نماز ادا کر لے۔ اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو نماز کو مؤخر کر کے بعد میں ادا کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

جب خطرہ ٹل جائے تو چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کر لی جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر عمل فرمایا۔ (سورۃ البقرہ:۲۳۹)

نماز کے وقت حملہ کا اندیشہ

● حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا۔ مشرکین نے کہا کہ مسلمانوں کی ایک نماز ایسی ہے جو انہیں اپنی جانوں اور اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے، اور وہ عصر کی نماز ہے؛ لہٰذا اس

وقت ان پر یکبارگی حملہ کر دینا چاہئے۔ اسی اثناء میں حضرت جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک گروہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کرے اور دوسرا گروہ ہتھیاروں اور ڈھالوں کے ساتھ دشمن کے مقابل کھڑا رہے۔ پھر دوسرا گروہ آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کرے اور پہلا گروہ اپنی جگہ سنبھالے رہے۔ اس طرح ہر گروہ کی ایک ایک رکعت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو رکعتیں مکمل ہو جائیں۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۳۵)

مسئلہ: اگر دو امام مقرر کر لئے جائیں اور ہر جماعت الگ الگ امام کے پیچھے نماز ادا کرے تو یہ زیادہ افضل ہے۔ البتہ اگر سب ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں تو وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو اوپر بیان ہوا۔

مسئلہ: اگر جنگ کی حالت میں اس قدر مشغول ہو جائیں کہ کثرتِ عمل لازم آ جائے، تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس کے متعلق تفصیلات سورۃ البقرہ (رکوع ۳۱) میں گزر چکی ہیں، جہاں آیت فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کی تفسیر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

● اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ یعنی جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو اپنے ہتھیار ساتھ رکھیں، تاکہ اگر اچانک مقابلے کی ضرورت پیش آ جائے تو فوراً دفاع کیا جا سکے۔ اگرچہ قتال کرنے سے نماز ٹوٹ جائے گی، لیکن دشمن کے مقابلے کے لیے نماز توڑ دینا گناہ نہیں ہوگا۔

پھر فرمایا: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ یعنی اگر بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیماری لاحق ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو، لیکن اپنی حفاظت کا سامان ضرور ساتھ رکھو۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بارش یا بیماری کے باعث ہتھیار اٹھانا دشوار ہو تو انہیں اتار کر رکھا جا سکتا ہے، مگر دشمن سے حفاظت کا اہتمام بہر حال ضروری ہے۔ اگر ہتھیار باندھ نہ سکیں تو انہیں قریب رکھیں یا کسی کو نگرانی پر مقرر کر دیں، اور اس احتیاط کے ساتھ نماز ادا کریں۔

❁❁❁

آیت نمبر ۱۰۳ سے ۱۱۵ تک

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِــيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰي نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ:

(۱۰۳) پھر جب تم نماز ادا کر چکو، تو اللہ کو یاد کرو، خواہ کھڑے ہو، بیٹھے ہو یا لیٹے ہو۔ پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کو قائم رکھو۔ یقیناً نماز مؤمنوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔ (۱۰۴) اور دشمن قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ دکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو وہ بھی اسی طرح تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے تم، لیکن تم اللہ سے ایسی امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔ (۱۰۵) اے نبی! ہم نے آپ کی طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب

نازل کی ہے تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔ (۱۰۶) اور اللہ سے معافی مانگیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ (۱۰۷) اور ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو خود اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ خیانت کرنے والے اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۰۸) وہ (اپنی حرکات) لوگوں سے تو چھپا سکتے ہیں، لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے، کیونکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو مشورے کرتے ہیں ایسے کاموں کے بارے میں جو اللہ کو پسند نہیں۔ اور اللہ ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (۱۰۹) دیکھو! یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑ رہے تھے، لیکن قیامت کے دن ان کی طرف سے کون اللہ سے جھگڑا کرے گا؟ یا ان کا وکیل (مددگار) کون ہوگا؟ (۱۱۰) اور جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے، تو وہ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا پائے گا۔ (۱۱۱) جو شخص گناہ کماتا ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی جان پر بوجھ ڈالتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ (۱۱۲) اور جو شخص کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرے، پھر اسے کسی بے گناہ پر ڈال دے، تو یقیناً وہ بہت بڑا بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ (۱۱۳) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ حالانکہ وہ صرف خود کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ کا فضل آپ پر بے حد عظیم ہے۔ (۱۱۴) ان کی زیادہ تر چھپی باتوں میں کوئی بھلائی نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی صدقہ دینے، بھلائی کی تلقین کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی بات کرے۔ اور جو شخص اللہ کی رضا کے لیے ایسا کرے گا، ہم اسے بڑا اجر عطا کریں گے۔ (۱۱۵) اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہو چکی ہو، اور مؤمنوں کے راستے کے خلاف چلے، تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھرتا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے، جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۰۳ سے ۱۱۵ تک

آیت نمبر (۱۰۳) فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: ”پھر جب تم نماز ادا کر چکو، تو اللہ کو یاد کرو، خواہ کھڑے ہو، بیٹھے ہو یا لیٹے ہو۔ پھر جب

تمہیں اطمینان حاصل ہوجائے تو نماز کو قائم رکھو۔ یقیناً نماز مؤمنوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے''۔

تفسیر پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ یعنی جب تم نماز سے فارغ ہوجاؤ تو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو، کھڑے ہوکر، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے بھی۔

نماز ایک ذکر ہے

نماز بذاتِ خود ذکر ہی ہے، جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں فرمایا گیا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ یعنی نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ نماز ابتدا سے انتہا تک ذکر ہی کا مجموعہ ہے، دل کا ذکر بھی اور زبان کا ذکر بھی، اور ہر عبادت کی روح ذکرِ الٰہی ہی ہے۔ اسی لئے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہنا چاہئے: بیٹھتے ہوئے، لیٹتے ہوئے، چلتے پھرتے۔ یہاں تک کہ جب دنیا میں کوئی بھی ''اللہ، اللہ'' کہنے والا باقی نہ رہے گا تو قیامت قائم ہوجائے گی۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۸)

ذکر کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر چند لوگ کسی جگہ جمع ہوں اور اپنی مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کریں اور نہ اپنے نبی پر درود بھیجیں، تو ان کی وہ مجلس ان کے لئے باعثِ نقصان ہوگی۔ پھر اللہ چاہے تو انہیں عذاب دے اور چاہے تو معاف فرمادے۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۳۸۰)**

فائدہ: اسی طرح جو شخص کسی جگہ لیٹے اور اس حالت میں اللہ کو یاد نہ کرے، تو اس کا یہ لیٹنا اس کے لئے نقصان کا سبب ہوگا، اور جو شخص کسی راستے پر چلے اور اس چلنے میں اللہ کا ذکر نہ کرے، تو اس کا یہ چلنا بھی اس کے لئے باعثِ خسارہ ہوگا۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور وہاں اللہ کا ذکر نہ کریں اور نہ اپنے نبی پر درود بھیجیں، تو قیامت کے دن وہ مجلس ان کے لئے حسرت وندامت کا باعث ہوگی، خواہ وہ ثواب کے سبب جنت میں داخل ہی کیوں نہ ہوجائیں۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۷۰۹۳)**

جہاد جیسی عظیم عبادت بھی ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ہر عبادت کو ذکر سے معمور رکھنا چاہئے، کیونکہ ذکر سے عبادت میں نورانیت اور روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے ذکر سے غفلت برتی جائے؛ ذکر تو ہر مومن کے دل کا دائمی ساتھی ہے۔

نماز، روزہ اور ذکر کا اجر

حضرت سہل بن معاذؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جائے، یا نماز، روزہ اور ذکر کیا جائے، اس کا ثواب سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔

(سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۴۹۸)

پھر ارشاد فرمایا: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز کو (پورے اہتمام کے ساتھ) قائم کرو۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق اس آیت وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ سے بھی ہے، یعنی جب سفر ختم ہو جائے اور تم مقیم ہو جاؤ تو مکمل نماز ادا کرو۔ اور یہ صلاۃ الخوف سے بھی متعلق ہو سکتا ہے، یعنی جب خوف کی حالت ختم ہو جائے تو نماز کو اس کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کیا جائے۔

آخر میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا یعنی نماز مومنوں پر مقررہ اوقات کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ لہٰذا سفر ہو یا حضر، امن ہو یا خوف، صحت ہو یا مرض، ہر حال میں نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے۔ نہ کسی نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا جائز ہے اور نہ ہی بلا عذر اسے مؤخر کرنا۔ جان بوجھ کر نماز کو قضا کرنا سخت گناہ ہے۔

البتہ اگر کسی سے نیند یا بھول کی وجہ سے نماز رہ جائے، یا ایسی مجبوری پیش آ جائے کہ ہر طرف دشمن کا خطرہ ہو اور نماز ادا کرنے کا موقع نہ ملے، تو بعد میں اس کی قضا ادا کی جائے۔

دو نمازیں ایک ساتھ (امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک)

سفر میں ''جمع صوری'' کی اجازت ہے، یعنی ظہر کو اس کے آخری وقت میں اور عصر کو اس کے ابتدائی وقت میں پڑھ لیا جائے، اور اسی طرح مغرب کو آخری وقت میں اور عشاء کو ابتدائی وقت میں ادا کیا جائے۔ بظاہر یہ جمع معلوم ہوگا، مگر درحقیقت ہر نماز اپنے وقت میں ادا ہوگی۔ چونکہ قرآنِ کریم نے نماز کے لئے كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا فرمایا ہے، اس لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سفر میں حقیقی جمع (یعنی دو نمازوں کو ایک ہی وقت میں ادا کرنا) جائز نہیں۔

نماز کی اہمیت

● حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس وقت کیا کرو گے جب لوگ نماز کو تاخیر سے ادا کریں گے؟'' میں نے عرض کیا: آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: ''تم اپنی نماز وقت پر ادا کر لیا کرو، پھر اپنے کام میں لگ جاؤ، اور اگر بعد میں جماعت ہو اور تم مسجد میں موجود ہو تو دوبارہ نماز پڑھ لینا''۔

(صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۶۴۸)

● حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے، اس کا کفارہ یہی ہے کہ جیسے ہی یاد آئے فوراً ادا کر لے''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۷۸)**

مسئلہ: ''اگر کوئی شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے تو فوراً اس کی قضا ادا کرنی چاہئے اور سچے دل سے توبہ و استغفار کرنا لازم ہے''۔

آیت نمبر (۱۰۴) وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: ''اور دشمن قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ دکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو وہ بھی اسی طرح تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے تم، لیکن تم اللہ سے ایسی امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے''۔

تفسیر اس آیتِ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ دشمن کے تعاقب میں ہرگز سستی، کمزوری یا ہمت ہارنے کا مظاہرہ نہ کریں۔ چونکہ دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے قتال کے مواقع پیش آتے ہیں جن میں قتل، زخم اور دیگر مشقتیں لازماً پیش آتی ہیں، اس لئے ان طبعی تکالیف کے اثر کو کم کرنے اور دلوں کو مضبوط رکھنے کے لئے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

● حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! میں ایک انسان ہوں۔ ممکن ہے کوئی شخص اپنی دلیل پیش کرنے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہو اور میں اس کی بات سے متأثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو، اور اس طرح میں کسی دوسرے مسلمان کا حق اسے دے بیٹھوں۔ تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ وہ دراصل آگ کا ایک ٹکڑا لے رہا ہے؛ اب اس کی مرضی ہے کہ اسے لے یا چھوڑ دے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۵۸)**

دشمن بھی تکلیف اٹھاتا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جو صرف تمہارے ساتھ خاص ہو؛ تمہارے دشمن بھی اسی طرح دکھ اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ بھی زخم کھاتے ہیں، قتل ہوتے ہیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ اب تم خود غور کرو کہ انہیں ان مصائب کے بدلے کیا حاصل ہوتا ہے، اور تمہیں کیا ملتا ہے؟

تم تو اللہ تعالیٰ سے آخرت کے اجر، بلند درجات اور جنت کی دائمی نعمتوں کی امید رکھتے ہو۔ ان عظیم انعامات کے مقابلے میں دنیا کی یہ عارضی تکلیفیں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ جبکہ کفار میں سے بہت سے لوگ تو سرے سے آخرت اور جزا و سزا کے قائل ہی نہیں، اور اگر کچھ قائل بھی ہیں تو وہ بھی ایسی مضبوط امید اور یقین نہیں رکھتے۔

پس جب اہلِ باطل، جن کے پاس نہ کوئی حقیقی مقصد ہے اور نہ آخرت کی امید، پھر بھی وہ جنگ میں اپنی جان و مال کھپا دیتے ہیں، تو اہلِ ایمان کو تو اس سے کہیں بڑھ کر ہمت، جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

جنگ میں تکلیف تو لازمی ہے، مگر مومن کے سامنے جنت کی امید ہے، جبکہ کافر کے پاس اس کے باطل نظریے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے اہلِ ایمان کے لیے کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں، انہیں ہمیشہ حوصلہ، دلیری اور عزم کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے؛ کیونکہ اگر زندہ رہے تو غازی، اور اگر شہید ہو گئے تو کامیاب۔

آخر میں فرمایا: وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے، وہ تمہاری حالتوں، تمہاری مصلحتوں اور تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔ اور وہ حکمت والا ہے، اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں۔ لہٰذا اگر تم اس کے احکام پر عمل کرو گے تو کامیابی ہی تمہارا مقدر ہوگی۔ **(روح المعانی، جلد ۵، صفحہ ۱۳۸)**

آیت نمبر (۱۰۵-۱۰۹) اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: ''اے نبی! ہم نے آپ کی طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔ اور اللہ سے معافی مانگیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو خود اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ خیانت کرنے والے اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ وہ (اپنی حرکات) لوگوں سے تو چھپا سکتے ہیں، لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے، کیونکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو مشورے کرتے ہیں ایسے کاموں کے بارے میں جو اللہ کو پسند نہیں۔ اور اللہ ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دیکھو! یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑ رہے تھے، لیکن قیامت کے دن ان کی طرف سے کون اللہ

سے جھگڑا کرے گا؟ یا ان کا وکیل (مددگار) کون ہوگا؟''

تفسیر آیات ۱۰۵ سے ۱۰۹ تک کی آیات ایک خاص واقعے کے پس منظر میں نازل ہوئی ہیں۔ مفسرین، جیسے مجاہد بن جبر، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، قتادہ بن دعامہ اور سدی نے بیان کیا ہے کہ یہ آیات بنواُبیرق کے ایک چور کے بارے میں نازل ہوئیں، جس کا نام ''طعما بن اُبیرق'' تھا۔ اس نے ایک شخص کی زرہ چوری کر لی۔ جب اس پر شک ہونے لگا تو اس نے چپکے سے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر میں رکھ دی۔ پھر وہ اور اس کے بھائی اس یہودی پر الزام لگانے لگے اور سب نے قسمیں کھا کر کہا کہ طعما بے قصور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بظاہر ان کی بات کو سچ سمجھا اور اس یہودی پر حد جاری کرنے کا ارادہ فرمایا، مگر اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں اور حقیقت واضح ہوگئی۔ طعما کا جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا۔ اس کے بعد اس نے ارتداد اختیار کیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا، جہاں چوری کے دوران اس پر ایک دیوار گر پڑی اور وہ کفر ہی کی حالت میں ہلاک ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اصل حقیقت سے آگاہ فرما دیا۔

خیانت کرنے والوں کی طرف سے مدافعت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا

اس بات کی دلیل ہے کہ جب تک کسی شخص کے سچا اور حق پر ہونے کا یقین نہ ہو جائے، اس کی حمایت نہیں کرنی چاہئے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک لطیف تنبیہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیانت کرنے والوں کی طرف سے مدافعت نہ فرمائیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا گیا کہ آپ نے بظاہر ایک بے گناہ (یہودی) کے خلاف اقدام کا ارادہ فرمایا تھا۔

تحقیق کے بغیر کسی کی حمایت

ان آیات میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو تحقیق کے بغیر دوسروں کی حمایت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا

یہاں ''خَوَّاناً'' مبالغے کا صیغہ ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی علم تھا کہ طعما نہایت بڑا خائن اور گنہگار ہے۔ بعد کے حالات نے اس حقیقت کی تصدیق کر دی کہ وہ مرتد ہو کر مکہ سے فرار ہوا اور کفر کی حالت میں مر گیا۔

پھر منافقین کو متنبہ کیا گیا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اپنے برے اعمال چھپاتے ہیں، مگر اللہ سے

نہیں چھپ سکتے، جو ہر راز اور ہر پوشیدہ بات کو جاننے والا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ جب یہ لوگ خفیہ سازشیں کرتے ہیں، اس وقت بھی اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی ان کے تمام افعال سے باخبر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت بلیغ سوال کے ذریعے حقیقت واضح فرمائی کہ اے لوگو! تم دنیا میں تو ان خائنوں کا ساتھ دے رہے ہو، مگر قیامت کے دن اللہ کے مقابلے میں کون ان کی طرف سے دفاع کرے گا اور انہیں عذاب سے بچا سکے گا؟

آیت نمبر (۱۱۰-۱۱۳) وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــًٔـا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: ''اور جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے، تو وہ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا پائے گا۔ جو شخص گناہ کماتا ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی جان پر بوجھ ڈالتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ اور جو شخص کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرے، پھر اسے کسی بے گناہ پر ڈال دے، تو یقیناً وہ بہت بڑا بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ حالانکہ وہ صرف خود کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ کا فضل آپ پر بے حد عظیم ہے''۔

تفسیر آیات ۱۱۰ سے ۱۱۳ تک بھی اسی واقعۂ ''**طُعْمَه بن اُبَيْرِق**'' سے متعلق ہیں۔ ان میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے چوری کی، اور جنہوں نے ابنِ اُبیرک کا ساتھ دے کر اس کی مدافعت کی، اگر وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کریں تو اللہ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ یہ حکم صرف انہی تک محدود نہیں بلکہ عام ہے، ہر وہ شخص جو گناہ کرے، اگر رجوع کرے تو مغفرت کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہے۔

اپنے گناہ کا بوجھ

یہ بھی فرمایا گیا کہ ہر انسان اپنے گناہ کا بوجھ خود اٹھائے گا؛ کسی کے جرم کا مواخذہ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا۔ البتہ جو شخص خود گناہ کر کے اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپ دے، جیسا کہ بنواُبیرک نے ایک بے قصور یہودی پر الزام لگا دیا تو وہ بہتان باندھنے اور عظیم گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی تعلیم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ سے استغفار اور اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۳۰۷)**

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے خاص احسانات کو یاد دلایا کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے وحی کے ذریعے حقیقت کو واضح نہ فرما دیتا کہ اصل چور یہودی نہیں بلکہ ابنِ اُبیرک ہے تو بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بے گناہ کو سزا دینے کا ارادہ فرما لیتے، اور اس جھوٹ کا وبال انہی لوگوں پر ہوتا۔

تاہم اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوتا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقیقتِ حال کا علم نہ تھا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ عظیم احسان بھی فرمایا کہ آپ کو قرآنِ کریم اور سنت جیسی بے مثال نعمتیں عطا کیں، اور دین و شریعت کے وہ تمام احکام و معارف سکھائے جن سے آپ پہلے واقف نہ تھے۔ یہی علمِ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی اور امت کی ہدایت کا سرچشمہ بنا۔

آیت نمبر (۱۱۴) لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: ''ان کی زیادہ تر چھپی باتوں میں کوئی بھلائی نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی صدقہ دینے، بھلائی کی تلقین کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی بات کرے۔ اور جو شخص اللہ کی رضا کے لیے ایسا کرے گا، ہم اسے بڑا اجر عطا کریں گے''۔

تفسیر جب قرآنِ کریم کا یہ حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہتھیار لے کر تشریف لائے اور وہ حضرت رفاعہ بن زیدؓ کے حوالے فرما دئے۔ اس واقعے کے بعد بشیر، جو منافق تھا، مشرکین سے جا ملا اور سلافہ بنت سعد کے یہاں جا کر ٹھہرا۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ

الْهُدٰى... یہاں تک کہ بَعِيْدًا تک آیات نازل ہوئیں۔

بشر بن حارث کی چوری کا واقعہ

امام حاکم نیشاپوریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ نیز محمد بن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں اپنی سند کے ساتھ محمود بن لبید سے روایت نقل کی ہے کہ بشیر بن حارث نے حضرت قتادہ بن نعمانؓ کے چچا، یعنی رفاعہ بن زیدؓ کے گھر میں نقب لگا کر دو زرہیں چرالیں۔

حضرت قتادہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بشیر کو بلایا اور تحقیق فرمائی، مگر اس نے اسی خاندان کے ایک معزز شخص لبید بن سہلؓ پر تہمت لگا دی۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی آیات نازل ہوئیں، جن میں بشیر کی تکذیب اور لبیدؓ کی براءت ظاہر کر دی گئی۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۳۶)**

جب یہ آیات بشیر کے جھوٹ کو بے نقاب کرنے کے لئے نازل ہوئیں تو وہ مرتد ہو کر مکہ مکرمہ بھاگ گیا اور سلافہ بنت سعد کے یہاں جا کر ٹھہر گیا۔ وہاں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اشعار کہنا شروع کئے۔ اس پر اس کے بارے میں وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ والی آیت نازل ہوئی، اور حسان بن ثابتؓ نے اس کے جواب میں اشعار کہے، یہاں تک کہ وہ وہاں سے بھی نکل گیا۔ **(تفسیر ابن عباس)**

مجرم کی حمایت

● یہ آیتِ کریمہ بھی دراصل بنی اُبیرک ہی کے واقعے سے متعلق ہے، جہاں اصل مجرم کو بچانے کے لئے اس کے حمایتی خفیہ سرگوشیوں میں مشغول تھے۔ تاہم مفسرین کے بیان کے مطابق اس آیت کا حکم عام ہے، یعنی عموماً لوگوں کی خفیہ باتوں اور سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔

خیر صرف اسی سرگوشی میں ہے جس کا مقصد نیکی ہو جیسے چھپا کر صدقہ کرنا، لوگوں کے درمیان صلح کرانا، یا کسی اور بھلائی کے کام کی تدبیر کرنا۔ آیت کے الفاظ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اس بات کی دلیل ہیں کہ ان اعمال میں اجر و ثواب اسی وقت حاصل ہوگا جب ان کا مقصد خالصتاً اللہ کی رضا ہو۔

نیکی کا حکم

● حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کی اکثر باتیں اس کے لئے بوجھ بن جاتی ہیں، فائدہ نہیں دیتیں، سوائے اس کے کہ وہ اللہ کا ذکر کرے، نیکی کا حکم دے یا برائی سے روکے''۔

(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۱۲)

صلح کروانے کی اہمیت

● اسی طرح حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے کسی کی طرف اچھی بات منسوب کردے یا خیر کی کوئی بات کہہ دے، وہ جھوٹا نہیں ہوتا''۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۹۲)

فائدہ: یہ تعلیمات اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ کلام کی قدر و قیمت اس کے مقصد سے وابستہ ہے، اگر وہ اصلاح، خیر اور رضائے الٰہی کے لئے ہو تو باعثِ اجر ہے، ورنہ بے فائدہ بلکہ وبال بن جاتا ہے۔

آیت نمبر (۱۱۵) وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: '' اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہو چکی ہو، اور مؤمنوں کے راستے کے خلاف چلے، تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھرتا ہے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے، جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے''۔

تفسیر یہ آیتِ کریمہ بھی بنی اُبیرک کے اسی واقعے سے متعلق ہے، کیونکہ طعما کو اس حقیقت کا یقین تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور اسلام ہی دینِ برحق ہے، اس کے باوجود اس نے صحابۂ کرامؓ کی راہ چھوڑ کر کافروں کا راستہ اختیار کیا اور مرتد ہو کر انہی سے جا ملا۔

اس آیت کا حکم

تاہم اس آیت کا حکم محض اسی واقعے تک محدود نہیں، بلکہ عام ہے، جیسا کہ سابقہ آیات کے ضمن میں بھی واضح کیا گیا۔ چنانچہ جو شخص حق واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اختیار کرے اور مسلمانوں کے راستے، یعنی دینِ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور راہ کو اپنائے، تو اللہ تعالیٰ اسے اسی گمراہی پر چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اس کے باطل عمل کو اس کی نگاہ میں آراستہ کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ انجامِ کار جہنم میں جا پہنچتا ہے۔

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے اجماع، یعنی اہلِ علم کے متفقہ موقف کی مخالفت بھی ایک سنگین گناہ ہے، اور یہ کہ اجماع، قرآن وسنت کی طرح ایک معتبر دلیل ہے۔

اسی بنا پر امام شافعیؒ نے اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا اور فرمایا کہ چونکہ مومنوں کے طریقے کی مخالفت کا انجام جہنم قرار دیا گیا ہے، اس لئے ان کی پیروی لازم ہے۔

مزید یہ کہ یہ آیت اس حقیقت پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جو شخص مومنوں کے راستے کی پیروی سے انحراف کرے، وہ بھی سزا کا مستحق ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے والا وعید کا حق دار ہے، ورنہ اس بات کو مستقل طور پر ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔



آیت نمبر ۱۱۶ سے ۱۲۷ تک

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ:

(۱۱۶) یقیناً اللہ اس کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، البتہ اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑتا ہے۔ (۱۱۷) وہ (مشرک) اللہ کے سوا صرف مؤنث بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور وہ صرف شیطان سرکش کی عبادت کرتے ہیں۔ (۱۱۸) جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس نے کہا تھا: میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ ضرور لے کر رہوں گا۔ (۱۱۹) اور ضرور انہیں گمراہ کروں گا، اور انہیں جھوٹی امیدیں دلاؤں گا، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ مویشیوں کے کان چیر دیں گے، اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدل دیں گے۔ اور جس نے شیطان کو اللہ کے سوا اپنا دوست بنایا، وہ کھلے

خسارے میں پڑ گیا۔ (۱۲۰) شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں جھوٹی امیدیں دلاتا ہے، حالانکہ وہ صرف دھوکے کے وعدے کرتا ہے۔ (۱۲۱) یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔ (۱۲۲) اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، ہم انہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر بات میں کون سچا ہوسکتا ہے؟ (۱۲۳) (نیک انجام) تمہاری خواہشات سے نہیں اور نہ اہل کتاب کی خواہشات سے طے ہوگا۔ جو کوئی برائی کرے گا، اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا، اور وہ اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی پائے گا نہ مددگار۔ (۱۲۴) اور جو نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مؤمن، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ (۱۲۵) اور اس شخص سے بہتر (دین میں) کون ہوسکتا ہے جس نے اپنا چہرہ (یعنی اپنے آپ کو) اللہ کے حوالے کیا، اور وہ نیک عمل کرنے والا ہو، اور اُس نے ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، جو خالص اللہ کے ہو گئے تھے؟ اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل (قریبی دوست) بنایا۔ (۱۲۶) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (۱۲۷) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے: اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اور جو کچھ کتاب میں تم پر پڑھا جاتا ہے، وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں بھی ہے جنہیں تم وہ حق نہیں دیتے جو ان کے لیے مقرر ہے، اور تم چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کرلو، اور کمزور بچوں کے بارے میں بھی (ہدایت کی گئی ہے)، اور یہ بھی کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو۔ اور جو بھی بھلائی تم کرو گے، تو یقیناً اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیت نمبر ۱۱۶ سے ۱۲۷ تک

آیت نمبر (۱۱۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

ترجمہ: ”یقیناً اللہ اس کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، البتہ اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑتا ہے“۔

تفسیر اس آیتِ کریمہ کی تفسیر پہلی آیت نمبر ۴۸ کے ضمن میں گزر چکی ہے، تاہم یہاں دوبارہ شرک کی ہولناکی اور اس کی سنگینی کو مؤکد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اس شخص کا انجام بھی واضح کیا گیا ہے جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے اور شرک ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوا۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قول ہے کہ پورے قرآن میں یہ آیت مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں امید دلائی ہے کہ وہ شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو، جس کے لئے چاہے، معاف فرمادے گا۔(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۳۷)

شرک کی قسمیں

شرک کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: (۱) شرکِ اکبر (بڑا شرک)، (۲) شرکِ اصغر (چھوٹا شرک)۔

شرکِ اکبر (بڑا شرک)

بڑا شرک انسان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اسی حالت میں بغیر توبہ کے مرجائے تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے۔

شرکِ اکبر کی حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی کوئی بھی قسم غیر اللہ کے لئے انجام دی جائے یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنا، اس سے دعا کرنا، یا اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربانی دینا اور نذر و نیاز پیش کرنا۔

اس میں مزارات، جنات اور شیاطین سب شامل ہیں؛ مثلاً ان سے خوف کھانا کہ وہ نقصان پہنچا دیں گے، بیماری میں مبتلا کر دیں گے، یا کسی قسم کی اذیت دیں گے۔

اسی طرح غیر اللہ سے ایسی امیدیں وابستہ کرنا جو صرف اللہ کے اختیار میں ہیں جیسے حاجات پوری کرنا یا مصیبتوں کو دور کرنا یہ سب شرکِ اکبر کی صورتیں ہیں۔

آج کے دور میں اس قسم کے اعمال بعض مقامات پر بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ منسوب ہو کر دیکھے جاتے ہیں۔اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

ترجمہ: ''یعنی یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع دے سکتی ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

شرکِ اکبر کی قسمیں

شرکِ اکبر کی تین بنیادی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا۔(۲) اللہ کے تصرف و اختیار میں کسی کو شریک سمجھنا۔(۳) عبادت میں کسی کو اللہ کا شریک بنانا۔

اللہ کے علم میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بزرگ، پیر یا ہستی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ ہر حال میں، ہر وقت، انسان کے تمام حالات سے باخبر ہے۔ اسی طرح نجومیوں اور پنڈتوں سے غیب کی خبریں معلوم کرنا، یا کسی بزرگ کے کلام سے فال نکال کر اس پر یقین کر لینا بھی اسی قبیل سے ہے۔

نیز کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اسے فوراً علم ہو گیا، یا کسی شخصیت کو ہر جگہ حاضر و ناظر ماننا، یا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہر چیز کا مکمل علم رکھتا ہے، خواہ وہ چیز قریب ہو یا دور، پوشیدہ ہو یا ظاہر، تاریکی میں ہو یا روشنی میں، آسمانوں میں ہو یا زمین میں، پہاڑ کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہہ میں یہ سب تصورات باطل ہیں، کیونکہ اس طرح کا کامل اور محیط علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی ہستی کا نام اٹھتے بیٹھتے پکارتا رہے، مثلاً ''یا خواجہ'' یا مصیبت کے وقت اسے پکارے، یا دشمن کے مقابلے میں یا علی کہہ کر حملہ کرے، یا کسی کے نام کا وظیفہ و ختم پڑھے، یا کسی کا تصور باندھ کر یہ گمان کرے کہ جیسے ہی میں اس کا نام لیتا ہوں، زبان سے یا دل سے یا اس کا تصور قائم کرتا ہوں، اس کو فوراً خبر ہو جاتی ہے، اور میری کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہتی؛ میرے حالات، بیماری و صحت، خوشی و غم، سب اس کے علم میں آ جاتے ہیں، بلکہ وہ میری ہر بات سن لیتا ہے اور میرے دل کے خیالات تک سے واقف ہے، تو یہ تمام عقائد انسان کو شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

ایسے نظریات خواہ کسی نبی یا کسی ولی، پیر، شہید یا امام کے بارے میں، حتیٰ کہ جنات کے بارے میں رکھے، ہر صورت میں یہ عقیدہ انسان کو شرک کے دائرے میں لے جاتا ہے، کیونکہ علمِ کامل اور ہر چیز پر احاطہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے۔

کاملِ علمِ غیب

غیب کا کامل اور مطلق علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

یعنی غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے، وہ سب اس کے علم میں ہے۔ کوئی پتہ بھی گرتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے، اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہو، یا کوئی تر و

خشک چیز، سب ایک روشن کتاب میں درج ہے۔ (سورۃ الانعام:۵۹)

غیب کی کنجیاں

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظاہری چیزوں کے ادراک کے لئے مختلف ذرائع عطا فرمائے ہیں، آنکھ دیکھنے کے لئے، کان سننے کے لئے، ناک سونگھنے کے لئے، زبان چکھنے کے لئے، ہاتھ محسوس کرنے کے لئے، اور عقل سمجھنے کے لئے اور ان سب کو اس کے اختیار میں رکھا ہے کہ جب چاہے ان سے کام لے اور جب چاہے روک دے؛ اسی طرح جیسے کسی کے پاس کنجی ہو تو وہ تالا اپنی مرضی سے کھولتا اور بند رکھتا ہے۔

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے غیب کی کنجیاں اپنے اختیار میں رکھی ہیں۔ کسی ولی، نبی، امام یا امام زادے، یا کسی جن، بھوت یا پری کو یہ قدرت نہیں دی گئی کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں غیب کی باتیں جان لیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق جس قدر چاہے، جسے چاہے، غیب کی کچھ خبریں عطا فرما دیتا ہے۔

تمام علم صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں

اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس کے پاس ہر چیز کا کامل اور حقیقی علم ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

یعنی قیامت کی گھڑی کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحموں میں کیا ہے، کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ کس زمین میں اس کی موت واقع ہوگی۔ بے شک اللہ ہی ہر چیز کا علم رکھنے والا اور ہر حال سے باخبر ہے۔ (سورۃ لقمان:۳۴)

● اسی مضمون کو ایک اور مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

یعنی آپ کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو، سوائے اللہ کے، اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں کب دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ (سورۃ النمل:۶۵)

اللہ کے سوا کسی کو پکارنا

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ

یعنی اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوسکتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا

جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے، بلکہ وہ تو اس کی پکار سے بھی بے خبر ہیں۔ (سورۃ الاحقاف:۵)

● ان آیاتِ کریمہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ علمِ غیب، تدبیرِ کائنات اور بندوں کی حاجات پوری کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے سوا کسی کو پکارنا یا اس سے امید وابستہ کرنا صریح گمراہی ہے، کیونکہ نہ وہ سن سکتے ہیں، نہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کسی نفع یا نقصان کے مالک ہیں۔

تصرف (اختیار) میں کسی کو شریک ٹھہرانا

تصرف میں شرک سے مراد یہ ہے کہ کسی مخلوق کو نفع ونقصان کا مالک سمجھ لیا جائے، یا اس سے اپنی حاجات اور مرادیں طلب کی جائیں جیسے اس سے رزق یا اولاد مانگنا، یا یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ اپنی مرضی سے کائنات میں تصرف کرسکتا ہے، احکام جاری کرسکتا ہے، زندگی وموت کا فیصلہ کرسکتا ہے، کسی کو صحت دے یا بیماری میں مبتلا کردے، روزی فراخ یا تنگ کردے، مشکلات کو دور کرے یا بلاؤں کو ٹال دے۔

حالانکہ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ کسی نبی، ولی، پیر، یا کسی بھی مخلوق، خواہ وہ انسان ہو یا جن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا درست نہیں کہ وہ ان اختیارات کے مالک ہیں یا ان سے ایسی مرادیں طلب کی جائیں۔

لہٰذا جو شخص کسی غیر اللہ کے لئے اس نوعیت کا اختیار ثابت کرے، اس سے حاجات مانگے، اس کے نام پر نذر ونیاز پیش کرے، اس کی منتیں مانے اور مصیبت کے وقت اسے پکارے، تو وہ شرک کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

نذر ونیاز کا اصل مفہوم

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

یعنی آپ کہہ دیجئے: وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے، جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اگر تم جانتے ہو؟ وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ پھر کہہ دیجئے: تمہیں کہاں سے دھوکہ لگا دیا جاتا ہے؟

فائدہ: ان آیاتِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی مکمل ملکیت، اختیار اور حفاظت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی سب کو پناہ دینے والا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی کو حقیقی پناہ دے سکے۔ حتیٰ کہ مشرکین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے کہ سب کچھ اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، لیکن اس کے باوجود وہ عملی طور پر گمراہی میں مبتلا ہوجاتے تھے۔

اس ارشاد کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جب اختیارِ کامل صرف اللہ کے پاس ہے، تو نذر و نیاز بھی اسی کے لئے خاص ہونی چاہئے۔ غیر اللہ کے نام پر نذر دینا یا ان سے امید وابستہ کرنا دراصل اسی بنیادی حقیقت سے انحراف ہے کہ اصل اختیار اور قدرت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

حفاظت اور اختیار

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

یعنی لوگ اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ آسمانوں اور زمین سے انہیں ذرّہ برابر رزق دینے کی قدرت رکھتی ہیں اور نہ اس کی کوئی طاقت ہی رکھتی ہیں۔ (سورۃ النحل: ۷۳)

● اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو، جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان؛ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے۔ (سورۃ یونس: ۱۰۶)

مزید ارشاد فرمایا: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

آپ کہہ دیجئے: جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھتے ہو، انہیں پکار کر دیکھ لو؛ وہ نہ آسمانوں میں ذرّہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی حصہ ہے، اور نہ ہی ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔ (سورہ سبا: ۲۲)

● اور مزید فرمایا: وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

یعنی اس کے حضور کسی کی سفارش بھی کارگر نہیں ہوتی، مگر اسی کے لئے جسے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو وہ (فرشتے) پوچھتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ جواب دیتے ہیں: حق فرمایا، اور وہی بلند مرتبہ، عظمت والا ہے۔ (سورہ سبا: ۲۳)

خلاصہ: ان آیاتِ مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق دینا، نفع و نقصان پہنچانا، حفاظت کرنا اور سفارش قبول

کرنا، یہ سب اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے سوا کسی کو ذرّہ برابر بھی اختیار حاصل نہیں، نہ وہ کسی معاملے میں شریک ہے اور نہ اس کا مددگار۔ لہٰذا غیر اللہ کو پکارنا، اس سے امیدیں وابستہ کرنا یا اس کے ذریعے نفع و نقصان کا عقیدہ رکھنا صریح گمراہی ہے، کیونکہ حقیقی اختیار اور اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے۔

عبادات

عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نہایت عاجزی، انکساری اور دل و جان کے اخلاص کے ساتھ کسی کی بندگی اختیار کرے۔ اور دینی اصطلاح میں عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی جائے، جو ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شریعت کی صورت میں انسانوں تک پہنچتے رہے۔ اگر کوئی عمل شریعت کے حکم کے خلاف کیا جائے، چاہے وہ بظاہر عبادت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو، تو وہ عبادت شمار نہیں ہوگا بلکہ گناہ قرار پائے گا۔

عبادت کی حقیقت

نماز عبادات میں سب سے عظیم عبادت ہے، لیکن اگر اسے مکروہ اوقات میں ادا کی جائے یا کسی غصب شدہ زمین پر پڑھی جائے تو وہ گناہ کا باعث بن جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ بھی ایک بڑی عبادت ہے، مگر عید یا ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا ممنوع اور گناہ ہے، کیونکہ یہ شریعت کے حکم کے خلاف ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عبادت کی اصل حقیقت اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے، نہ کہ اپنی مرضی سے عبادت کے طریقے اختیار کرنا۔

عبادت میں توحید کا تقاضا

عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے محبت اللہ کے برابر نہ ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اس کے برابر رکھی جائے، اور نہ کسی پر ایسا بھروسہ کیا جائے جیسا اللہ پر ہونا چاہئے۔

اسی طرح کسی عمل کو اللہ کی عبادت کے برابر اہمیت نہ دی جائے، نہ اللہ کے سوا کسی کے نام کی نذر و نیاز پیش کی جائے، نہ اس کے علاوہ کسی کی قسم کھائی جائے، اور نہ کسی کو اللہ کے برابر تعظیم و تکریم دی جائے۔ یہی خالص توحید ہے کہ بندہ اپنی محبت، خوف، امید اور اعتماد سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر دے۔

عبادت جیسا معاملہ کرنا

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ساتھ عبادت کا سا برتاؤ کرنا شرک میں داخل ہے۔ مثلاً کسی غیر اللہ کو سجدہ کرنا، اس کے سامنے رکوع کرنا، ہاتھ باندھ کر اس کی تعظیم میں کھڑا ہونا، کسی کے نام پر جانور دوڑانا یا چڑھاوا پیش کرنا، اس کے نام

کی منت ماننا، کسی قبر یا گھر کا طواف کرنا، یا اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی اور کی بات یا رسم کو ترجیح دینا، یہ سب اعمال عبادت کے مفہوم میں آتے ہیں، اور انہیں غیر اللہ کے لئے کرنا درست نہیں۔

اسی طرح کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، کسی مقام کو کعبہ کی طرح ادب و تعظیم کرنا، یا وہ اعمال جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے خاص فرمائے ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی ایک درجے کا شرک ہے۔ مثلاً کسی کے نام کا روزہ رکھنا، اس کے مقام کی طرف دور دراز سے سفر کرنا اور ایسی حالت اختیار کرنا کہ گویا اس کی زیارت کے لئے جا رہے ہوں؛ راستے میں اس کا نام لینا، وہاں پہنچ کر طواف کرنا، سجدہ کرنا، جانور چڑھانا، منتیں ماننا، اس کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر اس سے دعائیں مانگنا اور دین و دنیا کی اس سے حاجات طلب کرنا، یہ سب امور عبادت کے دائرے میں آتے ہیں۔

اسی طرح کسی پتھر کو بوسہ دینا، دیواروں سے جسم لگانا، غلاف پکڑ کر دعائیں کرنا، اس کے مجاور بن کر خدمت کرنا، کسی خاص پانی کو برکت سمجھ کر پینا یا بدن پر ڈالنا، دوسروں میں تقسیم کرنا، غیر حاضر لوگوں کے لئے لے جانا، واپسی پر الٹے قدم چلنا، اور اس مقام کے درختوں اور گھاس کو بھی خاص تعظیم دینا، یہ تمام اعمال وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے مخصوص رکھا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی عمل کو کسی پیر، پیغمبر، دیوی دیوتا، قبر، مزار، تھان، کسی گھر، کسی تبرک یا کسی علامت کے ساتھ خاص کر دے، جیسے سجدہ کرنا، رکوع کرنا، اس کے نام کا روزہ رکھنا، تعظیم میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، اس کے نام پر جانور چڑھانا، یا دور دراز سے اس کی زیارت کے لئے جا کر وہی افعال انجام دینا جو عبادت کے طور پر بیان ہوئے تو یہ سب اعمال شرک کے زمرے میں شمار ہوں گے۔

کسی کو بزرگ کہہ کر رب کا درجہ دینا

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

یعنی ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں (بزرگوں) کو اپنا رب بنا لیا، اور مسیح ابنِ مریمؑ کو بھی؛ حالانکہ انہیں حکم صرف یہی دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی معبود کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اس شرک سے پاک ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ (سورۃ التوبہ: ۳۱)

فائدہ: اس آیتِ کریمہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اور نہ ہی کسی کو ایسا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے یا اس کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے

برابر سمجھا جائے۔ لہٰذا کسی بزرگ، عالم یا کسی بھی شخصیت کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اس کے احکام کو اللہ کے حکم پر ترجیح دی جائے یا اس کے سامنے عبادت کا سا معاملہ کیا جائے، یہ درست نہیں، کیونکہ عبادت اور بندگی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے۔

اللہ کی صفات میں شرک

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے صفاتی نام جیسے خالق، رازق، علیم، سب اسی کے لئے خاص ہیں۔ ان صفات میں کسی اور کو شریک ٹھہرانا شرک ہے۔ البتہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ان الفاظ کا استعمال اگر مخلوق کے لئے کیا جائے تو وہ اسی محدود اور مجازی معنیٰ میں ہوگا جو مخلوق کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اگر یہی صفات کسی مخلوق کے لئے اسی معنیٰ اور اسی کمال کے ساتھ ثابت کی جائیں جس طرح اللہ کے لئے ہیں، تو یہ اللہ کی صفات میں شریک ٹھہرنا قرار پائے گا۔

اللہ کے حقوق میں شرک

اللہ کے حقوق میں شریک ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات سے جو حقوق بندوں پر لازم آتے ہیں، ان میں کسی اور کو برابر کا حصہ دار بنا لیا جائے۔ مثلاً جب اللہ خالق ہے تو لازماً کائنات کا پورا نظام اور اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص یہ مان لے کہ پیدا کرنے والا تو اللہ ہے، مگر نظام چلانے والا کوئی اور ہے، تو یہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہوگا۔

اسی طرح جب خالق صرف اللہ ہے تو عبادت اور اطاعت بھی اسی کے لئے خاص ہونی چاہئے۔ اگر کوئی شخص کسی اور کی بندگی اختیار کرے، یا اللہ کی اطاعت کے مقابلے میں کسی اور کی اطاعت کو اسی درجے میں قبول کر لے، تو یہ بھی اللہ کے حقوق میں شرک ہے۔ اس طرح کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جو یا تو خود شرک ہیں یا شرک کا ذریعہ بن جاتی ہیں، اور انسان کو آہستہ آہستہ اصل شرک کی طرف لے جاتی ہیں، جس کی نشان دہی قرآنِ کریم نے اپنی مختلف آیات میں واضح طور پر فرمائی ہے۔

شرک ایک ناقابلِ معافی جرم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، البتہ اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے معاف فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ ایک بہت بڑا جھوٹ اور عظیم گناہ گھڑتا ہے۔ (سورۃ النساء: ۴۸)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ شرک سب سے بڑا جرم ہے، جو اگر بغیر توبہ کے باقی رہے تو نا قابلِ معافی ہے، جبکہ دیگر گناہوں کے بارے میں امیدِ مغفرت موجود ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

یعنی آپ کہہ دیجئے کہ یہ (قرآن اور دین) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوا ہے، پس لوگوں کو چاہئے کہ اسی پر خوشی منائیں؛ یہ اس (دنیاوی مال ومتاع) سے کہیں بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ (سورۃ یونس:۵۸)

فائدہ: ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عظیم رحمت یعنی ہدایت اور دینِ حق سے نوازا ہے، جو دنیا کی ہر جمع پونجی سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اسی ہدایت کی روشنی میں شرک سے بچنا اور خالص توحید کو اختیار کرنا انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

شرکِ اکبر (بڑا شرک)

شرکِ اکبر وہ عظیم گناہ ہے جو انسان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اسی حالت میں بغیر توبہ کے دنیا سے چلا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔ شرکِ اکبر کی حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی کوئی بھی صورت غیر اللہ کے لئے انجام دی جائے۔

مثلاً غیر اللہ سے دعا کرنا، اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے اس کے نام پر قربانی دینا، نذر و نیاز پیش کرنا، چاہے وہ مزارات ہوں، جنات ہوں یا شیاطین، یہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح مُردوں، جنات یا دیگر مخلوقات سے اس نیت سے خوف کھانا کہ وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، بیماری میں مبتلا کر سکتے ہیں یا کسی قسم کی تکلیف دے سکتے ہیں، یہ بھی شرک کی صورتیں ہیں۔

اسی طرح غیر اللہ سے ایسی امیدیں وابستہ کرنا جن پر صرف اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے جیسے حاجات پوری کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، یہ بھی شرکِ اکبر میں شامل ہے۔ بدقسمتی سے اس نوعیت کے اعمال آج کل بعض لوگوں کی طرف سے بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ منسوب کر کے کئے جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

یعنی یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع دے سکتی ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ آپ کہہ دیجئے: کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اسے آسمانوں اور زمین میں کوئی علم نہیں؟ وہ پاک اور بلند ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ (سورۃ یونس: ۱۸)

فائدہ: یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ عبادت اور امید صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونی چاہئے، اور غیر اللہ کو اس میں شریک ٹھہرانا کھلی گمراہی ہے۔

شرکِ اصغر (چھوٹا شرک)

شرکِ اصغر وہ ہے جس سے انسان اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا، لیکن اس کی توحید میں کمی آجاتی ہے، اور یہ اکثر بڑے شرک (شرکِ اکبر) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

(۱) شرکِ جلی (ظاہری شرک)

اس سے مراد وہ الفاظ اور اعمال ہیں جن میں شرک کا پہلو ظاہر ہو۔ مثلاً غیر اللہ کی قسم کھانا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے کفر یا شرک کیا''۔ **(جامع ترمذی، حدیث نمبر: ۱۵۳۵)**

● اسی طرح ایک شخص نے عرض کیا: ''اگر اللہ اور آپ چاہیں تو ایسا ہو جائے گا''، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر بنا دیا؟ بلکہ یوں کہو: اگر اللہ چاہے (تو ہوگا)''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۸۳۹)**

● اسی طرح یہ کہنا کہ اگر فلاں نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا درست نہیں، بلکہ اس طرح سے کہنا چاہئے: ''اگر اللہ چاہتا، پھر فلاں کے ذریعے ایسا ہوا''، تاکہ یہ واضح رہے کہ بندے کی چاہت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ، جو تمام جہانوں کا رب ہے، نہ چاہے۔ **(سورۃ التکویر: ۲۹)**

شرکیہ اعمال

مثلاً نفع و نقصان کے اعتقاد سے کڑا پہننا، یا مصیبت سے بچنے کے لئے دھاگہ باندھنا، اگر ان چیزوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ خود تکلیفوں کو دور کرتی ہیں یا بلاؤں کو ٹالتی ہیں، تو یہ شرکِ اصغر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو ان مقاصد کے اسباب نہیں بنایا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ یہ چیزیں بذاتِ خود نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتی ہیں، تو یہ شرکِ اکبر بن جائے گا، کیونکہ اس میں غیر اللہ کے لئے وہ اختیار ثابت کیا جا رہا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔

شرکِ خفی (پوشیدہ یا ہلکا شرک)

شرکِ خفی سے مراد وہ شرک ہے جو انسان کے ارادوں اور نیتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسے ریا کاری یا شہرت طلبی بھی کہا جاتا ہے، یعنی بندہ عبادت اور نیکی کے کام اس نیت سے کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، نہ کہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے۔ مثلاً کوئی شخص نماز اس لئے خوب اہتمام سے ادا کرے کہ لوگ اسے نیک سمجھیں، یا صدقہ و خیرات اس غرض سے کرے کہ اس کا چرچا ہو تو جب کسی عمل میں دکھاوا یا نام ونمود شامل ہو جائے، وہ عمل اپنی اصل روح کھو دیتا ہے اور بے وزن ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

یعنی جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔ **(سورۃ الکہف:۱۱۰)**

● نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خوف شرکِ اصغر کا ہے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ریا کاری''۔ **(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۴۰۳۰)**

● اسی طرح دینی اعمال کو دنیوی مفاد کے لئے انجام دینا بھی شرکِ خفی میں شامل ہے۔ جیسے کوئی شخص مال و دولت کے حصول کے لئے حج کرے، اذان دے، امامت کرے، علمِ دین حاصل کرے یا جہاد کرے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہلاک ہو دینار کا بندہ، ہلاک ہو درہم کا بندہ، ہلاک ہو اچادر کا بندہ..... اگر اسے دیا جائے تو خوش ہوتا ہے، اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے''۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۴۳۵)**

نیتوں کا شرک

● ابن قیم الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ نیتوں اور ارادوں کا شرک نہایت باریک اور وسیع ہے، اس سے بچنا آسان نہیں۔ جو شخص اپنے عمل سے اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور مقصد کا ارادہ کرے، یا اللہ کے قرب کے بجائے کسی اور سے اس عمل کا بدلہ چاہے، تو وہ نیت و ارادہ کے شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح شرکِ خفی انسان کے باطن میں جنم لیتا ہے، اور اگر اس کی اصلاح نہ کی جائے تو یہ بڑے شرک کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے، اس لئے نیت کی پاکیزگی اور اخلاص سب سے زیادہ ضروری ہے۔

اخلاص

اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال وافعال، ارادوں اور نیتوں کو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص

کردے۔یہی وہ اصل روح ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا جوہر ہے، اور اسی کو اختیار کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو دیا ہے۔اس کے سوا کوئی طریقہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، اور یہی درحقیقت اسلام کی حقیقت ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے گا، اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔(سورۃ آل عمران: ۸۵) یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی حقیقت ہے، لہٰذا جو شخص اس سے روگردانی کرے وہ دراصل انتہائی نادانی کا مرتکب ہے۔

شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں فرق

۱۔شرکِ اکبر انسان کو اسلام سے خارج کردیتا ہے، جبکہ شرکِ اصغر سے وہ دائرۂ اسلام سے باہر نہیں ہوتا۔

۲۔شرکِ اکبر کا مرتکب اگر بغیر توبہ کے مرے تو ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا، جبکہ شرکِ اصغر میں ایسا نہیں؛ اگر سزا ہوئی بھی تو دائمی نہیں ہوگی۔

۳۔شرکِ اکبر تمام اعمال کو ضائع کردیتا ہے، جبکہ شرکِ اصغر تمام اعمال کو باطل نہیں کرتا، البتہ ریاکاری والے اعمال اپنی حقیقت کھودیتے ہیں۔

۴۔شرکِ اکبر کی صورت میں مشرک کے مال وجان کے احکام مختلف ہوجاتے ہیں، جبکہ شرکِ اصغر میں ایسا نہیں ہوتا۔

شرکیہ رسمیں

کبھی کبھی شرک انسان کی عادات میں نہایت پوشیدہ انداز میں داخل ہوجاتا ہے۔مثلاً اچھے یا برے شگون کا عقیدہ رکھنا، نجومیوں کی باتوں پر یقین کرنا، کسی کے نام پر کان یا ناک چھیدنا، کسی خاص نسبت سے چوٹی رکھنا یا رسمیں اپنانا، کسی کے نام پر جانور کو مخصوص کردینا، کسی مہینے یا وقت کو منحوس سمجھنا، یا غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا، یعنی اس طرح کے امور جن میں شرک یا اس کے اسباب کا پہلو پایا جاسکتا ہو اس سے بچنا۔

اسی طرح کسی شخصیت کی غیر معمولی تعظیم کرنا، اس کی تصویر کو عقیدت کا مرکز بنانا، یا کفر وباطل باتوں کو پسند کرنا اور اچھا سمجھنا بھی ایمان کے لئے نقصان دہ امور ہیں۔

خلاصہ: ان تمام مباحث کا حاصل یہی ہے کہ انسان ہر طرح کے شرک سے بچنے کی کوشش کرے، چاہے

وہ شرک اللہ کی ذات سے متعلق ہو یا اس کی صفات سے، کیونکہ دونوں ہی صورتیں گمراہی کا سبب ہیں۔ نجات کا راستہ صرف اخلاص اور خالص توحید میں ہے، کہ بندہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے وقف کر دے۔

مشرک کی بخشش نہیں

یہ وہی شرک ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، البتہ اس سے کم درجے کے گناہوں کو جس کے لئے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بہت بڑا بہتان اور عظیم گناہ گھڑتا ہے۔ (سورۃ النساء: ۴۸)

مزید ارشاد فرمایا:

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا یعنی یہ لوگ آپ کے سامنے جو بھی اعتراض یا مثال پیش کرتے ہیں، ہم اس کے جواب میں حق بات واضح کر دیتے ہیں اور بہترین انداز میں اس کی وضاحت فرما دیتے ہیں۔ (سورۃ الفرقان: ۳۳)

بعض مفسرین کے مطابق اس آیت کا مفہوم عام ہے، یعنی باطل پرست لوگ قیامت تک جو بھی شبہات اور دلائل پیش کریں گے، قرآنِ کریم ان سب کا جواب حق اور واضح تفسیر کے ساتھ دے چکا ہے اور دیتا رہے گا۔ ان آیات سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ شرک ایسا جرم ہے جس پر اصرار کی حالت میں مغفرت کی کوئی امید نہیں، جبکہ دیگر گناہوں کے لئے اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔

قدیم اور جدید شرک کا تقابلی جائزہ

ہمارے زمانے کے شرک کا اگر پہلے زمانے کے شرک سے موازنہ کیا جائے تو ایک نمایاں فرق سامنے آتا ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ مشرکین کا طرزِ عمل موجودہ زمانے کے بعض رویّوں کے مقابلے میں کم شدت کا حامل تھا۔ اس کی بنیادی طور پر دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

مشرکین کا حال

اوّل: پہلے زمانے کے مشرکین کا حال یہ تھا کہ وہ آرام، خوشحالی اور سہولت کے اوقات میں تو ملائکہ، اولیاء یا

بتوں کو پکارتے اور انہیں اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے، لیکن جب کوئی شدید مصیبت، خوف یا بے بسی کی حالت پیش آتی، تو وہ تمام سہاروں کو چھوڑ کر خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

یعنی: جب تمہیں سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو، سب گم ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ تمہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو، اور انسان بڑا ناشکرا ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل: ۶۷)

● اسی طرح فرمایا: قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاۗءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: کہہ دیجئے! اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا قیامت آ پہنچے، تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ بلکہ تم اسی کو پکارتے ہو، پھر وہ چاہے تو تمہاری مصیبت دور کر دیتا ہے، اور اس وقت تم اپنے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

(سورہ الانعام: ۴۰-۴۱)

● مزید ارشاد ہوتا ہے: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ... (سورہ الزمر: ۸) یعنی: جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع ہو کر اسی کو پکارتا ہے، پھر جب وہ اسے نعمت عطا کرتا ہے تو پہلے کی پکار کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

● اور ایک مقام پر فرمایا: وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ... (سورہ لقمان: ۳۲) یعنی ''جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں، تو وہ خالص ہو کر اللہ ہی کو پکارتے ہیں''۔

فائدہ: ان تمام آیات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے زمانے کے مشرکین شدید حالات میں خالص توحید کی طرف لوٹ آتے تھے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا سہارا بناتے تھے۔

مگر آج کے بعض لوگوں کا طرزِ عمل اس کے برعکس نظر آتا ہے کہ وہ راحت ہو یا مصیبت، ہر حال میں پہلے غیر اللہ، پیر، فقیر یا دیگر ہستیوں کو پکارتے ہیں اور انہیں ہی فریاد رسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی فرق سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ قدیم اور موجودہ طرزِ عمل میں نمایاں امتیاز پایا جاتا ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآنِ حکیم نے مختلف انداز میں واضح کر کے انسان کو خالص توحید کی طرف بلایا ہے۔

دین کے کسی ایک فرض کا انکار

علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی ایک قطعی حکم کو بھی تسلیم نہ کرے، وہ کافر

ہے اور اسلام میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اسی اصول کے تحت اگر کوئی شخص توحید کا اقرار کرے لیکن نماز کی فرضیت کا انکار کر دے، یا نماز کو مانے مگر زکوٰۃ سے انکار کرے، یا تمام احکام مانے مگر روزہ یا حج کی فرضیت کو تسلیم نہ کرے، یا ہر چیز پر ایمان لائے مگر قیامت کا انکار کر دے تو ایسا شخص بلا اختلاف کافر شمار ہوگا۔

● قرآنِ مجید اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے: بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ... أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (سورہ نساء: ۱۵۰-۱۵۱)

ترجمہ: ''جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کچھ احکام کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے، اور ایمان و کفر کے درمیان کوئی راستہ نکالنا چاہتے ہیں، وہی درحقیقت پکے کافر ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر حج کی فرضیت کے بارے میں فرمایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ... وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (سورہ آل عمران: ۹۷) یعنی: جو اس کی استطاعت رکھتا ہو، اس پر اللہ کے لئے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے، اور جو انکار کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

فائدہ: یہ آیات اس بات کو دوٹوک انداز میں واضح کرتی ہیں کہ دین کے کسی ایک جز کا انکار بھی کفر کے زمرے میں آتا ہے، چاہے باقی تمام اعمال و عقائد موجود ہوں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص تمام دینی احکام کو مان لے مگر قیامت کا انکار کرے، یا رمضان کے روزوں کی فرضیت کو تسلیم نہ کرے، تو اس کے کفر میں کسی اہلِ علم کو اختلاف نہیں۔ قرآنِ مجید اور اجماعِ امت دونوں اس پر شاہد ہیں۔

بنیادی فرض (توحید)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دین لے کر آئے، اس میں سب سے عظیم اور بنیادی فرض ''توحید'' ہے۔ یہ نماز، روزہ اور حج سمیت تمام احکام سے بڑھ کر ہے، کیونکہ یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان احکام میں سے کسی ایک کا انکار کرے تو وہ کافر قرار پاتا ہے تو سوچئے! اگر کوئی خود توحید ہی کا انکار کر دے، جو تمام رسل کا مشترکہ پیغام ہے، تو وہ کیسے مومن رہ سکتا ہے؟ یہی وہ نکتہ ہے جو انسان کو دین کی جزوی نہیں بلکہ مکمل پیروی کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور ایمان کی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ کلی اطاعت اور کامل تسلیم کا نام ہے۔

ایک کلمۂ کفر سے ایمان کا زائل ہونا

قرآنِ حکیم میں ایک نہایت عبرت آموز حقیقت بیان کی گئی ہے کہ بعض لوگ محض ایک کلمۂ کفر کی بنا پر ایمان سے محروم ہو گئے، حالانکہ وہ بظاہر اہلِ اسلام میں شمار ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ...وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ ...(سورہ توبہ:۷۴)

ترجمہ: یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے وہ بات نہیں کہی، حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی، اور اپنے اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

یہ وہ لوگ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانے میں موجود تھے، آپؐ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے، نمازیں ادا کرتے، زکوٰۃ دیتے، حج کرتے اور توحید کا اقرار بھی رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، ایک کلمۂ کفر ان کے ایمان پر ایسا ضرب لگا گیا کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار پائے۔

● اسی مضمون کو ایک اور مقام پر مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ...لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ

ترجمہ: اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہیں گے کہ ہم تو محض ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کرتے تھے؟ بہانے نہ بناؤ، تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔

(سورہ توبہ:۶۵-۶۶)

فائدہ: یہ آیات اس واقعے کی نشاندہی کرتی ہیں جب یہ لوگ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے، اور انہوں نے ایک ایسی بات کہی جسے وہ بعد میں محض مذاق قرار دینے لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ ''مذاق'' درحقیقت کلمۂ کفر تھا، جس نے انہیں ایمان کے بعد کفر میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک نہایت اہم اصول سامنے آتا ہے: ایمان صرف ظاہری اعمال یا زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دل کی سچائی، زبان کی احتیاط اور عقیدے کی سلامتی بھی لازم ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی ایسی لغزش واقع ہو جو کفر پر دلالت کرے، تو وہ انسان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

اصلاح کی ضرورت

لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ شرک کے ہر چھوٹے بڑے اثر کو دل و معاشرے سے نکال کر خالص توحید کا مینار قائم کیا جائے، ایسا مینار جو انسان کو دنیا اور آخرت دونوں کے نقصان سے بچا سکے۔ یہ اصلاح کسی بڑے میدان سے نہیں بلکہ ہر فرد کے اپنے گھر سے شروع ہونی چاہئے، تاکہ آہستہ آہستہ پورا معاشرہ اس حقیقت کو محسوس کرے کہ شرک ایک نہایت سنگین گناہ ہے، اور توحید ہی نجات کا حقیقی راستہ ہے۔

❁❁❁

عالمی شہرت یافتہ علماء کے تائیدی کلمات سے متعلق اصل تحریریں

عالمی شہرت یافتہ علماء کے تائیدی کلمات سے متعلق تحریروں کی فہرست طویل ہے جسے تفسیر فاروقی کے آخری جلد میں شامل کیا گیا ہے ان میں سے چند اہم معروف عالمی شہرت یافتہ علماء کی تحریریں اگلے صفحات پر درج ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مرشدامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

(جانشین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سابق صدر: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ الھند)

الحمدللہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علٰی سید المرسلین خاتم النبین سیدنا محمد، و علٰی آلہ و صحبہ أجمعین و من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین و بعد۔

زبان کوئی بھی ہو، اس میں الفاظ معانی کے ساتھ کیفیات کے بھی حامل ہوتے ہیں، اسی طرح بعض وقت الفاظ موقعوں کے فرق کے ساتھ معانی میں فرق رکھتے ہیں اور یہ ہر زبان میں الفاظ کے مختلف موقعوں پر اور مختلف کیفیتوں میں استعمال ہونے کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بعینہ اسی مفہوم میں نہیں ہو سکتا، جس مفہوم میں اصل زبان میں ہوا ہے اور جب الفاظ کا استعمال کرنے والا موقع ومحل کے الفاظ کو اور موقع ومحل کے مطابق استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا ترجمہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، موقع ومحل اور کیفیات سے پوری واقفیت اللہ رب العالمین سے زیادہ کون جانتا ہے۔

پھر زبان، زبان میں فرق ہوتا ہے، بعض زبانیں سادہ انداز اور شروع شروع کی ہوتی ہیں اور بعض زبانیں بہت خوبیوں سے گزری ہوئی زیادہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں، اس لحاظ سے عربی زبان کو بڑا امتیاز حاصل ہے، اس میں انسانی نفسیات کی ترجمانی بہتر طریقہ سے ملتی ہے، پھر قرآن مجید جو کلام الٰہی ہے اور کلام الٰہی ہونے کے باعث انسان سے مخاطب میں اعلیٰ ترین خصوصیات کا حامل ہے اور عربی زبان میں ہے، لہٰذا اس کے معانی ومفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت اس میں ہو سکتی ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں کے الفاظ کے معانی کی کیفیات کا بہتر طریقہ سے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر معانی ومفہوم بہت کٹے پٹے طریقہ سے منتقل ہوتے ہیں، بلکہ بعض وقت بدل جاتے ہیں، قرآن مجید ایک طرف تو رب العزت کا کلام ہے، دوسری طرف وہ انسانوں کی رہنمائی اور توجہ دہانی کی خصوصیت رکھتا ہے اور اس کے مخاطب انواع واقسام کے لوگ ہیں، کہیں تو اپنے ماننے والوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں اپنے منکر لوگوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں سادہ مزاج لوگوں کو مخاطب کیا ہے، کہیں گہری بات واضح کی ہے، کہیں سادہ اور روزمرہ کی بات کہی ہے، مخاطب کی سمجھ اور مطلب سمجھنے اور سمجھانے کا خیال رکھا گیا ہے، ایسی صورت میں اس کا ترجمہ حقیقت میں تو ناممکن ہے، لیکن

ضرورت کی بنا پر ان لوگوں کے فائدہ کے لیے جنہوں نے عربی زبان کا علم حاصل نہیں کیا اور عربی زبان کے انداز بیان کو نہیں سمجھا، ان کے لیے، ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے صاحب صلاحیت لوگوں نے ترجمے کیے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے کیے ہیں کہ وہ حق تو ادا نہیں کر پا رہے ہیں لیکن بقدر ضرورت مفہوم کو مخاطب کی سمجھ کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہی بات مفتی محمد سرور فاروقی صاحب ندوی کے ترجمۂ قرآن کریم کی ہے۔

اس ترجمہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس کام کو عرصہ سے انجام دے رہے ہیں اور اپنے اساتذہ اور باصلاحیت رفقاء کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، انہوں نے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کیا اور کئی سال کی کوششوں کے بعد سات جلدوں میں تفسیر بھی لکھی، اب اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں، ترجمہ کی دشواری اور خصوصیت کا احساس پوری طرح رکھتے ہیں اور اس دشواری کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے تمہیدی مضمون میں وضاحت کی ہے اور اس مشکل کا اعتراف کیا ہے اور اس مشکل کا جتنا حل ان کے تجربہ اور علم میں آیا ہے اس کا انہوں نے جو لحاظ کیا ہے اس کا تذکرہ کیا ہے، ان کے اس تذکرہ سے اس سلسلہ میں ان کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے ترجمے کے بعض نمونے دیکھے تو اندازہ ہوا کہ بہتر سے بہتر جو بات ان کو سمجھ میں آئی وہ اختیار کی ہے، بلکہ دوسرے بڑی صلاحیتوں کے حامل لوگوں نے جو ترجمے کیے ہیں اس پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے، تاکہ جس قدر وہ راہ مستقیم پر چل سکیں، چلیں اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہیں، ہم اس پر اپنی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے اس ترجمہ کی جو افادیت ہے اس کے اثرات کی اچھی توقع رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں، **و ھو الموفق و ھو یھدی السبیل۔**

محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
(شب جمعرات، دارالحسن، خاتون منزل، گولا گنج، لکھنؤ)

۶ صفر ۱۴۳۷ھ
۱۸ نومبر ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم

(مہتمم دارالعلوم دیوبند، الھند)

بسم سبحانہ وتعالیٰ

قرآن پاک کے ترجمہ وترجمانی اور تفسیر وتشریح کا عمل انتہائی نازک عمل ہے، صرف اس بنا پر نہیں کہ قرآن عظیم الشان جو کہ فصاحت وبلاغت کے معجزانہ معیار پر ہے اور اپنی وسعت وگہرائی کے لحاظ سے اس کی تعبیرات کا درحقیقت کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس بنا پر بھی کہ قرآن پاک کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا انتہائی حساس، نازک اور ذمہ داری کا عمل ہے کہ ترجمہ نگار گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے الفاظ میں جو مفہوم ادا کر رہا ہوں یہی مراد خداوندی ہے۔ اور قرآن پاک میں عربی زبان میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے بعینہ وہی بات میں ترجمہ کی زبان میں نقل کر رہا ہوں، اس لئے متقدمین بطور خود کسی آیت کا ترجمہ کرنے کے مقابلہ میں اس بات میں عافیت محسوس کرتے تھے کہ کسی محقق عالم کے ترجمہ کو نقل کر دیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے مفسر کے لئے ۲۵/علوم میں مہارت کو ضروری قرار دیا ہے، جو آسان نہیں ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ پاک کے پیغام کو عام مسلمانوں تک انذار وتبشیر اور موعظت ونصیحت کی خاطر پہنچانے کی مخلصانہ کوششیں ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہیں۔

جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اس سے قبل ہندی زبان میں قرآن پاک کی ترجمانی کی خدمت انجام دی ہے، جسے اہل علم نے سراہا ہے، اور اب ان کے اردو ترجمہ کا نمونہ سامنے آیا ہے جس میں حتی الامکان لفظی ترجمہ کی کوشش کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

لیکن صرف لفظی ترجمہ کی بنیاد پر قرآن فہمی کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ محقق علماء واکابر نے اپنے ترجمہ کے ساتھ جو تفسیری حواشی تحریر فرمائے ہیں مثلاً تفسیر بیان القرآن یا فوائد عثمانی پر ترجمہ شیخ الہند، ان کو بھی مطالعہ میں شامل رکھنا چاہئے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۵ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ

۱۴/فروری ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم
(مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند ونائب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ)

وحی ربانی کی مخاطب بننے والی تین صاحب عقل مخلوقات ''جنات'' ''ملائکہ'' اور ''انسان'' ہیں خالق حکیم نے عقل انسانی کو صرف تحمل وحی کی قدرت ہی نہیں دی بلکہ اس کے سرار وغوامض، اور عبارت، اشارت، دلالت، اور اقتضا میں مکنون حقائق ولطائف اور احکام وہدایات تک پہنچنے کی قوت تدبر وتعمق کی عظیم صلاحیت سے نواز کر، منصب نبوت کی اہلیت وصلاحیت کے شرف سے انسان کو مشرف فرمایا، اور ان پر وحی کا نزول فرما کر انسانیت کی رہنمائی فرمائی۔

کتاب فطرت قرآن کریم نے، اقوام وامم کی ترقی وتنزلی کے لئے بطور ضابطہ فطرت ''انّ مَعَ العُسر یُسرا'' کو پیش فرمایا ہے جو ایک اساسی اور فطری ربّانی قانون ہے۔

نئی نسل کے دینی مربّی علمائے کرام اگرچہ اپنی عظیم علمی وسعت، اور وقیع مخلصانہ جذبہ خدمت کے باوجود بالعموم نئی نسل کی جدت ذوق اسلامک میں پرداز اور محبوب انداز پر کلام سے اپنے علمی ذوق کی وجہ سے مانوس نہیں ہیں، اور طویل تجربات اس پر شاہد عدل ہیں کہ اس ناآشنائی اور ناواقفیت کے نتیجے میں ان کی خدمات کا معتد بہ حصہ بے اثر وبے نتیجہ رہ جاتا ہے، جبکہ ہمارے پاس وقت کی زندہ زبان، نئے طرز فکر، اور جدید تعبیر وبیان سے واقفیت کے ساتھ دینی ذوق ومزاق رکھنے والا، عصری تعلیم سے آراستہ وہ طبقہ بھی موجود ہے کہ جسے ہم بسہولت اس اہم ملّی اور دینی خدمت میں استعمال کر سکتے ہیں، اور نئی نسل کے سامنے آنے والے نئے سوالات، نئے شبہات، نئے اعتراضات اور نئی تلبیسات کے نہ صرف جوابات ہی سے بلکہ ان کے مانوس افکار ونظریات کو ملحوظ رکھ کر ان کی محبوب زبان واصطلاحات کے ذریعہ انہیں مطمئن بھی کر سکتے ہیں، اور نئے چیلنجوں کا کتاب وسنت کی روشنی میں تار پود بھی بکھیر سکتے ہیں، اسلام کی بنیاد پر نئی مسلم نسل کے روشن مستقبل سازی کے لئے اس کا سد باب بھی ضروری ہے۔

مفتی مولانا محمد سرور فاروقی صاحب ندوی نے قرآن کریم کا لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو ترجمہ کر کے ایک نمایاں کام انجام دیا ہے، جس سے عوام الناس کو استفادے میں آسانی ہو جائے گی، حق تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مزید دینی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین،

۵ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ
مطابق ۱۴ فروری/ ۲۰۱۶ء

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

تائیدی کلمات

حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم

(استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیت علماء ہند)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

أحمدہٗ وأصلی علیٰ رسولہ الکریم

آقاء نامدار حضرت محمد صلی کی خصوصیت میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے رحمت بنائے گئے ہیں، جس طرح آپ ذات تمام عالم کے لئے ہے اسی طرح آپ کی لائی ہوئی شریعت اور کتاب یعنی قرآن کریم بھی تمام عالم کے لئے ہدایت ہے، کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم سے جن افراد کے لئے عنداللہ ہدایت مقدر تھی انہوں نے قرآن کو اور اس کی ہدایت کو اپنایا اور دین ودنیا کی سعادت کے مستحق ہوئے، قرآن اور صاحب قرآن کا اس کو اعجاز ہی کہا جائے گا کہ جزیرۃ العرب کے اِردگرد ایشیا اور افریقہ کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے کہ جس نے قرآن کو اس طرح اپنایا کہ اپنی اور اپنے آباء واجداد کی مادری زبان کو یکسر چھوڑ دیا اور قرآن کی زبان کو یکسر چھوڑ دیا اور قرآن کی زبان کو اپنی زبان بنالیا، چونکہ قرآن صرف الفاظ کا ہی نام نہیں ہے بلکہ الفاظ اور معنیٰ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، یعنی فرشتہ جس طرح قرآن کے الفاظ رسول اللہ کے پاس لاتا تھا اسی طرح ان الفاظ کے معنیٰ یعنی مرادِ خداوندی بھی لیکر آتا تھا، اس لئے یہ ایک اسلامی اصول بن گیا کہ ان الفاظ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شخص اپنی طرف سے اس کے معنیٰ کو متعین کرسکتا ہے، چنانچہ ساری دنیا کے مسلمان قرآن کو پڑھتے ہیں تو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اترا تھا اور جس طرح اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، البتہ اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی تفسیر کو آسان الفاظ اور اپنی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے ہمارے ہندوستان کے علماء نے ضرورت پڑنے پر قرآنی علوم کو عربی زبان سے فارسی زبان میں منتقل کرڈالا، اور جب فارسی زبان کا چلن ختم ہونے لگا تو قرآنی علوم کو اردو زبان میں منتقل کردیا گیا۔

اب جبکہ ہندی زبان ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے اور امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو سے دور ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کو ہندی زبان میں بھی منتقل کیا جائے۔

یہ بات قابل قدر ہے کہ مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے مذکورہ ضرورت کو ملحوظ رکھ کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو سامنے رکھتے ہوئے مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا ہے، اور اب ہندی ترجمہ وتفسیر کے بعد اردو زبان میں لفظی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے رواں ترجمہ کیا ہے جو عوام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اگرچہ یہ فقیر اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کو بالاستیعاب نہیں دیکھ سکا، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو بنیاد بنانا اس ترجمہ کی ثقاہت کے لئے کافی ہے۔

سید ارشد مدنی

(صدر جمعیت علماء ہند)

۱۵ فروری/ ۲۰۱۶ء

۵ / جمادی الاول/ ۱۴۳۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی دامت برکاتہم

(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، ومدیر البعث الاسلامی لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین و امام المتقین و علی من تبعھم باحسان الی یوم الدین: امابعد!

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے یہ رہتی دنیا تک انسانی زندگی کی بھرپور رہنمائی کرتا رہے گا اور کائنات، زندگی اور انسان سب کے لئے ہمیشہ ہمیش روشنی کا مینار بنکر قائم رہے گا اور زندگی کے تمام مسائل کا ہر زمان ومکان میں فطری حل پیش کرتا رہے گا، زمانہ چاہے جتنا بھی بدل جائے علم چاہے جتنا بھی ترقی کرلے، سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں انسان خواہ کتنا ہی بلند ثابت ہوجائے، طرح طرح کے حیرت انگیز دریافتوں سے علم کا سینہ کتنا ہی معمور ہوجائے مگر اللہ کے کلام کی رہنمائی پوری طاقت کے ساتھ اپنا معجزہ دکھاتی رہے گی، تاریخ اپنے حیرت انگیز صفحات میں اضافہ کرتی رہے گی، زمین کا تعلق آسمان سے گہرا ومضبوط ہوتا جائیگا، ایمان ویقین اپنے قائدانہ کردار سے تمام تاریک گوشوں کو منور کرتے رہیں گے، انسان کے اندر روشنی کی تلاش میں شدید اصرار کا جذبہ کارفرما ہوتا رہے گا اور کوئی مادّی طاقت اس کو تلاش صبح روشن سے روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے گی۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی عملی سیرت میں پوری طرح موجزن ہیں۔

قرآن کریم اپنے بے پناہ وسعت کے لحاظ سے روشنی در روشنی کا ایک بحر متواج ہے، اسی کے رہنما دائمی اصولوں پر نوع بنی انسان کا وجود قائم ہے اس لئے ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس کتاب جاوداں سے مکمل طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے معنٰی ومطلب کو سمجھنے اس کے حقائق اور باریکیوں پر غور کرنے اور زندگی کے ماضی حال مستقبل کو سمجھنے اور جلا بخشنے کی راہ میں اپنا علمی سفر شروع کریں اور سب سے پہلے اس کتاب عظیم کے معانی ومفاہیم کا ادراک حاصل کرنے کے لئے اس کی آیتوں کے ترجمہ پر غور کریں اور دیکھیں کہ کامیاب زندگی کے لئے یہ کس قدر ضروری اور ناگزیر ہے۔

یوں تو اس کتاب عزیز کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں تفسیریں لکھی جاچکی ہیں اور لوگوں نے بقدر ظرف ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ ہمارے اس ملک میں ہندی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ اور اس مختصر تفسیر مختلف اداروں اور شخصیات کی طرف سے شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں لیکن ابھی تک کسی ایسے عالم دین کی طرف سے جس کو ہندی زبان پر پوری طرح عبور حاصل ہو اور وہ عربی زبان کی روح کو سمجھ کر ہندی زبان میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، کوئی کام نہ ہوسکا تھا، ہمیں اس بات کا

اعتراف کرنے میں نہایت خوشی ہورہی ہے کہ ہمارے حلقۂ ندوۃ العلماء کی طرف سے یہاں کے عالم دین عربی، اردو، ہندی کے ماہر مایہ ناز ادیب عالم اور صحابی قرآن کریم کا ہندی زبان میں ایک نہایت ہی قابل وثوق اور عربی زبان کی روح سے قریب تر ہندی ترجمہ پیش کررہے ہیں اس ترجمہ کی چند خصوصیات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔اس سے قبل چند اردو کے ترجمے ہندی رسم الخط میں تبدیل کئے گئے لیکن ان میں بعض لوگوں نے خالص اردو زبان کا استعمال کیا ہے جس سے ہندی داں یا غیر مسلم بالکل ناواقف ہیں اور بعض لوگوں نے سخت ہندی کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے بالکل ناقابل فہم ہوگیا ہے اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر مترجم عربی داں یا عالم دین جو تمام اصطلاحات سے واقف ہو تاکہ ترجمہ کا صحیح فائدہ ہندی داں طبقہ کو نہایت اچھے اور عملی انداز میں پہونچتا اور اس کا بنیادی مقصد پورا ہوتا، اس لئے ضرورت تھی کہ ایسا ترجمہ جو اصل عربی سے قریب تر اور الفاظ درمیانی یعنی نہ سخت ہندی ہو اور نہ سخت اردو تو اس میں دونوں کی ہی رعایت کی گئی ہے۔

۲۔انہی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو قرآنی ہیں اور معاشرے میں ابھی استعمال ہوتے ہیں جیسے ''ظالم'' اردو کا لفظ ہے لیکن عام فہم ہے جبکہ ہندی میں اس کو ''اتیاچاری'' کہتے ہیں اس طرح سمیپ بمعنی قریب ہوتا ہے لیکن قریب سبھی لوگ سمجھتے ہیں اس لئے اسی کو استعمال کیا گیا ہے۔

۳۔اسی طرح وہ الفاظ جو مسلمانوں کے یہاں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جیسے رحمت، مغفرت، رحمٰن، رحیم وغیرہ لیکن ہندو بھائی بالکل ناواقف ہوتے ہیں تو ایسے الفاظ کی تشریح بریکٹ میں کردی گئی ہے۔

۴۔اسی طرح ان الفاظ سے احتیاط برتی گئی ہے جس کے معنیٰ قدیم دور میں کچھ تھے اور اب وہی الفاظ دوسرے معنیٰ میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

۵۔اس ترجمہ میں اتباع سلف کو بنیاد بنا کر معبر تراجم سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔اس طرح بیک وقت اصطلاحی ترجمہ کے ساتھ لفظی رعایت بھی کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کوشش ہر حلقے کے لئے مفید ومقبول بن گئی ہے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتا ہوں یا عام خواندہ گروہ سے متعلق ہو۔

ان تمام خصوصیات کی بناء پر جناب مولینا محمد سرور فاروقی ندوی کا یہ علمی تحفہ ان کی یہ علمی کاوش ہمارے اس ملک کے ہندی داں طبقے کے لئے خاص طور پر بے انتہا ضروری اور مفید ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمت قرآن سے متعلق جملہ مساعی کو قبولیت عام سے سرفراز فرمائیں۔اور اپنے شایان شان جزائے خیر سے نوازے۔آمین۔

سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
(مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، الھند)

۹/جون ۲۰۰۴ء
۱۹/۴/۱۴۲۵ھ

فہرست مضامین

عرض ناشر ۳
دعائیہ کلمات (عالم اسلام کی عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے) ۴
عالم اسلام کے معروف علماء دین کی تصدیقات کے منتخب جملے جیسے ۶
عالم اسلام کی معروف شخصیت مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ العالی، معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ، معروف عالم دین حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی، معروف عالم دین اور ادیب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی، معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سعید مظاہری رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی، عالمی شہرت یافتہ ادیب حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ، حضرت مولانا عبدالقادر ندوی مظاہری گجراتی مدظلہ العالی، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ھلال عثمانیؒ، مشفق ومربی حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ وغیرہ حضرات کے تائیدی کلمات۔
عرض مترجم ۱۲

(سورہ آل عمران آیت نمبر ۳۸ سے سورہ نساء آیت نمبر ۱۱۶ تک)

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۳۸ سے ۴۶ تک)	۱۶
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۳۸ سے ۴۶ تک)	۱۷
حضرت زکریاؑ کا تعجب	۱۸
دنیا کی بہترین عورتیں	۲۰
رسول ہونے کی دلیل	۲۱
مسیح کا لقب	۲۲
گود میں بات کرے گا	۲۳
گود میں تین بچوں کی گفتگو	۲۳
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۴۷ سے ۵۵ تک)	۲۴
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۴۷ سے ۵۵ تک)	۲۵
عقلی جواب (Rational Explanation)	۲۶
سائنسی جواب (Modern Science Perspective)	۲۶

مضمون	صفحہ نمبر
کلوننگ اور جنیٹک سائنس	۲۷
سائنس کی حد	۲۷
سائنسی قوانین میں تبدیلی	۲۷
''کُنْ فَیَکُوْن'' کا سائنسی مفہوم	۲۷
کلوننگ کا عمل	۲۸
بغیر نر کے تولید	۲۸
حضرت مریم کو بشارت	۲۹
اللہ کی نشانی	۳۰
انبیاء علیہم السلام کی دعوت	۳۱
ظاہری اسباب توکل کے منافی نہیں	۳۲
آسمان کی طرف سفر	۳۴
لغت کی معتبر کتابوں کے مطابق	۳۵

مضمون	صفحہ نمبر
''خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ'' کا مطلب	۳۵
سائنس کا اصول	۳۶
اللہ کے لئے ''مکار'' کہنا کیوں غلط ہے؟	۳۶
حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش	۳۷
مفسرین کی رائے	۳۸
نصاریٰ کا غلبہ	۳۸
قیامت کے قریب آسمان سے نزول	۳۸
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک)	۴۰
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۵۶ سے ۶۴ تک)	۴۱
دنیاوی عذاب کی شکلیں	۴۱
ناقابلِ برداشت عذاب	۴۲
جہنم کی آگ	۴۳
دائمی حسرت اور پچھتاوا	۴۳
اللہ کی رحمت سے محرومی	۴۳
بے مثال حکمت کا اظہار	۴۵
آیاتِ مباہلہ	۴۶
اسباب نزول	۴۶
ہرقل کے نام رسول اللہ ﷺ کے خط کا ترجمہ	۴۹
تین بنیادی اصولوں کی دعوت	۴۹
علماءِ سوٗ کی اتباع	۵۰
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۶۵ سے ۷۴ تک)	۵۱
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۶۵ سے ۷۴ تک)	۵۲
ملتِ ابراہیمی کی نسبت	۵۳
ایمان والوں کے لئے خوشخبری	۵۴
مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرنے کی سازش	۵۷
اللہ کی حکمتیں	۵۷

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۷۵ سے ۸۲ تک)	۵۹
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۷۵ سے ۸۲ تک)	۶۰
یہودیوں کی دینی ومالی خیانت	۶۰
وضاحت	۶۱
جھوٹی قسم کھانے کی ممانعت	۶۱
عہد کی پاسداری اور تقویٰ	۶۲
اللہ کے عہد اور قسموں کا بدلہ	۶۳
سبب نزول	۶۳
یہود کا واقعہ	۶۳
حضرت عیسیٰؑ پر الزام	۶۵
بندگی کی اعلیٰ مثال	۶۶
حضرت عیسیٰؑ کا بشر ہونا	۶۶
علم نافع	۶۷
عبادت کی ایک شکل	۶۷
انبیاءؑ کا مشن	۶۸
نبی کی عظمت کا معیار	۶۸
آخری نبی ﷺ پر ایمان	۶۹
رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت	۷۰
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۸۳ سے ۹۱ تک)	۷۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۸۳ سے ۹۱ تک)	۷۳
دین محمدی سے روگردانی	۷۳
اللہ کے حکم کا پابند	۷۳
اللہ کے یہاں قابلِ قبول دین	۷۴
اللہ کے نزدیک قبولیت کا واحد راستہ	۷۵
اسلام کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم	۷۶
اصطلاحی معنیٰ	۷۶

مضمون	صفحہ نمبر
رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی فرضیت	۷۶
اہلِ کتاب کا انکار اور توبہ کا دروازہ	۷۷
کافر کی دعا	۷۷
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار	۷۹
اللہ کا عذاب	۸۰
قیامت کے دن جہنمی کا حال	۸۰
اخلاقی نیکیاں	۸۱
کافر کا حال	۸۱
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۹۲ سے ۱۰۱ تک)	۸۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۹۲ سے ۱۰۱ تک)	۸۳
حضرت ابوطلحہؓ کا نکاح	۸۳
یہود کے دعوے کی تردید	۸۴
یہود کی چالیں	۸۶
مقامِ ابراہیم اور شعائرِ حج	۸۶
حج کی فرضیت اور استطاعت	۸۷
اسبابِ نزول	۹۰
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۰۲ سے ۱۱۰ تک)	۹۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۰۲ سے ۱۱۰ تک)	۹۳
اتحاد کی بنیاد	۹۴
اصلاح اور دعوتِ دین کا نظام	۹۵
دعوت وتبلیغ کے لئے ایک باصلاحیت جماعت	۹۵
تبلیغ دین کی ذمہ داری	۹۶
امتِ مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری سے غفلت کے نتائج	۹۷
استطاعت کے مطابق دعوت	۹۷
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت تنبیہ	۹۸
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وجوب	۹۸
علم کے بغیر امیر بالمعروف	۹۹
امر بالمعروف کی قدرت	۹۹
منکر سامنے ہو تو ذمہ داری	۱۰۰
امر بالمعروف کے دو درجے	۱۰۰
دعوتِ اِلی الخیر (بھلائی کی دعوت)	۱۰۰
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وضاحت	۱۰۰
فرقہ بندی سے سخت تنبیہ	۱۰۱
اچھے اور برے اعمال کا بدلہ	۱۰۱
اعمال کی دائمی حیثیت	۱۰۲
شرمندگی اور رسوائی کا لمحہ	۱۰۲
ایمان کے بعد کفر	۱۰۳
کافروں جیسے اعمال	۱۰۳
فیصلہ کن سوال اور انجام	۱۰۳
ایمان وتقویٰ والوں کا انعام	۱۰۴
رحمت الٰہی سے مراد	۱۰۴
عدلِ الٰہی کا مظہر	۱۰۵
آخرت کا عذاب	۱۰۵
حقیقی مالک	۱۰۶
امتِ مسلمہ کی فضیلت اور اس کی بنیاد	۱۰۷
امتِ محمدیہ اور خیرِ امت	۱۰۸
افضلیت کی اصل دلیل	۱۰۸
ایمان باللہ سے پہلے امر بالمعروف کا ذکر	۱۰۸
حضرت عمرؓ کی تنبیہ	۱۰۹
ایمان باللہ کا مفہوم	۱۰۹
امت کا معیار	۱۰۹
امت کا زوال	۱۰۹

مضمون	صفحہ نمبر
برائی کو اچھا سمجھنا	۱۱۰
اہلِ کتاب کے لئے دعوت	۱۱۰
خیرِ امت کا مفہوم	۱۱۰
نہی عن المنکر کا عملی درجہ	۱۱۱
امتِ محمدیہ کی ذمہ داری	۱۱۱
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۱۱ سے ۱۱۷ تک)	۱۱۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۱۱ سے ۱۱۷ تک)	۱۱۳
اللہ کی مدد کا وعدہ	۱۱۳
یہود پر ذلت و مسکنت	۱۱۴
یہودیوں کو امن ملنے کے دو سبب	۱۱۵
پہلا سبب	۱۱۵
دوسرا سبب	۱۱۶
موجودہ یہودی حکومت	۱۱۶
ایک اصولی نکتہ	۱۱۷
یہودیوں پر ناراضگی کے اسباب	۱۱۷
سبھی کافر بُرے نہیں ہوتے	۱۱۷
بُروں میں کچھ اچھے بھی ہیں	۱۱۸
بعض اہل کتاب کے اوصاف	۱۱۹
کافروں کے اعمال کا بدلہ	۱۲۰
ایمان کی اہمیت	۱۲۰
کافروں کے صدقات و خیرات	۱۲۱
اعتراض کا جواب	۱۲۱
اعمال کی کھیتی	۱۲۲
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۱۸ سے ۱۲۷ تک)	۱۲۳
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۱۸ سے ۱۲۷ تک)	۱۲۴
کافروں کے ساتھ بے جا اختلاط کی ممانعت	۱۲۵

مضمون	صفحہ نمبر
دشمنی کی حقیقت	۱۲۵
ممکنہ شبہ کا ازالہ	۱۲۶
اصلاح کا قرآنی نسخہ	۱۲۶
آیت کا اصل مفہوم	۱۲۷
اسلام تمام غیر مسلموں کو دشمن نہیں سمجھتا	۱۲۷
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مسلموں کے ساتھ معاملات	۱۲۷
دنیاوی اصول	۱۲۸
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نا سمجھی کا وبال	۱۲۸
غزوۂ اُحد کا پس منظر	۱۲۹
منافقین کی دھوکہ بازی	۱۳۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی تدبیر	۱۳۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی ہونا	۱۳۱
اللہ پر بھروسا	۱۳۱
غزوۂ بدر	۱۳۳
بدر کا مقام اور پس منظر	۱۳۳
اہلِ ایمان کی تیاری	۱۳۳
قریش کا نقصان	۱۳۴
قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک	۱۳۴
اسلامی مساوات	۱۳۵
فرشتوں کے ذریعہ مدد	۱۳۵
مدد کی صورتیں	۱۳۶
صبر و تقویٰ کی شرط	۱۳۶
جنگ اُحد کا نقشہ	۱۳۷
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۳۸ تک)	۱۳۸
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۳۸ تک)	۱۳۹
تقویٰ کا حکم	۱۴۱

مضمون	صفحہ نمبر
سود کا حکم	۱۴۲
سودی قرض	۱۴۲
سود (Interest) کا نظام	۱۴۳
مرکب سود (Compound Interest) کا نظام	۱۴۳
سودی نظام کے بنیادی نقصانات	۱۴۳
سود اور غربت (Debt Trap)	۱۴۵
اسلامی معاشی نظام کا متبادل	۱۴۵
سودی نظام اور عالمی بینکاری	۱۴۶
تقویٰ (پرہیزگاری) کی تاکید	۱۴۶
جنت کی وسعت	۱۴۷
اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا	۱۴۸
صدقہ کی وسعت	۱۴۹
حقیقی طاقت اور غصہ پر قابو	۱۴۹
غصہ پی جانے کی فضیلت	۱۵۰
معاف کرنے کی فضیلت	۱۵۰
محسنین اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں	۱۵۱
توبہ اور استغفار کی فضیلت	۱۵۱
اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی گناہ معاف کرنے والا نہیں	۱۵۱
نیک بندوں کا عظیم اجر	۱۵۲
نصیحت اور عبرت	۱۵۲
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۸ تک)	۱۵۳
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۸ تک)	۱۵۴
ایمان والوں کو بلندی	۱۵۴
مسلمانوں کو تسلی	۱۵۵
اسباب نزول	۱۵۶
غزوۂ اُحد کے دن	۱۵۶
حالات میں تبدیلی	۱۵۷
غزوۂ اُحد کی حکمتیں	۱۵۷
اہل ایمان کی پہچان	۱۵۸
شہادت کا مقام و مرتبہ	۱۵۸
اہل ایمان کی تطہیر	۱۵۸
کافروں کا انجام	۱۵۸
وضاحت	۱۵۹
جہاد اور صبر	۱۵۹
شہادت کی تمنا	۱۵۹
دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرنا	۱۶۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفات کی افواہ	۱۶۱
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار	۱۶۱
حضرت طلحہؓ کا ہاتھ	۱۶۲
حضرت کعبؓ کی پکار	۱۶۲
حضرت انس بن نضرؓ کی شہادت	۱۶۳
حضرت ثابتؓ کی حوصلہ افزا تقریر	۱۶۳
ایک زخمی انصاری کا ایمان افروز جواب	۱۶۳
حضرت سعد بن ربیعؓ کا ایمان افروز واقعہ	۱۶۴
ابوسفیان کا نعرہ	۱۶۴
ابوسفیان کے نعرہ کا جواب	۱۶۴
حضرت عمرؓ کا ابوسفیان کو جواب	۱۶۵
اُبی بن خلف کا قتل	۱۶۵
سخت عذاب کا مستحق	۱۶۶
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب و مرتبہ	۱۶۶
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا دن	۱۶۶
آیت کا مفہوم	۱۶۷

مضمون	صفحہ نمبر
ہر جان کے لئے موت کا وقت	۱۶۷
دنیا اور آخرت کے اجر کا فرق	۱۶۸
تنبیہ اور نصیحت	۱۶۸
حق کے داعی	۱۷۰
واضح نصیحت	۱۷۰
پچھلی قوموں کی دعائیں	۱۷۰
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۴۹ سے ۱۵۵ تک)	۱۷۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۴۹ سے ۱۵۵ تک)	۱۷۲
کافروں کی اطاعت	۱۷۴
الذین کفرو کا مفہوم	۱۷۴
دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالنے کا وعدہ	۱۷۵
خالق اور مخلوق	۱۷۶
عقیدہ اور عمل	۱۷۶
قرآن مجید کا واضح اصول	۱۷۷
غزوۂ اُحد کی وقتی ناکامی	۱۷۹
تیراندازوں کے امیر	۱۷۹
ایک غم کے بدلے میں دوسرا غم	۱۸۰
مسلمانوں کی آزمائش	۱۸۰
غم پہنچانے میں بھی حکمت	۱۸۱
غم دور کرنے کے لئے نیند کا غلبہ	۱۸۱
صحابہؓ کی معافی کا اعلان	۱۸۲
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۵۶ سے ۱۶۸ تک)	۱۸۳
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۵۶ سے ۱۶۸ تک)	۱۸۴
کافر اور جہاد	۱۸۵
شہادت اور موت	۱۸۶
مغفرت اور رحمت	۱۸۶

مضمون	صفحہ نمبر
شہید کا مرتبہ	۱۸۷
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق	۱۸۷
بلند اخلاق کا اظہار	۱۸۸
حسن اخلاق کا پیکر	۱۸۹
استاذ اور مصلح کے اخلاق	۱۸۹
مشورہ کرنے کا حکم	۱۹۰
مشورت کی ضرورت	۱۹۰
استخارہ کی اہمیت	۱۹۰
مشورے کی شرعی حیثیت	۱۹۱
مشورے کا حکم آج بھی	۱۹۲
موجودہ جمہوریت (Modern Democracy)	۱۹۲
جمہوری انتخابات	۱۹۳
نمائندگی	۱۹۳
اسلامی نظام میں قیادت کا اصول	۱۹۴
خلفائے راشدین کا انتخاب	۱۹۴
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۱۹۵
حضرت عمر فاروقؓ اور مجلس شوریٰ	۱۹۵
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد	۱۹۵
اللہ تعالیٰ کی مدد	۱۹۶
خیانت کی ممانعت	۱۹۷
مالِ غنیمت کی تقسیم کا طریقہ	۱۹۷
خیانت اور غلول کی سنگینی	۱۹۸
مال غنیمت میں خیانت	۱۹۸
قیامت کے دن	۱۹۸
خیانت کا وبال	۱۹۸
وقف کے مال میں خیانت	۱۹۸

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ تعالیٰ کی خوشی کے طالب	۲۰۰
اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان	۲۰۱
مسلمانوں کو تسلی	۲۰۲
اللہ تعالیٰ کی حکمت	۲۰۳
منافقوں کا عذر	۲۰۳
موت سے حفاظت	۲۰۴
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۶۹ سے ۱۷۹ تک)	۲۰۵
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۶۹ سے ۱۷۹ تک)	۲۰۶
شہداء کی زندگی	۲۰۷
شہداء کا انعام	۲۰۷
شہداء کی خواہش	۲۰۷
شہداء کی عظیم نعمتوں کا ذکر	۲۰۷
شہادت کی تمنا	۲۰۸
صحابہ کی بے مثال اطاعت	۲۰۹
توکل علی اللہ کی درخشاں مثال	۲۱۰
استقامتِ صحابہؓ	۲۱۱
شیطانی خوف	۲۱۲
کفار کی سازشیں	۲۱۳
ایمان کے بدلے کفر کا سودا	۲۱۳
مہلت الٰہی کا راز	۲۱۴
نافرمانوں کو مال و دولت کی کثرت	۲۱۵
فاجر کی نعمتوں پر رشک	۲۱۵
منافقین کا نفاق	۲۱۶
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۸۰ سے ۱۸۹ تک)	۲۱۷
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۸۰ سے ۱۸۹ تک)	۲۱۸
کنجوسی کی مذہب	۲۱۸

مضمون	صفحہ نمبر
زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید	۲۱۹
مال ایک آزمائش ہے	۲۱۹
یہود کی گستاخی	۲۲۰
قرآن کے اسلوب پر اعتراض	۲۲۱
برے اعمال کا انجام اور منکرین کا طرز عمل	۲۲۲
مطالبہ کا جواب	۲۲۲
ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے	۲۲۳
حقیقی کامیابی کا معیار	۲۲۳
دنیا ایک فریب انگیز متاع	۲۲۳
اسباب نزول	۲۲۴
اہل کتاب سے عہد اور خلاف ورزی	۲۲۶
یہودیوں کا فریب	۲۲۶
یہود اور منافقین	۲۲۷
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک)	۲۲۸
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۹۰ سے ۲۰۰ تک)	۲۲۹
اللہ کی قدرت کی نشانیاں	۲۳۰
اللہ کے ذکر کی حقیقت	۲۳۱
خالق کی معرفت	۲۳۱
آخرت کی رسوائی اور ظالموں کا انجام	۲۳۲
اولوالالباب کی دعا اور اس کے معانی	۲۳۳
سب کے لئے ہادی و داعی	۲۳۳
سیئات سے مراد	۲۳۴
وعدۂ الٰہی کی امید اور دعا کا یقین	۲۳۵
دعا کی تکمیل	۲۳۵
اطاعت میں مرد و عورت کی یکسانیت	۲۳۶
مہاجرین و مجاہدین کا عظیم ثواب	۲۳۷

مضمون	صفحہ نمبر
عظیم بشارت	۲۳۷
کافروں کے حالات اوران کا انجام	۲۳۸
اسباب نزول	۲۳۸
متقیوں کا انجام	۲۳۹
بعض اہل کتاب کی خصوصیات	۲۴۰
نیکیوں کا صلہ	۲۴۱
پہلی نصیحت (صبر واستقامت)	۲۴۱
دوسری نصیحت (مقابلے میں ثابت قدمی)	۲۴۲
تیسری نصیحت (ہمہ وقت تیاری اور سرحدوں کی حفاظت)	۲۴۲
سرحد کے پہرے داروں کی فضیلت	۲۴۲
رباط کا وسیع مفہوم	۲۴۳
چوتھی اور آخری نصیحت (تقویٰ)	۲۴۴
سورہ نساء کا مختصر تعارف	۲۴۶
اسباب نزول	۲۴۶
وضاحت	۲۴۷
سورہ کا خلاصہ	۲۴۸
وراثت کے احکامات	۲۴۸
زنا کی حرمت	۲۴۸
بیوی شوہر کے تعلقات	۲۴۸
پاکیزگی کی اہمیت	۲۴۹
منافقین کی دوغلی پالیسی کا ذکر	۲۴۹
قتل مومن کے احکامات	۲۴۹
حسن سلوک اور انصاف کا حکم	۲۵۰
نماز میں سستی کا انجام	۲۵۰
یہود ونصاریٰ کی سرکشی	۲۵۰
سورہ نساء کی فضیلت	۲۵۰

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ا سے ۱۰ تک)	۲۵۲
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ا سے ۱۰ تک)	۲۵۳
خاندانی نظام کے لئے جامع قوانین	۲۵۴
آخرت کی جواب دہی کا احساس	۲۵۴
قیامت تک کے تمام انسان	۲۵۵
پیدائش کی حکمتیں	۲۵۵
حضرت حوّا کی تخلیق	۲۵۵
پیدائش کی تین صورتیں	۲۵۶
اللہ کے نام پر تعلقات کی پاسداری	۲۵۶
اللہ ہر حال سے باخبر ہے	۲۵۷
یتیموں کے حقوق	۲۵۸
ولی کو ہدایت	۲۵۸
اچھی چیز کو بری چیز سے نہ ملاؤ	۲۵۸
یتیم کے مال کا حکم	۲۵۹
یتیم کے مال کا مفہوم	۲۶۰
شدید وعید اور گناہ کی سنگینی	۲۶۰
یتیم لڑکیوں کے حقوق	۲۶۱
تعددِ ازواج اور عورتوں کے حقوق	۲۶۱
مغربی معاشرے کا حال	۲۶۲
خواتین کی اضافی تعداد کا حل	۲۶۲
نکاح کی ترغیب	۲۶۲
یتیم کے ساتھ انصاف	۲۶۳
چار بیویوں کی حد	۲۶۳
حضرت گیلان بن اسلمہ ثقفیؓ کے نکاح میں	۲۶۳
حضرت قیس بن الحارث الاسدیؓ کے نکاح میں	۲۶۳
عدل کی شرط	۲۶۴

مضمون	صفحہ نمبر
بیویوں کے درمیان مساوات اور اعتدال کا حکم	۲۶۵
اسلام کا معتدل نظام	۲۶۶
تعددِ ازدواج (تاریخی تناظر)	۲۶۶
اعتدال اور حکمت کا جامع نظام	۲۶۷
انبیائے کرام علیہم السلام اور تعددِ ازدواج	۲۶۷
حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰؑ	۲۶۷
حضرت محمد ﷺ سے پہلے کا معاشرتی پس منظر	۲۶۸
عصرِ حاضر اور مغربی معاشرہ	۲۶۸
قانونِ اسلام اور عصرِ حاضر کا تضاد	۲۶۸
یتیم لڑکیوں کے حقوق کی حفاظت	۲۶۹
اسلامی شریعت کا حکم	۲۷۰
انسان کی حیاتیاتی (Biological) حقیقت	۲۷۰
طبی وجسمانی پہلو	۲۷۱
نفسیاتی پہلو	۲۷۱
سماجی وخاندانی نظام	۲۷۲
اخلاقی وعملی حقیقت	۲۷۲
مختلف مذاہب اور تہذیب میں متعدد بیویوں کی مثالیں	۲۷۳
یہودی شریعت میں تعدد ازدواج	۲۷۴
حضرت یعقوب، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی بیویاں	۲۷۴
یورپی معاشروع میں ایک سے زائد بیویوں کا رواج	۲۷۵
ہندوازم کی مذہبی روایات میں	۲۷۶
برہما (ब्रह्मा) کی بیویوں کی تعداد	۲۷۷
وِشنو (विष्णु) کی بیویوں کی تعداد	۲۷۸
مہیش/مہادیو/شیو کی بیویوں کی تعداد	۲۷۹
شری کرشن جی (कृष्ण) کی بیویوں کی تعداد	۲۷۹
8 اہم رانیوں (अष्टमहिषी) کا ذکر	۲۸۰
شری کرشن کی 8 رانیوں کے نام	۲۸۰
16108 بیویوں کا ذکر	۲۸۰
راجہ دشرتھ (राजा दशरथ) کی بیویاں	۲۸۱
ارجن (अर्जुन) کی بیویوں کی تعداد	۲۸۱
خلاصہ	۲۸۲
مہر کی ادائیگی اور عورت کا حق	۲۸۲
مہر کی خوش دلی سے ادائیگی	۲۸۳
مہر معاف کرنے کا مفہوم	۲۸۴
خوش دلی اور مہر کا حقیقی مفہوم	۲۸۴
رضامندی کی شرط اور شرعی اصول	۲۸۴
عملی زندگی میں اس اصول کی اہمیت	۲۸۵
مہر کی مقدار میں اعتدال	۲۸۵
مہر کی مقدار	۲۸۱
مہر کی ادائیگی کی اہمیت	۲۸۶
مہر معاف کرنے کی صورت	۲۸۶
مہر کی مناسب مقدار کا تعین	۲۸۷
معاشرتی اصلاح	۲۸۷
یتیموں کے سرپرستوں کو ہدایت	۲۸۸
مال کی اہمیت اور اس کی حفاظت	۲۸۸
مال کی ضرورت	۲۸۹
مال کی حفاظت کا حکم	۲۸۹
یتیم کے مال کے لئے بلوغت اور فہم کی شرط	۲۸۹
یتیم کے سرپرست کی ذمہ داریاں	۲۹۰
گواہی اور تحریر کی اہمیت	۲۹۰
حساب لینے والا	۲۹۱
ایک عمومی اصول	۲۹۱

مضمون	صفحہ نمبر
وراثت کے احکام	۲۹۱
قانونِ وراثت کا امتیاز	۲۹۲
قانونِ وراثت کی تمہید اور اسلامی اصلاح	۲۹۳
محروم رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک	۲۹۵
حکم کی نوعیت	۲۹۵
ایک اہم اخلاقی نتیجہ	۲۹۵
نرمی اور دلجوئی کا حکم	۲۹۶
یتیم کے مال میں خیانت پر سخت وعید	۲۹۷
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۱۱ سے ۱۶ تک)	۲۹۹
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۱۱ سے ۱۶ تک)	۳۰۰
لڑکوں اور لڑکیوں کے حصصِ میراث	۳۰۱
لڑکے کا حصہ دو گنا رکھنے کی حکمت	۳۰۲
اگر صرف بیٹیاں ہوں	۳۰۲
ماں باپ کے حصصِ میراث	۳۰۳
وصیت کا حق اور اس کی حکمت	۳۰۳
دنیاوی قوانین اور شریعتِ اسلامی کا امتیاز	۳۰۴
چند اہم فقہی نکات	۳۰۵
دورِ جاہلیت میں وراثت اور اسلامی اصلاحات	۳۰۵
شانِ نزول سے متعلق روایات	۳۰۶
اولاد کی میراث	۳۰۷
صرف لڑکیاں ہوں تو حکم	۳۰۷
اگر ایک ہی لڑکی ہو	۳۰۷
ماں باپ کے حصص اور ترکہ کی ترتیب	۳۰۷
ترکہ کی تقسیم سے پہلے	۳۰۸
میراث کے تقسیم کی حکمتیں	۳۰۹
کلالہ کی میراث کا حکم	۳۱۰

مضمون	صفحہ نمبر
جس کے نہ اصول ہو نہ فروع	۳۱۰
وصیت کے بعد	۳۱۱
بھائی بہن کی اقسام اور ان کے حصص	۳۱۱
تیسرے قسم کی تفصیل	۳۱۱
وارثوں کو نقصان پہنچانے کی ناجائز صورتیں	۳۱۲
جائداد میں حصہ پانے والے افراد	۳۱۳
انسانوں کی قسمیں	۳۱۸
تیسری قسم	۳۱۸
حضرت عمرؓ کی نصیحت	۳۱۸
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نصیحت	۳۱۹
حضرت ابوموسیٰؓ کی نصیحت	۳۱۹
زنا کا جرم	۳۱۹
زانی کی سزا کا حکم	۳۲۰
چار گواہوں کی شرط	۳۲۰
چار گواہوں کے شرط کی حکمت	۳۲۱
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۱۷ سے ۲۳ تک)	۳۲۳
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۱۷ سے ۲۳ تک)	۳۲۴
توبہ کی حقیقت	۳۲۴
توبہ کی قبولیت	۳۲۵
توبہ کے عدمِ قبولیت کی صورت	۳۲۶
پہلی حالت	۳۲۶
دوسری حالت	۳۲۶
سچی توبہ	۳۲۸
ظالمانہ رسمیں	۳۲۸
عورت کو میراث سمجھنا	۳۲۹
مردوں کے لئے خصوصی ہدایت	۳۳۰

مضمون	صفحہ نمبر
مردوں کو نصیحت	۳۳۰
عربوں کا حال	۳۳۱
ازدواجی زندگی میں اعتدال	۳۳۱
ظلم کی ممانعت	۳۳۱
عورتوں کے حقوق کی حفاظت	۳۳۲
مہر کی ترغیب	۳۳۳
مہر کی مقدار	۳۳۳
تحفہ واپس لینا	۳۳۴
عہدِ جاہلیت کی ایک قبیح رسم	۳۳۴
سوتیلی ماں سے نکاح	۳۳۴
باپ کی بیوی سے نکاح	۳۳۵
جن سے نکاح حرام ہے	۳۳۶
دوسری قسم: محرماتِ رضاعیہ (دودھ کے رشتے سے حرام ہونے والی عورتیں)	۳۳۷
حرمت رضاعت کا دور	۳۳۷
شہادت	۳۳۸
تیسری قسم: محرماتِ مصاہرت (سسرالی رشتے)	۳۳۸
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۲۴ سے ۳۳ تک)	۳۴۰
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۲۴ سے ۳۳ تک)	۳۴۱
حرمت کی چوتھی قسم	۳۴۲
حلال ہونے کی شرط	۳۴۲
باندیوں سے نکاح	۳۴۳
بے حیائی کی سزا	۳۴۳
نکاح سے متعلق متعدد اہم احکامات	۳۴۴
تعلیم وتربیت کی ترغیب	۳۴۵
قدیم دنیا کا نظام	۳۴۶
''ماملکت ایمانکم'' کا مفہوم	۳۴۶

مضمون	صفحہ نمبر
اسلام کی اصلاح تبدیلیاں	۳۴۷
سماجی واخلاقی حکمت	۳۴۷
لونڈی سے نکاح کی طرح اصول	۳۴۸
جبری تعلقات کی سخت ممانعت	۳۴۸
اعتراضات کی وضاحت	۳۴۹
بے سہارا عورتوں کے لئے تحفظ	۳۵۰
لونڈیوں کے لئے اخلاقی معیار	۳۵۲
صبر کی ترغیب	۳۵۲
ملازم اور خادماؤں کا حکم	۳۵۴
شرعی باندیوں سے نکاح کے احکام	۳۵۴
اس نکاح کے لئے چند اہم شرائط	۳۵۵
نکاح سے اجتناب	۳۵۵
خواہشات کے غلام	۳۵۷
اجازت کی شرط	۳۵۸
ناحق قتل	۳۵۹
تجارت میں دھوکہ	۳۵۹
خودکشی کی سزا	۳۶۰
چھوٹے گناہوں کی معافی	۳۶۱
گناہِ کبیرہ کی تعریف	۳۶۲
گناہِ صغیرہ کی تعریف	۳۶۲
گناہ کسے کہتے ہیں	۳۶۲
چند نمایاں گناہ کبیرہ	۳۶۳
شانِ نزول اور حکمتِ الٰہی	۳۶۳
صلاحیت یا کمالات کی تقسیم	۳۶۴
نعمتوں کا شکر	۳۶۴
نیکیوں کی ترغیب	۳۶۵

مضمون	صفحہ نمبر
مرد ہو یا عورت دونوں کا صلہ	۳۶۵
خیر کا سبب	۳۶۶
میراث کی تقسیم میں حکمتیں	۳۶۷
عہد و پیمان کی اہمیت	۳۶۷
اخوت یعنی منھ بولے بھائی	۳۶۷
موالی سے مراد	۳۶۸
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۳۴ سے ۴۳ تک)	۳۶۹
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۳۴ سے ۴۳ تک)	۳۷۰
مرد کو عورت پر ایک درجے کا امتیاز	۳۷۱
لفظ قوام کی تشریح	۳۷۱
مردوں کے امتیاز کی وجہ	۳۷۲
فطری امتیاز	۳۷۲
جواب دہی کی ذمہ داری	۳۷۲
جسمانی قوت	۳۷۲
مختلف ذمہ داریاں	۳۷۳
بہترین عورت	۳۷۳
علامتی تنبیہ	۳۷۴
عورتوں کو مارنے کی ممانعت	۳۷۴
منصفانہ طریقہ	۳۷۵
حکیمانہ دستور	۳۷۵
نکاح کے بعد جدائی کی صورت	۳۷۵
والدین کے حقوق	۳۷۶
والدین کے ساتھ حسن سلوک	۳۷۷
حقوق کی ادائیگی	۳۷۷
والدین کی نافرمانی کا وبال	۳۷۸
رزق اور عمر میں برکت	۳۷۸

مضمون	صفحہ نمبر
مقبول حج کا ثواب	۳۷۸
یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک	۳۷۹
پڑوسیوں کے حقوق	۳۷۹
تین قسم کے پڑوسی	۳۸۰
دور کے پڑوسی اور عام معاشرتی تعلقات	۳۸۰
مسافر اور محتاج کا حق	۳۸۰
زیرِ کفالت افراد اور جانوروں کے حقوق	۳۸۱
بڑائی جتلانے کی مذمت	۳۸۱
عاجزی کی تعلیم	۳۸۲
تکبر کرنے والوں کا انجام	۳۸۳
یہود کا غرور	۳۸۳
بخل کی مذمت	۳۸۳
تین خصلتوں سے پرہیز	۳۸۴
نام و نمود کے لئے خرچ کرنے کی مذمت	۳۸۴
قبولیت کی بنیاد	۳۸۵
قیامت کے دن	۳۸۵
ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں	۳۸۶
اللہ تعالیٰ کی رویئت	۳۸۷
قیامت کے دن انبیاء کی گواہی	۳۸۸
رسول اللہ ﷺ کا قرآن سننا	۳۸۹
رسول اللہ ﷺ کے گواہی کی وضاحت	۳۸۹
اعضاء کی گواہی	۳۹۰
جنابت کی صورت میں تیمم	۳۹۲
بیماری کی صورت میں تیمم	۳۹۲
دلوں کے اتحاد کا سبب	۳۹۳
نشے کی حالت میں نماز کی ممانعت	۳۹۳

مضمون	صفحہ نمبر
شانِ نزول	۳۹۳
تدریجی انداز میں شراب کی ممانعت	۳۹۴
حکمت	۳۹۴
دیگر حالتوں میں نماز کا حکم	۳۹۴
تیمم کی اجازت	۳۹۵
تین حالتوں میں تیمم کا حکم	۳۹۵
تیمم کے حکم کا واقعہ	۳۹۵
جنابت میں تیمم کا طریقہ	۳۹۶
تیمم: امتِ محمدیہ ﷺ کی خصوصی فضیلت	۳۹۶
امت محمدیہ کی پانچ اہم خصوصیات	۳۹۷
تیمم کے مسائل اور طریقہ	۳۹۷
تیمم کن چیزوں سے جائز ہے	۳۹۷
کن چیزون پر تیمم درست نہیں	۳۹۸
وضو اور غسل کے لئے تیمم	۳۹۸
تیمم کے ٹوٹنے کا حکم	۳۹۸
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۴۴ سے ۵۵ تک)	۳۹۹
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۴۴ سے ۵۵ تک)	۴۰۰
تورات میں تحریف	۴۰۱
بددعا کا پہلو	۴۰۲
ہفتہ کی بے حرمتی کرنے والوں پر لعنت	۴۰۳
دین پر ثابت قدمی	۴۰۴
شرک کی مذمت	۴۰۵
مشرکانہ اعمال سے اجتناب	۴۰۵
اللہ کی محتاجی	۴۰۵
ناقابل معافی جرم	۴۰۶
ہمیشہ کی جہنم	۴۰۶

مضمون	صفحہ نمبر
بے عیب اور برتر سمجھنا	۴۰۷
کھجور کے گٹھلی کی مثال	۴۰۸
اخلاقی اصول	۴۰۸
تعریف میں احتیاط	۴۰۹
یہود کا تکبر	۴۱۰
جبت اور طاغوت	۴۱۱
شراب کے بارے میں وعید	۴۱۲
دھوکہ اور فریب کی ممانعت	۴۱۲
تقدیر کے منکرین	۴۱۲
قبروں کے آداب	۴۱۳
نوحہ کرنے والوں پر لعنت	۴۱۳
شوہر کی نافرمانی کرنے والی پر وعید	۴۱۴
صحابۂ کرامؓ کی گستاخی کرنے والوں پر لعنت	۴۱۴
سودخوروں پر لعنت	۴۱۴
رشوت لینے اور دینے والوں پر لعنت	۴۱۴
ذخیرہ اندوزی کرنے والوں پر لعنت	۴۱۵
فطری امتیاز کو بدلنے والوں پر لعنت	۴۱۵
مخالف جنس کا لباس اختیار کرنے والوں پر لعنت	۴۱۵
غیر فطری طریقوں سے شہوت پوری کرنے والوں پر لعنت	۴۱۵
جسمانی تبدیلی کرنے والوں پر لعنت	۴۱۶
عیب چھپا کر فروخت کرنے والوں پر لعنت	۴۱۶
غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والوں پر لعنت	۴۱۷
غیر محرم پر نگاہ ڈالنے پر لعنت	۴۱۷
نسب بدلنے والوں پر لعنت	۴۱۷
حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت	۴۱۸
مال و دولت کے غلام پر لعنت	۴۱۸

مضمون	صفحہ نمبر
یہودیوں کا بغض وحسد	۴۱۹
آلِ ابراہیم کو عطا کی گئی نعمتیں	۴۲۰
اللہ کے اختیارات اور شریعت کی حکمتیں	۴۲۰
تاریخ انسانی کی حقیقت	۴۲۱
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۵۶ سے ۶۵ تک)	۴۲۲
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۵۶ سے ۶۵ تک)	۴۲۳
کافروں کو عذاب اور مومنوں کو ثواب	۴۲۴
عذاب کی کیفیت	۴۲۴
دلنشیں منظر	۴۲۵
دائمی سائے	۴۲۵
امانت کی ادائیگی اور فیصلوں میں انصاف	۴۲۵
خانۂ کعبہ کی کلید (چابی)	۴۲۶
امانتوں کی تفصیل	۴۲۷
ذمہ داریاں	۴۲۷
امانت داری اور ایمان کا بنیادی تقاضا	۴۲۸
منافق کی پہچان	۴۲۸
اداروں کے مال کی حفاظت	۴۲۸
عہدہ کی ذمہ داری	۴۲۹
نااہل افراد کو عہدے	۴۲۹
نااہل کے مقرر کرنے پر لعنت	۴۳۰
حکام کی خیانت	۴۳۰
عوام کے حقوق	۴۳۰
کام کی ادائیگی اور معاشرتی ذمہ داریاں	۴۳۰
مجالس بھی امانت ہیں	۴۳۱
مشورہ ایک امانت ہے	۴۳۱
دیگر معاملات میں امانت داری	۴۳۲

مضمون	صفحہ نمبر
عدل وانصاف کا حکم	۴۳۲
قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے	۴۳۲
ظالمانہ فیصلوں کے نتائج	۴۳۳
تقویٰ اور انصاف کی بنیاد	۴۳۴
آج کا المیہ اور انجام	۴۳۴
انصاف کے فیصلے اور ظالموں کی ہلاکت	۴۳۵
اہل جنت کی قسمیں	۴۳۵
حاکموں کے لئے سخت تنبیہ	۴۳۶
حاکم کے انتخاب کا معیار	۴۳۶
قضا کے منصب کا طالب	۴۳۷
موجودہ نظام کا المیہ	۴۳۷
اللہ کی نصیحت (سراپا خیر)	۴۳۸
اللہ اور رسول کی اطاعت	۴۳۹
وسیع مفہوم	۴۳۹
امیر کی اطاعت (اتحاد کی بنیاد)	۴۳۹
امیر کی نافرمانی	۴۴۰
اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری نہیں	۴۴۰
اطاعت کی ممانعت	۴۴۰
امام المسلمین پر واجب امر	۴۴۱
اولوالامر کا مفہوم	۴۴۱
اہل اقتدا کی اطاعت کا معیار	۴۴۱
اختلاف کا حل	۴۴۲
کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی طرف رجوع	۴۴۲
مسلم معاشرے کی موجودہ حقیقت	۴۴۲
اجتماعی رویّہ اور کمزوری	۴۴۳
بدعت اور سنت کا معیار	۴۴۳

مضمون	صفحہ نمبر
حقیقی کامیابی کا راستہ	۴۴۳
ایک منافق کا واقعہ	۴۴۴
غیر اسلامی قانون کی طرف رجوع کی مذمت	۴۴۵
طاغوت کی حقیقت اور گمراہی کا راستہ	۴۴۵
منافقین کا طرز عمل	۴۴۶
منافق کے قبیلے والوں کا انجام	۴۴۶
دو مفہوم	۴۴۷
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور اطاعت	۴۴۷
سچی توبہ	۴۴۸
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۶۶ سے ۷۶ تک)	۴۴۹
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۶۶ سے ۷۶ تک)	۴۵۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کو دل سے ماننا	۴۵۰
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد	۴۵۱
انسانی ذہن کی گمراہی	۴۵۲
ظالمانہ قوانین کہنا	۴۵۲
جانوں کے قتل کا حکم	۴۵۳
محبت کا اظہار	۴۵۳
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت	۴۵۴
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر اعتراض	۴۵۴
ایمانی جرأت	۴۵۴
اطاعت الٰہی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۴۵۶
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت	۴۵۶
انبیاء وصالحین کی رفاقت	۴۵۷
نیک لوگوں سے محبت	۴۵۷
نماز کی پابندی نہ کرنے والے کا انجام	۴۵۷
روح المعانی کی وضاحت	۴۵۸
اللہ کے لئے محبت	۴۵۸
رفاقتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا	۴۵۸
جنت کے بلند درجات	۴۵۹
جنت کا منظر	۴۶۰
اللہ کے انعام یافتہ بندے (چار عظیم جماعتیں)	۴۶۰
حضرات انبیاء علیہم السلام	۴۶۰
حضرات صدیقین	۴۶۰
شہداء	۴۶۱
صالحین	۴۶۱
راہِ ہدایت کی دعا	۴۶۱
حقیقی انعام اور بہترین رفاقت	۴۶۲
اہل ایمان کو ہدایت	۴۶۳
جہاد کی اہمیت	۴۶۳
اللہ کی راہ میں ایک صبح شام	۴۶۳
ایمان کے کمزوری کی علامت	۴۶۴
شہادت کی تمنا	۴۶۴
منافقوں کا طرز عمل	۴۶۴
دنیا کو آخرت پر ترجیح	۴۶۵
جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت	۴۶۵
تین اہم نکات	۴۶۷
اسلام کا اصولِ قتال	۴۶۸
سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عملی ثبوت	۴۶۸
اجر کا ذکر	۴۶۸
حقیقت کی نشاندہی	۴۶۸
منافقین کی مذمت	۴۶۹
فی سبیل اللہ کا مطلب	۴۶۹

مضمون	صفحہ نمبر
مظلوموں کی حفاظت	۴۷۰
مظلوم مسلمانوں کی نصرت اور جہاد کی تاکید	۴۷۱
مظلوموں کی دعائیں	۴۷۱
مومن اور کافر کی جنگ کا بنیادی فرق	۴۷۲
ظلم کے خلاف مزاحمت	۴۷۳
مظلوموں کی مدد ایک اخلاقی فرض	۴۷۳
''سبیل اللہ'' اور ''سبیل الطاغوت'' کا فرق	۴۷۴
خلاصہ	۴۷۵
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۷۷ سے ۸۴ تک)	۴۷۶
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۷۷ سے ۸۴ تک)	۴۷۷
درگذر کرنے کا حکم	۴۷۸
دلوں پر خوف کا غلبہ	۴۷۸
بزدلی کی حقیقت اور اس کا سبب	۴۷۹
موت سے فرار ناممکن ہے	۴۸۰
منافقین اور یہودیوں کی روش	۴۸۱
اعمال کا اثر	۴۸۱
پوری انسانیت کے رسول	۴۸۲
اللہ کا نظام	۴۸۳
قرآن کا متوازن نظریہ	۴۸۳
اطاعتِ رسول اور اطاعتِ الٰہی	۴۸۴
انکارِ حدیث کی گمراہی	۴۸۵
رسول کا منصب	۴۸۵
اطاعت کی اہمیت	۴۸۶
منافقین کی خصلت	۴۸۶
قرآن میں تدبر کی دعوت	۴۸۷
غور وفکر کے اہل	۴۸۸

مضمون	صفحہ نمبر
تفسیر کا فتنہ	۴۸۸
تفسیر بالرائے	۴۸۸
کیا قرآن آسان ہے؟	۴۸۹
بنیادی احکام	۴۹۰
حضرت صدیقِ اکبرؓ کا احتیاط وتقویٰ	۴۹۰
اصولِ تفسیر اور مفسر کی ذمہ داریاں	۴۹۰
صحابۂ کرام کا امتیاز	۴۹۱
مفسر کے لئے لازم علوم	۴۹۱
سابقہ مفسرین سے استفادہ	۴۹۲
تفسیر کے بیان میں احتیاط وذمہ داری	۴۹۲
فہم قرآن کے لئے عمل	۴۹۲
اہل علم تک خبر پہنچانے کی اہمیت	۴۹۳
منافقین کی روش اور خبر پھیلانے کا فتنہ	۴۹۴
استنباط کا مطلب	۴۹۴
خبر کی تحقیق	۴۹۵
احتیاط کا اصول	۴۹۵
استنباط اور قیاس کا اصول	۴۹۶
ائمہ مجتہدین کا منہج اور اجتہاد کی حقیقت	۴۹۶
آیت نمبر ۸۴ کی توضیح	۴۹۷
اللہ کی راہ میں جہاد کا مفہوم	۴۹۷
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۸۵ سے ۹۳ تک)	۴۹۸
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۸۵ سے ۹۳ تک)	۴۹۹
اچھی اور بری سفارش	۵۰۰
سفارش کرنے والے کی نیت پر اجر	۵۰۰
خدمت خلق کا ذریعہ	۵۰۱
ناحق سفارش پر گرفت	۵۰۱

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ تعالیٰ کے حدود کو روکنے کے لئے سفارش	۵۰۱
گناہ کے کاموں میں سفارش	۵۰۲
لفظ مقیتاً کا مفہوم	۵۰۳
سلام کے احکام ومسائل	۵۰۳
سلام کی اہمیت	۵۰۳
سلام پر نیکیاں	۵۰۴
سلام کے اصول	۵۰۴
انجان شخص کو بھی سلام	۵۰۴
سلام کی ابتدا	۵۰۴
سلامتی کی دعا	۵۰۵
ملاقات کے وقت دیگر اقوام کے طریقے	۵۰۵
دور جاہلیت کا سلام	۵۰۶
لفظ اسلام	۵۰۶
سلام کی کثرت اور اس کا جواب	۵۰۶
سلام کا جواب	۵۰۷
افضل اعمال	۵۰۷
راستے کے حقوق اور سلام	۵۰۷
مجلس یا گھر میں داخل ہوتے وقت سلام	۵۰۸
اپنے گھر والوں کو سلام	۵۰۸
سلام میں پہل کرنے کی فضیلت	۵۰۸
سلام کا بہتر جواب	۵۰۸
سلام کی انتہا	۵۰۹
سلام سے متعلق مسائل	۵۱۰
کسی کے گھر میں داخل ہونے کا طریقہ	۵۱۰
دوسرے کے ذریعہ سلام	۵۱۰

مضمون	صفحہ نمبر
تین دن کے اندر سلام	۵۱۰
سلام سے متعلق چند اصول وآداب	۵۱۱
حضرت آدمؑ کا سلام	۵۱۲
جنت میں انسانوں کا قد وقامت	۵۱۲
منافقوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملہ	۵۱۳
منافقین کے ارادوں کا بیان	۵۱۵
فعال دشمنوں کے خلاف حکم	۵۱۷
الزامی جواب	۵۱۷
منواسمرتی کی گواہی	۵۱۷
جدید دنیاوی قوانین	۵۱۸
ہجرت کا ابتدائی حکم	۵۲۰
غلطی سے قتل کا حکم	۵۲۱
قتل کا بدلہ اور احکام	۵۲۲
قتل کی سزا	۵۲۲
قتل خطا کی دو صورتیں	۵۲۲
دیت کی تعریف	۵۲۳
دیت اور کفارہ کی ادائیگی کا حکم	۵۲۳
غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے روزے	۵۲۴
ذمی کا معاہد	۵۲۴
دیت سے متعلق مسائل	۵۲۵
عاقلہ کے دیت کا مسئلہ	۵۲۶
دیت کی حکمت	۵۲۶
قتلِ عمد (جان بوجھ کر) اور قتلِ شبہ عمد	۵۲۶
قتل کی دیگر صورتیں	۵۲۷
کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے کا گناہ	۵۲۸

مضمون	صفحہ نمبر
ایک مومن کی اہمیت	۵۲۹
اتحادِ امت اور قتلِ مومن کی سنگینی	۵۳۰
ہتھیار سے اشارہ کی ممانعت	۵۳۰
فتنوں کی کثرت	۵۳۰
مومن کے قاتل کی مغفرت	۵۳۱
جمہور علماء کا موقف	۵۳۱
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۹۴ سے ۱۰۲ تک)	۵۳۳
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۹۴ سے ۱۰۲ تک)	۵۳۴
اسلام کا اظہار کرنے والے کے لئے حکم	۵۳۵
سلام یا کلمہ پڑھنے والے کے لئے حکم	۵۳۶
ظاہر کا اعتبار	۵۳۶
سلامتی اور عدل کا دین	۵۳۷
کلمہ گو کو کافر کہنا	۵۳۷
ایمان کے تقاضے	۵۳۸
مجاہدین اور قاعدین برابر نہیں	۵۳۸
غزوہ بدر میں نکلنے کا حکم	۵۳۹
ہجرت کی وسعت	۵۴۱
مدینہ منورہ کی طرف ہجرت	۵۴۱
کافروں کی طرف سے مصیبتیں	۵۴۲
حضرت ام سلمہ کا واقعہ	۵۴۲
ہجرت ترک کرنا گناہ کا سبب	۵۴۳
ہجرت کا شوق	۵۴۵
حضرت خالد بن حرامؓ کا واقعہ	۵۴۶
دین کی حفاظت کے لئے ہجرت	۵۴۶
عذر کی وجہ	۵۴۶

مضمون	صفحہ نمبر
ہجرت کا مفہوم اور اس کی عظمت	۵۴۶
ہجرت کا اجر وثواب	۵۴۷
اصل ہجرت (گناہوں سے کنارہ کشی)	۵۴۸
حقیقی مہاجر	۵۴۸
افضل ہجرت	۵۴۸
ہجرت کا مقصد	۵۴۹
انصارِ مدینہ کی بے مثال صفت	۵۴۹
دنیا سے بے رغبتی	۵۵۰
اعمال کی بنیاد	۵۵۰
اُم قیس کا واقعہ	۵۵۰
سفر میں نماز قصر	۵۵۱
امام اور مقتدی کی نماز	۵۵۱
جدید پیمائش (۴۸ میل اور کلومیٹر کی تحقیق)	۵۵۲
سفر میں سنتوں کا حکم	۵۵۲
سنت نماز کا حکم	۵۵۲
خوف کی حالت میں قصر	۵۵۳
دو اہم باتیں	۵۵۳
سفر میں قصر ہی لازم ہے	۵۵۳
چار رکعت پر تعجب	۵۵۴
صلوٰۃُ الخوف (نمازِ خوف)	۵۵۵
نماز خوف کا طریقہ	۵۵۵
اگر امام مقیم ہو	۵۵۶
حملے کی صورت میں احکام	۵۵۶
نماز کے وقت حملہ کا اندیشہ	۵۵۶
مسئلہ	۵۵۷

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۱۰۳ سے ۱۱۵ تک)	۵۵۸
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۱۰۳ سے ۱۱۵ تک)	۵۵۹
نماز ایک ذکر ہے	۵۶۰
ذکر کی فضیلت	۵۶۰
نماز، روزہ اور ذکر کا اجر	۵۶۱
دو نمازیں ایک ساتھ (امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک)	۵۶۱
نماز کی اہمیت	۵۶۱
دشمن بھی تکلیف اٹھاتا ہے	۵۶۲
خیانت کرنے والوں کی طرف سے مدافعت	۵۶۴
تحقیق کے بغیر کسی کی حمایت	۵۶۴
اپنے گناہ کا بوجھ	۵۶۶
بشر بن حارث کی چوری کا واقعہ	۵۶۷
مجرم کی حمایت	۵۶۷
نیکی کا حکم	۵۶۷
صلح کروانے کی اہمیت	۵۶۸
اس آیت کا حکم	۵۶۸
ترجمہ سورہ نساء (آیت نمبر ۱۱۶)	۵۷۰
تفسیر سورہ نساء (آیت نمبر ۱۱۶)	۵۷۱
شرک کی قسمیں	۵۷۲
شرکِ اکبر (بڑا شرک)	۵۷۲
شرکِ اکبر کی قسمیں	۵۷۲
اللہ کے علم میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا	۵۷۳
کامل علم غیب	۵۷۳
غیب کی کنجیاں	۵۷۴
تمام علم صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے	۵۷۴

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ کے سوا کسی کو پکارنا	۵۷۴
تصرف (اختیار) میں کسی کو شریک ٹھہرانا	۵۷۵
نذر و نیاز کا اصل مفہوم	۵۷۵
حفاظت اور اختیار	۵۷۶
عبادات	۵۷۷
عبادت کی حقیقت	۵۷۷
عبادت میں توحید کا تقاضا	۵۷۷
عبادت جیسا معاملہ کرنا	۵۷۷
کسی کو بزرگ کہہ کر رب کا درجہ دینا	۵۷۸
اللہ کی صفات میں شرک	۵۷۹
اللہ کے حقوق میں شرک	۵۷۹
شرک ایک ناقابلِ معافی جرم	۵۷۹
شرکِ اکبر (بڑا شرک)	۵۸۰
شرکِ اصغر (چھوٹا شرک)	۵۸۱
شرکِ جلی (ظاہری شرک)	۵۸۱
شرکیہ اعمال	۵۸۱
شرک خفی (پوشیدہ یا ہلکا شرک)	۵۸۲
نیتوں کا شرک	۵۸۲
اخلاص	۵۸۲
شرکِ اکبر اور شرک اصغر میں فرق	۵۸۳
شرکیہ رسمیں	۵۸۳
مشرک کی بخشش نہیں	۵۸۴
قدیم اور جدید شرک کا تقابلی جائزہ	۵۸۴
مشرکین کا حال	۵۸۴
دین کے کسی ایک فرض کا انکار	۵۸۵

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
بنیادی فرض (توحید).....	۵۸۶		
ایک کلمۂ کفر سے ایمان کا زائل ہونا.....	۵۸۶		
اصلاح کی ضرورت.....	۵۸۷		

❁❁❁

نوٹ:.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....